VISIT AMERICA BEFORE IT VISITS YOU

پینٹاگون۔ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ۔ ہوم لینڈ سیکورٹی۔ تھنک ٹینکس میں طے ہوتا، دنیا کا مستقبل

"دنیا اگر انسانوں کے لئے خطرناک ہو رہی ہے۔ اور دہشت گردی بڑھ رہی ہے تو اسکی وجہ بعض حساس علاقوں میں موجود دیرینہ سیاسی تنازعات ہیں۔ جو اتفاق سے سب سے زیادہ مسلم ممالک میں ہیں۔ کوسوو بوسنیا فلسطین۔ افغانستان، کشمیر۔ عراق سب جگہ انہی کا خون بہہ رہا ہے۔ مغرب کو چاہیے کہ ان کو سنجیدگی سے حل کرنے کی کوشش کرے۔ ان کی وجہ سے ہی مسلم نوجوان پر شدت پسندی کا غلبہ ہوا ہے۔ اور امریکہ اور مغرب کے ذرائع بلاغ نے یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا ہے کہ اسلام دہشتگردی۔ انتہا پسندی اور بنیاد پرستی کا مذہب ہے۔"

صدر جنرل پرویز مشرف

گزشتہ تیس برسوں میں امریکہ کا منظر نامہ تیزی سے تبدیل ہوا ہے۔ اسلامی مراکز اور مساجد۔ ہندو اور بدھ مت کے مندر روحانی سوچ کے مراکز امریکا میں تقریباً ہر بڑے شہر میں ہیں اور مختلف مقامات پر قدیم روایات کا سامنا ہوتا ہے۔ اب امریکا میں یہ سب سے اہم اور حساس معاملہ ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے امریکی تیزی سے صورت پذیر مذہبی کثرتیت میں ایک دوسرے سے کس طرح ملیں جلیں، گفتگو کریں۔ آنے والے دنوں میں بھی یہ مسئلہ انتہائی مرکزی حیثیت رکھے گا۔

WE MUST SCRUPULOUSLY GUARD THE CIVIL RIGHTS AND CIVIL LIBERTIES OF ALL CITIZENS, WHATEVER THEIR BACKGROUND.
WE MUST REMEMBER THAT ANY OPPRESSION, ANY INJUSTICE, ANY HATRED, IS A WEDGE DESIGNED TO ATTACK OUR CIVILIZATION.

صدر روزویلٹ کو جن شہری آزادیوں کی فکر تھی وہ خطرے میں ہیں

محمود شام

امریکہ کیا سوچ رہا ہے

دنیا بدل جانے کے بعد امریکہ میں تین ہفتے

مصنف	:	محمود شام
ناشر	:	ویلکم بک پورٹ
اشاعت اول	:	2009ء
اشاعت دوم	:	2010ء
طباعت	:	اے بی سی پرنٹرز
قیمت	:	600روپے

ناشر

ویلکم بک پورٹ

مین اردو بازار۔کراچی، پاکستان

فون : 021-32633151 - 021-32639581

فیکس : 021-32638086

ای میل : welbooks@hotmail.com

ویب : www.welbooks.com

امریکہ کیا سوچ رہا ہے

امریکہ کے ایک مطالعاتی پروگرام کی روداد

محمود شام

ویلکم بک پورٹ

انتساب

خاموش اکثریت کے نام

اظہارِ تشکر

سب سے پہلے تو میں شکر گزار ہوں.... امریکی محکمۂ اطلاعات کا.... جس کے توسط سے مجھے امریکہ میں دو ہفتے مختلف محکموں کی کارکردگی دیکھنے کا موقع ملا۔ انٹرنیشنل وزیٹر پروگرام میں شرکت کی بدولت ایسے امریکی دریچوں میں جھانکنے کا اتفاق ہوا.... جن تک عام حالات میں رسائی نہیں ہوسکتی تھی میں صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف کا بھی ممنون ہوں کہ ان سے جب اس کتاب کے لیے پیغام کی درخواست کی گئی تو انہوں نے خاص طور پر کہا کہ اس کے ذریعے امریکہ کو یہ احساس دلانا چاہیئے کہ مسلم اکثریت اس سے ناراض کیوں رہتی ہے... انہوں نے اپنے مختصر مگر جامع پیغام سے نوازا۔ اپنی بیگم بلقیس بانو، صاحبزادیوں فرخندہ اشرف، رخشندہ باشار، صاحبزادوں قاسم محمود، سلیم محمود اور نعیم محمود کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جنہوں نے وقتاً فوقتاً اس سفر کے بارے میں گفتگو میں حصہ لیا اور یہ بتایا کہ پاکستانی امریکہ کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ سید قیصر زیدی چیئرمین ویلکم ٹریڈرز اور ہمارے ویلکم بک پورٹ کے پبلشر اصغر زیدی بھی تشکر کے حقدار ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ وسیع، دلکش اور خوبصورت بنانے میں بھرپور دلچسپی لی۔ اور ان ہزاروں قارئین کا جنہوں نے ''جنگ'' میں ابتدائی تاثرات پر مبنی اقساط پڑھ کر انہیں کتابی شکل دینے کی تجاویز دیں۔

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان جنرل پرویز مشرف کا پیغام

جناب محمود شام پاکستان کے ایک نامور اور کہنہ مشق صحافی ہیں۔ اُن کے کالم میری نظر سے گزرے ہیں جن میں قومی سوچ اور روشن اسلامی نکتہ نظر کو اہمیت دی جاتی ہے۔ محمود شام کی تحریریں اس بات کی عکاسی کرتی ہیں کہ وہ صحافت کے ساتھ ساتھ شعروادب کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب "امریکہ کیا سوچ رہا ہے" اُن کی علمی اور تحقیقی کاوش ہے۔ کتاب میں اُنہوں نے امریکی نظامِ حکومت خصوصاً اس کے پالیسی ساز اداروں کے کردار پر روشنی ڈالی ہے اور گیارہ ستمبر کے سانحے کے امریکی پالیسیوں پر اثرات پر جامع بحث کی ہے۔

اس کتاب سے قارئین کو گیارہ ستمبر کے بعد امریکی خارجہ پالیسی کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔آپ میرے ساتھ ایک سفر میں شامل ہو رہے ہیں۔ جو ہر پاکستانی کا خواب ہوتا ہے زندگی میں ایک بار یا زندگی بھر کے لیے امریکہ جانا۔آپ میرے ساتھ چلیں۔ اس طرح اسے آپ اچھی طرح جان لیں گے یقیناً ہر پاکستانی کے لیے امریکہ کو جاننا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ جہاں ترقی، روشنی، سلامتی، مضبوط دفاع، مستحکم معیشت اور دولت علم کے لیے شہرت رکھتا ہے۔ وہاں یہ اپنی جارحانہ، توسیع پسندانہ یکطرفہ مہم جوئیوں کے باعث نفرت کا مرکز بھی بنتا جا رہا ہے۔

امریکہ جانا پہلے مشکل تھا اب دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے ویزا ملنا ایک سخت مرحلہ۔ پھر وہاں پہنچ بھی جائیں تو جوتے، کپڑے سب کچھ اتارنے کا خوف، اس لیے میں آپ کو اپنے ساتھ لے کر چل رہا ہوں۔ ویزے کی پریشانی، نہ فضائی سفر کے اخراجات، نہ امیگریشن حکام کے سامنے بے لباس ہونے کے خدشات۔

میرے ساتھ افغانستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے ایڈیٹرز بھی ہیں۔ ہمیں جنوبی ایشیا کے نظریہ ساز کہا جا رہا ہے۔ غلط فہمی ہے۔ تو رہنے ہی دیں۔ ہماری تو اہمیت بن رہی ہے۔ ورنہ آپ بھی جانتے ہیں ہم بھی۔ کہ اب ہمارے ہاں اخباری اداریے، مضامین اور کالم پڑھ کر لوگ

اپنے نظریے قائم نہیں کرتے۔ اب تو ایڈیٹوریل سے ایڈیٹر کا۔ کالم سے کالم نویس کا مضمون سے مضمون نگار کا متفق ہونا بھی ضروری نہیں ہوتا۔ آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں.....بہت سے لکھنے والوں کو اپنی تحریر کی اشاعت کے بعد بھی علم نہیں ہوتا کہ کیا لکھا ہے۔

جنوبی ایشیا کے ہم نظریہ ساز انٹرنیشنل وزیٹر پروگرام میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔ آئی وی پی امریکی محکمۂ خارجہ کے بیورو آف ایجوکیشنل اینڈ کلچرل افیئرز کا ایک سلسلہ ہے۔ اس کا مقصد جارج بش کے الفاظ میں یہ ہے کہ بہترین بین الاقوامی تعلقات اس وقت شروع ہوتے ہیں جب لوگ دوسرے افراد کے بارے میں احساس کرتے ہیں۔ جب وہ یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ دوسرا کیسے سوچ رہا ہے۔ اور دوسرے کی زندگی آگے کس طرح بڑھ رہی ہے۔"

یا وزیر خارجہ کولن پاول کے مطابق:

جب آپ اپنے گھروں کے، محلوں کے اور دلوں کے دروازے دنیا بھر سے آنے والے مہمانوں کے لیے کھول دیتے ہیں۔ تو آپ انہیں امریکہ کو اپنی بہترین کیفیت میں دیکھنے کا موقع دیتے ہیں۔ وہ ہماری گرمجوشی..... ہمارے تنوع کی بنیاد.....اور ہمارے اس یقین کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں کہ گرہیں کھولتی بحث .....اور مخلصانہ تبادلۂ خیال سے سودمند نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔"

عام طور پر مہمانوں کو تین یا چار ہفتے امریکہ میں قیام کرنا ہوتا ہے۔ ان کے لیے پروگرام بڑی احتیاط اور غوروفکر سے تشکیل دیئے جاتے ہیں۔ اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ امریکہ کی جمہوریت..... معاشرت، تمدن اور تنوع کو خود ملاحظہ کرسکیں۔ اور اپنے ملک کے معاشرے..... تمدن ،اور جمہوری اقدار سے موازنہ کرسکیں۔ اس عرصے میں مہمانوں کو زندگی کے مختلف شعبوں میں سرگرم شخصیتوں سے آزادانہ تبادلۂ خیال کی سہولت دی جاتی ہے۔ جن میں سرکاری افسر کانگریس، سینٹ کے ارکان، وکلاء تاجر، صنعت کار، ماہرین تعلیم سبھی شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح ان امریکیوں کو دنیا بھر کی نمائندہ شخصیتوں سے رابطے، معانقے اور بالمشافہ گفتگو کا موقع ملتا ہے۔ ٹونی بلیئر نے اس پروگرام کو امریکہ سمجھنے اور امریکی عوام کو براہ راست تجربے سے جاننے، قیمتی رابطے قائم کرنے کا انمول موقع قرار دیا ہے۔ اور انہوں نے اس اسکیم کے ذریعے امریکہ

میں دروں بنی پر اظہار تشکر کیا۔

اب تک کے مہمانوں میں کم از کم 200 ایسے ہیں۔ جو بعد میں مختلف ممالک میں سربراہ مملکت، اور سربراہ حکومت بنے۔ اب بھی کچھ اس مسند پر فائز ہیں۔ مثلاً حامد کرزئی، صدر افغانستان، میگاوتی سوکارنو پتری۔ صدر انڈونیشیا۔ عبداللہ گل سابق وزیر اعظم ۔موجودہ وزیر خارجہ ترکی ان کے علاوہ رچرڈ لاگوس۔ صدر چلی ۔ انورسادات۔ صدر مصر۔ اندرا گاندھی۔ وزیر اعظم بھارت۔ سوائی کیاس۔ صدر کینیا۔ کم ڈائی چنگ۔ صدر کوریا۔ فریڈرک کلارک۔ صدر جنوبی افریقہ۔ بھی حالیہ تاریخ کی نامور شخصیتیں ہیں۔ یہ اعداد وشمار حوصلہ افزا بھی ہیں۔ اور خوفزدہ کرنے والے بھی۔ صدر انور سادات۔ اور وزیر اعظم اندرا گاندھی کے انجام پر نظر ڈالیں۔ تو شرکت خطرناک لگتی ہے۔ دوسرے شرکاء کی بعد میں ترقی۔ کچھ سہانے خواب بھی دکھاتی ہے۔

اس پروگرام کے ذریعے ہمیں محکمۂ خارجہ، وزارت دفاع (پینٹاگون) ہوم لینڈ سیکورٹی کی کارگزاری کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ آنے والے صفحات میں آپ بھی یہ مشاہدہ کرسکیں گے۔ حالات جس طرح کروٹ بدل رہے ہیں۔ امریکہ جس طرح اب پوری دنیا کی باگ ڈور سنبھال رہا ہے۔ جہاں جہاں جمہوریت نہیں ہے۔ وہاں اس کا احیا اپنی ذمہ داری سمجھ رہا ہے۔ اور جہاں ضروری سمجھتا ہے۔ اپنی فوجیں لے کر اتر جاتا ہے۔ اس لیے ہم سب کے لیے لازمی ہوگیا ہے کہ ہم یہ جاننے کا اہتمام کریں کہ امریکہ کیا سوچ رہا ہے۔ امریکی انتظامیہ ملک کیسے چلاتی ہے۔ محکمۂ خارجہ دنیا بھر کے لیے پالیسیاں کیسے تشکیل دیتا ہے۔ محکمہ دفاع (پینٹاگون) منصوبے کیسے بناتا ہے۔ پہلے بھی یہ سب کچھ جاننا چاہئے تھا۔ لیکن 11 ستمبر کے بعد تو یہ اور بھی ناگزیر ہوگیا ہے۔ 11 ستمبر کے بعد ہماری حیثیت اپنے محل وقوع اور پالیسیوں کے حوالے سے اہم بھی ہوچکی ہے۔ اور خطرناک بھی۔ ہم اپنے بہت قریب قیامتیں اترتی دیکھ چکے ہیں۔ جیسا کہ صدر جنرل پرویز مشرف بار بار کہہ چکے ہیں کہ امریکہ اور دوسری مغربی طاقتوں کی نظر میں پاکستان ایک انتہا پسند بنیاد پرست اکثریت رکھنے والا ملک ہے۔ ہم ان تاثرات اور خدشات کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ ہم دہشت گردیٔ کے خلاف جنگ میں امریکہ کے اتحادی ہیں۔ پاکستان میں ایک حلقہ جو کبھی امریکہ کا مداح... ہم خیال... اور حاشیہ بردار تھا۔ اب وہ امریکہ کا

سخت مخالف ہے وہ پاکستان کی 11 ستمبر کے بعد کی پالیسیوں پر کڑی نکتہ چینی کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہتا ہے کہ امریکہ صرف اپنے مفادات کے حصول کی فکر کرتا ہے۔ مفادات پورے ہونے کے بعد وہ پھر اسی طرح پاکستان کو نظرانداز کردے گا۔ جیسے 1980ء کی دہائی میں سوویت یونین کے خاتمے کے بعد کیا تھا۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ میں بھرپور تعاون کے باوجود امریکہ کے پاکستان کے بارے میں خدشات دور نہیں ہوئے ہیں۔ حال ہی میں مارکل فاؤنڈیشن کے تعاون سے امریکی کونسل آن فارن ریلشنز نے دہشت گردی کے باب میں پاکستان کے بارے میں سوالات اور جوابات مرتب کیے۔ جسے پاکستان میں امریکی قونصلیٹ جنرل کراچی کے امریکن انفارمیشن ریسورس سینٹر سے جاری کیا۔ یہ سوالات و جوابات یقیناً ہم سب کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں۔ کچھ سوالات اور جوابات ملاحظہ ہوں:۔

(1) س: 11 ستمبر سے اب تک، پاکستان نے امریکہ کی مدد کے لیے کیا کیا ہے؟

ج: پاکستان، افغانستان میں جنگ کے لیے مرکزی اسٹیج بنا۔ پاکستان کے صدر پرویز مشرف جو ایک جنرل ہیں اور ایک فوجی بغاوت کے ذریعے 1999ء میں برسراقتدار آئے۔ وہ امریکہ کے کلیدی اتحادی بن گئے ہیں۔ پاکستان نے امریکہ اور برطانیہ کو جنگی جہازوں کے گزرنے کے لیے فضائی حقوق دیئے۔ مشتبہ دہشت گردوں کے خلاف خفیہ معلومات میں حصہ لیا۔ اور امریکی افواج کو دو پاکستانی ہوائی اڈے استعمال کرنے دیئے۔

(2) س: کیا پاکستان نے دہشت گردی میں تعاون کیا ہے؟

ج: ہاں! پاکستان کی خفیہ ایجنسی .... انٹر سروسز انٹلی جینس یا آئی ایس آئی نے کشمیر کے متنازع علاقے میں بھارت کے خلاف برسرپیکار دہشت گرد گروپوں سے خفیہ لیکن دستاویزی تعاون کیا ہے۔ پاکستان، افغانستان میں طالبان حکومت کا بھی اتحادی تھا۔ جس نے القاعدہ کے اسامہ بن لادن کو پناہ دی۔ پاکستان کے بہت سے حصوں میں بن لادن کو ایک ہیرو تسلیم کیا جاتا ہے۔

(3) س: کیا پاکستان نے طالبان کی حمایت کی؟

ج: ہاں! مشرق میں بھارت سے اپنے دیرینہ تنازع کے سبب پاکستان کو اپنے مغرب میں افغانستان میں ایک دوست حکومت کی تلاش تھی۔ طالبان جن کی پاکستان نے پیدا ہونے اور تربیت میں مدد کی۔ انہوں نے اس ضرورت کو پورا کیا۔ آئی ایس آئی اور فوج میں متعدد اب بھی طالبان کے انتہاپسندانہ مذہبی نظریات اور عالمی نقطۂ نظر کے ہم خیال ہیں۔

(4) س: پاکستان نے طالبان کی حمایت کا آغاز کیسے کیا؟

ج: جب روسیوں نے 1979ء میں افغانستان پر حملہ کیا۔ پاکستان کے سربراہ جنرل محمد ضیاء الحق نے سوویت یونین کے مقابلے میں افغانستان کے مجاہدین کی مدد کی۔ جنرل ضیاء نے سیاسی اسلام کی شدت پسند شکل کو فروغ دیا۔ اور سعودی عرب کی پشت پناہی سے اس دور میں افغان سرحد کے نزدیک بے شمار نئے دینی مدارس تعمیر کیے گئے۔ جہاں پاکستانیوں اور افغان مہاجرین کو روسیوں کے خلاف جہاد کی تربیت دی گئی۔ طالبان پاکستانی مدرسوں میں پڑھائی گئی سیاسی اسلامی اور قدامت پسندی کی پیداوار ہیں۔ طالبان 1996ء میں طویل خانہ جنگیوں کے بعد افغانستان میں برسراقتدار آئے۔ خانہ جنگی 1989ء میں روسیوں کی واپسی کے بعد سے جاری تھی۔ طالبان کی حمایت کرکے پاکستان اپنی ممکنہ اندرونی لسانی علیحدگی کی تحریک کو بھی دبانا چاہتا تھا۔ دنیا کے دو کروڑ پشتون پاکستان اور افغانستان کے درمیان بٹے ہوئے ہیں۔ یہی طالبان کی بھی اصل لسانی طاقت ہیں۔

(5) س: کیا پاکستان نے کبھی القاعدہ کی بھی مدد کی؟

ج: ظاہری طور پر ہاں ''نیویارک ٹائمنر میں جمیز رزن۔ اور جوڈتھ ملر نے اکتوبر 2001ء میں رپورٹ دی تھی کہ آئی ایس آئی کے القاعدہ سے بالواسطہ لیکن دیرپا تعلقات تھے اور اس نے افغانستان میں القاعدہ کے کیمپوں کو بھارت کے خلاف دہشت گردی کی وارداتوں میں تربیت کے لیے استعمال کیا تھا۔ القاعدہ کے کیمپوں کے اس استعمال کا پہلا ثبوت 1996ء میں ظاہر ہوا جب امریکہ نے مشرقی افریقہ میں دو امریکی سفارت خانوں پر دہشت گردوں کے بم حملوں کے جواب میں افغانستان میں القاعدہ کے دہشت گردی کے مشتبہ ٹھکانوں پر کروز میزائل پھینکے امریکی حملے سے ہلاک ہونے والوں میں پاکستان کے حمایت یافتہ کشمیری عسکریت پسند گروپوں

کے ارکان بھی شامل تھے۔ جو ان کیمپوں میں تربیت حاصل کر رہے تھے۔ امریکی انٹلی جنس حکام کا یہ بھی کہنا ہے کہ پاکستان کے بعض ایٹمی سائنسدان القاعدہ سے ایٹمی ٹیکنالوجی کا تبادلہ بھی کرتے رہے ہیں اگرچہ اس کے لیے کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں ہیں۔

(6) س: کیا اسلامی بنیاد پرستی پاکستان میں بہت زیادہ پھیلی ہوئی ہے؟

ج: ہاں! ''واشنگٹن پوسٹ'' کے مطابق پاکستان میں اس وقت سات ہزار کے قریب دینی مدارس میں ساڑھے چھ لاکھ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ خود پاکستانی حکام کے اندازے کے مطابق 10 سے 15فی صد مدارس انتہا پسندانہ نظریات کو پروان چڑھاتے ہیں (حقیقت میں ایسی درسگاہوں کی تعداد زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔ ہارورڈ کے کینڈی اسکول آف گورنمنٹ کی جسیکا سٹرن کا تخمینہ ہے کہ چالیس ہزار مزید مدارس موجود ہیں لیکن وہ حکومت پاکستان کے پاس رجسٹرڈ نہیں ہیں) یہ اسکول ہر سال ہزاروں پاکستانی لڑکوں کو کھانے، لباس، رہائش کی فراہمی کے ساتھ ساتھ مختلف سطح کی عسکریت رکھنے والی اسلامی تعلیم بھی دیتے ہیں۔

مدارس کے علاوہ عسکریت پسند اسلامی رہنماؤں نے نفاذ شریعت کا مطالبہ کرتے ہوئے پنجاب میں شیعہ سنی تصادم کو ہوا دی ہے۔ اسی سے کراچی میں خونی تشدد کا سلسلہ شروع ہوا۔ شمال مغربی سرحدی صوبے اور ملحقہ قبائلی علاقوں میں اکا دکا پرتشدد واقعات ہوئے۔ 1993ء میں افغان اور پاکستانی مدارس کے سینکڑوں طلبہ حکومت مخالف سرگرمیوں میں شریک ہوئے۔ جنہیں فوج نے ختم کیا۔ اسلامی عسکریت پسندوں نے سیٹلائٹ ڈشوں کی توڑ پھوڑ کی، وڈیو شاپ مالکان کو ہلاک کیا اور مغربی شہر کوئٹہ میں بازاروں میں عفت کے تحفظ کے نام پر خواتین کو ہراساں کیا۔

(7) س: کیا دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نتیجے میں مشرف حکومت خطرے میں ہے؟

ج: ماہرین اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ کارنیگی اینڈومنٹ کے اناطول لیون کے مطابق پاکستان کی مسلح افواج نظم وضبط کی قائل ہیں۔ ان کے پاس مالی وسائل بھی ہیں۔ مشرف کے خلاف فوجی بغاوت کا امکان نہیں ہے۔ مزید یہ کہ طالبان کے تیزی سے خاتمہ نے مشرف کی

امریکہ نواز پالیسی کو آسانی سے آگے بڑھنے دیا ہے۔ طالبان کی حمایت میں سڑکوں اور گلیوں میں مظاہرے زیادہ دیر نہیں چل سکے۔ کونسل آف فارن ریلشنز میں ایشیائی امور کی ماہر رادھا کمار کے مطابق پاکستان کے اکثر تاجر، صنعت کار، دانشور اور عام لوگوں کے بڑے حلقے مشرف کی ان پالیسیوں کی حمایت کرتے ہیں جو انہوں نے دہشت گردی اور اسلامی عسکریت پسندی کے خلاف اختیار کر رکھی ہیں۔

پاکستان کے قریبی اتحادیوں طالبان کے خلاف ہونے کے بعد مشرف نے متعدد اسلامی تنظیموں۔ آئی ایس آئی، فوج، کشمیری عسکری تحریکوں کے ارکان کو اپنے خلاف کرلیا ہے۔ ماہرین یہ کہتے ہیں کہ پارلیمنٹ پر دسمبر 2001ء میں حملے کے بعد امریکہ کی طرف سے مشرف پر دہشت گردی کے خلاف کارروائیاں تیز کرنے کا دباؤ پڑا ہے۔ بھارت نے پاکستان کی حمایت یافتہ عسکری تنظیموں لشکر طیبہ اور جیش محمدؐ پر الزام عاید کیا ہے۔ ان کوششوں کے نتیجے میں مشرف کے لیے خطرات پیدا ہوئے ہیں۔

(8) س: مشرف نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ سے تعاون کیوں کیا ہے؟

ج: بعض تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ بش انتظامیہ نے 11 ستمبر کے بعد مشرف کے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا۔ واضح طور پر کہا تھا کہ وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں یا تو اتحادی ہیں یا اس کا نشانہ۔ مشرف امریکہ کے پاکستان کے ساتھ سرد مہری کے تعلقات میں بھی بہتری چاہتے تھے۔ جو پاکستان کے 1998ء میں ایٹمی دھماکے اور 1999ء میں ایک منتخب حکومت کے مشرف کے ہاتھوں خاتمے کے بعد سے مزید خراب ہوگئے تھے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مشرف نے مجبوری کے تحت نہیں بلکہ باقاعدہ قوت ارادی کے تحت اقدامات کیے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ مشرف پاکستان کو دوبارہ ایک سیکولر (غیر مذہبی) معاشرے میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ جنوری 2002ء کی ایک اہم تقریر میں انہوں نے قوم سے پوچھا: ''کیا ہم پاکستان کو ایک مذہبی مملکت بنانا چاہتے ہیں یا ایک ترقی پسند متحرک اسلامی فلاحی مملکت۔''؟

(9) س: پاکستان کو امریکہ سے تعاون سے کیا فائدے حاصل ہوئے ہیں؟

ج: کانگریس نے وہ پابندیاں ختم کردی ہیں۔ جو 1998ء میں بھارت اور پاکستان کے ایٹمی دھماکوں اور 1999ء میں مشرف کے فوجی قبضے کے بعد لگائی گئی تھیں۔ نومبر 2001ء میں صدر بش نے پاکستان کے لیے ایک ارب ڈالر کی امداد کا وعدہ کیا۔ اور اس سے پہلے 100 ملین ڈالر کی ہنگامی امداد بھی دی۔ اس کے علاوہ پاکستان امریکہ کے 1242 ملین ڈالر کے قرضے ری شیڈول کرواسکے گا۔ امریکہ نے آئی ایم ایف کو بھی کہا ہے کہ وہ پاکستان کو غربت کے خاتمے کے لیے 2ء1 ملین ڈالر دے۔ مزید یہ کہ یورپی یونین نے پاکستانی ٹیکسٹائل پر ٹیرف ختم کردیئے ہیں۔ اس طرح یورپی مارکیٹوں میں پاکستانی ٹیکسٹائل کو ترجیحی رسائی میسر آگئی ہے۔ اور عالمی بنک نے بھی امداد میں اضافہ کیا ہے۔

(10) س: مشرف نے ملک میں بنیاد پرستی اور دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کیا کیا ہے؟

ج: دسمبر 2001ء میں بھارتی پارلیمنٹ پر حملے کے بعد 12 جنوری کو ایک اہم تقریر میں مشرف نے انتہا پسندوں کے خلاف مہم کا آغاز کیا۔ تاکہ پاکستان کو دہشت گردی کے لیے میدان نہ بنایا جائے۔ دینی مدارس کے نظم وضبط کے لیے نئے قوانین کا اعلان کیا۔ جس کے تحت انتہا پسندانہ نصاب کو اعتدال پر لایا جائے۔ جیش محمدؐ اور لشکر طیبہ پر پابندی لگادی گئی۔ ان کے رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا۔ ان کے بینک اکاؤنٹ منجمد کردیئے گئے۔ امریکہ نے دہشت گرد تنظیموں کی فہرست جاری کی تھی۔ اس کے علاوہ پاکستان نے مقامی طور پر قائم تین انتہا پسند تنظیموں کو بھی ممنوع قرار دیا۔ دوہزار سے زیادہ عسکریت لیڈروں کو گرفتار کیا۔ ان کے قریباً 390 دفاتر سربمہر کیے۔

(11) س: کیا مشرف پاکستان سے دہشت گردی کو جڑ سے ختم کرنا چاہتے ہیں؟

ج: طالبان سے دیرینہ تعاون ختم کرنے۔ کشمیر کے نام پر ہونے والی دہشت گردی کی برسرعام مذمت۔ اسلامی عسکریت پسندوں کے خلاف مہم سے یقیناً مشرف نے دہشت گردی کے خلاف قابل ذکر اقدامات کیے ہیں۔ حالانکہ سیاسی طور پر ان کی ذات کے لیے خطرناک تھے۔ لیکن ماہرین کہتے ہیں کہ ابھی یہ یقین کرنا قبل از وقت ہے کہ وہ حقیقتاً کسی طویل المیعاد

کارروائی کے لیے پرعزم ہیں۔ بھارت اصرار کرتا رہتا ہے کہ وہ الفاظ نہیں عمل چاہتا ہے۔ اور شکایت کرتا رہتا ہے کہ پاکستان نے بھارت میں دہشت گردی میں ملوث 20 سرگرم افراد کو اس کے حوالے کرنے سے انکار کیا ہے۔ امریکی وزیرخارجہ کولن پاول نے مشرف کی 12 جنوری کی تقریر کو پاکستان کی طرف سے دہشت گردی اور انتہا پسندی کے خلاف ایک جراتمندانہ پیشرفت قرار دیا۔ اور امریکی حکام نے ان پر اقدامات کرنے پر زور دیا۔

(12) س: کیا اسامہ بن لادن پاکستان میں ہے؟

ج: ہم نہیں جانتے۔ افغانستان کے ساتھ پاکستان کی سرحد 1500 میل طویل ہے اور امریکی خفیہ حکام کہتے ہیں کہ اسامہ کہیں نکل گئے ہوں گے۔ مزید یہ کہ متعدد تجزیہ نگار کہتے ہیں کہ پاکستانی حکام۔ آئی ایس آئی کے اہلکار۔ یا قبائلی رہنما جو اسامہ بن لادن کے ہمدرد ہیں۔ وہ پناہ دے سکتے ہیں۔ امریکی فوجی حکام آج کل پاکستان میں القاعدہ کی کمیں گاہوں کی تلاش میں ہیں۔ لیکن زیادہ تر تعاقب اور کوششیں پاکستانی فوج اور نیم فوجی دستے کررہے ہیں جن کے طالبان سے دیرینہ گہرے رابطے رہے ہیں۔

(13) س: کیا پاکستان کے پاس ایٹمی ہتھیار ہیں؟

ج: جی ہاں! پاکستان نے 1998ء میں پہلی بار انتہائی کامیابی سے ایٹمی صلاحیت کا تجربہ کیا۔ امریکی حکومت کا تخمینہ ہے کہ پاکستان کے پاس کم از کم 24 بم (Warheads) ہیں جو قریبی فاصلوں کے میزائیلز یا پاکستان کے ایف 16 کے بیڑے کے ذریعے گرائے جاسکتے ہیں۔

(14) س: کیا پاکستان کے ایٹمی اثاثے محفوظ ہیں؟

ج: ماہرین اتفاق نہیں کرتے۔ وزیرخارجہ پاول سمیت امریکی حکام نے پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کی سیکورٹی پر اعتماد ظاہر کیا ہے۔ اکتوبر 2001ء میں بھارت کے وزیردفاع جارج فرینڈس نے بھی کہا تھا کہ پاکستان کے ایٹمی اثاثے محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔ یونیورسٹی آف ٹیکساس کی سمت گنگولی کی دلیل یہ ہے کہ پاکستان کی فوج کبھی بھی ملک کے ایٹمی ہتھیاروں کو غیر محفوظ نہیں ہونے دے گی۔ ''واشنگٹن پوسٹ'' کے مطابق مشرف نے افغانستان پر امریکی

بمباری سے قبل پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں کو ملک میں ہی مختلف مقامات پر منتقل کرنا شروع کردیا تھا۔ لیکن نیویارک ٹائمز کے تجربہ کار تحقیقی رپورٹر سیمیوئر ہرش کا کہنا ہے کہ امریکی انتظامیہ کے بعض حکام کو شک ہے کہ امریکی انٹلی جینس پاکستان کے تمام ایٹمی ہتھیاروں کے محل وقوع کے بارے میں باخبر ہے۔

(15) س: کیا امریکہ ایٹمی ہتھیاروں کی حفاظت میں پاکستان کی مدد کر رہا ہے؟

ج: جی ہاں! نومبر 2001ء میں پاکستان نے اعلان کیا کہ اس نے امریکی وزیر خارجہ کی یہ پیشکش قبول کرلی ہے۔ جس کے تحت پاکستانی حکام کو ایٹمی اثاثوں کی سلامتی اور تحفظ کے لیے تربیت دی جائے گی پاکستان کے وزیر خارجہ عبدالستار نے کہا کہ پاکستانی حکام کو ان حفاظتی اقدامات سے آگاہ کیا جائے گا جو امریکہ نے اختیار کیے ہوئے ہیں۔

کیا آپ نے دیکھا اور محسوس کیا۔ کہ یہ پندرہ کے پندرہ کتنے اہم اور حساس نکات ہیں۔ ہم میں سے کتنوں کو ان امور کی اہمیت کا احساس ہے۔ لیکن اصل معاملات اور مسائل یہی ہیں۔ جن کی بنیاد پر امریکہ دوسری مملکتوں سے اپنے تعلقات کی سطح متعین کرتا ہے۔ پہلے اس میں منشیات بھی شامل ہوتی تھیں۔ لیکن وہ اب پس منظر میں چلی گئی ہیں۔ ہمیں پاک امریکہ تعلقات پر بات کرتے وقت انہی بنیادی امور کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ یہ ترجیحات صرف امریکہ کی نہیں یورپ کی بھی ہیں۔ ہم جس انتہا پسندی سے گزر رہے ہیں۔ امریکہ یورپ اس کا ڈیڑھ دو سو سال پہلے سامنا کر چکے ہیں۔ تاریخی تناظر میں وہ اس کے بھیانک نتائج کا تصور کر کے ہی گھبرا جاتے ہیں۔

پاکستان کیمونزم کے خلاف امریکہ اور مغرب کی جنگ میں بھی امریکہ کا اتحادی رہ چکا ہے اس وقت امریکہ کو مذہب اور مذہبی شدت پسندی کی ضرورت تھی۔ اس لیے ان دنوں لبرل سوچ آزاد فکر اور روشن خیالی کی مخالفت کی گئی۔ لیکن یہ ایک اہم پہلو تھا کہ کیمونزم کے خلاف جنگ میں امریکہ نے علم و دانش ...ادب ..اور کتابوں کو بھی استعمال کیا۔ دنیا بھر میں مختلف ملکوں میں عالمی ادب کو مقامی زبانوں میں ترجمہ کر کے سستے نرخوں پر کتابیں تقسیم کیں۔ روس نے بھی اس کے مقابلے میں اپنے اعلیٰ ادب کو تمام اہم عالمی زبانوں میں منتقل کیا۔ پھر افغانستان پر روسی

حملے کے بعد امریکہ نے تمام مسلمان ملکوں کے نوجوانوں کو مجاہدین کا لقب دے کر پشاور میں جمع کیا۔ انہیں اسلحہ دیا۔ فنڈز دیئے۔ اور ان کے مذہبی جذبات کو ہوا دی۔ وہ افغانستان میں لڑائی میں شریک ہوتے رہے۔ اپنے ہاں تو امریکہ، یورپ غیر مذہبی معاشروں کو پسند کرتے رہے۔ لیکن مسلمانوں میں انتہا پسندی کی حمایت کرتے رہے۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد مسلمان نوجوانوں کا غیر اسلامی قوتوں سے جنگ کا جذبہ برقرار تھا۔ ان کے ذہنوں اور دلوں میں جوش تھا۔ اور سامنے کیمونزم نہیں رہا تھا۔ اس لیے وہ امریکہ یورپ کی غیر مذہبی پالیسیوں کو اسلام دشمن پالیسیاں قرار دے کر ان کے خلاف سرگرم ہوگئے۔ ان رجحانات کو امریکہ اور یورپ نے دہشت گردی کا نام دینا شروع کردیا۔

مسلمانوں کے خلاف امریکی پالیسیوں بالخصوص فلسطینیوں کے بارے میں امریکی موقف خاص طور پر مسلمان نوجوانوں میں نفرت کا باعث بنا۔ امریکہ نے اسرائیل کی ہر ظالمانہ کارروائی کو عالمی طور پر تحفظ فراہم کیا۔ فلسطینیوں کے بہتے ہوئے نوجوان خون نے امریکہ کے خلاف نفرتوں میں شدت پیدا کی۔ اسی طرح کشمیر میں بھارت کے ظلم و ستم، غاصبانہ عزائم، نوجوانوں کی ہلاکتوں پر بھی امریکہ نے کھل کر مذمت نہیں کی۔ ایک طرف مسلمان ملکوں میں نوجوانوں کو جمہوری آزادیاں اور زندگی کی آسانیاں نہیں ملتیں۔ ان کی حکومتیں امریکہ کی کاسہ لیس بنی رہتی ہیں۔ دوسری طرف امریکہ مسلمان ملکوں کو درپیش مسائل کے حل کو فوقیت نہیں دیتا۔ مسلمانوں میں جابر مسلمانوں، آمروں اور شخصی حکومتوں کی سرپرستی کرتا ہے۔ اس لیے مسلم نوجوان انتہائی مایوسی اور ناامیدی کی کیفیت میں ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ اتنی برہمی اور وحشت میں مبتلا ہیں کہ وہ اپنی سب سے قیمتی متاع زندگی کو ہتھیار بنا بیٹھے ہیں۔ نوجوان خواتین، خوبرو مرد اپنے حسین جسموں کو دھماکہ خیز مواد میں ڈھال کر ظالموں سے ٹکرا رہے ہیں۔

یہ خطرناک رجحانات نفسیات..... سیاسیات..... عمرانیات اور سماجیات کے امریکی ماہرین کو بھی دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ اور مسلمان سربراہوں..... دانشوروں..... اسکالرز، علماء اور ماہرین کو بھی للکار رہے ہیں..... کہ انہیں اپنے مسائل کے حل پر زور دینا چاہیئے۔ اپنی مملکتوں میں جمہوری اداروں کو مستحکم کرنا چاہیئے۔ نوجوانوں کو اپنی امنگوں..... خواہشوں اور عزائم کے اظہار کے راستے

ملنے چاہئیں۔ انہیں یہ اعتماد ہونا چاہیئے کہ وہ پر امن راستوں سے بھی مغرب کے غلبے کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔

مسلم نوجوانوں کو بھی یہ احساس ہونا چاہیئے کہ امریکہ اور مغرب اس وقت غالب قوتیں کیوں ہیں۔ یہاں اپنے شہریوں کو زندگی کی جو آسانیاں فراہم کی جاتی ہیں۔ اس وقت وہاں جو اقدار ہیں۔ وہ کس طرح سینکڑوں سال میں مختلف کشمکشوں سے گزرتے ہوئے حاصل ہوئی ہیں۔ ان کے مثبت اور روشن پہلوؤں پر بھی ہماری گہری نظر ہونی چاہیئے۔ مسلمان مملکتوں میں نوجوان اپنی حکومتوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہیں۔ اور ان حکومتوں کی پالیسیوں کے برعکس انتہا پسندانہ سرگرمیوں میں حصہ لے رہے ہیں امریکہ میں نوجوان اپنی حکومت کے خلاف یہ کیوں نہیں کررہے ہیں۔ امریکہ نے باہمی تصادم .....اور طویل خانہ جنگیوں کے بعد چرچ اور مملکت کو الگ گیا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ قائم کیا ہے۔ جہاں علم کے حصول اور ہر معاملے میں تحقیق کا تمدن ہے۔ تعلیمی اداروں ..... یونیورسٹیوں کا ایک ایسا معیار ہے کہ دنیا بھر سے نوجوان ان کا رخ کرتے ہیں۔ مسلمان ملکوں اور تیسری دنیا کے ممالک کے ان رہنماؤں کے بیٹے بھی یہاں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جو بظاہر امریکی پالیسیوں کے سخت مخالف ہیں۔

امریکی پالیسیوں کے بدترین ناقد بھی یہ امر تسلیم کریں گے کہ اس معاشرے میں کتاب کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے لائبریریاں اسی طرح پڑھنے والوں کا ہجوم رکھتی ہیں۔ کتابوں کی دکانیں اسی طرح قائم ہیں۔ بسوں.....ٹرینوں، جہازوں میں کتابیں پڑھتے ہوئے لوگ اسی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ حالانکہ ٹیلی ویژن چینل.....انٹرنیٹ وہاں بہت پہلے سے آچکے ہیں اور کہیں زیادہ تعداد میں ہیں۔ بلکہ یہ چینل، ویب سائٹس اور اخبارات، کتابوں کے فروغ میں زیادہ معاون ثابت ہورہے ہیں۔ سارے بڑے اخبارات ہر ہفتے ایک ضخیم ''بک سیکشن'' شائع کرتے ہیں جس میں ہر موضوع کی بہترین کتابوں کی فہرست دیتے ہیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ سب سے زیادہ کونسی کتابیں بک رہی ہیں۔ اپنی تاریخ سے بچوں کو کتابوں کے ذریعے آگاہ کرتے ہیں۔ تنازعات پر رپورٹیں فوراً کتابی شکل میں آجاتی ہیں۔ القاعدہ پر نہ جانے کتنی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ہمارے ہاں کمیشنوں کی رپورٹیں کبھی منظر عام پر نہیں آتیں۔ امریکہ

میں ہر کمیشن کی رپورٹ کتابی شکل میں دستیاب ہے..... حال ہی میں نائن الیون کے تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ بھی مارکیٹ میں آ گئی ہے۔

اپنی تاریخ کے روشن پہلوؤں کو یاد رکھنے کا ایک انتہائی موثر ذریعہ ملک بھر میں یادگاروں اور عجائب گھروں کا قیام ہے۔ امریکی عجائب گھر انتہائی دردمندی عرق ریزی اور گہری فکر کے بعد قائم کیے جاتے ہیں۔ جو کثیر المقاصد ہوتے ہیں۔ تفریح کی تفریح۔ اور معلومات میں بھی اضافہ.....کسی بھی عجائب گھر میں کچھ وقت گزارلیں۔ تو اس شعبے کی کئی صدیوں کی تاریخ سے آگاہی ہوجاتی ہے۔ 1۔ دی سٹی میوزیم صرف دارالحکومت واشنگٹن سے متعلق تاریخی معلومات اور نوادرات سے مرصع ہے۔ 2۔ ڈی ای اے میوزیم اینڈ وزیٹرز سنٹر.....امریکہ کی منشیات کے عادی افراد کے خلاف طویل جنگ کے مناظر اور تصاویر یہاں دیکھی جاسکتی ہیں اور رابطے کے مراکز بھی ہیں۔ 3۔ انٹرنیشنل سپائی میوزیم (بین الاقوامی جاسوسی عجائب گھر..... جاسوسی کی خفیہ تاریخ، جاسوس طیارے، قدیم زمانوں سے اب تک کے جاسوسوں، جاسوس ایجنسیوں کی تصاویر تاریخ۔ 4۔ امریکی یہودی فوجی تاریخ کا قومی عجائب گھر..... امریکی فوج میں موجود یہودی مردوں اور عورتوں کی تصاویر یادداشتیں۔ 5۔ نیشنل بلڈنگ میوزیم، تعمیرات کا عجائب گھر، مکانات، دکانیں، ریستوراں۔ 6۔ نیشنل جاپانیز امریکی میموریل سے دوسری جنگ عظیم کے دوران حب الوطنی تک واشنگٹن میں تازہ ترین یادگار۔ جو امریکیوں کے انصاف، مساوات اور حب الوطنی کے اصولوں کی دہائی کرواتی ہے۔ جاپانیوں سے امریکی صدر کی معافی کہ آئندہ ایسے واقعات نہ ہوں۔ 7۔ فلپ کلیکشن ..... جدید مصوری کا عجائب گھر۔ 8۔ دی ٹیکسٹائل میوزیم..... ٹیکسٹائل آرٹ.....لباس کے ڈیزائن۔ 9۔ اسمتھ سونین نیشنل میوزیم آف نیچرل ہسٹری، دی ڈسکوری سینٹر۔ قدرت کے شاہکاروں کا عجائب گھر۔ اس کے علاوہ بری فوج، فضائیہ، بحریہ کے عجائب گھر ہیں۔ خلاء سے متعلق عجائب گھر.....خوراک، سمندر، سمندری مخلوقات، پرندوں، فلکیات ..... ہر سائنس اور علم سے متعلق معلومات دستاویزات، تصاویر یکجا کردی گئی ہیں۔ غیر ملکی سیاحوں کی قطاریں تو ہر وقت نظر آتی ہی ہیں۔ امریکہ بھر سے اسکولوں کے بچے، کالجوں کے طلبہ و طالبات، بزرگ شہریوں کے گروپ ہر عجائب گھر کے باہر دیکھے جاسکتے ہیں۔ کیپٹل ہل، پہاڑی پر کانگریس

اور سینٹ کی عمارتوں سے لے کر واشنگٹن کی یادگار تک دونوں طرف عجائب گھر ہیں۔ جن میں امریکہ کی تاریخ سانس لیتی دکھائی دیتی ہے۔ سڑکوں کے درمیان میں ہرا بھرا علاقہ ہے آپ پیدل چلتے جائیں۔ تو محسوس ہوتا ہے کہ آپ خود صدیوں کے درمیان سے گزر رہے ہیں۔ یہیں آپ کو کوریا کی جنگ میں حصہ لینے والوں اور جان نثار کرنے والوں کی یادگار بھی نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ویت نام میں امریکہ کے لیے جان کی قربانی دینے والوں کی یادگاری دیوار ہے۔ امریکیوں کی ہر نسل کے گروپ یہاں عقیدت سے پھول رکھتے۔ خاموش کھڑے نظر آتے ہیں۔ مشہور سائنسداں آئین اسٹائن بھی اپنی یادگار کے باہر ایک بڑے مجسمے کی شکل میں بیٹھے ہیں۔ ایک یادگار ان وفاقی، صوبائی اور مقامی حکومتوں کے قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں اور افسروں کے کارناموں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ہے۔ جو اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران ہلاک ہوگئے۔ 1792ء سے اب تک ایسے جاں نثار 16 ہزار کے قریب ہیں۔ ان میں ڈیڑھ سو سے زاید خواتین بھی ہیں۔

میں سب سے زیادہ متاثر ہو رہا ہوں ان یادگار عمارات سے جو امریکیوں نے قریباً اپنے ہر صدر کے احترام میں تعمیر کی ہیں..... ابراہیم لنکن..... جیفرسن..... جان ایف کینڈی..... روز ویلٹ..... ٹرومین سب کے بڑے بڑے مجسمے ہیں..... ان کے اقوال ہیں۔ ان کے دور میں کیے گئے اہم اقدامات ہیں..... زندہ قومیں اس طرح اپنے معززین کو یاد رکھتی ہیں۔ ہم اپنے ہر سابق حکمراں کو مطعون کر کے رکھ دیتے ہیں ان کے صدور بھی کوئی فرشتے تو نہیں تھے۔ ان سے بھی غلطیاں ہوئی ہوں گی۔ لیکن یہ ان کی صرف اچھائیوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ اب تو ایک صدر دوبار سے زیادہ منتخب نہیں ہوسکتا۔ روز ویلٹ شاید 12 سال رہے تھے۔ اسی لیے ان کی یادگار تین حصوں میں ہے۔ ہر حصے میں سال بہ سال اہم واقعات کے حوالے سے گوشے تعمیر کیے گئے ہیں۔ جمہوریت..... قانون..... انصاف..... آزادی تحریر و تقریر کے حوالے سے روز ویلٹ کے اقوال بھی نمایاں طور پر درج ہیں۔ نئی امریکی نسل اپنی تاریخ کتابوں میں نہ بھی پڑھے۔ ہفتہ وار تعطیل ان عجائب گھروں یادگاروں میں گزار کر بھی اپنے ماضی سے باخبر ہو جاتی ہے۔

امریکہ آج اگر دنیا کی واحد سپر طاقت ہے۔ تو وہ اچانک ہی اس مقام تک نہیں پہنچ گیا۔

دو صدیوں سے زیادہ عرصہ مسلسل جدوجہد جاری رہی ہے۔ اور ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے میں بالآخر کامیابی ہوئی ہے۔ جہاں سب کو آگے بڑھنے کے مساوی مواقع ملتے ہیں۔ انصاف سب کے لیے ہے۔ اسی لیے دنیا بھر سے نوجوان امریکہ پہنچنے کی کوششوں میں رہتے ہیں۔ ایسا معاشرہ تشکیل دینے کے لیے تعلیم، تحقیق ضروری ہے۔ امریکی تعلیمی ادارے تو اپنے معیار کے لیے مسلمہ ہیں ہی۔ لیکن یہاں ہر وقت ماضی کے تجزیے اور مستقبل کے لیے منصوبہ بندی ہوتی رہتی ہے۔ تحقیق اور تشکیل پر سب سے زیادہ زور ہے۔ زندگی کے ہر شعبے کی مانیٹرنگ ہوتی ہے۔

امریکہ میں رائے عامہ جاننے کے لیے ..... یا رائے عامہ بنانے کے لیے سروے..... اور پول ہوتے رہتے ہیں۔ ٹی وی چینل..... اخبارات..... این جی اوز..... تھنک ٹینک رائے عامہ کا جائزہ مختلف طریقوں سے لیتے رہتے ہیں۔ بعض نکات اور موضوعات ایسے ہیں۔ جن پر نصف صدی سے زیادہ عرصے سے وہی سوالات پوچھے جا رہے ہیں۔ جس سے ایک ہی موضوع پر مختلف امریکی نسلوں کی رائے کا موازنہ سامنے آجاتا ہے۔ یہ رائے عامہ کے جائزے امریکی عوام کے ذہنوں کو بڑے قاعدے اور دلیل سے متاثر کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ سب کچھ سائنسی بنیادوں پر ہو رہا ہے۔ ویت نام کی جنگ کے دوران یہی رائے عامہ حاصل کی جاتی رہی۔ اب زیادہ جدید طریقے آگئے ہیں۔ ٹیلی فون کی صنعت اور ٹیکنالوجی ترقی کر گئی ہے۔ انٹرنیٹ تو بہت ہی طاقت ور، موثر اور ہمہ گیر ذریعہ ہے۔ جو ایسے جائزوں میں سب سے زیادہ معاونت کر رہا ہے۔ opinion polls ایک سائنس بھی ہے۔ کاروبار بھی..... اور جادوگری بھی۔ ان میں تین اقسام ہی نمایاں کی جاتی ہیں کہ جو سوال پوچھا جا رہا ہے۔ اس کے حق میں ہیں۔ یا مخالف ہیں گزشتہ سال اس عرصے سے موازنہ کر کے اندازہ کیا جاتا ہے کہ کیا حمایت میں کمی آرہی ہے یا بڑھ رہی ہے۔ مثلاً پوچھا جاتا ہے۔

کہ........ جس طرح اپنے صدر ہونے کی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں۔ آپ اسے درست قرار دیتے ہیں یا نا درست۔

یہ سروے ہر صدر کے بارے میں کیا گیا ہے۔ یہ تو ایک مجموعی تاثر قائم کرتا ہے۔ پھر ہر شعبے کے بارے میں الگ الگ سوالات بھی کیے جاتے ہیں۔ تعلیم کے اقدامات کیسے ہیں۔

خارجہ پالیسی کیسی ہے۔ اس کے علاوہ ہر دور میں اس وقت کے اہم ترین معاملات پر بھی جائزے لیے جاتے ہیں۔

صدام کو زندہ گرفتار کیا جائے یا ہلاک کر دیا جائے۔

عراق میں امریکہ فوجیں بڑھائے یا واپس آ جائے۔

آپ کے خیال میں عدے اور قصے حسین کی ہلاکت امریکہ کے لیے بڑی کامیابی ہے ،چھوٹی کامیابی یا کامیابی ہی نہیں ہے۔

آپ کے خیال میں زیادہ سے زیادہ کتنے امریکی فوجی ہلاک ہوجائیں کہ اس کے بعد فوج واپس بلائی جائے۔ 200 - 500 -1000 یا اس سے بھی زیادہ۔

ایسے سوالات سے وہ امریکی عوام کو مطمئن بھی کر دیتے ہیں کہ ان کے ذہنوں میں جو الجھنیں ہیں حکومت ان کا جائزہ لے رہی ہے۔ رائے عامہ جاننا چاہتی ہے۔

امریکی شہری۔ ان جائزوں میں دل سے حصہ لیتے ہیں یا نہیں۔ اس طرح جو نمونے یکجا کیے جاتے ہیں کیا وہ پوری امریکی قوم کی فکر کو منعکس کرتے ہیں یا نہیں۔ یہ امور توجہ طلب ہیں۔ ان پر بات بھی ہوتی رہتی ہے۔ اس سلسلے میں بھی کافی تحقیق کی جاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس طرح جواب دینے والوں کے کوائف اور معلومات بھی جمع ہوتی رہتی ہیں۔ امریکی قوم کی ڈیٹا بیس بہت مضبوط ہے۔

امریکیوں میں اپنے آپ پر.....اپنے نظام اور پالیسیوں پر تنقید برداشت کرنے کا بہت حوصلہ ہے۔ سرکاری حکام کی موجودگی میں امریکی شہری ہمارے سامنے مختلف امور پر سخت نکتہ چینی کرتے رہے۔ لیکن انہوں نے منع نہیں کیا۔ بلکہ جہاں انہیں اتفاق تھا.....اس کا اظہار بھی کرتے رہے۔ ان کی طرف سے کوئی پابندی نہیں تھی۔ ہم جہاں جائیں.....ملیں.....ان کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔

امریکی اپنی جمہوری اقدار.....انصاف کے اصولوں.....شہری آزادیوں کو برقرار رکھنے کے لیے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ دنیا کی دوسری قومیں بھی ان کو اختیار کریں۔ سرد جنگ میں تو صرف قوموں کو کمیونزم کا شکار ہونے سے بچانا.....اور کمیونسٹ مملکتوں کو کمزور کرنا امریکہ کا ہدف

تھا۔ اب امریکہ نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے اپنے ذمے یہ امور لگالیے ہیں کہ آمریت.....شخصی حکومت، بادشاہت ختم کر کے جمہوری نظام قائم کیا جائے۔ ایٹمی ہتھیاروں کو زیادہ سے زیادہ محدود کر دیا جائے۔ ایٹمی ٹیکنالوجی کی مزید منتقلی نہ ہو۔ دہشت گردی اور انتہا پسندی کے رجحانات ختم کیے جائیں۔ کمیونزم کے خلاف جنگ میں تو ہدف واضح تھا۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں سب سے بڑی مشکل یہی ہے کہ اس میں ہدف اور دشمن کی صورت واضح نہیں ہے۔ یہ جنگ بڑی تیزی اور شدت سے جاری ہے۔ موجودہ امریکی صدارتی انتخابات کا اصل محور یہی ہے۔ میرے ساتھ اس سفر میں آپ امریکہ کو یقیناً کولمبس کی طرح دریافت کریں گے۔ امریکہ کو ہر زاویے سے جاننا، دیکھنا، پرکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ آئندہ بھی کئی برسوں تک.....ممکن ہے صدیوں تک پاکستان اور دوسرے مسلم ملکوں کو امریکہ سے سیاسی اقتصادی اور دفاعی تعلقات رکھنے ہوں گے۔ امریکہ اپنے مفادات کے لیے دھمکیاں بھی دیتا ہے۔ حملے بھی کرتا ہے۔ مختلف قوموں کو امداد بھی دیتا ہے۔ بحالی جمہوریت میں تعاون بھی کرتا ہے۔ ہمیں بھی اپنے مفادات کا تعین کرنا ہے۔ جو مفادات مشترکہ ہوں۔ ان کے تحفظ کے لیے مشترکہ کوششیں ہوں جہاں مفادات میں کچھ فرق ہو۔ وہاں اپنے مفادات کو زیادہ سے زیادہ محفوظ کرنے کی کوشش کی جائے۔ عالمی برادری میں تمام ملک برابری کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر ملک اقتصادی، دفاعی اور جمہوری طور پر مستحکم ہو۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ پاکستان کے اپنے مفاد میں بھی ہے۔ جمہوری اداروں کا استحکام پاکستان کے اپنے لیے بھی ضروری ہے۔ خواندگی کی شرح میں اضافہ، خواتین کی بہبود لڑکیوں کے لیے تعلیم ہمارے اپنے لیے سود مند ہے۔ آئندہ نسلوں کے لیے ایک پرامن، اعتدال پسند، آزاد خیال ماحول کی ضمانت ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ اور یہ ہماری اپنی ضرورت ہے کیونکہ ہمارے بیٹوں، بیٹیوں، پوتوں پوتیوں، نواسوں نواسیوں کو یہاں زندگی گزارنی ہے۔ جس طرح ہم ان کے لیے ورثے میں شایان شان مکان چھوڑ کر جانے کی فکر کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمیں ان کے لیے ایک اچھا، معاشرہ چھوڑ کر جانے کے لیے بھی کوششیں کرنی چاہئیں۔

آیئے پھر ہم اپنا سفر شروع کرتے ہیں۔ امریکہ چلتے ہیں..... بیشتر اس کے کہ وہ چل کر

ہمارے پاس آئے۔

سفر کی روداد کے علاوہ میں نے امریکہ کے تھنک ٹینکوں..... امریکہ میں مسلمانوں اور امریکی منتخب اداروں کے اختیارات کے بارے میں بھی اطلاعات یکجا کی ہیں سفر مکمل ہوجائے تو بتایئے گا ضرور کہ آپ پر کیا گزری۔ یہ سفر کیسا لگا۔

محمود شام

یوم آزادی 2004ء

امریکہ اب کیا سوچ رہا ہے

نومبر 2004

''امریکہ کیا سوچ رہا ہے''

ابھی تکمیل کے مراحل سے گزر رہی ہے کہ مجھے اسی اثنا میں امریکہ جانے کا مزید دو بار اتفاق ہوگیا ہے۔ یہاں کے بڑے شہروں میں گھومتے ہوئے امریکی ذہنوں میں جھانکتا رہا ہوں۔ پہلے ستمبر پھر نومبر میں مختلف فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں واحد سپر طاقت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے خوشی یہ ہے کہ اپنے قارئین کو تازہ ترین صورتحال سے باخبر کرسکتا ہوں۔ اور یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ ایک سال پہلے بش کے دوبارہ الیکشن جیتنے کا میں نے جو اندازہ کیا تھا۔ وہ پورا ہوگیا ہے.... اس لیے میری باتوں پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔

جولیانا کا اب امریکی محکمہ خارجہ سے تعلق نہیں رہا۔ انہیں میری آمد کا علم ہوا تو کہا کہ اس سے پہلے کہ امریکہ آپ کے ہاں آئے۔ آپ پھر امریکہ آرہے ہیں۔ یہ تو موقع ہے جب صدر جنرل پرویز مشرف کو اقوام متحدہ میں جنرل اسمبلی سے خطاب کرنا ہے۔ امریکی صدارتی الیکشن کو چند ہفتے رہ گئے ہیں پیشہ ورانہ میٹنگوں کے سلسلے میں پھر امریکی شہروں میں ہوں... یہ امریکی صدارتی انتخابات کے فوراً بعد کا ہفتہ ہے۔ شکست کھانے والوں کے زخم بھی ہرے ہیں۔ جیتنے

والوں کے چہروں پر بھی پھول تازہ تازہ ہیں۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس عام طور پر ستمبر اکتوبر میں ہوتا ہے۔ اس دوران قریباً تمام ملکوں کے سربراہ نیویارک آتے ہیں۔ اجلاس سے خطاب کرتے ہیں۔ مختلف سربراہوں سے ملتے ہیں۔ اپنے لوگوں کی تقدیروں کے فیصلے کرواتے ہیں۔ پہلے اس موقع پر امریکی کمیونسٹ اور غیر جانبدار ملکوں کے بلاک کے درمیان کشمکش کے مناظر دیکھنے میں آتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان دنوں میں ان اجلاسوں کی اہمیت اور ہی ہوتی تھی۔ بڑے بڑے عالمی مدبرین یکجا ہوتے تھے۔ اپنے اپنے نظریات کی ترویج کے لیے گرما گرم تقریریں کرتے تھے۔ جن سے واقعی دنیا کی تقدیر بدلتی رہی ہے۔ اب واحد سپر طاقت کا زمانہ ہے۔ تدبر، بصیرت کا نہیں۔ اس لیے اس معیار کے خیالات ہیں نہ تقابل۔ نہ تقریروں میں زور... نہ اجلاسوں میں دلچسپی... اور نہ زیادہ جوڑ توڑ۔

ہم جب 20 ستمبر 2004ء کو امریکہ پہنچتے ہیں تو یہ انتخابی مہم کے عروج کا زمانہ ہے۔ مگر دنیا کی اس سب سے جدید جمہوریت میں اپنے ہاں کی انتخابی مہموں جیسی گرمی نظر نہیں آتی۔ نہ ہر روز جلسے جلوس، نہ ہی پورے شہر میں بینر... پوسٹر... دیواروں پر چاکنگ... امریکی قوم حالانکہ سیاسی طور پر ویسے صرف انہی دنوں میں متحرک ہوتی ہے۔ ڈیموکریٹک امیدوار جان کیری مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔ ان کا کنونشن بھرپور رہا ہے۔ میں شروع میں یہ لکھ چکا ہوں صدر بش دوبارہ جیت جائیں گے۔ کیونکہ امریکی قوم دہشت گردی کے خلاف مہم کو جاری رکھنا چاہے گی۔ ڈیموکریٹس کے تیور اور کامیاب کنونشن دیکھ کر کبھی کبھی خدشہ ہوتا تھا کہ کہیں میری بات خراب نہ ہو جائے۔

نیویارک میں صرف ایک موڑ پر کچھ خواتین اور مرد ڈیموکریٹس کے ہینڈ بل تقسیم کرتے نظر آتے ہیں۔ باقی انتخابی مہم ٹی وی چینلوں میں ہے۔ اخبارات میں اور ویب سائٹس پر دکھائی دیتی ہے... امریکی الیکشن کو ایکشن سمجھتے ہیں مشغلہ دل نہیں بناتے۔

ان دنوں میں گیلپ پول... اور جائزے بھی بہت ہوتے ہیں... کسی دن بتاتے ہیں دو نکات کیری اوپر چلا گیا... کسی روز دو نکات بش اوپر ہے... لیکن سب کا خیال ہے کہ دونوں

میں برابر کا مقابلہ ہے۔

امریکہ کے باہر تو اس الیکشن کا حوالہ دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ ہے... عراق میں حالات پر قابو پانے میں ناکامی ہے۔ افغانستان میں جمہوریت کے قیام میں تاخیر ہے... لیکن امریکہ کے اندر اس کے حوالے بدل رہے ہیں... یہاں مذہب بھی درمیان میں آ گیا ہے... صدر جارج بش نے چرچ اور اسٹیٹ کو ملانا شروع کر دیا ہے۔ اقبال نے کہا تھا... جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی... لیکن بش چنگیزی جاری رکھنے کے لیے دیں اور سیاست کو قریب لا رہے ہیں... امریکہ سے باہر رہنے والوں کے لیے اسقاطِ حمل... کلوننگ... اسٹیم سیل... اتنے اہم نہیں ہوں گے لیکن امریکیوں کی ایک بڑی تعداد کے لیے یہ وقعت رکھتے ہیں... انہیں قدامت پرست کہیں... مشترکہ خاندان... خاندانی زندگی کی اہمیت... مردوں کی آپس میں شادیوں یا گرجا گھروں سے وابستگی... ان کے لیے بش کی یہ باتیں بہت وقیع ہیں۔ وہ اپنی قیادت کو براہِ راست خدا کی طرف سے ودیعت قرار دے رہے ہیں۔

ڈیموکریٹس ان معاملات میں لبرل رویے کا اظہار کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے یہ ایک عجیب دور رہا ہے۔ بش کے مسلم ملکوں کے بارے میں رویوں... اسرائیل نواز پالیسی کے باعث وہ جان کیری کو بہتر انتخاب سمجھ رہے ہیں... لیکن مذہبی معاملات میں ڈیموکریٹس کے آزاد رویے مسلمانوں کے اپنے معتقدات سے متصادم ہیں۔

امریکیوں نے بہر حال 3 نومبر کو صدر جارج بش کو دوبارہ مسندِ صدارت پر متمکن ہونے کا موقع دے دیا ہے... اور وہ بھاری تعداد میں ووٹ لے کر آئے ہیں۔ پاپولر بھی اور الیکٹورل ووٹ بھی۔

ڈیموکریٹس امیدوار جان کیری نے خالصتاً امریکی روایت کی پاسداری کی ہے اور اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے جارج بش کو جیتنے پر مبارکباد دے دی ہے۔ انتخابی مہم بہت پرجوش رہی ہے۔ مقابلہ کانٹے کا رہا ہے۔ اس لیے امریکہ جذباتی اور سیاسی طور پر تقسیم ہو گیا ہے۔ جان کیری حوصلے تدبر کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ صدمے کے باوجود فراخدلی سے ہار مانتے ہوئے منتخب صدر سے توقع کر رہے ہیں کہ وہ سب سے پہلے اس تقسیم کو دور کرنے کی طرف توجہ دیں گے۔

جارج بش بھی تمام الزامات... مخالفتیں فراموش کرتے ہوئے جان کیری سے تعاون کی اپیل کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ آیئے مل جل کر امریکی قوم کے ان زخموں مندمل کریں جو انتخابی مہم کے دوران لگے ہیں۔

یہ امریکی سیاسی روایت ہے کہ صدارتی انتخابات کے نتائج کے بعد نومنتخب صدر ہر امریکی کا صدر ہوتا ہے چاہے اس نے اسے ووٹ دیا ہو یا نہیں۔ اب امریکہ کی قیادت اسکی ذمہ داری ہے۔ اس کے اقدامات کو سب کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں کی طرح آئندہ انتخابات کے لیے مہم شروع نہیں کر دی جاتی۔ نیا صدر اندرونی اور بیرونی طور پر جو اعلان بھی کرتا ہے وہ پوری قوم کے فیصلے سمجھے جاتے ہیں۔ اس لیے دنیا بھر میں امریکی پالیسیوں کی ایک دھاک بیٹھ جاتی ہے۔ ہمارے ہاں تو آج تک کسی بھی منتخب حکومت کو ہارنے والی پارٹیوں نے یہ احترام اور وقعت نہیں دی ہے۔ اس لیے بیرونی دنیا میں بھی ہماری حکومتوں کو اہمیت اور وزن نہیں ملا ہے۔

سیاسی طور پر امریکہ میں اگرچہ نومنتخب صدر کو سب کی طرف سے مینڈیٹ مل جاتا ہے۔ لیکن اس کی حیثیت کسی اعتبار سے متنازع نہیں ہوتی۔

انتخابی مہم میں کیا رجحانات رہے۔

ہارنے والا کیوں ہارا۔

جیتنے والا کیوں جیتا۔

کس ریاست (صوبے) میں کس سیاسی... مذہبی یا سماجی پہلو نے زیادہ نتیجہ خیز کردار ادا کیا۔

یہ تحقیق کی جاتی ہے... سیاسی پارٹیاں بھی یہ جائزے لیتی ہیں۔ یونیورسٹیاں... تھنک ٹینک اس میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ عوامی ذہنوں میں ہیجان برپا نہیں ہونے دیا جاتا... وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں... انہیں یہ اعتماد اور تسلی ہوتی ہے کہ انہوں نے ووٹ کسی کو بھی دیا ہو... انتظامیہ ان کو تحفظ اصولوں اور ملکی قواعد وضوابط کے مطابق دے گی۔

بش کے منتخب ہونے پر امریکیوں کی ایک بڑی تعداد کو شاک ہے۔ ان کے تبصرے بھی دلچسپ ہیں... ایک امریکی تجزیہ نگار کا کہنا ہے کہ وہ اتنا برا ہے... اس لیے مرد کامل ہے۔

ایک دلچسپ جملہ یہ ہے کہ جب وہ صدر نہیں تھے... الیکشن جیت لیا تھا... اب جب وہ امریکی صدر ہے تو کیسے ہار سکتا تھا۔ امریکیوں کی اکثریت ویسے بھی بش کی طرح دائیں بازو... مذہب اور بنیاد پرستی کی طرف راغب ہورہی ہے... جبکہ ڈیموکریٹس کی پالیسیاں آزادانہ تھیں اور مذہب کے خلاف بھی... وہ مردوں کی آپس میں شادی... کلوننگ... اسقاطِ حمل کے حق میں تھے۔

میں ایسے ہی سوچ رہا ہوں کہ کیا مسلمان بش کی ان مذہب نواز پالیسیوں کے باعث اس کے قریب نہیں آسکتے۔

دہشت گردی کے خلاف مہم... افغانستان... عراق پر حملے بش کو مسلمانوں سے دور کرتے رہے ہیں۔ ان کے خلاف سخت نفرت پائی جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ خدا کی وحدانیت کا ذکر کرتے ہیں... مردوں کی باہمی شادیوں کے خلاف ہیں... اور معاشرے میں مذہبی پابندیاں چاہتے ہیں تو کیا اسلامی تعلیمات بھی یہی نہیں ہیں۔ اس مذہب نوازی کا بالآخر کوئی نہ کوئی نتیجہ تو یقیناً برآمد ہوگا۔ کیا مسلم معاشرہ... بالخصوص پاکستان نئی صورت حال سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا دہشت گردی... انتہا پسندی... آمریت... تو خود مسلم اقدار سے متصادم ہیں۔

واشنگٹن میں ایک درمیانی عمر کے ایرانی ٹیلسی ڈرائیور کا تبصرہ بھی سننے والا ہے... میں نے ایران اس لیے چھوڑا تھا کہ وہاں ملاؤں کا راج آ گیا تھا... اب یہاں بھی ملاں بش آ گیا ہے موصوف اکیلے رہتے ہیں اور زندگی کے مزے اڑاتے ہیں۔

لبرل امریکی بھی بڑی تعداد میں ہیں... وہ فکر مند ہیں کہ معاشرے میں قدامت پسندانہ رجحانات غالب آ سکتے ہیں... یہ امریکیوں کی اندرونی کشمکش ہے... لیکن اس سے وہاں کسی قسم کا سیاسی انتشار... یا سماجی مایوسی پھیلنے کا اندیشہ نہیں ہے... بلکہ متعلقہ تنظیمیں اور ادارے تدریسی انداز میں اس کا تحقیقی جائزہ لیں گے۔ سروے ہوں گے... گیلپ پول ہوں گے... جو کسی طرح بھی حکومت کو عدم مستحکم نہیں کریں گے... کیونکہ امریکی اپنے وطن سے بے انتہا محبت کرتے ہیں... ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ مختلف محکموں میں آگے بڑھنے کا جو عمل ہے... وہ جاری رہے... حکومت کے کام حکومت کرے... تحقیق... تدریس... اور تربیت کے ذریعے جو

رجحانات ظاہر ہوں گے... ان کے پیش نظر اگر قیادت میں تبدیلی ضروری ہوگی تو اب چار سال کے بعد ہی ہوگی۔ بعض نئے مسائل پر اگر مختلف قوانین تیار کرنے ہیں تو کانگریس اور سینٹ اس کے لیے موجود ہیں۔ تھنک ٹینکس ہیں۔ ان کے ذریعے یہ مقاصد حل کیے جاسکتے ہیں۔

امریکی قوم اپنے صدر کو اتنا واضح مینڈیٹ دیتی ہے... اور سرکاری نظام ایسا ہے کہ صدر پوری ٹیم اپنی مرضی کی لاسکتا ہے۔ اپنی قوم کے بہترین وکیل کو اٹارنی جنرل مقرر کرسکتا ہے... اسی طرح صحت... تعلیم... امور خارجہ... زراعت وغیرہ کے لیے ملک کے بہترین دماغ چن سکتا ہے... ان کے لیے قومی اسمبلی یا سینٹ کی رکنیت ضروری نہیں ہے... نہ کسی بااثر خاندان یا گروپ سے وابستگی... خوبی دیکھئے کہ یہ صوابدید تو اپنی جگہ ہے... لیکن پھر صدر کے ان پسندیدہ افراد کی بھی کانگریس... سینٹ کی کمیٹیوں کے سامنے پیشی ہوتی ہے... جہاں ان سے ہر پہلو سے سوالات کیے جاتے ہیں۔ جن کے ذریعے ان کی تعلیمی انتظامی اہلیت اور متعلقہ شعبے میں مہارت سامنے لائی جاتی ہے۔

کابینہ کے ارکان کا تعین ہورہا ہے.. ہر چار سال بعد 20 جنوری کو نئے صدر کی حلف برداری ہوتی ہے۔ اس سے پہلے صدر جارج بش اپنی ٹیم مکمل کرلیں گے۔ چناؤ کے اس عمل سے ظاہر ہورہا ہے کہ بش صاحب اپنے اس چار سالہ دور میں امریکیوں کے لیے نرم پالیسی اختیار کریں گے۔ جس کے لیے انہوں نے اٹارنی جنرل کو تبدیل کیا ہے۔ سابق اٹارنی جنرل کے بارے میں بہت منفی تاثرات پائے جاتے تھے... انہوں نے پیٹریاٹ ایکٹ جس طرح منظور کروایا اس پر جس طرح عملدرآمد ہوا... امریکی عوام کی اکثریت اسے پسند نہیں کررہی تھی... تعلیم... زراعت صحت میں کی جانے والی تبدیلیاں یہی ظاہر کررہی ہیں۔ لیکن محکمہ خارجہ انہوں نے اپنی معتمد ترین ساتھی کونڈالیزا رائس کے حوالے کیا ہے... جو دہشت گردی کے خلاف سخت گیر رویے کی حامل ہیں... پاکستان پر بھی سخت تنقید کرتی رہی ہیں۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ شمالی کوریا اور ایران کے بارے میں بھی افغانستان اور عراق جیسی پالیسیاں اختیار کی جاسکتی ہیں... یہ ہدایت تو مسلمانوں کو دی گئی تھی کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے رحم کا رویہ رکھیں اور کفار پر سخت ہوں... مسلمان تو اس ہدایت کے برعکس ایک دوسرے سے برسرپیکار اور کفار سے

نرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں... جبکہ صدر جارج بش یہی کچھ کررہے ہیں... آپس میں نرمی اور غیر امریکیوں کے خلاف سخت رویہ... جو یقیناً امریکہ کے مفاد میں ہوگا لیکن اگر امریکہ کو عالمی طاقت بنتا ہے اور دنیا کی قیادت کرتا ہے... تو کیا یہ اس کے لیے بالآخر سودمند ہوگا... امریکی تھنک ٹینک یہ جائزے لے رہے ہوں گے۔

نومبر 2004ء کے تیسرے ہفتے میں، میں بوسٹن... نیویارک... واشنگٹن... کنساس اور شکاگو میں رہا ہوں۔ خنکی زوروں پر ہے۔ بوسٹن امریکی انقلاب کا مقام آغاز ہے... ڈیموکریٹس کا ہیڈکوارٹر... نیویارک میں ری پبلکن نے اپنا مرکزی کنونشن کیا... واشنگٹن جہاں صرف امریکہ نہیں دنیا بھر کی قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں... ہر ریاست اپنا مزاج رکھتی ہے... اپنے فیصلے دیتی ہے۔ ویسے امریکی سیاسی امور پر مباحث میں الجھے نظر نہیں آتے ہیں۔ لیکن آپ بات شروع کردیں تو اظہار خیال ضرور کرتے ہیں۔ مختلف سیاسی سوچ رکھنے والے امریکیوں سے ملنے کے بعد یہ تاثر ضرور اُبھرتا ہے کہ جارج ڈبلیو بش دوبارہ صدارتی انتخاب جیتنے... دنیا بھر میں واحد سپر طاقت کے سربراہ ہونے کے باوجود ایسے صدر نہیں ہیں جن کی بصیرت... تدبر... معاملہ فہمی فیصلہ سازی... پر فخر کا اظہار کرسکتے ہوں۔

شکاگو سے زیورچ تک ساتھ طویل سفر کرنے والی امریکی خاتون نے بھرپور گفتگو کے بعد یہی کہا کہ صدر بش نے عالمی سطح پر جو کچھ کیا ہے... وہ مجھے یورپ میں سر اٹھا کر چلنے نہیں دیتا۔

ایک عبوری دور تو 20 جنوری تک ہے۔ لیکن امریکی معاشرہ فکری... نفسیاتی اور سماجی اعتبار سے مجموعی طور پر ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے۔ انٹیلکچوئل بنیادیں متزلزل ہیں۔ کوئی ایسا مفکر دانشور یا فلسفی نہیں ہے جو اس واحد سپر طاقتی زمانے میں امریکہ کو ایک سمت دے سکے۔ اور ایک ٹھوس فکری بنیاد فراہم کرسکے۔

دیکھا جائے تو باقی دنیا میں بھی یہی حال ہے۔

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے

اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی جولیانہ

"آپ امریکہ کیوں جارہے ہیں؟"

یہ پہلا سوال ہے مجھے احساس ہے کہ اب مجھے ہر گام پر ایسے سوالات کا سامنا کرنا ہوگا۔

یہ سوال ٹورنٹو ایئرپورٹ پر واشنگٹن روانگی کے وقت پوچھا جارہا ہے۔ امریکہ اور کینیڈا ہمسائے ہیں۔ کینیڈا حق ہمسائیگی اس حد ادا کرتا ہے کہ اس نے اپنی ایئرپورٹس پر ہی امریکی امیگریشن کو اپنے دفاتر اور کاؤنٹرز قائم کرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ وہ تمام رسمیں، پوچھ گچھ جو آمد والی ایئرپورٹ پر ہونی چاہیئے۔ روانگی والی ایئرپورٹ پر ہوجاتی ہے۔

امریکن ایئر لائن کی خاتون نے مجھے بورڈنگ کارڈ دے دیا ہے۔ سامان کے ٹیگ بھی......لیکن سامان وصول نہیں کیا ہے۔ یہ مرحلہ امیگریشن سے بخیرو عافیت گزر جانے کے بعد طے ہونا ہے۔ میں سامان بھری ٹرالی کھینچتا ہوا امریکی امیگریشن کی طرف بڑھ رہا ہوں........

ایک سیام فام خاتون کا کاؤنٹر فی الحال میری منزل ٹھہرا ہے۔

سبز پاکستانی پاسپورٹ دیکھ کر اس دبلی پتلی، غزالی آنکھوں والی سیاہ فام خاتون کی سب حسیں بیدار ہوگئی ہیں۔ یقیناً اس کے ذہن میں ٹریڈ ٹاورز گرنے لگے ہوں گے۔ اسامہ بن لادن کی پگڑی۔ تورابورا کی غاریں......خودکش بم دھماکے بہت کچھ اسکرین پر نظر آرہا ہوگا۔

"آپ امریکہ کیوں جارہے ہیں؟"

"مجھے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے بلایا ہے۔ میرا ویزا بھی خاص ہے۔"

وہ ویزا دیکھ رہی ہے۔

میرے پاس ایک سربمہر خط بھی ہے۔ لیکن مجھے یہ صرف یو ایس امیگریشن آفیسر کو دینا ہے؟

اب اس خاتون کے چہرے پر کچھ مسکراہٹ جھلکنے لگی ہے۔

"میں یو ایس امیگریشن آفیسر ہوں۔ یہ دیکھیں۔"

وہ اپنا فیتہ کندھے پر لگا بیج دکھا رہی ہے۔ نام اسکا کیٹ ہے۔

میں نے کوٹ کی جیب سے امریکی قونصل خانہ کراچی سے ملا ہوا سربمہر لفافہ کیٹ کے حوالے کردیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس میں کیا لکھا ہوا ہے۔ یہی کہا گیا تھا کہ اسے صرف یو ایس امیگریشن آفیسر کو کھولنا ہے۔ میں کیٹ سے پوچھ رہا ہوں کہ کیا میں مطمئن ہوجاؤں خط اسی بندے تک پہنچ گیا ہے۔ جس تک پہنچنا چاہیئے تھا۔

"100 فیصد" مسکراتے ہوئے کہہ رہی ہے۔ اس نے میرا امیگریشن فارم دیکھا ہے۔ پھر اس نے ایک نیا فارم نکالا ہے۔ بڑی تیزی سے اسے مارکر سے پر کرنا شروع کردیا ہے۔ لگتا ہے کہ میں نے جو فارم پر کیا ہے۔ وہ اسے پسند نہیں آیا۔ وہ اپنی خطاطی کے نمونے دکھا رہی ہے۔ فارم کا ایک حصہ اپنے پاس رکھ کر دوسرا حصہ پاسپورٹ کے ویزے کے سامنے والے پر اسٹیپل کردیا ہے۔ پاسپورٹ میرے حوالے کرتے ہوئے بڑے مہرباں لہجے میں کہہ رہی ہے۔

"مسٹر شام.....ریاستہائے متحدہ امریکہ میں خوش آمدید۔"

امیگریشن کا مرحلہ جو عام طور پر نازک اور مشکل ہوتا ہے۔ طے ہوگیا ہے۔ عمر رسیدہ ہونا کام آیا ہے۔ 45 سال سے نیچے ہوتے تو رجسٹریشن کے مراحل سے بھی گزرنا پڑتا۔ انگلیوں کے نشان بھی ثبت کرنے پڑتے۔ اب سامان کی سپردگی کا مسئلہ درپیش ہے۔ میں بیلٹ پر سامان رکھ رہا ہوں۔ تو ایک سفید فام عمر رسیدہ امریکی خاتون آفیسر منع کرتی ہے اور سامان اپنے پاس لانے کا حکم دیتی ہے۔ میرے حلیے۔ اور سبز پاسپورٹ کے پیش نظر سامان کی چیکنگ اس کے لیے

لازمی ہوگئی ہے۔ میں اٹیچی کیس کا تالا کھول کر اسے اس کے حوالے کر دیتا ہوں۔ بڑی محنت کرتی ہے۔لیکن کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ملتی۔ اب وہ اسے بند کرنے کا حکم دے رہی ہے۔

سامان امریکی ایئر لائن کی تحویل میں چلا گیا ہے۔ میں لاؤنج میں بیٹھ گیا ہوں۔ پرواز کی روانگی کا وقت قریب آ رہا ہے۔ لیکن کوئی اعلان نہیں ہو رہا ہے۔ ایک آفیسر سے پوچھتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں غلط لاؤنج میں بیٹھا ہوں۔ حالانکہ میری دانست میں یہی آخری لاؤنج ہے۔ وہ ایک دروازے سے نکل کر جانے کا مشورہ دیتا ہے۔ مجھے T گیٹ پر جانا ہے۔

میرا سفر A گیٹ سے شروع ہوا ہے۔ انگریزی کے تمام حروف تہجی باری باری میرے سامنے سے گزر رہے ہیں۔ یا میں ان کے سامنے سے گزر رہا ہوں۔ ہر حرف پر ایک گیٹ ہے۔ لگتا ہے کہ میں پیدل ہی واشنگٹن پہنچ جاؤں گا۔ T گیٹ بالآخر آ گیا ہے۔ میں آخری مسافروں میں سے ہوں۔ یہیں امریکہ میں مقیم شاعرہ اور ماہر تعلیم ڈاکٹر صبیحہ صبا بھی نظر آ رہی ہیں۔ وہ گزشتہ روز ٹورنٹو میں ہونے والے ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے آئی تھیں۔ لیکن مشاعرہ پڑھے بغیر ہی واپس جا رہی ہیں کیونکہ ایئر پورٹ پر کوئی لینے ہی نہیں آیا تھا۔ فون کرتی رہیں۔ کسی نے صحیح جواب نہیں دیا۔ بہت غصے میں دکھائی دے رہی ہیں۔ ٹورنٹو میں رہنے والی کوئی فیملی انہیں ایئر پورٹ سے اپنے ساتھ گھر لے گئی۔ اور پھر صبح ہی ایئر پورٹ پر واپس چھوڑ گئی، کیونکہ سب کو اپنے اپنے کام پر جانا ہوتا ہے۔ مشاعرے کے منتظمین نے کسی کو ایئر پورٹ نہیں بھیجا۔ پھر فون پر بھی اچھی طرح گفتگو نہیں کی۔ اور یہی کہتے رہے کہ آپ کو خود پہنچ جانا چاہیے۔ کہہ رہی ہیں کہ اچھا ہوا آپ نے دیکھ لیا۔ آپ گواہ رہیئے گا کہ میں ٹورنٹو آئی تھی۔

طیارے میں مجھے ایک امریکی نوجوان کے ساتھ سیٹ ملی ہے۔ مجھے یہ بھی ڈر ہے کہ اگر یہ کسی وجہ سے کہہ دے کہ میں اس مسافر کے ساتھ بیٹھے ہوئے بے آرام محسوس کر رہا ہوں تو سیٹ بدل سکتی ہے۔ ایف بی آئی آ سکتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ وہ ہمدردانہ پوچھ رہا ہے کہ پاکستانی پاسپورٹ سے تو سفر میں مشکل ہوتی ہوگی۔ پاکستان کیسا ملک ہے کتنے شہر ہیں۔ میں بتانے کی کوشش کر رہا ہوں پھر میں پوچھتا ہوں کہ واشنگٹن تک کتنی دیر کی پرواز ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اڑھائی گھنٹے لگتے ہیں۔ لیکن سوا گھنٹے بعد ہی پائلٹ نے اعلان کردیا ہے کہ ہم

واشنگٹن اترنے والے ہیں۔ امریکی اپنی ناقص معلومات پر کچھ خفیف ہو رہا ہے۔ میں خوش ہو رہا ہوں کہ میرے سفر کا آغاز امریکیوں کی خفت سے ہو رہا ہے۔ کھڑکی سے واشنگٹن کی ہریالی....... پیڑ نظر آ رہے ہیں۔ پھر واشنگٹن کے اکثر تاریخی مقامات واشنگٹن یادگار..... کانگریس۔

میں ایک مہینے پہلے ہی یہاں آ کر گیا ہوں۔ صدر جنرل پرویز مشرف کی صدر بش سے کیمپ ڈیوڈ میں ملاقات کے تاریخی لمحے دیکھ کر گیا ہوں۔ زیادہ دن واشنگٹن میں ہی گزرے۔ اس لیے واشنگٹن مانوس مانوس لگتا ہے۔

☆

میں اب واشنگٹن میں امریکی حکومت کے مہمان کے طور پر آ رہا ہوں۔ جنوبی ایشیا کے ایڈیٹروں اور نظریہ نگاروں کے لیے انٹرنیشنل وزیٹرز پروگرام ہے۔ موضوع ہے۔ ''نائن الیون کے بعد کی دنیا میں امریکہ کی مصروفیات'' اس سلسلے میں سب سے پہلے امریکی قونصل خانہ کراچی نے 22 مئی 2003ء کو خط لکھا تھا۔ اور تفصیلات بتائی تھیں۔

پھر 4 جون 2003ء کو پاکستان میں امریکی سفیر نینسی پاول نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے عوام کی طرف سے مجھے خط بھیجا۔ جس میں وہ لکھتی ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے عوام کی طرف سے میں آپ کو امریکی محکمۂ خارجہ کے زیر اہتمام انٹرنیشنل وزیٹرز پروگرام میں شرکت کے لیے امریکہ کے دورے کی دعوت دینے کا شرف حاصل کر رہی ہوں۔

یہ تو واقعی ہمارے لیے اعزاز تھا۔ یہ مقام اللہ اللہ ...... امریکی سفیر کا خط ...... امریکی عوام کی طرف سے دعوت۔

☆

پہلے بھی کئی بار یہ دعوت ملی ہے۔ لیکن وقت نہیں ہوتا تھا اس لیے انکار کرتے رہے۔ کون تین چار ہفتے امریکہ میں گزارے۔ تفصیلات معلوم ہوتیں تو شاید کبھی بھی انکار نہ کرتے۔ اب کے ہم کئی سال بعد دفتر سے رخصت لے رہے ہیں۔ کینیڈا میں مقیم دو بیٹوں سے بھی ملنا ہے۔ اپنی بیگم کے ساتھ پہلی بار غیر ملکی سفر کرنا ہے۔ اور یہ پروگرام اسی درمیان میں پڑ رہا ہے۔ اس لیے سوچا کہ اس میں بھی شامل ہو جائیں۔ اگرچہ یہ رخصت میں کام کرنا ہو جائے گا۔

☆

پہلے ہم ٹورنٹو پہنچے۔ وہاں ایک ہفتے قیام کے بعد اب امریکہ روانگی ہے۔ ایک دن پہلے امریکی قونصل خانہ کراچی سے برقی ڈاک (ای میل) ملی ہے۔ ''براہ کرم نوٹ کریں۔ واشنگٹن سے ہدایت ملی ہے۔ (آج کل، اور کہاں سے ہدایت مل سکتی ہے!!!) کہ ایئر پورٹ، کسٹمز اور امیگریشن سے بخیریت گزرنے کے بعد مجھ سے درخواست کی گئی ہے کہ میں ٹیکسی یا ایئر پورٹ شٹل لے کر ہوم وڈ سوٹس۔ 1475 مساچوسٹس ایونیو، این ڈبلیو، واشنگٹن ڈی سی 2005۔ ٹیلی فون: 256-8000 (202) پہنچ جاؤں۔ (یہ ہوٹل ہے۔ جہاں ہمارا قیام ہوگا)۔ ہوٹل میں پہنچنے کے بعد آپ جولیانہ ہیدوتووا۔ انگلش لینگویج آفیسر۔ سے فون نمبر (703) 405-6627 سے رابطہ کرسکتے ہیں۔ وہیں آپ کو میریڈیان انٹرنیشنل سنٹر کا تیار کردہ ''خیر مقدمی پیکٹ'' بھی منتظر ملے گا۔

اس میں پہلا حصہ بڑا مایوس کن ہے۔ ہم تو اپنے صدور، وزرائے اعظم کے ساتھ سفر کرنے کے عادی ہیں۔ طیارے سے باہر نکلتے ہی ہمیں ہاتھوں ہاتھ لے لیا جاتا ہے۔ پروٹوکول والے پاسپورٹ وغیرہ لے لیتے ہیں۔ میزبان ملک کے آفیسر گاڑی لیے منتظر ہوتے ہیں۔ یہ پیغام تو یہ انکشاف کررہا ہے کہ امیگریشن، کسٹم ہمیں تنہا ہی اپنی ذات پر جھیلنا ہوگا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی یہ کیسی مہمان نوازی ہے۔

دوسرے حصے میں تھوڑی سی رومانویت ہے۔ جولیانہ سے رابطہ ہونا ہے۔ لیکن وہ بھی خود ہی کرنا ہے۔ امریکی اسی لیے دنیا میں محبت کی نظر سے نہیں دیکھے جاتے۔ مہمانوں کو دعوت دے کر بھی چاہتے ہیں کہ وہ خود ہی سب کچھ کریں۔

امیگریشن تو ٹورنٹو ایئر پورٹ پر ہوچکا ہے۔ سامان لینا ہے۔ اور کسٹم سے گزرنا ہے۔ ان مراحل میں مشکل پیش نہیں آتی ہے۔ ٹیکسی کے لیے بھی اچھا انتظام ہے۔ قطار میں لگنا ہے جس کی ہمیں اپنے ہاں عادت نہیں ہے۔ ایک بروشر بھی مجھے دے دیا گیا ہے۔ جس میں ٹیکسی سسٹم کے بارے میں مکمل معلومات ہیں۔ واشنگٹن ڈلس ایئر پورٹ، پر واشنگٹن فلائر ٹیکسی، میں مسافر نمبر 37 ہوں۔ ایئر پورٹ پر میری معلومات بھی موجود ہیں۔ اس ٹیکسی کا نمبر بھی.... کہیں معاملہ

بگڑ جائے تو اطلاعات کا تبادلہ ہوسکتا ہے۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو پتہ دکھا دیا ہے۔ اسے اندازہ ہے۔ کہہ رہا ہے کوئی مسئلہ نہیں۔ پہنچ جائیں گے۔

میں نے واشنگٹن میں ملنے والے اس پہلے انسان سے مکالمے کے لیے نام پوچھا ہے۔ تو اس نے الٹا سوال مجھ سے کیا ہے۔ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس جوابی سوال کا کیا مطلب۔ یہ بزرگ کہہ رہے ہیں۔ آپ کا علاقہ معلوم ہوگا تو اسی حساب سے نام بتاؤں گا۔

''میں پاکستان سے آیا ہوں۔''

''میرا نام حسین ہے۔ میں ایران سے ہوں۔''

''علاقہ پوچھنے کا کیا مقصد تھا۔''

''میں کسی غیر مسلم کو ''حسین'' بتاتا تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر میں اس کو انگریزی نام بتاتا۔''

امریکہ میں مسلم دشمنی کے ماحول میں نام بدلنے پڑتے ہیں۔ یہ 11 ستمبر سے پہلے بھی ہوتا تھا۔ کئی داؤد۔ ڈیوڈ بن گئے۔ بعض نے صرف مخفف بتانا شروع کردیے۔

حسین کو امریکہ میں 35 سال ہوگئے ہیں۔ اپنی جوانی اس نے امریکہ کے مختلف شہروں میں گزاری ہے۔ ایران گئے اسے 15 سال ہوچکے ہیں۔ اب فیملی یہیں ہے۔ دو بیٹے ہیں ایک بیٹی ہے۔ انہیں اسکولوں میں داخل کروایا ہوا ہے۔ ساری توجہ اس پر ہے کہ وہ پڑھ لکھ جائیں۔ تہران یاد آتا ہے۔ لیکن وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہاں کام نہیں ہے۔ امریکی صدر جارج بش سے اس کے تعلقات بھی کچھ زیادہ اچھے نہیں لگتے ہیں۔ فلسطین میں اسرائیل سب کچھ امریکہ کی شہ پر کررہا ہے۔ افغانستان میں بہت ظلم ہوا۔ طالبان بھی اچھے لوگ نہیں تھے۔ اب عراق میں دیکھیں یہ کیا ہورہا ہے۔ کتنا خون بہہ رہا ہے۔

''11 ستمبر کے بعد کیا ہوا تھا۔''

''ایک دو دن کام پر نہیں نکلے تھے۔ اس کے بعد کچھ زیادہ فرق محسوس نہیں ہوا۔ اپنے

کام سے کام رکھتے ہیں۔ کبھی کبھار کوئی ایسی سواری مل جاتی ہے۔ جو متعصب ہوتی ہے۔ ہم پھر اس سے بات آگے نہیں بڑھاتے۔

مانوس مقامات سے گزرتے ہوئے۔ ہم منزل مقصود پر پہنچ گئے ہیں۔ یہاں حسین خالص ٹیکسی ڈرائیور بن گیا ہے۔ اوہ۔ انہوں نے کہیں بتایا بھی نہیں ہے کہ یہ ون وے ہے۔ اس نے الٹ سمت میں گاڑی بڑھا دی ہے۔ لیکن ہوٹل کے عین دروازے پر پہنچا دیا ہے۔

''اچھا حسین پھر ملیں گے۔''

''السلام علیکم۔''

☆

استقبالیے پر مامور امریکی نوجوان نے نام سن کر کمپیوٹر کو حرکت دی ہے۔ آپ کا نام تو ہے۔ کمرہ ذرا دیر میں تیار ہوگا۔ آپ انتظار کریں۔

امریکیوں نے پھر اپنی میزبانی پر تنقید کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ ٹھیک ہے ہمارا چھوٹا ملک ہیں۔ مقروض ہیں۔ اپنے لوگوں کو ان کے جائز جمہوری حقوق بھی نہیں دیتے۔ لیکن ہر ملک میں سرخ قالین کے ساتھ استقبال تو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ کمرہ تیار ہونا چاہیئے تھا۔ اس طرح استقبالیے میں بیٹھنا ہماری توہین ہے۔

ہم اخبار لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ آدھے گھنٹے کے بعد کمرہ تیار ہونے کی خوش خبری ملی ہے۔ ہوٹل والے ایڈوانس مانگ رہے ہیں۔ ''بھئی ہم تو سرکاری مہمان ہیں۔'' وہ جب بل دیں گے۔ تو یہ ری فنڈ ہو جائیں گے۔ خیر کڑوا گھونٹ پی کر یہ بھی کر ڈالا۔

میں پوچھتا ہوں کہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے کوئی خیر مقدمی پیکٹ .....وہ بتاتے ہیں کہ ابھی تو کوئی نہیں۔ کمرہ اچھا ہے۔ خواب گاہ الگ ہے۔ ٹی وی لاؤنج۔ لکھنے پڑھنے کے لیے میز۔ ایک چھوٹا سا کچن۔ ریفریجریٹر، اوون، چائے، کافی کی کیتلی۔

وقت اچھا گزرے گا۔ اب اگلا مرحلہ ہونا چاہیئے۔ جولیانہ سے رابطے کا۔ فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ یہ کون ہو سکتا ہے۔

''میں جولیانہ ہیدوتووا ہوں۔ انگلش لینگوئج آفیسر۔''

''میں آپ کو فون کرنے ہی والا تھا۔''

''میں یہاں نیچے لابی میں ہوں۔ اگر فرصت ہو۔ تو ہم مل لیں۔''

جولیانہ خالص امریکی نہیں ہے۔ بلغاریہ سے معاش کی تلاش میں یہاں آئی اور یہیں کی ہو کر رہ گئی۔ پروگرام کی تفصیلات دے رہی ہیں۔ یہ واشنگٹن میں بھی ہمارے ساتھ ہوں گی۔ دوسرے شہروں میں جانا ہوا تب بھی ساتھ رہیں گی۔ کوئی مشکل ہو۔ ضرورت ہو تو انہیں ہی آگاہ کرنا ہوگا۔

وہ بتا رہی ہیں کہ اس پروگرام کے شرکاء میں سے پہلے پہنچنے والا میں ہی ہوں۔ دوسرے اپنے اپنے ملکوں سے براہ راست امریکہ پہنچیں گے۔ اسی رات کو اور کچھ اگلے دن آجائیں گے۔ سب آجائیں گے تو آنے والی کل سہ پہر واشنگٹن کے اہم مقامات دیکھنے نکلیں گے۔

آج کوئی سرکاری مصروفیات نہیں ہیں۔ واشنگٹن میں گزشتہ ماہ قیام کے دوران ایک انتہائی نفیس، متین اور پنجابی میں ''بیبے'' شخص چوہدری شمشاد احمد سے ملاقات رہی تھی۔ وہ چوہدری شجاعت حسین، چوہدری پرویز الٰہی کے اقارب میں سے ہیں۔ اصل واسطے داری تو ان کی ہمارے پنڈی کے ایڈیٹر رانا طاہر محمود سے ہے۔ ان کی بدولت ہماری بھی میزبانی انہوں نے بہت کی۔ آج کی شام ان کے نام ہی کرتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ ایک ماہ میں واشنگٹن پر کیا گزری ہے۔

چوہدری شمشاد احمد، چوہدری فاروق، حافظ ضیا الرحمٰن یہاں اپنے پاکستانی بھائیوں کی بہبود کے لیے بہت کچھ کرتے رہتے ہیں۔ مختلف دفاتر میں ان کے مسائل کے حل کے لیے ساتھ جاتے ہیں۔ غمی خوشی میں شریک ہوتے ہیں۔ ان کے لیے سب سے نازک اور سنگین صورت حال کسی پاکستانی کی موت کے وقت پیش آتی ہے۔ کہ اولین ترجیح میت کو وطن واپس پہنچانا ہوتا ہے۔ اس کے لیے امیگریشن، ایئر لائن سے بات کرنا اور پیسوں کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ متاثرہ خاندان صدمے کے باعث اس وقت اس کیفیت میں نہیں ہوتا کہ اکیلے تمام مراحل طے کر لے۔ اب چوہدری شجاعت حسین نے وزیر اعظم کی حیثیت سے پی آئی اے سے یہ طے کروا دیا ہے کہ غیر ممالک سے پاکستانیوں کی میتیں کسی کرایے کے بغیر لائی جائیں گی۔

پاکستانی ریستوران میں کھانے میں بہت آسانیاں ہیں۔ حلال حرام کی تشخیص کی مشکل بھی نہیں ہوتی مغربی ڈشز سے پیٹ بھرتا ہے نہ جی، اس لیے کولوریز، کولیسٹرول کے خدشات کے باوجود سب پاکستانی کھانوں کا رخ ہی کرتے ہیں۔ اب تو ان کھانوں کے شیدائی امریکی بھی ہوگئے ہیں۔ یہاں بعض اوقات دیسیوں سے زیادہ انگریز بیٹھے نظر آتے ہیں۔ کالے امریکی تو دونوں وقت بڑی باقاعدگی سے آتے ہیں۔ ان میں مسلم بھی ہوتے ہیں۔ غیر مسلم بھی۔

واشنگٹن اور امریکہ کے دوسرے شہروں میں پاکستانی ریستورانوں کے علاوہ انڈین، سری لنکن، تھائی، چینی، اٹالین، انڈونیشین، لبنانی، افغانی سب کے ہوٹل موجود ہیں۔ ایک صاحب نے اس صنعت کے بارے میں ایک کتاب "On a plate" بھی قلمبند کردی ہے۔

چوہدری شمشاد بتارہے ہیں کہ صدر جنرل پرویز مشرف نے دورہ امریکہ میں پاکستانی کمیونٹی کے امور پر امریکی صدر اور دوسرے حکام سے گفتگو کی تھی۔ لیکن اس کے خاص نتائج برآمد نہیں ہوئے ہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد پاکستانیوں کے لیے جن مشکلات کا آغاز ہوا ہے۔ وہ اسی طرح موجود ہیں۔ بلکہ بعض اوقات بڑھ جاتی ہیں۔ حال ہی میں دو زیر تعلیم پاکستانی نوجوانوں کو معمولی سی بات پر قتل کردیا گیا۔ قاتل سیاہ فام ہیں۔ لیکن وہ اب تک پکڑے نہیں گئے ہیں۔

امریکہ میں قانون کی پابندی سختی سے ہوتی ہے۔ لیکن کالوں کے معاملے میں قانون بھی بے بس ہے۔ دونوں بدقسمت نوجوان کی میتیں پاکستان بھیجنے کی کوششیں جاری ہیں۔

چار بجے لابی میں جمع ہونا ہے۔ میں کچھ پہلے ہی آگیا ہوں۔ یہ عرفان صدیقی ہیں۔ پاکستان سے آئے ہیں۔ نوائے وقت میں کالم لکھتے ہیں۔ صدر رفیق تارڑ کے پریس سیکرٹری رہ چکے ہیں۔ یہ شکریہ بارکزئی ہیں۔ افغانستان کے ہفت روزہ ''آئینہ زن'' کی ایڈیٹر ہیں۔ ایمبسڈر محمد ضمیر، بنگلہ دیش میں مختلف انگریزی اخبارات میں کالم لکھتے ہیں۔ فارن سروس سے ہیں کئی ملکوں میں سفیر رہ چکے ہیں۔ تمل اور آصف صاحب بھارت سے ہیں۔ تمل بزنس اسٹینڈرڈ بمبئی کے سٹی ایڈیٹر ہیں۔ آصف عمر اردو نیوز جدہ اور بمبئی کے دہلی میں بیورو چیف ہیں۔

یہ عائشہ بیگ محمد ہیں۔ بلند قامت، پراعتماد، یہ بھی اپنے شہر کراچی سے تعلق رکھتی ہیں۔

ایک آئی ٹی کمپنی سے منسلک ہیں۔ بہت مخصوص قسم کے سیاحوں کے لیے گائیڈ کے فرائض بھی انجام دیتی ہیں۔ امریکی تاریخ انہیں ازبر ہے۔ کیونکہ یہ ان کی جاب ہے، معلوم نہیں کہ اپنے وطن کی تاریخ بھی انہیں اس طرح معلوم ہے کہ نہیں۔ آج تمام سرکاری امریکی عمارتوں پر پرچم سرنگوں ہے۔ عائشہ بتارہی ہیں کہ کوریا کی جنگ میں کام آنے والوں کی یاد منائی جارہی ہے۔ وائٹ ہاؤس کے باہر تصویریں بنوانے کے لیے رش لگا ہوا ہے۔ ہم بھی اسی رش میں شامل ہورہے ہیں۔ وائٹ ہاؤس کے سامنے ایٹمی جنگ، اور ایٹم بم کے خلاف احتجاج تو سالہا سال سے جاری ہے۔ ہیروشیما، ناگاساکی کے ہلاک شدگان کی تصویریں، ایک دو جاپانی بھی موجود رہتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ نئی جنگوں کی تباہ کاریوں پر احتجاج بھی شامل ہوجاتا ہے۔ اب عراق پر امریکی حملہ نیا موضوع ہے۔ جنگ کے خلاف ایک خاتون اور مرد بھی خیمہ زن ہیں۔ ایک سچائی یہ درج ہے۔

"When the rich make war it is the poor who die."

جب متمول لوگ جنگ کا آغاز کرتے ہیں۔

یہ غریب لوگ ہیں جو مرتے ہیں۔

وائٹ ہاؤس کے پھاٹک سے اس پار میڈیا اپنے کیمروں، چھتریوں، روشنیوں سمیت موجود ہے۔ گرمی ہو سردی، برف پڑرہی ہو۔ وائٹ ہاؤس میں متعین ریڈیو، ٹی وی، اخبارات کے نمائندے خبر کی تلاش میں یہیں رہتے ہیں۔ یہیں سے خبریں تصویریں دنیا بھر میں پہنچنے کے انتظامات ہیں۔

عائشہ بیگ بتارہی ہیں کہ آئزن ہاور کے زمانے میں وائٹ ہاؤس اور دوسرے ایگزیکٹو دفاتر کو ایک سرنگ کے ذریعے آپس میں ملادیا گیا تھا۔ اب اس سرنگ میں بھی ایک متوازی شہر آباد ہوگیا ہے جس میں دفاتر ہیں۔ جہاں ایئر کنڈیشنگ اور ہیٹنگ کا بھی انتظام ہے۔ تمام ضروریات آسانی سے مل جاتی ہیں۔ یہ سامنے بلیئر ہاؤس ہے۔ جہاں امریکی صدر کے مہمان قیام کرتے ہیں۔ پاکستانی وزیراعظم بھی یہاں ٹھہر چکے ہیں۔ اس طرف ایڈم ہوٹل ہے۔ امریکہ کا سب سے مہنگا ہوٹل۔ لیکن سعودی ولی عہد شہزادہ جب یہاں دورے پر آئے تو انہوں نے پورا

ہوٹل ہی اپنے لیے بک کرلیا تھا۔ سیکورٹی بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی چرچ ہے۔ جہاں امریکی صدر بھی عبادت کے لیے آتے ہیں۔ صدر بش تو کچھ زیادہ ہی آتے ہیں۔

اب ہم کوسٹر پر بیٹھ کر واشنگٹن کی سرکاری عمارتوں کے درمیان سے گزر رہے ہیں۔ وفاقی وزارتوں کے سیکریٹریٹ سب یہیں ہیں۔ انہی کے درمیان کینیڈا کا سفارت خانہ بھی ہے۔ یہ امریکہ اور کینیڈا کے درمیان قربت اور گرمجوشی کی علامت ہے۔ کسی دوسرے ملک کے سفارت خانے کو ادھر جگہ نہیں دی گئی۔ یہ شاہراہ آئین ہے۔ Constitution Avenue۔ شاید اس کی پیروی میں ہمارے ہاں بھی یہ ایونیو بنا ہے۔ اور شاید کبھی آئین کی پیروی بھی ہوجائے۔

یہ قدیم پوسٹ آفس ہے۔ اب یہ قومی آثار قدیمہ کا حصہ ہے۔ امریکہ کی قوم سازی میں پوسٹ آفس نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس پر باقاعدہ فلمیں بھی بنائی گئی ہیں۔

شاہراہ آئین پر ہی سینٹ اور کانگریس کی عمارتیں ہیں۔ جہاں ممبرز کے چیمبر ہیں۔ اور امریکہ کی بہت ہی بااختیار کمیٹیوں کے دفاتر بھی۔ جہاں انتظامیہ کے نمائندوں، وزراء کو بلا کر طویل جرح کی جاتی ہے۔ آنے والے چند دنوں میں ہمیں یہاں بار بار آنا ہوگا۔ یہ امریکی سپریم کورٹ ہے کیا پرشکوہ عمارت ہے۔ آزادی اور قانون کی سربلندی کو برقرار رکھنے میں اس عمارت میں کیے گئے فیصلوں کی تاریخی حیثیت رہی ہے۔ عائشہ بیگ بعض اوقات بڑی تفصیلات میں چلی جاتی ہیں۔ کانگریس کی نشست کے باہر خاتون کا مجسمہ ہے۔ سنگ مرمر سے بنا ہوا۔ یہ مشرق کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ ہم اس میں خوش ہیں۔ مشرق سے سورج ابھرتا ہے۔ اس لیے ادھر ہی دیکھنا چاہیئے۔ کانگریس، سینٹ دونوں میں پہلی بار ری پبلکن کی اکثریت ہے۔ دونوں میں واشنگٹن ڈی سی کی نمائندگی نہیں ہے۔ البتہ جارج واشنگٹن کی تصویر لگی ہوئی ہے۔ صرف اسی ایک صدر کی تصویر یہاں آویزاں ہے۔ دوسرے کسی بھی صدر کی تصویر اگر لگے گی تو غیر قانونی ہوگی۔ (نہ ہوا۔ پاکستان۔ جارج واشنگٹن کی غیر قانونی ہوجاتی مگر موجودہ صدر کی قانونی ہوتی) عائشہ ایک اور اہم نکتہ بتارہی ہیں کہ کانگریس میں سب بغیر دعوت اجازت کے آسکتے ہیں۔ اگر کوئی نہیں آسکتا۔ تو وہ صدر امریکہ ہوتا ہے۔ وہ بغیر دعوت کے یہاں آنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔

یہ ورلڈ لائبریری آف کانگریس ہے۔ جو جیفرسن کے دور میں بنی تھی۔ ایک کہاوت ہے کہ یہاں موجود کتابوں کو اگر قطار میں رکھا جائے تو یہ بلا مبالغہ 500 میل تک چلی جائیں گی۔ یہ امریکہ کے اصل باشندوں یعنی ریڈ انڈینز کا عجائب گھر ہے۔ اپنے اصل آباواجداد کے ساتھ امریکی کیسا سلوک کرتے ہیں۔ انہیں قریباً غاروں میں واپس بھجوا دیا ہے۔ ہم پاکستانی ان کے ساتھ سلوک پر اس لیے خوش ہیں کہ یہ انڈینز کے ساتھ ہورہا ہے۔ اتنی دور انڈیا کے لوگ کیسے پہنچ گئے تھے۔ یہ معلوم نہیں۔

عمارتوں میں سے گزرتے ہوئے عائشہ ہمیں دریا پر لے آئی ہیں۔ پوٹومک دریا۔ واشنگٹن میں گھومتے ہوئے یہ دریا آپ کے سامنے کہیں نہ کہیں آہی جاتا ہے۔ یہاں یہ دریا اس شہر کی خوبصورتی شگفتگی اور ہریالی میں اضافہ کررہا ہے۔ ہمارے دریاؤں کی طرح سرکش ہوکر تباہی نہیں پھیلاتا۔ دریا کے کنارے سبزہ زار میں ایک بہت بڑا مجسمہ ہے۔ جسے خصوصی طور پر دکھانے کے لیے ہمیں یہاں لایا گیا ہے۔ ایک دیوہیکل انسان لیٹا ہوا ہے۔ اس کا ایک ہاتھ اوپر بلند ہورہا ہے اس مقام کو ''ہینس پوائنٹ'' Haines Point کہا جاتا ہے۔ یہ ''مجسمہ بیداری'' Statue of Awakening ہے یہ چند سال پہلے ہی بنا ہے۔ رشتہ اس کا ٹیکنالوجی سے جوڑا جارہا ہے۔ لیکن گیارہ ستمبر کے تناظر میں تو اسے امریکی بچے اسامہ بن لادن کا مجسمہ سمجھیں گے۔ اور اس کے قریب آنے سے ڈریں گے۔ اندھیرا پھیلنے لگا ہے۔ ہم ابراہیم لنکن کے میموریل کے سامنے سے گزر رہے ہیں۔ ہم میں سے ایک دو اظہار عقیدت کے لیے سیڑھیاں تیزی سے عبور کرتے ہوئے چلے گئے ہیں۔ ہم کوریا اور ویت نام کی جنگوں میں کام آنے والے امریکی فوجیوں کی یادگار کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ویت نام کے امریکی ''شہیدوں'' کے لیے تو ایک باقاعدہ طویل دیوار بنائی گئی ہے۔ اور اس پر تاریخ اور سن کے اعتبار سے نام لکھے گئے ہیں۔ جو قریباً 58 ہزار ہیں۔ اور یہ 1975ء سے 1979ء کے درمیان کام آئے تھے۔ ایک طرف کاؤنٹرز پر ضخیم رجسٹر بھی رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں آپ اپنے عزیز کا نام تلاش کرسکتے ہیں۔ پھر اسے دیوار پر جاکر دیکھ سکتے ہیں۔ اظہار عقیدت کے لیے گلدستے رکھے جاتے ہیں۔ دیئے جلائے جاتے ہیں۔

کوریا کے شہیدوں کی یادگار ذرا مختلف ہے۔ نام تو وہاں بھی ہیں۔ لیکن فوجیوں کے مجسمے بنائے گئے ہیں۔ جو سبزہ زار میں اس طرح کھڑے ہیں جیسے کسی کھیت میں فصل اگ رہی ہو۔

یہاں میں ہر عمر کے امریکیوں کو دیکھ رہا ہوں۔ معمر، بزرگ، جواں سال، بچے، لیکن سب کی آنکھوں میں احترام جھلک رہا ہے۔ عقیدت نمایاں ہورہی ہے۔ ایک سنجیدگی ہے۔ اور وہ اپنے اپنے انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کررہے ہیں۔

میں سوچ رہا ہوں کہ امریکی آخر دنیا میں اتنے دور دراز ملکوں میں جاکر کیوں لڑے۔ موت کی دلدل میں کیوں اترے۔ کمیونزم کے خاتمے کے لیے کیسی خوفناک جنگیں لڑیں۔ کتنے خاندان برباد ہوئے ان اجنبی دیاروں میں وہ وہاں کے مقامی لوگوں کے تعاون اور مدد کے بغیر کیسے لڑ سکتے تھے۔ لیکن ان میں سے کسی کا نام یہاں ہے نہ مجسمہ۔ وہ جنوبی ویت نامی جو شاید ان سے بھی زیادہ تعداد میں کام آئے ہوں ان کا کسی کا ذکر تک نہیں ہے۔ وہ بھی تو اسی مقصد کے لیے ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ اس طرح جنوبی کوریا تو ان کے ساتھ جنگ میں اس لیے شریک تھا کہ وہ بھی کمیونزم کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ امریکی انتظامیہ اپنے لوگوں کو۔ آنے والی نسلوں کو آدھے سچ سے کیوں باخبر کرنا چاہتی ہے۔ ان کے نام کیوں نہیں بتاتی۔ جن کی مدد کے بغیر وہ ان علاقوں میں فوجیں بھی نہیں اتار سکتی تھی۔ دنیا کے دوسرے علاقوں کے وہ لوگ بھی اس حقیقت کو جان لیں کہ وہ امریکیوں کا ساتھ بے شک کسی اصول کے تحت ہی دے رہے ہیں۔ لیکن امریکی اپنی تاریخ میں ان کا ذکر ضروری نہیں سمجھتے۔ اور اپنے ملک میں ایسے ساتھ دینے والوں کو ہم وطن کچھ اور ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ فاعتبرو یا اولی الابصار۔

دوسری طرف میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ امریکیوں نے یہ یادگاریں بنا کر اپنی تاریخ کے اوراق اپنے سبزہ زاروں، دریا کناروں اور مرکزی مقامات پر اس طرح کھول کر رکھ دیئے ہیں کہ ہر آنے والی نسل تفریح تفریح میں اپنی تاریخ کو جان لیتی ہے۔ اپنے بزرگوں، اور بہادروں کے کارناموں سے آگاہ ہوجاتی ہے۔ یہاں سیاح بھی آتے ہیں۔ اسکولوں کے بچے بچیاں بھی لائے جاتے ہیں۔ کالج یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات بھی۔ مختلف سرکاری محکموں کے افسروں کو بھی لایا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں کہیں بھی ایسا نہیں ہے۔ اپنی اپنی جگہ نشان حیدر پانے والوں کے مزار ہیں۔ گمنام شہیدوں کی یادگاریں ہیں۔ لیکن اس طرح مرکزی دارالحکومت یا دوسرے بڑے شہروں میں تفریح گاہوں میں ایسی یادگاریں قائم نہیں کی گئی ہیں۔ جہاں چلتے چلتے تفریح کرتے کرتے تاریخ کے اوراق بھی سامنے کھلتے چلے جائیں۔

قوم سازی اسی غیر محسوس طریقے سے ہوتی ہے۔ لیکن اس کے لیے ایک درد چاہیئے۔ دور رس نظریں چاہئیں۔ سب سے محبت چاہیئے۔ ہمارے ہاں تو نفرت ہے۔ محاذ آرائی ہے۔ روشن پہلو دیکھنے کی عادت ہی نہیں رہی۔ ہم نے اپنی تاریخ میں ''ہیروز'' بنانے کی کوشش بہت کم کی ہے۔ ''ولین'' بہت بنائے ہیں۔

عائشہ بیگ اپنی ذمہ داری پوری کرچکی ہے۔ وہ اجازت لے رہی ہیں۔ جولیانہ بھی رخصت ہورہی ہیں۔ کل سے پروگرام باقاعدہ شروع ہوجائے گا۔ صبح آٹھ بجے لابی میں موجود ہونا چاہیئے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اب سوجائیں۔

سونے سے پہلے میں اب تک ملنے والے کاغذات لے کر بیٹھ گیا ہوں۔ ایک سرکلر نما خط برینڈ سپریگ ڈائریکٹر آفس آف لینگویج سروسز کی طرف سے ہے۔ یہ ایک طرح کا ہدایت نامہ بھی ہے۔ اور لینگویج آفیسر کے استعمال کی ترکیب بھی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ لینگویج آفیسر مرد ہو یا خاتون۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ آپ کے لیے ترتیب دیئے گئے ولولہ انگیز پروگرام کی تکمیل میں آپ کی معاونت کرے۔ یہ آفیسر لسانی خدمات کے دفتر سے معاہدے کے تحت کام کرتے ہیں ملازم نہیں ہوتے۔ وہ متعلقہ زبان اور پروگرام کے سلسلے میں بڑے سخت امتحانات سے گزرے ہوتے ہیں۔ اور اس دوران میں ممکنہ چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے انہیں تجربہ ہوتا ہے تربیت بھی۔ اس آفیسر کا اصل مقصد یہ ہے کہ پروگرام کے دوران آپ کو امریکہ سے روشناس کروائے۔ وہ وقتاً فوقتاً آپ کے لیے بات چیت میں معاون ہوگا۔ لیکن اس سے یہ توقع نہ کریں کہ وہ آپ کے رکی سیکرٹری کے طور پر تمام نکات درج کرے آپ کے لیے تفصیلی ترجمہ تیار کر کے دے۔ ہر روز وہ آپ کو اگلے روز کے پروگرام کے بارے میں بتائے گی تاکہ آپ ان کے لیے ذہنی طور پر آمادہ ہوں۔ ہر جگہ بر وقت پہنچنے کے لیے وہ یہ بھی طے کرے گی کہ آپ

کوکس وقت چلنا چاہیئے۔ یہ بھی رعب ڈالا گیا ہے کہ بہت سے امریکی انتہائی مصروف شیڈول رکھتے ہیں۔ اگر آپ بروقت نہ پہنچیں تو شاید وہ انتظار نہ کرسکیں۔

یہ آفیسر آپ کے پروگرام کی تیاری میں چونکہ شامل نہیں تھی۔ اس لیے اسے پروگرام میں تبدیلی کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ البتہ وہ آپ کو اس وقت کے بارے میں مشورے دے سکتی ہے جب آپ پروگرام سے فارغ ہوں گے۔ اگر آپ کو پروگرام کے بارے میں کوئی تشویش ہے۔ تو آپ اس سے آغاز پر ہی پروگرام سے متعلقہ ادارے کو آگاہ کردیں۔ کوئی تبدیلی صرف اسی وقت ممکن ہے۔ آپ کے دورے کے دوران آپ کو کچھ رقم ملے گی۔ آپ کو اپنے کھانے پینے، ہوٹل کے بل اور دوسرے سفری اخراجات خود ہی ادا کرنے ہوں گے۔ آپ کے آفیسر کو بھی رقم ملتی ہے۔ لیکن صرف اپنے اخراجات کے لیے۔ اگر کہیں کھانے، ٹیکسی کے کرایے میں حصہ ڈالنا ہے تو یہ اس کے اور آپ کے درمیان ہوگا۔

یہ بھی خبردار کیا گیا ہے کہ ترجمانی یا رہنمائی جسمانی اور ذہنی طور پر دشوار ہے۔ اس لیے اسے باقاعدگی سے وقفے درکار ہوں گے تاکہ وہ اگلی میٹنگوں کے لیے تازہ دم ہوسکے۔ یہ کہا گیا ہے کہ اس کے زیادہ محتاج نہ بنیں۔ شاپنگ وغیرہ کے لیے خود بھی چلے جائیں۔ کھانے وغیرہ کے لیے بھی نکل جائیں تاکہ آپ ہمارے ملک کے بارے میں اپنے آزاد تاثرات بھی قائم کرسکیں۔ یہ سرکلر پڑھتے ہوئے ہمارے ذہن میں اپنی لینگوئج آفیسر جولیانہ ہے۔ لگتا ہے کہ اس کے تحفظ کے لیے یہ ساری تفصیلات بتائی گئی ہیں دیکھنا ہے کہ اگلے دو ہفتوں کے دوران میں ہم میں سے کتنے ان ہدایات پر عملدرآمد کرتے ہیں۔

انٹرنیشنل وزیٹرز پروگرام

ہماری منزل میریڈیان انٹرنیشنل سینٹر ہے۔ جس نے ہمارا یہ سارا پروگرام ترتیب دیا ہے۔ عمارت پراسراری ہے۔ جیسے ایک زمانے میں فری میسنز کی لاجز ہوتی تھیں۔ ہمیں جس کمرے میں بٹھایا گیا ہے اس میں روشنی بہت کم ہے۔ پردے گرے ہوئے ہیں۔ یہ بھی کسی باضابطہ حکمت عملی کا حصہ ہوگا۔ تازہ ہوا، سورج کی قدرتی روشنی کو روکنا یقیناً کوئی مصلحت ہوگی۔ یہ ڈاکٹر ڈیوڈ این کوہن ہیں۔ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے پروگرام افسر۔ ان کے علاقے شمالی افریقہ، مشرق قریب اور جنوبی ایشیا ہیں۔ مسز نان بیل، یہ بھی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ سے ہیں گرانٹ پروگرام ڈویژن کی چیف ہیں۔ ہمارے سفر کے اخراجات کی منظوری انہوں نے ہی دی ہوگی۔ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ سے دو افسر نہیں آسکے ہیں۔ آفس آف انٹرنیشنل وزیٹرز کے ڈائریکٹر ڈبلیو چارلس مور اور لیری اے موڈی۔ چیف شمالی افریقہ، مشرق قریب، اور جنوبی ایشیا۔

امریکہ میں پروگرام میں لکھے سب افسرز نہ آئیں۔ یا تحریری پروگرام کے مطابق امور نہ چل رہے ہوں تو پرانے اور سیانے لوگ کہتے ہیں کہ پروگرام کی اہمیت کم ہوگئی ہے۔ شرکا کی حیثیت کم ہوگئی ہے یہاں معلوم نہیں کہ یہی وجہ ہے یا واقعی یہ آفیسرز کہیں اور مصروف ہیں۔

میریڈیان انٹرنیشنل سینٹر کے پروگرام ڈویژن سے ڈاکٹر میلکوم سی پیک ہیں جو سینئر پروگرام آفیسر ہیں۔ رانیہ اصیلی ہیں۔ جو پروگرام ایسوی ایٹ ہیں۔

آج کی یہ نشست آپس میں تعارف اور اس پروگرام سے آگاہی کے لیے ہے کہ یہ پروگرام کیا ہے۔ کیوں شروع کیا گیا۔ اس کے مقاصد کیا ہیں۔

اس پروگرام کا اہتمام امریکی محکمۂ خارجہ (اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ) کا بیورو برائے تعلیمی و ثقافتی امور (بیورو آف ایجوکیشنل اینڈ کلچرل افیئرز) کرتا ہے، بین الاقوامی تعلیمی اور تجرباتی پروگراموں امریکہ اور دوسرے ملکوں کے درمیان باہمی تفہیم کو فروغ دیتا ہے۔ امریکہ اور بیرونی دنیا میں اداروں اور عام شہریوں کے درمیان ذاتی، پیشہ ورانہ اور اداراتی تعلقات کو بڑھاتا ہے۔

انٹرنیشنل وزیٹرز پروگرام دنیا بھر سے شرکاء کو ہر سال امریکہ لاتا ہے۔ جہاں وہ اپنے پیشہ ورانہ ہم منصبوں کو ملتے ہیں۔ اور امریکی معاشرے میں سیاسی اور ثقافتی اثر و رسوخ کا وسیع تر تناظر میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ سمجھتے ہیں۔ پروگرام کا اصل مقصد۔ ذاتی اور پیشہ ورانہ سطح پر رابطے سے باہمی افہام و تفہیم میں وسعت پیدا کرنا ہے۔ وزیٹرز (مہمانوں) میں زیادہ تر حکومت سیاست، میڈیا، تعلیم اور دوسرے شعبوں موجودہ یا ممکنہ رہنماؤں کو شامل کیا جاتا ہے ان کی نامزدگی متعلقہ ملک میں امریکی سفارت خانے کی کمیٹیاں کرتی ہیں۔ پرگرام میں اب تک شامل کیے جانے والے مہمانوں میں سے 186 سے زیادہ بعض ملکوں کے موجودہ یا سابقہ سربراہانِ مملکت ہیں۔ 1500 مرکزی کابینہ کے وزراء ہیں۔ مہمانوں کی بڑی تعداد آج کل یا ماضی قریب میں اپنے اپنے ملک میں سرکاری یا نجی شعبے میں نمایاں حیثیتوں میں فائز رہ چکی ہے۔

اس تفصیل سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امریکہ دنیا بھر کے ملکوں میں اپنے سیاسی فلسفے کے حامی کس طرح تیار کرتا ہے۔ لوگ آسانی سے بعض نمایاں شخصیتوں پر امریکی ایجنٹ ہونے کا الزام عائد کردیتے ہیں۔ اور ان افراد کی سیاسی سوچ اور ذاتی فیصلوں کو قومی مفاد کے منافی قرار دے دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کی سوچ اور فیصلوں کے پیچھے ایک باقاعدہ تربیت اور زاویہ نگاہ ہوتا ہے۔ سوچنے کی ضرورت یہ ہے کہ دنیا میں کسی اور ملک نے کیا اس طرح کے باقاعدہ پروگرام ترتیب دیئے ہیں۔ کیا ان کے لیے اتنا بجٹ مختص کیا ہے۔ اور کیا وہ اس کے لیے اتنی محنت کرتے ہیں۔ ایک کامیاب مملکت بننے کے لیے اور ایک بڑی طاقت بننے کے لیے یہ سب کچھ بہت ضروری ہے۔ یہیں ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ امریکہ کے اندرون ملک مختلف ریاستوں

سے ماہرین، پیشہ ور، ہنرمند افراد کو ایک دوسرے سے ملانے کے بھی اسی طرح کے شعبے اور پروگرام ہیں۔ ریاستیں اپنی اپنی جگہ خودمختار ہیں۔ لیکن اس طرح کی کوششوں سے امریکہ اپنے شہریوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔ اس موضوع پر باتیں چلتی رہیں گی۔ میریڈیان انٹرنیشنل سنٹر ایک غیر منافع بخش ادارہ ہے۔ جس نے اپنے آپ کو فنون لطیفہ۔ افکار اور لوگوں کے تبادلے کے ذریعے بین الاقوامی مفاہمت کے فروغ کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ پروگرام ڈویژن، امریکی محکمۂ خارجہ کی گرانٹ کے تحت ان مہمانوں کے لیے سفر اور پیشہ ورانہ پروگراموں کا انتظام کرتا ہے۔ جو محکمۂ خارجہ کی سرپرستی میں انٹرنیشنل وزیٹرز پروگرام میں شرکت کے لیے آتے ہیں۔

ہمیں مدھم مدھم روشنی میں بتایا جارہا ہے کہ انٹرنیشنل وزیٹرز پروگرام باقاعدہ قانون سازی کے ذریعے متعارف کروایا گیا۔ یہ ایک طرح کا تبادلے کا پروگرام ہے۔ جس کا مقصد مزید معلومات کی فراہمی اور علم کا فروغ ہے اس سے تربیت بھی ہوتی ہے۔ مختلف ممالک میں،علاقوں کے انسان ایک دوسرے کے حالات اور سوچ کو بھی سمجھتے ہیں۔ اور یہ بھی جان لیتے ہیں کہ امریکہ میں کیا ہورہا ہے۔

یہ خاص طور پر واضح کیا جارہا ہے کہ اس کا مقصد قطعی طور پر خیالات تبدیل کرنا نہیں ہے۔ نہ کسی کو فکری اعتبار سے متاثر کرنا ہے۔ یہ تو ایک دریچہ کھولنا ہے۔ اس کا مقصد ایک بین الاقوامی مکالمے کو جاری رکھنا ہے اس وقت دنیا میں اہم ترین موضوعات یہ ہیں۔

1۔ بعد از عراق صورت حال۔

2۔ ایٹمی ہتھیاروں کا پھیلاؤ۔

3۔ دہشت گردی کے خلاف عالمی مہم۔

ہمیں آگاہ کیا جارہا ہے کہ اس پروگرام کے دوران ہماری ملاقات مختلف ماہرین سے ہوگی۔ ان کے خیالات آپ غور سے سنیں۔ پھر آپ ان سے سوالات بھی کرسکیں گے۔ مکالمہ بھی ہوسکے گا۔

رسمی اور خالصتاً پیشہ ورانہ میٹنگوں سے علاوہ ایک دلچسپ پروگرام یہ ہوگا کہ کسی بھی شہر

میں امریکی شہریوں سے ان کے گھر میں خالصتاً غیر رسمی انداز میں بے تکلفی سے ملاقات ہوگی۔ جہاں عام شہریوں کے خیالات جاننے کا موقع بھی مل سکے گا۔ جو کسی طرح بھی امریکی سرکار کے خیالات نہیں ہوں گے۔

منتظمین کا کہنا ہے کہ اس سے جنوبی ایشیا سے آئے ہوئے ایڈیٹروں کے درمیان بھی رابطہ بڑھے گا۔ آپ خود ایک دوسرے کو سمجھ سکیں گے۔

جب آپ گھوم پھر کر واپس آئیں گے۔ تو واشنگٹن میں۔ اسی عمارت میں ان دو ہفتوں کے دورے۔ پروگراموں۔ اور ملاقاتوں پر آپس میں گفتگو ہوگی۔ ہر شریک اپنی اپنی رائے تجزیہ اور جائزہ پیش کرے گا۔

ڈاکٹر میلکوم بتا رہے ہیں کہ یہ انٹرنیشنل وزیٹرز پروگرام 60 سال پہلے شروع ہوا تھا۔ اس کے بعض شرکاء اپنے ملکوں کے سربراہوں تک کے عہدے پر بھی پہنچے۔ جیسے حامد کرزئی اس وقت افغانستان کے عبوری سربراہ ہیں۔

ہم سب اپنی جگہ خوش ہیں کہ شاید ہمارے سر پر بھی ہما کسی وقت بیٹھ جائے۔ ہمارا مقدر بھی چمک اٹھے۔ امریکن نگہ انتخاب ہم پر بھی ٹھہر جائے۔

اب شرکاء اپنی اپنی باری پر بول رہے ہیں۔ بنگلہ دیش سے آئے ہوئے ایمبسیڈر محمد ضمیر نے اچھی تجویز پیش کی ہے کہ ہم میں سے جو لکھنے والے ہیں۔ ان کے کالم اپنے علاقوں میں تو بہت شائع ہوتے ہیں۔ امریکی اخباروں میں ان کی اشاعت کا اہتمام ہو۔ تو مفاہمت اور وسیع ہوسکتی ہے ڈیوڈ کوہن اپنی سرکاری ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں کہ اس پروگرام کے دوران جو گفتگو کی جائے گی۔ وہ سب آف دی ریکارڈ ہوگی۔ اسے بغیر حوالے کے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اسے کسی سے منسوب نہیں کیا جائے گا۔ جو گفتگو اشاعت کے لیے ہوگی اس کے لیے پہلے سے آگاہ کردیا جائے گا۔ آف دی ریکارڈ رکھنے میں یہ فائدہ بھی ہے کہ آپ ہر امر یا مسئلے پر کھل کر بات چیت کریں۔ زیادہ سے زیادہ سوالات کریں۔ معاملے کی تہہ تک پہنچیں۔

ہمیں یہ بھی خبردار کردیا گیا ہے کہ کسی شخصیت کی تصویر لینا ہو یا اس کے ساتھ تصویر

اتروانا ہو۔ تو اس کے لیے بھی پہلے سے اجازت لینا مناسب ہوگا۔

ایک دلچسپ احتیاط یہ بھی بتائی جارہی ہے کہ اکثر میٹنگوں میں وقت کی پابندی کے پیش نظر براہ راست گفتگو شروع ہوجائے گی۔ چائے پانی، جوس، بسکٹ کا کوئی اہتمام نہیں ہوگا۔

ہمارے ہاں تو ایسی خشک ملاقاتوں کا تصور نہیں ہے۔ بلکہ اسے تہذیب، اخلاقیات مہمان نوازی سے گری ہوئی حرکت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ظالم امریکیوں نے اسے اکثر سرکاری میٹنگوں میں سچ ثابت کردکھایا ہے۔

میں اپنی باری پر کہہ رہا ہوں۔ کہ اس وقت دنیا میں جینا مشکل اور خطرناک ہوتا جارہا ہے عالمی سطح پر حالات تشویش ناک ہیں۔ میں تو اس پروگرام میں شرکت کے لیے اس لیے آیا ہوں کہ یہ جان سکوں کہ لوگ امریکہ سے نفرت کیوں کرتے ہیں۔ امریکہ ایمپائر کیوں بن رہا ہے۔

میں کہہ رہا ہوں کہ ایسے پروگراموں کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے اثرات کو قائم رکھنے کے لیے ان کے بعد فالو اپ نہیں کیا جاتا ہے۔ میں نے 1997ء میں ایک ٹریولنگ سیمینار میں شرکت کی تھی۔ جو پاکستان اور بھارت میں امریکی محکمۂ اطلاعات کے زیر اہتمام ہوا تھا۔ سیمینار بہت اچھا تھا۔ بہت موثر تھا۔ شرکاء بہت وعدے کرتے ہیں۔ پروگرام بناتے ہیں۔ لیکن بعد میں اپنے اپنے مسائل میں الجھ کر سب بھول جاتے ہیں۔ ہم نے بہت سنجیدگی اور خلوص سے پیشکش کی تھی کہ ہم ایک دوسرے کے مضامین اور رپورٹیں شائع کریں گے۔ پاکستان اور بھارت کے شہریوں سے ایک ہی موضوع پر سوال کیا جائے۔ ان کے جوابات دونوں ملکوں میں شائع کیے جائیں۔ اس طرح دونوں ملکوں کے عوام ایک دوسرے کے نزدیک آئیں گے۔ لیکن بعد میں پروگرام کا سرپرست، اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ یا امریکی محکمۂ اطلاعات بھی اس کا فالو اپ نہیں کرتا۔

میں تجویز پیش کر رہا ہوں کہ ان پروگراموں کے شرکاء واپس اپنے اپنے ملکوں میں جاکر جو کچھ لکھیں۔ وہ ایک دوسرے تک پہنچانے کا اہتمام کیا جائے۔ وقفوں وقفوں سے باقاعدہ مانیٹرنگ ہو۔

دوسرے شرکاء بھی اپنی اپنی تجاویز دے رہے ہیں۔ سب میں ایک جذبہ ہے۔ ایک

خواہش ہے۔ دنیا کو امن وسلامتی کا گہوارہ بنانے کی۔

اب سفر کے امور طے ہو رہے ہیں۔ کہاں کہاں جانا ہے۔ کتنے اخراجات ہوں گے۔ ادائیگی کیسے ہوگی۔

اب ہم میریڈیان کے اندھیروں سے نکل کر روشنی میں آ گئے ہیں۔ دوپہر کے کھانے کا یہیں لان میں اہتمام کیا گیا ہے۔

امریکہ کا وفاقی نظام

دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے دارالحکومت میں ایک بڑے تھنک ٹینک میں ہم دن گزار رہے ہیں۔ اس وقت امریکی محکمۂ خارجہ کے اہم افسروں کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے ذائقے، ماما عائشہ ریستوران سے آئے ہیں۔ لیکن ایک عجیب بے چینی سی ہے، جی چاہ رہا ہے کہ انہیں کہوں کہ مجھے اس پروگرام میں شرکت نہیں کرنی ہے۔ اپنا الاؤنس اور سارے انتظامات سہولتیں واپس لے لیں۔

یہ وحشت سی مجھ پر بعض فیصلہ کن اوقات میں طاری ہوتی رہی ہے۔ اب بھی میں سمجھ رہا ہوں کہ یہ نازک لمحات ہیں۔ میں یہاں ایک فرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک بڑے اخباری گروپ کی نمائندگی کر رہا ہوں یہ کوئی تفریحی دورہ نہیں ہے۔ اپنے اخبارات کے لاکھوں قارئین کو مجھے جواب دینا ہے۔ وہ انتظار میں ہیں کہ میں یہاں کیا دیکھتا ہوں۔ امریکہ میں اقتدار کے ایوانوں میں کیا سوچا جا رہا ہے۔ اخبارات کیا کہتے ہیں۔ عام شہری کا انداز فکر کیا ہے۔ مستقبل کے بارے میں کیا منصوبے ہیں۔ مجھے یہاں وہ سب کچھ دیکھنے سننے کو مل رہا ہے۔ جو وہاں ہم تک مختلف رپورٹوں کے ذریعے پہنچا ہے۔ پہلی بار براہ راست بہت کچھ سننے پڑھنے اور دیکھنے کو ملے گا۔ مجھے اس موقع کو نہیں گنوانا چاہیئے۔ میں اللہ تعالیٰ سے بھی دعا کرتا ہوں کہ وہ حوصلہ دے میرے علم میں اضافہ کرے۔ میرے دل کو کھولے۔ میرے کام کو آسان کرے۔ مجھے اپنی زبان

سے مسئلے حل کرنے کی توفیق دے۔ میرے قارئین میرے الفاظ سمجھ سکیں۔

ہم اب میریڈیان کے کتب خانے میں بیٹھے ہیں۔ پرانی پرانی پینٹنگز۔ قدیم الماریوں میں نئی کتابیں۔ جارج ٹاؤن یونیورسٹی میں امریکی حکومت کا موضوع پڑھانے والے پروفیسر ڈاکٹر کلائیڈ ولکوکس ہم سے ریاستہائے متحدہ امریکہ میں وفاقی نظام حکومت پر گفتگو کررہے ہیں۔

ڈاکٹر کلائیڈ ولکوکس نے اوہائیو اسٹیٹ یونیورسٹی سے 1984ء میں ڈاکٹریٹ کی۔ یونین کالج شینکٹڈے نیویارک میں تدریس فرائض انجام دیئے۔ وفاقی الیکشن کمیشن میں شعبۂ شماریات سے وابستہ رہے۔ ڈاکٹر موصوف امریکی انتخابی سیاست پر متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں انہوں نے انتخابی مہم کے مالیاتی پہلو۔ رائے عامہ، سماجی مسائل اور سیاست میں مذہبی گروپوں کے کردار جیسے اہم امور کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر ولکوکس کا انداز بیاں دوستانہ ہے۔ لہجہ دھیما ہے۔ وہ بتارہے ہیں کہ آج سے 230 سال پہلے بادشاہ کے خلاف انقلاب شروع ہوا۔ عام لوگوں نے سیاسی قوت اپنے ہاتھوں میں حاصل کرنے کی کوششیں شروع کردیں۔ ایک وفاقی نظام بتدریج قائم کیا گیا۔ جس میں اختیارات کی تقسیم افقی تھی۔ امریکیوں نے اپنا آئین بنایا۔ پھر اس میں فوری طور پر ترامیم بھی کیں۔ پہلی ترمیم آزادئ اظہار کے لیے تھی۔ اس وقت ریاستوں میں مختلف حکومتی نظام زیرِعمل ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے مطابق امریکہ میں قومی حکومت کمزور ہے۔ زیادہ اختیارات ریاستوں کے پاس ہیں۔ پولیس، تعلیم، صحت زیادہ تر اہم محکمے ریاستوں کی تحویل میں ہی ہیں۔ پہلے تجارت بھی قومی حکومت کے پاس ہی ہوتی تھی۔ اب کرنسی اور تجارت دونوں مرکزی (قومی) حکومت کے پاس ہیں ولکوکس کا کہنا ہے۔ کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ابتدا میں قومی سطح کے زیادہ لیڈر نہیں ہوتے تھے۔ علاقائی لیڈر زیادہ ابھرتے تھے۔ ریاستیں اپنے درمیان تجارت کرسکتی ہیں۔ لیکن ان کے قواعد مرکزی حکومت بناتی ہے۔ مثلاً صارفین کے حقوق کے تحفظ، محفوظ خوراک کے قوانین کی تشکیل مرکزی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

وہ ہمیں یہ بھی بتارہے ہیں کہ نسل اور مذہب کسی بھی شعبے میں تجارت میں یا تعلقات

میں رکاوٹ نہیں ہیں تعلیم کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ اگر کسی ریاست کا گورنر تعلیمی امور میں اور بالخصوص نصاب میں تبدیلی کرنا چاہے۔ حتیٰ کہ اسکول بند کرنا چاہے۔ تو مرکزی حکومت کچھ نہیں کرسکتی۔

وہ یہ دلچسپ پہلو بھی بتارہے ہیں کہ وفاق اگر کسی ریاست کو کسی شعبے کے لیے فنڈز فراہم کرتا ہے۔ لیکن ریاست انہیں کسی اور شعبے پر خرچ کردے۔ تو وفاق کچھ کہہ نہیں سکتا۔ جیسے ساچوسٹس ریاست کو جنسیات (Sex) کی تعلیم کے لیے پیسہ دیا گیا۔ لیکن ریاست نے ان پیسوں کو سائنس کی تعلیم پر خرچ کردیا کیونکہ وہاں سائنس کی تعلیم کو سیکس ایجوکیشن سے زیادہ ضروری سمجھا گیا تھا۔

اس حوالے سے وہ بتارہے ہیں کہ ریاستوں میں قواعد، اور قوانین الگ الگ ہیں۔ نیویارک میں ایک گورنر جتنی بار چاہے۔ منتخب ہوسکتا ہے۔ ٹیکساس میں ایسا نہیں ہے۔ مختلف ریاستوں میں ایک جیسے جرائم کی سزائیں الگ الگ ہیں۔ جیلوں میں سہولتیں مختلف ہیں۔ موت کی سزا کچھ ریاستوں میں ہے کچھ میں نہیں ہے۔

وہ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ مختلف ریاستوں میں جرائم کی تعریف میں بھی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ایک ریاست میں جسم فروشی کو جرم قرار نہیں دیا جاتا۔

ایک دلچسپ اصول وہ یہ بتارہے ہیں۔ کہ آپ کے لیے قانون وہ نہیں ہے۔ جہاں آپ رہتے ہیں۔ بلکہ قانون وہ ہے جہاں آپ ہیں۔ اس لیے آپ جہاں بھی جائیں۔ اور جہاں ہو۔ وہاں کے قوانین سے آگاہی ضرور حاصل کریں۔ ورنہ لاعلمی میں نقصان پہنچ سکتا ہے۔ شادی، طلاق، بچے کی پیدائش، ٹیکیشن وغیرہ کے لیے مختلف ریاستوں کے قواعد وضوابط الگ الگ ہیں۔ وفاق نیشنل انکم ٹیکس وصول کرتا ہے۔ ہر ریاست کے اپنے اپنے ٹیکس ہیں۔ بعض ریاستیں نئے ٹیکس نہیں لگاتیں۔ تو مختلف ٹکٹ کاٹ کر ان کے ذریعے آمدنی بڑھاتی ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ مختلف ریاستوں نے شروع سے الگ الگ اختیارات رکھے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ریاستیں مختلف طریقوں سے رہائش پذیر لوگوں کے ذریعے وجود میں آئی تھیں۔ مذہبی طور طریقے، سماجی انداز مختلف تھے۔ اس لیے وفاق نے سب کی آزادی اور

خورمختاری برقرار رکھی۔ کیونکہ مرکزیت سے ردعمل ہوسکتا تھا۔

امریکہ کی مختلف ریاستوں میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں۔ سب کی اپنی اپنی عبادت گاہیں ہیں سب کو ان کے مذاہب کے مطابق عبادت کرنے۔ اور اپنے شعائر پر عملدرآمد کی اس طرح آزادی ہے کہ کسی اقدام سے کسی دوسرے مذہب کے پیروکاروں کو شکایت نہ ہو۔

نائن الیون کے بعد دنیا بدل گئی ہے۔ امریکہ چونکہ گیارہ ستمبر کا براہ راست ہدف بنا ہے۔ اس لیے یہاں تبدیلیاں بہت زیادہ آئی ہیں۔ مرکز کی گرفت امریکیوں کی زندگی پر مضبوط ہوگئی ہے۔ پیٹریاٹ ایکٹ ایک مختلف قانون ہے۔ (اس پر تفصیل سے کسی آئندہ باب میں بات ہوگی۔) یہ قانون ہر ریاست پر لاگو ہے۔ بین الریاستی جرائم۔ بین الریاستی تنازعات میں بھی وفاق اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ سی آئی اے۔ اور ایف بی آئی وفاق کے مضبوط اور آہنی دست و بازو ہیں۔ سی آئی اے خفیہ معلومات کہیں سے بھی حاصل کرسکتی ہے۔ ایف بی آئی بڑے جرائم، منشیات کی اسمگلنگ، خرید وفروخت، اور منظم جرائم کے سلسلے میں کہیں بھی کسی وقت بھی کاروائی کرسکتی ہے۔ جرائم کی تفتیش، تحقیقات میں مختلف ریاستوں میں رابطے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ نائن الیون کے بعد ایک نیا وفاقی ادارہ زیادہ مضبوط بن کر ابھرا ہے۔ اور اسے زیادہ اختیارات حاصل ہوگئے ہیں۔ یہ ہے ہوم لینڈ سیکورٹی۔ (اس کا بھی تفصیل سے تذکرہ آئندہ کسی باب میں ہوگا۔) اس کے اختیارات کا دائرہ کچھ زیادہ ہی وسیع ہے۔ اس کے ذریعے ریاستوں کی پولیس، فائر بریگیڈ، ریڈ کراس، ہسپتال بھی ہنگامی صورت حال میں وفاق کے تحت ہوجاتے ہیں۔

سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کے کانگریس میں طریق کار کی بات چلی تو یہ دلچسپ حقیقت معلوم ہوئی کہ ایک رکن پارٹی کے موقف کے خلاف بات بھی کرسکتا ہے۔ ووٹ بھی دے سکتا ہے۔ یعنی پارٹی لائن سے تجاوز کرسکتا ہے۔ کانگریس اپنے قوانین منظور کرسکتی ہے۔

صدر کو جب اپنے بل منظور کروانے ہوتے ہیں۔ تو تاریخ کے مختلف حصوں میں ایسی روایات سامنے آئی ہیں کہ کانگریس کے اراکین کو مختلف قسم کی سہولتیں بہم پہنچا کر اپنے حق میں ووٹ لیے گئے یہ بھی بعض اوقات ہوا کہ صدر نے معمول میں ایک بل منظور کردیا۔ اور اسے علم

بھی نہیں تھا کہ بل میں کیا ہے۔ نائن الیون کے بعد کانگریس نے صدر کو غیر معمولی اختیارات بھی دے دیئے تھے۔

ایوان میں گفتگو کے قواعد وضوابط پر ایک دلچسپ بات یہ بتائی گئی کہ کوئی رکن جس مسئلے پر چاہے بات کرسکتا ہے۔ اس کا ایجنڈے میں ذکر ہو یا نہ ہو۔ ایک سینیٹر ایک بار ولیم شیکسپیئر کے فن ڈرامہ نگاری پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے اور کرتے رہے۔ ایک کو کیا سوجھی کہ انہوں نے کھانے کی ترکیبیں بیان کرنا شروع کردیں۔

پروفیسر اس بات سے اتفاق کررہے ہیں کہ آئین، جمہوری آزادی اور انصاف کے حوالے سے اب حالات بہتر نہیں ہیں۔ 230 سال کی روایات اپنی جگہ ہیں۔ لیکن نئے ماحول اور نئے قوانین کی اپنی اہمیت ہے۔ عالمی تجارتی ادارے (W.T.O) کے حوالے سے زرعی سبسڈی (زرتلافی) اس وقت زیر بحث ہے۔ اسٹیل کی تجارت کے مسائل ہیں۔ قومی مفادات عالمی قوانین سے متصادم ہیں۔

ان سے مختلف سوالات کیے جارہے ہیں۔ ان کے جواب میں ان کا تاثر یہی ہے کہ 2004ء کے انتخابات میں صدر بش جیت جائیں گے۔ اظہار آزادی پر پابندیاں اور دوسرے مسائل اپنی جگہ لیکن حب الوطنی کا شور اتنا زیادہ ہے کہ بش کو اکثریت کی حمایت حاصل رہے گی۔ اپوزیشن کو نیا پروگرام لے کر آنا مشکل ہوگا۔ افغانستان پر فوج کشی کے بعد تو صدر بش کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ عراق پر حملے کے بعد ملا جلا ردعمل رہا ہے۔

ابھی تک ڈیموکریٹس کو کوئی طاقت ور اور مقبول امیدوار بھی نہیں ملا ہے (خیال رہے کہ یہ گفتگو اگست 2003ء میں ہورہی ہے)۔ اس بات سے بھی وہ اتفاق کررہے ہیں کہ عراق میں 40 بلین ڈالر ماہانہ اخراجات امریکی معیشت پر بہت بوجھ ہیں۔ یہ انتخابی مہم میں اہم موضوع بنیں گے اس وقت تک معلوم نہیں کہ اور کیا کیا واقعات رونما ہوتے ہیں۔ لیکن امریکہ کی اب تک جو تاریخ رہی ہے۔ اس کے تناظر میں تو یہی لگتا ہے کہ موجودہ صدر ہی انتخابات میں کامیابی حاصل کرلیں گے۔

نئے قدامت پسند کون ہیں

ہم صبح سے یہیں میریڈیان میں ہیں۔ پہلا دن ہی کتنا طویل ہوگیا ہے۔ اگر یہ سارے دن اسی طرح مصروف گزریں گے۔تو سننے، لکھنے کو بہت کچھ جمع ہوجائے گا۔

اب موضوع ہے: نائن الیون کے بعد سے امریکی خارجہ پالیسی، ایک تنقیدی جائزہ۔

دی رینڈ کارپوریشن، امریکہ کا ایک مشہور اور ممتاز تھنک ٹینک ہے۔ جس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ ایک آزاد، غیر منفعت بخش تنظیم ہے جو سائنسی تحقیق اور تجزیے کرتی ہے۔ یہ عوامی دلچسپی کے مطالعے کا اہتمام کرتی ہے۔ جس میں اسے امریکی حکومت .... مقامی اور ریاستی حکومتوں۔ پرائیوٹ فاؤنڈیشنز...... اور بعض اوقات اپنے فنڈز سے معاونت ملتی ہے۔ تحقیقی کام کا دائرہ فزیکل ....سوشل اور بائیولاجیکل سائنسز جیسے بڑے علوم کا احاطہ کرتا ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ داخلی اور خارجی پالیسی سازی اور منصوبہ بندی میں ان کا اطلاق کیسے کیا جائے۔ امریکی سول سوسائٹی کی تشکیل اور استحکام میں اس کارپوریشن کا اہم کردار ہے۔

رینڈ کارپوریشن سے آئے ہیں۔ جہاندیدہ، سرد و گرم زمانہ چشیدہ، سینئر فیلو ایمبسڈر رابرٹ ہنٹر، جو 1993ء سے 1998ء تک نیٹو میں امریکی سفیر جیسے اہم عہدے پر فائز رہے ہیں۔ سیکرٹری کوہن کے ڈیفنس پالیسی بورڈ میں بھی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ 1998ء سے 2001ء تک وہ اٹلانٹک ٹریٹی ایسوسی ایشن کے وائس چیئرمین رہے۔ وہ صدر کارٹر کی نیشنل

سیکورٹی کونسل کے اسٹاف میں یورپ اور مشرق وسطیٰ کے ڈائریکٹر بھی رہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی میں بیلفر سنٹر برائے سائنس و بین الاقوامی امور سے ایسوسی ایٹ۔ کونسل آن فارن ریلیشنز کے رکن اور انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ برائے اسٹریٹجک اسٹڈیز سے اسکالر کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ انہوں نے خارجہ امور اور قومی سیکورٹی کے امور پر بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکچر دیئے ہیں۔ اور ریڈیو سے تقریریں کی ہیں۔ وبسلیان یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں۔لندن اسکول آف اکنامکس سے ڈاکٹریٹ حاصل کی ہے۔

دی ہیری ٹیج فاؤنڈیشن عوامی پالیسی پر تحقیق کا ادارہ ہے۔ انفرادی آزادی۔ محدود حکومت، آزاد مارکیٹ کے نظام، اور مضبوط قومی دفاع کے اہم امور کے فروغ اور پرچار کے لیے یہ ادارہ تحقیق اور تجزیہ بھی کرتا ہے۔ لیکچرز، مباحثوں اور پالیسی فورم کی سرپرستی بھی کرتا ہے۔

ہیری ٹیج سے آئے ہیں۔ جواں سال، شعلہ بیان ڈاکٹر جان سی ہامین، ان کے پسندیدہ موضوع ہیں۔ مشرق و مغرب کے تعلقات، عالمی علاقائی سیاست اور دہشت گردی کے مقابلے میں بین الاقوامی تعاون .... ہیری ٹیج سے وابستگی سے پہلے وہ مرکز برائے اسٹریٹجک و بین الاقوامی اسٹڈیز میں یورپین اسٹڈیز کے فیلو تھے۔ وہ اسکاٹ لینڈ کی یونیورسٹی آف سینٹ اینڈریوز میں عالمی سیاسیات اور امریکی خارجہ پالیسی پڑھا چکے ہیں۔ ان کی تصنیفات ہیں۔

1- A paradigm for the new world order.

نئے عالمی نظام کے لیے ایک مثالی دائرہ

2- The world turned right side up.

دنیا دائیں طرف پلٹ گئی۔

ڈاکٹر جان سی ہامین گفتگو کرتے ہوئے جذباتی ہورہے ہیں۔ ان کا چہرہ تمتما رہا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ جس زمانے میں تاریخ کے خاتمے .... تہذیبوں کے تصادم کی باتیں ہورہی تھیں۔ وہاں نئی قدامت پسندی متعارف کردی گئی ہے۔ ہمیں ایک سلطنت (ایمپائر) چلانی پڑرہی ہے۔ ہمارے انداز استعماری ہوتے جارہے ہیں۔ جو حقیقت کی ترجمانی نہیں کرتے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ اس وقت مقابلے میں کوئی طاقت نہیں ہے۔ اس لیے اپنے اختیارات اور قوت کے استعمال میں ہم توازن نہیں رکھ پائے نئی نئی اصطلاحات وضع کی جارہی ہیں۔ بڑے پیمانے پر تباہی کے ہتھیار، بدمعاش ریاستیں، دہشت گردی کے بارے میں بہت سے سوالات اٹھے۔ عراق کا القاعدہ سے کیا کوئی تعلق ہے۔ عراق کا نائن الیون سے کوئی تعلق ہے نہیں۔ یورینیم کی فراہمی ہوئی یا نہیں۔ بڑے پیمانے پر تباہی کے ہتھیار یہاں تھے یا نہیں۔ یہ بھی بحث ہوئی کہ اگر اس کاروائی سے پہلے لوگوں سے خفیہ رائے مانگی جاتی تو جنگ کے خلاف رائے ملتی۔ بعض حلقوں نے یہ بھی کہا کہ صدر بش، آپ جنگ کے لیے منتخب نہیں کیے گئے آپ کو تو معیشت بہتر کرنے کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ جنگ کی کاروائی سے تو معیشت خراب ہورہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عراق اور شام سے اسرائیل کی سیکورٹی خطرے میں رہتی ہے۔ اور یہ اس سے بڑی حقیقت ہے کہ امریکہ اسرائیل کے ساتھ ہے۔ اس کی سیکورٹی کو امریکہ کے عوام اپنی سیکورٹی کہتے ہیں بعض امریکی حلقوں ہیں اب بھی یہ امر زیر بحث ہے کہ صدر بش کو خارجہ پالیسی کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ان کے والد تو پہلے نائب صدر بھی رہے۔ سی آئی اے سے بھی وابستہ رہے۔ اس لیے ان کا ایک تجربہ تھا۔

ایمسڈر نے خلیج کی پہلی جنگ کے دوران وائٹ ہاؤس میں کام کیا تھا۔ اس لیے انہیں یہ بھی تجربہ ہے کہ اعلیٰ ترین سطح پر فیصلے کیسے ہوتے ہیں۔

ایمسڈر بتا رہے ہیں کہ ہر جنگ کے دوران یہ سوال ضرور اٹھتا رہا ہے کہ جنگ کیوں ہورہی ہے۔ نائن الیون کے واقعات نے امریکی قوم کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ یہ نفسیاتی طور پر کمزور ہورہی تھی۔ اس لیے اسامہ کے خلاف ایکشن ضروری تھا۔

اگر دیکھا جائے تو عراق میں فوجی کاروائی امریکی فوج کی ایک بڑی کاروائی ہے۔ یہاں خطرات اور خدشات تھے کہ صدام حسین کے پاس ایٹمی، کیمیکل اور بائیولاجیکل اسلحہ ہوسکتا ہے۔ امریکی قوم کو خوف سے نکالنے کے لیے اتنے بڑے پیمانے پر فوجی کاروائی ضروری تھی۔ چاہے لوگ اب کہیں کہ امریکہ ایک ایمپائر بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور پہلی خلیجی جنگ میں صدام کو کیوں ختم نہیں کیا۔ عراق و ایران جنگ میں صدام کا ساتھ کیوں دیا۔ اب فیصلہ کن بات یہ ہے

کہ امریکہ اب دنیا بھر سے آمریتوں کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ امریکہ کی خواہش ہے کہ ہر ملک میں انسانوں کو جمہوری حقوق حاصل ہوں۔ ہمارے خیال میں دنیا تین ادوار سے گزری ہے۔

1۔ کمیونزم
2۔ فسطائیت
3۔ جمہوریت

کمیونزم تو اپنی طاقت اور اثر بالکل کھو چکا ہے۔ فسطائیت بھی ختم ہورہی ہے اگر چہ کہیں کہیں موجود ہے۔ اب صرف جمہوریت چل سکے گی۔ یورپ میں جمہوریت ٹھیک چل رہی ہے۔ مشرقی یورپ میں بھی اس کا دور شروع ہو چکا ہے۔ اسرائیل میں جمہوریت ہے۔ اکثر عرب ممالک میں نہیں ہے۔ اس لیے عراق میں کاروائی کے بعد سب سے پہلی ترجیح جمہوریت کا قیام ہونا چاہیئے۔ جیسے کہ لوگ کہہ رہے ہیں۔ صدام کے زمانے میں دہشت گرد اپنی کاروائیاں نہیں کرتے تھے۔ اب بہت زیادہ کر رہے ہیں۔ خیال تھا کہ کاروائی کے بعد ہلاکتیں ختم ہو جائیں گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ کم از کم دو امریکی فوجیوں کا روزانہ ہلاک ہونا ایک معمول بن گیا ہے۔ ہم معیشت میں نیچے جارہے ہیں۔ خسارہ بڑھ رہا ہے۔ تعلیم متاثر ہورہی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق عراق میں 4 بلین ڈالر ماہانہ خرچ ہورہا ہے۔ یہ قوم اتنا برداشت نہیں کرسکتی۔ اس لیے اب عراق میں صرف امریکی فوج نہیں دوسرے ملکوں کی فوجیں بھی لائی جانی چاہئیں۔ بھارت، پاکستان سے بھی کہا جارہا ہے۔ یورپی یونین سے بات ہورہی ہے۔ نیٹو کے پرچم تلے یا یورپی یونین کے پرچم تلے۔ کسی بھی طرح ہو۔ فوج آنی چاہیئے۔ دنیا میں ہونے والے کل دفاعی اخراجات کا 47 فیصد صرف امریکہ برداشت کر رہا ہے۔ یہ بہت زیادہ ہے۔

وہ کہہ رہے ہیں اور بجا طور پر کہ دہشت گردی کا خاتمہ صرف فوجی کاروائی کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے تعلیم کا پھیلاؤ بھی ضروری ہے۔ انٹلی جینس نیٹ ورک بھی وسیع تر ہونا چاہیئے دہشت گردوں کو ہر جگہ تلاش کرنا چاہیئے۔

ایمبسڈر موصوف نے چین کے بارے میں بھی خطرات ظاہر کیے۔ اور کہا کہ ہماری تحقیق کے مطابق ہماری آئندہ نسلوں کو سب سے بڑا علاقائی خطرہ چین سے پیش آنے والا ہے۔ کیونکہ

وہاں معیشت ترقی کررہی ہے۔

جمہوریت کے حوالے سے بھارت ہمارے لیے اہم ہے۔ ہمیں پاکستان کی بقا کے بارے میں خطرات ہیں۔ پاکستان کے پاس ایٹمی ہتھیار ہیں۔ غیر ذمہ دار انتظامیہ کے پاس ایسے ہتھیار ہوں تو دنیا کے لیے خطرہ ہوجاتا ہے۔

اس پر میں ان سے معذرت کے ساتھ عرض کررہا ہوں کہ آپ بہت تجربہ کار سفارت کار ہیں۔ لیکن اب یہ زبان آپ سفارت سے عاری بول رہے ہیں۔ ایک تو بھارت کے بڑی جمہوریت ہونے سے آپ غیر منطقی طور پر متاثر ہیں۔ جمہوریت صرف پارلیمنٹ کے تسلسل کا نام نہیں ہے۔ جمہوریت میں عوام کو یکساں، اور مکمل حقوق ملنے چاہئیں۔ روزگار کے مواقع میسر ہونے چاہئیں۔ ہر فرد کو عزت اور وقار ملنا چاہیئے۔ جو بھارت میں نہیں ہے۔ ہر قسم کی ناانصافیاں ہوتی ہیں۔ سرحد پار دہشت گردی کی اصطلاح سے بھارت نے مغرب کو متاثر کررکھا ہے۔ یہ قطعی غلط اصطلاح ہے ایک تو یہ تحریک آزادی ہے جو بہت پہلے سے جاری ہے۔ اور یہ صرف غاصب بھارتی فوجیوں کے خلاف ہے۔ شہریوں کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ انڈین پارلیمنٹ کے باہر حملہ ان کا اپنا ڈرامہ ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ورنہ ایک آدھ پارلمنٹیرین ہلاک ہوتا۔ انڈین سیکورٹی کے لوگ مارے جاتے۔ یہ ڈرامہ صرف اس لیے رچایا گیا کہ بھارت پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا مہم تیز کرسکے۔ پروازیں بند کرسکے۔ مغرب کے سامنے واویلا کرسکے۔ جہاں تک غیر ذمہ دار ملکوں کے ہاتھوں میں ایٹمی طاقت کا مسئلہ ہے۔ اور کسی بھی خطرے کا امکان ہے۔ تو امریکہ نے جب ہیروشیما ناگاساکی پر ایٹم بم گرایا تو کیا یہ ذمہ دار ملک یا ذمہ دار قوم کا رویہ تھا۔ مسئلہ ایٹمی طاقت کے استعمال کے فیصلے کا ہے۔ ذمہ دار یا غیر ذمہ دار قوم کا نہیں ہے۔ پاکستان نے اب تک اس طاقت کا غلط استعمال نہیں کیا ہے۔

تجربہ کار سفارت کار ذرا سے متاثر ہوئے۔ لیکن انہوں نے اس بات سے اتفاق یا انکار ضروری نہیں سمجھا۔ ان سے پوچھا گیا کہ امریکہ آج کل جس طرح ہر ملک میں طاقت کے استعمال کو ناگزیر سمجھ رہا ہے۔ کیا امریکی اکثریت اس کے حق میں ہے۔ انہوں نے اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

پھر افغانستان سے آنے والی ایڈیٹر شکریہ بارک زئی نے جب یہ کہا، کہ امریکہ افغانستان میں فوجیں لے کر آیا اور کہا کہ وہ افغانستان کے شہریوں کو دہشت گردی سے، القاعدہ سے نجات دلائے گا، ہم نے خیر مقدم کیا۔ لیکن اب حالات پہلے سے خراب ہیں۔ طالبان کے زمانے میں ہماری جان اور مال محفوظ تھے۔ لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ جنگجو سردار پھر غالب آرہے ہیں۔ اس کا کیا جواب کوئی تسلی بخش نہیں ملا ہے۔ وہ اس کے جواب میں امریکی پالیسی کی تفصیلات بتارہے ہیں کہ ہم اتنے ڈالر دے رہے ہیں۔ اتنے اسکول کھول رہے ہیں خواتین کو روزگار فراہم کریں گے۔ بچیوں کی تعلیم کا اہتمام کریں گے اس سے افغانستان کی ایڈیٹر کی تشفی نہیں ہوتی ہے۔ جتنی دیر ایمبیسڈ ہنٹر باتیں کرتے رہے ہیں۔ جواں سال ڈاکٹر جان زیرلب مسکراتے رہے ہیں۔ آخر میں ایمبیسڈر ہنٹر پھر کہہ رہے ہیں کہ میں نیوکون۔ (نئے قدامت پسند) کے نظریے سے اتفاق نہیں کرتا ہوں۔ ایسی اصطلاحات بلاوجہ استعمال کی جارہی ہیں۔

لیکن ہم جنوبی ایشیا کے ایڈیٹروں کو نئی قدامت پسندی سے دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ اس پر مزید معلومات جمع کرنی چاہئیں۔ اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ نئی قدامت پسندی کے زمرے میں کون کون آسکتا ہے۔

امریکی رائے عامہ..... ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے۔

رات کو ہی بتادیا گیا تھا کہ ہمیں صبح ساڑھے آٹھ بجے لابی میں جمع ہوجانا ہے۔ کل کا دن جلدی شروع ہونا ہے۔ اور دیر سے ختم ہوگا۔ بہت کچھ جاننا ہے۔ بہت کچھ سننا ہے۔

پھر ہم وہیں پہنچ گئے ہیں۔ میریڈیان سینٹر۔ اب پھر لائبریری کی آغوش میں ہیں۔

موضوع ہے: خارجہ پالیسی کے امور پر امریکی رائے عامہ۔

بات اہم ہے کہ دوسرے ملکوں کی قسمتوں کے بارے میں امریکی حکومت جو فیصلے کرتی ہے۔ اس پر امریکہ کے عوام کی رائے کیسے حاصل کی جاتی ہے۔ امریکی طرز حکومت تو صدارتی ہے۔ چار سال کے لیے صدر منتخب کرکے امریکی عوام ایک طرف ہوکر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ صدر پر مکمل اعتماد رکھتے ہیں۔ وہ جو چاہے کرے اسے پوری قوم کی پالیسی خیال کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں تو انتخابات کے نتائج پر پہلے دن سے ہارنے والے عدم اعتماد ظاہر کردیتے ہیں۔ اپوزیشن یہ نعرے بھی بلند کرتی ہے کہ حکومت جو فیصلے کرے گی۔ معاہدے کرے گی ہم اس کے پابند نہیں ہوں گے۔ امریکہ میں ایسا نہیں ہے۔ جو صدر منتخب ہوگیا۔ وہ ہر امریکی کا صدر ہے وہ جسے چاہے ملک میں ڈھونڈ کر اپنا وزیر بنالے...... وہاں وزیر کو سیکرٹری کہا جاتا ہے جیسے کولن پاول اب سیکرٹری اسٹیٹ ہیں۔ کبھی ہنری کسینجر ہوتے تھے۔ ہم اپنی آسانی کے لیے سیکریٹری اسٹیٹ کا ترجمہ وزیر خارجہ کردیتے ہیں۔ ملک میں دو ایوان موجود ہیں۔ کانگریس، دوسرے سینٹ، ان

کے انتخاب کے اپنے طریقے ہیں۔ دونوں بہت مضبوط ادارے ہیں۔ ان کی اپنی اپنی کمیٹیاں ہیں۔ جو مختلف محکموں کے امور پر کام کرتی رہتی ہیں۔ مختلف سیکرٹری اور عہدیدار ان کمیٹیوں کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ ان کو جواب دینا پڑتا ہے۔ خوب سوالات ہوتے ہیں۔

اس وقت ہمارا موضوع ہے۔ امریکی رائے عامہ، الیکشن تو ایک بار ہوجاتے ہیں۔ پھر رائے عامہ کیسے جانی جاتی ہے۔

کارلن بومین امریکن انٹر پرائز انسٹی ٹیوٹ برائے پبلک پالیسی ریسرچ سے آئی ہیں۔ AEI۔ امریکن انٹرپرائز انسٹی ٹیوٹ برائے پبلک پالیسی ریسرچ نامی ادارہ کیا کرتا ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ یہ ادارہ عوام کی معاونت سے چلتا ہے۔ غیر جانبدارانہ تحقیقی، تعلیمی تنظیم سمجھ لیجیے جس کا مقصد پالیسی بنانے والوں، اسکالرز، تاجروں، پریس اور پبلک سے تعاون کرنا ہے۔ یہ اس صورت میں کہ یہ انہیں قومی اور بین الاقوامی امور پر معروضی تجزیے فراہم کرتا ہے۔ یہ مطالعاتی تجزیے اقتصادیات، امور خارجہ، حکومت، صحت، قانون اور قانون سازی کے شعبوں کے حوالے سے تفویض کیے جاتے ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ نظریات میں مقابلے کا محرک بنتی ہے۔ لیکن پالیسی کے امور پر اپنا کوئی موقف اختیار نہیں کرتی ہے۔

کارلن بومین اس ادارے کی ریذیڈنٹ فیلو ہیں۔ امریکی سیاسیات اور عوامی رائے کی ماہر ہیں۔ انہوں نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن میں

* What's Wrong
* A survey of American satisfaction and complaint, 1998.
* Attitudes towards income inequality 1998
* Public opinion about abortion
* twenty five years after Roa-V Wade (1997)

امریکن انٹر پرائز انسٹی ٹیوٹ میں وہ رائے عامہ کے مطالعے، سے متعلقہ دستاویزات۔ سیاسی روایات پر مضامین کے لیے تحقیق کررہی ہیں۔ اور بالآخر انہیں اس انسٹی ٹیوٹ پر ایک جامع کتاب لکھنی ہے۔

کتاب لکھنا اس معاشرے میں انتہائی قابل قدر ذمہ داری سمجھی جاتی ہے۔ حکومت، حکومت کے بعض ادارے، پرائیویٹ ادارے، محققین اور مصنفین کو باقاعدہ چند ماہ۔ چند سال

کے لیے مصروف کر لیتے ہیں۔ اس عرصے میں ان کی تنخواہ قیام و طعام، سب اسی ادارے کے ذمے ہوتا ہے۔ اس طرح انتہائی یکسوئی سے اور دلجمعی سے کتاب تیار ہوتی ہے۔

کارلن بومین، تھنک ٹینکس کے بارے میں ہمیں باخبر کر رہی ہیں۔ اپنے اپنے وطن میں امریکی تھنک ٹینکس کے بارے میں ہم بہت سنتے آئے ہیں۔ آج اس کی باقاعدہ تاریخ کے اوراق ہمارے سامنے کھل رہے ہیں۔ امریکہ میں سب سے پرانا تھنک ٹینک 1907 میں ایک خاتون نے نیویارک میں قائم کیا تھا۔ اس کا نام تھا۔ اربن انسٹی ٹیوٹ۔ واشنگٹن میں تھنک ٹینک اس کے دس سال بعد 1917 ء میں شروع ہوتے ہیں۔ پھر دس سال بعد 1927 ء میں کانگریس نے سرکاری طور پر بجٹ میں ان کے لیے گنجائش رکھنے کی منظوری دی۔ فنڈز کے اعتبار سے اس وقت بروکلنز سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اس کے بعد امریکن انٹر پرائز انسٹی ٹیوٹ ہے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ کاروباری حلقوں کے فنڈ سے 1938ء میں قائم کی گئی تھی۔

خاتون بتا رہی ہیں کہ پورے امریکہ میں اس وقت 1200 تھنک ٹینک مختلف شعبوں کے لیے سوچ رہے ہیں تحقیق کر رہے ہیں۔ رپورٹیں تیار کر رہے ہیں۔ جبکہ دنیا بھر میں صرف 255 تھنک ٹینک ہیں۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ تھنک ٹینک کو طلبہ کے بغیر یونیورسٹیاں کہا جاتا ہے۔ رینڈ کارپوریشن نے 1943ء سے کام شروع کیا۔ اس وقت اس کا بجٹ 170 ملین ڈالر ہے۔ جو سب سے زیادہ ہے۔

تھنک ٹینک کا تیسرا ماڈل 1970ء میں قائم ہوا۔ ان میں سے ایک ہیریٹیج فاؤنڈیشن ہے۔ جو قطعی طور پر غیر جذباتی ریسرچ کی کوشش کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم غیر جانبدار نہیں ہیں۔ جس طرح طے ہو۔ اس کے مطابق تجزیہ کر کے کیپٹل ہلز والوں کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے تھنک ٹینکس والوں نے بھی اس راہ پر چلنے کی کوشش کی ہے۔

امریکن انٹر پرائز انسٹی ٹیوٹ سے 150 افراد وابستہ ہیں۔ ان میں سے کچھ فیلو ہیں اس کا بجٹ ساٹھ سے ستر ملین ڈالر سالانہ کے قریب ہے۔ تین بڑے ڈویژن ہیں۔ سماجی، سیاسی، آئیڈیالوجی، ڈک چینی بھی اس کے صدر رہ چکے ہیں۔ امریکن انٹر پرائز میں زیادہ بیوروکریسی نہیں ہے۔ ایک صفحے کا میمو بھیج کر لوگوں کو متحرک کر دیتے ہیں۔ اس کے فنڈز کا ذریعہ افراد بھی ہیں اور کارپوریشن بھی۔

ہم کوئی معاہدے نہیں کرتے۔ صدر فنڈز میں اضافے کے لیے کوششیں کرتے ہیں۔

رینڈ کارپوریشنیں حکومت سے پیسہ لیتی ہے۔ جو ٹیکنالوجی کے بڑھاؤ پر خرچ ہوتا۔

امریکن انٹر پرائز کی بیرون ملک کوئی شاخ نہیں ہے۔

ہیریٹیج کی ایک شاخ ہانگ کانگ میں ہے۔

دو تھنک ٹینک غربت کے خاتمے پر بھی کام کر رہے ہیں۔

بڑی کارپوریشین بھی تھنک ٹینکوں کو بعض مسائل کے تجزیے کے لیے ذمہ داری سونپتی ہیں۔ ہیریٹیج عام طور پر ڈیموکریٹس کے لیے کام کرتے رہے ہیں۔

اب موضوع زیر بحث یہ تھا کہ رائے عامہ کیسے حاصل اور یکجا کی جاتی ہے۔

خاتون بتا رہی ہیں کہ امریکہ میں رائے عامہ Public opinion polls کے لیے گیلپ سروے ہوتے ہیں۔ رائے عامہ سرکاری پالیسیوں کے ذریعے تشکیل نہیں پاتی۔ بعض اوقات تو سوالات کا یہ عمل بہت واضح اور جرات مندانہ بھی ہوتا ہے۔

وہ بتا رہی ہیں کہ رائے عامہ حاصل کرنے والے تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ پہلا ذریعہ تو ٹیلی فون ہے۔ ٹیلی فون ایکسچینج کے ذریعے نمبر جمع کر کے دس بجے صبح سے 9 بجے رات تک فون کیے جاتے ہیں۔ انٹرویو کرنے والا اپنی شناخت کراتا ہے۔ لیکن انٹرویو دینے والے گمنام رکھے جاتے ہیں انہیں پہلے سے خبردار کر دیا جاتا ہے۔ سی این این بھی ایسے سروے بہت کرتا ہے۔

ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس میں یہ خیال کیسے رکھا جاتا ہے کہ اس کے لیے جو نمونے جمع کئے گئے ہیں۔ وہ درست ہیں اور سب شعبوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ پھر یہ کیسے ظاہر ہوتا ہے کہ انٹرویو دینے والے اس موضوع پر کوئی معلومات بھی رکھتے ہیں۔ کیونکہ عام طور پر تو یہ کہا جاتا ہے کہ امریکنوں کے پاس اپنے اخبارات پڑھنے، ٹیلی ویژن دیکھنے کا وقت ہی نہیں ہوتا۔ اگر وقت ہوتا ہے تو وہ اپنی پسند کے پروگرام دیکھتے ہیں۔ سنجیدہ سیاسی اقتصادی موضوعات کے پروگرام بہت کم دیکھتے ہیں۔

یہ سروے 1930 ء سے ہو رہے ہیں۔ شروع شروع میں امریکی شہری زیادہ دلچسپی نہیں

لیتے تھے۔ امریکی ص ر روز ویلٹ ان پولز کے نتائج ماننے میں تامل کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے طور پر سروے کروایا تو یہی نتائج نکلے، تب وہ اس کے قائل ہوئے۔ عالمی سطح پر بھی ایسے پولز ہوتے رہتے ہیں۔ صرف مغربی یورپ کی حد تک بھی کیے گئے۔ امریکنوں کی اکثریت کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ خود جائزہ لیں۔ وہ اپنا کام کرنا چاہتے ہیں۔ بچے پالنا چاہتے ہیں۔ دوسری مصروفیات کے لیے وقت نکالتے ہیں اس لیے وہ ان پولز پر انحصار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ پولز قابل اعتماد ہیں۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ امریکنوں کی عادت ہے کہ وہ بات ضرور کرتے ہیں چاہے وہ اس سلسلے میں کچھ جانتے بھی نہ ہوں۔

1947 میں یہ جاننے کی کوشش کی گئی تھی کیا امریکنوں کا دنیا میں فعال کردار ادا کرنا مناسب ہوگا۔

گزشتہ 50 سال میں یہی سروے تقریباً 30 بار کیا گیا۔ نتائج ایک جیسے ہی آتے رہے ہیں۔ مثلاً 68 فیصد نے ہاں میں جواب دیا۔ کم وبیش اس کے نزدیک ہی رائے ملتی رہی ہے۔ البتہ یہ محل نظر رہا ہے کہ فعال کردار کی حدود کیا ہوں گی۔

ایک جائزہ ہمیشہ یہ بھی لیا جاتا رہا ہے کہ صدر پر بھروسے کی سطح کیا ہے۔

صدر بش کو بھروسے کی بنیادی سطح بھی حاصل نہیں ہے۔

صدر کارٹر خارجہ پالیسی میں مہارت نہیں رکھتے تھے۔ ریگن جارحانہ رویہ رکھتے تھے۔ ان کے زمانے میں تیسری عالمگیر جنگ کسی بھی وقت شروع ہونے کا خطرہ تھا۔

کلنٹن بھی اس کے ماہر نہیں تھے۔

بش سینئر خارجہ پالیسی کی سمتیں متعین کرنے میں کامیاب رہے۔

11 ستمبر کے واقعات امریکہ کی رائے عامہ پر بہت زیادہ اثر انداز ہوئے ہیں۔ ذاتی تاثر بھی۔ اور پیشہ ورانہ تاثر بھی بھرپور رہا ہے۔ اس کے بعد ملکوں پر جو حملے ہوئے ان کی وسعت اور سنگینی نے بھی رائے عامہ کو بہت متاثر کیا ہے۔ دہشت گردی کے خلاف کارروائیوں پر جو سروے کیے گئے۔ ان میں بنیادی فیصلے کو تو سب نے درست مانا۔ لیکن عراق کے خلاف کاروائی اور لائبیریا کے خلاف کاروائی کے سلسلے میں شرح فی صد مختلف رہی۔

ان جائزوں کے نتیجے میں بش کم مقبول ہوئے ہیں۔ وزیر خارجہ کولن پاول زیادہ ماہر مانے گئے۔ ان کا احترام اور حوصلہ زیادہ حمایت حاصل کرتا رہا ہے۔

1991ء میں عراق پر حملے سے پہلے جو جائزے لیے گئے۔ اور اب عراق پر تازہ حملے سے پہلے جو سروے ہوئے۔ رائے عامہ میں کوئی زیادہ فرق نہیں رہا ہے۔

امریکیوں کی دو تہائی اکثریت دنیا میں امریکہ کے فعال کردار کی حامی ہے۔ یہ بات ان کی نفسیات میں پختہ ہوگئی ہے۔

امریکی ذہن اسی طرح تشکیل پاتا ہے۔ زیادہ تر امریکی صدر کی تقریروں پر منحصر ہوتا ہے۔ کہ وہ عوام تک حکومت کا نقطۂ نظر کس طرح پہنچاتا ہے۔ ہر صدر کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے موقف کو بھرپور انداز میں پیش کرے۔ عوام کو قائل کرے۔

اس سلسلے میں جو سروے کیے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مہارت اور ذہانت کی آزمائش ان کے لیے سوالات مرتب کرنے پر ہوتی ہے۔ کہ صدر کے انداز تخاطب، کارکردگی کے لیے کیسے سوالات تیار کیے جائیں۔ سیاستدان بہت سوالات کرتے ہیں۔ صدر جارج بش پیش بینی سے عاری ہیں۔ ویسے بھی امریکی آئندہ کے بارے میں بہت کم بتا پاتے ہیں۔

ان جائزوں اور پولز کے لیے معلومات کے حصول کے بنیادی طور پر تین طریق کار ہیں۔

1۔ فرداً فرداً۔ سوال

2۔ ٹیلی فون پر۔

3۔ انٹرنیٹ

سوالات میں الفاظ کے صحیح استعمال پر منحصر ہوتا ہے کہ جوابات صحیح ملتے ہیں یا نہیں اس کے لیے باقاعدہ ماہرین تیار کیے جاتے ہیں۔ سوالات مرتب کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔

ہم پوچھ رہے تھے کہ امریکی رائے عامہ اور حقائق میں اعتبار کے حوالے سے کتنا فاصلہ رہ جاتا ہے۔

بتایا جارہا ہے کہ اس سلسلے میں بہت تحقیق کی گئی ہے کہ امریکی عوام میں سے کتنے فی صد ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں۔ کون سے پروگرام دیکھتے ہیں۔ ریڈیو کتنے امریکی سنتے ہیں۔ اخبارات کا

مطالعہ کتنے امریکی کرتے ہیں۔ ان میں سے کون سے صفحات کتنے امریکی پڑھتے ہیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ امریکنوں نے بڑی خبر کی صرف سرخی سنی ہوتی ہے۔ انہیں اس کی تفصیلات کا علم نہیں ہوتا۔

یہ دلچسپ امر ہے کہ جے سمپسن مقدمہ کی سماعت امریکنوں کا پسندیدہ پروگرام رہا اسے جتنے امریکیوں نے دیکھا۔ شاید ہی اور کوئی خبر دیکھی گئی ہو۔

سیاسی پروگرام امریکی اس لیے نہیں دیکھتے کہ وہ زیادہ تر سیاستدانوں کو بدعنوان سمجھتے ہیں۔

ایسے تناظر میں امریکی رائے عامہ جائزوں کی کیا وقعت رہ جاتی ہے۔ اس کا باقاعدہ تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔

دنیا بھر میں امریکیوں نے ایسا تاثر قائم کر رکھا ہے کہ امریکی حکومت کوئی بھی مسئلہ حل کرنے سے پہلے ان جائزوں کے ذریعے رائے عامہ حاصل کرتی ہے۔ امریکی معاشرہ بہت ذہین، مستند اور آگاہ ہے۔ مگر یہ سوال اپنی جگہ رہ جاتا ہے کہ جب امریکی اخبارات، ٹیلی ویژن، ریڈیو کے لیے اتنا وقت ہی نہیں نکال سکتے۔ خبریں نہیں پڑھتے، نہیں سنتے، تو وہ ان سے متعلقہ سوالات کے جوابات جائزوں میں صحیح کیسے دے پاتے ہوں گے۔

اکثر امریکی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ تیسری دنیا کے لوگ امریکی سیاست کے بارے میں امریکیوں سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔

بہت سے امریکی اخبارنویس، تاجر پاکستان آتے ہیں، انہیں جن خاص و عام پاکستانیوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ وہ واضح طور پر محسوس کرتے ہیں کہ بڑے بزنس مین، ان کے کارکن عام ٹیکسی ڈرائیور کو امریکی سیاست اور امریکی بزنس کے بارے میں زیادہ معلومات ہیں اور وہ بہت کھل کر بحث کرتے ہیں۔ امریکی تاجر، صنعت کار، ڈپلومیٹ، بیوروکریٹ کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں کہ انہیں بہت سے امریکی حقائق کا ادراک غیر ملکی لوگوں کی گفتگو سے ہوا۔

لیکن یہ بے خبری امریکی قوم کی کامیابیوں میں رکاوٹ نہیں ڈالتی ہے۔ لیکن انہیں اور زیادہ فتوحات سے ہم کنار کر رہی ہے۔ اس کے پس منظر میں کیا رمز ہے۔ اس کا تجزیہ آگے چل کر ہوگا۔

اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں چند لمحے

امریکی محکمۂ خارجہ (اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ) اس وقت دنیا کا نظام چلا رہا ہے۔ اس کے سربراہ سیکرٹری اسٹیٹ کہلاتے ہیں۔ ہمیں وزیروں کی عادت ہے۔ اس لیے ہم انہیں وزیر خارجہ کہتے ہیں لکھتے ہیں۔ سیکرٹری کو صدر نامزد کرتا ہے۔ عام امریکیوں میں سے کسی کو بھی سیکرٹری مقرر کیا جا سکتا ہے اس عہدے پر بڑے بڑے نام رہے ہیں۔ جو تاریخ کا ایک انمٹ حصہ بن چکے ہیں۔ ماضی قریب میں سب سے بڑا نام ڈاکٹر ہنری کسنجر کا ہے۔ ان سے پہلے جان فاسٹر ڈلس کا نام مشہور رہا۔ امریکہ کو دنیا میں جو مرکزیت حاصل ہے۔ اسی اعتبار سے اس کا سیکرٹری اسٹیٹ دنیا کی ایک مرکزی شخصیت بن جاتا ہے۔ اگر کوئی بحران چل رہا ہو جو دنیا میں اکثر چلتے رہتے ہیں۔ اس وقت امریکی سیکرٹری اسٹیٹ کی اور زیادہ وقعت ہو جاتی ہے۔ سیکرٹری کے بعد کئی انڈر سیکرٹری، اسسٹنٹ سیکرٹری، ڈپٹی سیکرٹری ہوتے ہیں۔ آج کل کرسٹینا روکا، رچرڈ آرمیٹج، کے نام بار بار آتے ہیں یہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں اسٹیٹ سیکرٹری اور انڈر سیکرٹری ہیں۔ پاکستان، بھارت جیسے ممالک کے معاملات انڈر سیکرٹری وغیرہ سنبھال لیتے ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کے لیے ان کا دورہ یا ان سے واشنگٹن میں ملنا ہی باعث صد عزو افتخار ہوتا ہے۔

پہرے سخت ہیں۔ گلیاں بند کی ہوئی ہیں۔ اپنی مطلوبہ گلی تک پہنچنے کے لیے کئی چکر لگانے پڑتے ہیں۔ یہ سب کچھ نائن الیون کے بعد ہوا ہے۔ پہلے سب راستے کھلے ہوتے تھے۔

گاڑی بہت دور روک دی گئی ہے۔ سیمنٹ کی پختہ رکاوٹیں تعمیر کی گئی ہیں۔

اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی عمارت سامنے ہے۔ 2201 سی اسٹریٹ این ڈبلیو واشنگٹن ڈی سی 20520 عام دوسری عمارتوں جیسی، ایشیائی ممالک کی طرح کوئی شان و شوکت نہیں۔ لیکن یہاں سے پوری دنیا پر کنٹرول کیا جاتا ہے۔ قطار لگی ہوئی ہے۔ ایک ناکے پر اپنی جیبیں خالی کی جارہی ہیں۔ سکے، کارڈ، سب کچھ نکال کر رکھ دیں۔ ایک مسلح گارڈ اس ڈیوٹی پر مامور ہے۔ دوسرے مسلح گارڈ کے سامنے آپ ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہوجائیں۔ وہ اوپر سے نیچے تک دست درازی کرتے ہوئے آپ کی تلاشی لے رہا ہے۔ امریکہ میں ایسے فرائض کے لیے گورے، کالے، مرد، خاتون کی کوئی قید نہیں ہے۔ آگے پیچھے، گھوم کر، تلاشی دینے کے بعد آپ اپنی چیزیں جمع کریں۔ پھر عمارت میں داخل ہوں۔

ایئرپورٹ بریفنگ ہال میں جیسے ایئر لائنز کے کاؤنٹر ہوتے ہیں۔ اسی طرح مختلف کاؤنٹرز پر خیر مقدمی خواتین و حضرات بیٹھے ہیں۔ کس سے ملنا ہے۔ کیوں ملنا ہے پہلے سے ملاقات طے ہے کہ سوالات.....کاؤنٹرز پر تمام ممالک کے پرچم لہرا رہے ہیں۔ پیچھے دیوار پر دنیا کا نقشہ ہے۔

اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ڈاکٹر ڈیوڈ... اور جولیانہ ہمارے ساتھ ہیں...... اس لیے تلاشی کے کچھ مراحل کم ہوگئے ہیں۔ پھر بھی دیر لگتی ہے۔ وزیٹرز کے کارڈ ہمارے گلے میں لٹک گئے ہیں۔ ایک بار پھر تلاشی کے مراحل۔ ان سب سے کامیابی سے گزرتے ہوئے اب ہم کمرہ نمبر 4253 میں داخل ہوچکے ہیں۔

میں مشعل جے سین ہوں۔ پرنسپل ڈپٹی اسسٹنٹ سیکرٹری۔

میں ڈیوڈ گڈ۔ ڈائریکٹر آفس آف انڈیا، نیپال، سری لنکا افیئرز۔

اور میں جیرالڈ فیرسٹین، ڈائریکٹر آفس آف پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش افیئرز۔

ہماری گفتگو کا موضوع ہے۔

خارجہ پالیسی کے موجودہ امور

امریکی محکمۂ خارجہ امریکی صدر کو خارجہ پالیسی کی تشکیل اور اس پر عملدرآمد کے لیے

مشورے دیتا ہے۔ چیف ایگزیکٹو ہونے کی حیثیت سے صدر ریاستہائے متحدہ کی خارجہ پالیسی کے مکمل ذمہ دار ہیں۔ محکمۂ خارجہ کا بنیادی مقصد امور خارجہ کو امریکہ کی طویل المیعاد سلامتی اور خوشحالی کے فروغ کے لیے چلانا ہے۔ محکمہ بیرونی دنیا سے وابستہ امریکی مفادات سے متعلقہ حقائق کا تجزیہ کرتا ہے۔ پالیسی اور مستقبل کی کاروائی کے لیے سفارشات مرتب کرتا ہے۔ اور طے شدہ پالیسی کو آگے بڑھاتا ہے۔ یہ امریکی عوام، کانگریس اور دوسرے امریکی شعبوں، ایجنسیوں اور ساتھ ساتھ غیر ملکی حکومتوں سے مسلسل مشاورت کرتا ہے۔ دوسری قوموں سے معاہدے، سمجھوتے اور مذاکرات بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ اقوام متحدہ میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ ساتھ 50 بڑی بین الاقوامی تنظیموں اور 800 سے زیادہ بین الاقوامی کانفرنسوں میں سالانہ نمائندگی بھی محکمۂ خارجہ ہی کرتا ہے۔

مشعل پاکستان میں ایک عرصہ گزار چکی ہیں۔ وہ امریکی سفارت خانے میں دوسری پوزیشن میں تھیں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ امریکیوں نے پاکستان خواتین کے حوالے کیوں کر رکھا ہے۔ جب دنیا نائن الیون کے بحران سے گزر رہی تھی تو ایک خاتون ہی امریکی سفیر تھیں۔ خاتون کم ہی لگتی تھیں۔ بہت فعال، تیز، اینڈی چیمبرلین، بہت مہارت اور محنت سے پاک امریکہ تعلقات بہتر کررہی تھیں۔ لیکن اپنی بیٹی کے احساس عدم تحفظ کے باعث انہیں وطن واپس جانا پڑا۔ نائن الیون کے بعد کے ہنگامہ خیز دن راتیں، پاکستان فرنٹ اسٹیٹ بن گیا تھا جہاں دنیا بھر کے صحافی جمع ہوگئے تھے۔ افغانستان پر امریکی حملے جاری تھے، ایسے میں سفارت کاری انتہائی نازک ذمہ داری بن جاتی ہے۔ اسلام آباد میں طالبان حکومت کے سفیر واحد ترجمان تھے۔ جو دنیا بھر کے الزامات اور حملوں کا جواب دیتے تھے۔ اتحادی فوجوں کے ترجمان بھی اسلام آباد میں ہی بریفنگ کرتے تھے۔

اینڈی کی عدم موجودگی میں مشعل ناظم الامور رہیں۔ ان کے بعد بھی پاکستان میں امریکہ کی نمائندگی ایک خاتون کو ہی سونپی گئی ہے۔ نینسی پاول، اب یہ ذمہ داری ادا کررہی ہیں امریکہ کے ہمسائے کینیڈا نے بھی پاکستان کو ایک خاتون کے حوالے ہی کیا ہے۔

مشعل کہہ رہی ہیں کہ جنوبی ایشیا کے امور امریکی محکمۂ خارجہ کی نظر میں مرکزی اہمیت

رکھتے ہیں۔ اہم شخصیتوں کے دورے ہوتے رہتے ہیں۔ ابھی گزشتہ ماہ جنرل پرویز مشرف ہوکر گئے ہیں۔ ان کو یقیناً غیر معمولی اہمیت دی گئی۔ صدر بش نے انہیں کیمپ ڈیوڈ میں مدعو کیا۔ جہاں ہر غیر ملکی مہمان کو نہیں بلایا جاتا۔ بھارت کے نائب وزیر اعظم ایل کے اڈوانی بھی تفصیلی دورہ کر کے گئے ہیں۔ امریکہ سے کرسٹینا روکا، رچرڈ آرمیٹج بھارت پاکستان کے دورے کر کے آئے ہیں۔ ہماری بعض شخصیتوں نے افغانستان کے دورے بھی کئے ہیں۔

وہ واضح طور پر کہہ رہی ہیں کہ نائن الیون کے بعد امریکہ اور جنوبی ایشیا کے درمیان مجموعی طور پر تعلقات میں خاصی تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ امریکہ اور بھارت کے درمیان قریبی تعلقات تجارت اور سیاست کے شعبوں میں بھی بڑھ رہے ہیں لیکن زیادہ تیزی اور شدت سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبے میں اشتراک میں آئی ہے۔

مشعل پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف کی دہشت گردی کے خلاف مسلسل کاروائی اور کوششوں کے بارے میں کہہ رہی ہیں کہ امریکہ ان کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ وہ پاکستان کو ایک طویل المیعاد، پائیدار، محفوظ جمہوری مستقبل دینا چاہتے ہیں۔

ڈیوڈ گڈ کا انداز فکر یہ ہے کہ حالات جنوبی ایشیا کو گلوب (دنیا) کے پیچھے سے اٹھا کر سامنے لے آئے ہیں۔ امریکہ کو وہاں کی سلامتی اور امن کے بارے میں خدشات ہیں۔ بھارت میں جمہوریت مستقل اور مستحکم ہے۔ جبکہ قریبی ملکوں میں ابھی عبوری دور سے گزر رہی ہے۔ صدر بش کے دور میں امریکہ بھارت تعلقات میں تبدیلی آئی ہے۔ اب یہ دونوں جمہوریتیں ایک دوسرے کے قریب آ رہی ہیں۔ بھارت اب تک دنیا میں سب سے بڑی جمہوریت ہے۔ اس کے اب سب سے بڑی معیشت بننے کے امکانات ہیں امریکہ میں 15 لاکھ بھارتی موجود ہیں۔ جو انتہائی سنجیدگی اور شعوری انداز سے امریکہ اور بھارت کے درمیان تعلقات کو فروغ دے رہے ہیں۔ سرد جنگ کے خاتمے کے نتیجے میں بہت تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ امریکہ اور بھارت دونوں کے سامنے اب کئی مشترکہ مقاصد اور منصوبے ہیں۔ بش انتظامیہ بھارت پر زیادہ توجہ دے رہی ہے۔ دوطرفہ تعلقات میں بہت زیادہ قربت پیدا ہورہی ہے۔ خاص طور پر

انفارمیشن ٹیکنالوجی میں بہت تعاون ہو رہا ہے۔

بنگلہ دیش کے حوالے سے صرف طلبہ کے ویزوں پر بات ہورہی ہے۔ یہ مسئلہ پاکستان، بھارت کا بھی ہے کہ نائن الیون کے بعد اسٹوڈنٹس کے ویزوں کے اجراء میں بھی مشکلات پیدا ہورہی ہیں۔ بعض طلبہ جن کی تعلیم ابھی جاری تھی۔ وہ چھٹی پر اپنے وطن آئے تو واپس امریکہ نہیں جاسکے ہیں۔ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے عہدیدار کہہ رہے ہیں کہ ہم کوشش کریں گے کہ اس مسئلے کو حل کروا سکیں۔ بہرحال یہ یقین رکھیں کہ نائن الیون کے بعد بھی تعلیم کے سلسلے میں امریکہ کی پالیسی میں ایسی کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔

افغانستان کی شکریہ بارک زئی کہہ رہی ہیں کہ امریکہ اب افغانستان پر اتنی توجہ نہیں دے رہا ہے۔ اس کی ترجیحات تبدیل ہورہی ہیں۔ اور وارلارڈز (جنگجو سرداروں) کی مدد کی جارہی ہے۔ جو ہمیشہ افغانستان کے حالات خراب کرتے رہے ہیں۔

جیراللہ اس سے اتفاق نہیں کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ افغانستان میں حالات یقیناً بہتری کی طرف جارہے ہیں۔ اس لیے دوسرے ملکوں میں مقیم افغان مہاجرین وطن واپس آرہے ہیں۔ اتحادی فوجی افغانستان کے پانچ ہزار افراد کو تربیت دے رہے ہیں۔ جو بعد میں پولیس اور مسلح افواج میں شامل کیے جائیں گے۔ امریکہ افغانستان سے اپنے تمام وعدے طویل المیعاد بنیادوں پر پورے کرے گا۔ یہاں کے اقتصادی مسائل کے حل پر بھی پوری توجہ دی جارہی ہے۔

ایک سوال کے جواب میں یہ عہدیدار کہہ رہے ہیں کہ امریکہ مسئلہ کشمیر کا کوئی حل پاکستان یا بھارت پر مسلط نہیں کرنا چاہتا۔ ہم صرف یہ خواہش رکھتے ہیں کہ دونوں ممالک اس مسئلے پر مذاکرات کا آغاز کریں اور کسی نتیجے پر پہنچیں۔

جنوبی ایشیا کے مستقبل کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ محفوظ اور امن دکھائی دیتا ہے۔ ابھی یہاں خدشات اور خطرات بہت ہیں۔ انتہا پسندی بھی یہاں بہت زیادہ ہے۔ ان کا خاتمہ ضروری ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ کوششیں جاری ہیں۔ اور اقتصادی استحکام کے لیے طویل المیعاد منصوبہ بندی کی جارہی ہے۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ جنوبی ایشیا میں سول سوسائٹی کے قیام

کے لیے سنجیدگی سے مساعی کی جائیں گی۔

ایک ہی دن میں کئی کئی میٹنگیں رکھی جارہی ہیں اس لیے کھل کر سوال جواب کا موقع نہیں ملتا ہے۔ بہت سی تشنگی رہ جاتی ہے۔ ہم منتظمین سے یہ گلہ بھی کررہے ہیں۔ لیکن ہمارے ساتھ رہنے والے ڈیوڈ اور جولیانہ پروگرام تشکیل دینے والوں میں سے نہیں ہیں۔ وہ تو پروگرام پرعملدرآمد کرنے والوں میں سے ہیں۔ جولیانہ کہہ رہی ہیں کہ ہماری شکایت بجا ہے۔ وہ متعلقہ افسروں تک یہ بات پہنچادیں گی۔ ممکن ہے آنے والوں کے لیے کچھ صحیح پروگرام تیار کیے جاسکیں گے۔ ہمیں تو اپنے اسی پروگرام کو پورا کرنا ہے۔

سینٹ کی کمیٹیاں کس طرح کام کرتی ہیں۔

اب ہم امریکی سینٹ کی طرف رواں ہیں۔ جہاں ہمیں کمیٹی آف فارن ریلیشنز کے مقاصد، طریق کار سے آگاہی حاصل کرنا ہے۔ دوپہر کے کھانے کا وقت بھی ہے۔ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ ''کیپٹل ہل'' (دارالحکومت کی پہاڑی) کے قریب کئی ریستوران ہیں۔ وہاں کہیں بھی جلدی جلدی پیٹ بھرلیں امریکی کام سے کام رکھتے ہیں۔ چائے، پانی، کھانے، کے تکلفات میں نہیں، پڑتے ہیں۔ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں کسی نے چائے پوچھی تک نہیں۔ پیاس لگی ہوتو برآمدوں میں ٹونٹیاں لگی ہیں۔ بٹن دبائیں پانی آپ کے منہ میں پہنچ جائے گا۔ چپراسی کی ضرورت ہے۔ نہ گلاس رکھنے کی، کھانا بھی اپنا اپنا کھانا ہے۔ پیسے شروع میں دے دیئے گئے ہیں۔ آپ اب خودخریدیں کھائیں۔

وقت کم ہے۔ اس لیے سب لوگ کوئیک لنچ (فوری کھانے) پراکتفا کرتے ہیں۔ پھر ہم ڈاکسن سینٹ آفس بلڈنگ میں پہنچ گئے ہیں۔ ہمارے ساتھی یہاں پانی تلاش کررہے ہیں۔ برآمدوں میں ٹونٹیاں مل گئی ہیں۔ ہمیں ایسے مزانہیں آتا۔ اس لیے پیاسے رہنے کوترجیح دیتے ہیں۔

دی سینٹ فارن ریلیشنز کمیٹی 20 سینیٹرز پر مشتمل ہوتی ہے۔ جو امریکہ کے دوسری قوموں سے تعلقات کے ضمن میں مصروف رہتے ہیں۔ دوسرے امور کے علاوہ درج ذیل

معاملات اس کمیٹی کی طرف بھیجے جاتے ہیں۔

1۔ دوسرے ملکوں کو دی جانے والی اقتصادی، فوجی ٹیکنیکل اور انسانی اعانت

2۔ غیر ملکی قرضے۔

3۔ ایٹمی توانائی اور ایٹمی منتقلی کے بین الاقوامی پہلو۔

4۔ انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ۔ اور دوسری بین الاقوامی تنظمیں جو بین الاقوامی مالیاتی مقاصد کے لیے قائم کی گئی ہوں۔

5۔ بیرون ملک مداخلتیں اور جنگ کے اعلانات

6۔ غیر ممالک کے ساتھ کاروباری اور تجارتی تعلقات کی بہتری کے لیے اقدامات اور بیرون ملک امریکی کاروباری مفادات کا تحفظ

7۔ قومی سلامتی اور ٹرسٹی شپ کے بین الاقوامی پہلو۔

8۔ اقوام متحدہ

9۔ عالمی بنک اور دوسری مالیاتی تنظمیں جو ترقیاتی امداد کے لیے قائم کی گئی ہیں۔

10۔ اور وہ امور جو غیر ممالک میں خوراک، بھوک اور غذائیت سے متعلق ہوں۔

اس کمیٹی کے دفتر میں ہمارے لیے کوئی سینیٹر منتظر نہیں ہیں۔ بلکہ اس کمیٹی کے اسٹاف کے ممبرز ہم سے ملاقات کے لیے موجود ہیں۔

ڈاکٹر جونا بلینک ، منارٹی پروفیشنل اسٹاف ممبر ہیں۔ ایک خاتون ہیں کم سیوٹ، جو پروفیشنل اسٹاف ممبر ہیں۔

موضوع گفتگو ہے: کیپٹل ہل سے ایک منظر۔ قانون سازی کا تناظر

مسز کم نے بات شروع کی ہے۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ سینٹ فارن ریلشنز کمیٹی انتظامیہ کی طرف سے استعمال کے لئے اختیارات کو مانیٹر کرتی ہے۔ جس میں ایٹمی پھیلاؤ جیسا حساس عالمی مسئلہ ہے۔ دہشت گردی ہے۔ وہ دوسرے تمام امور ہیں۔ جو امریکہ اور دوسرے ملکوں کے درمیان چل رہے ہیں۔ ہماری کمیٹی جائزہ لیتی ہے کہ سرکاری ایجنسیاں کیسے اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ ان میں اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ بنیادی ادارہ ہے۔ جس پر اس کمیٹی کی نظر رہتی ہے

دنیا کو امریکہ کی طرف سے جو امداد ملتی ہے۔ گرانٹس دی جاتی ہیں۔ اس کے لیے کمیٹی کے ماتحت ایک سب کمیٹی قائم ہے۔ اس کی ذمہ داری صرف اسی امداد کا جائزہ لینا ہے۔

مسز کم تو کچھ تجربہ کار لگتی ہیں۔ ڈاکٹر جونا بلینک اگرچہ پی ایچ ڈی ہیں۔ لیکن ابھی عالم شباب میں ہی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کمیٹی کے ارکان کے خیالات میں بھی تنوع ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ سب خود کسی معاملے پر اتفاق رائے رکھتے ہوں۔ سینٹ میں ایک عرصے سے تسلسل سے رہنے والے ارکان نکتہ بہ نکتہ بھی اختلاف کرتے ہیں۔ جیسے عراق پر حملے کے سلسلے میں بہت سوالات ہوئے۔ ری پبلکن ، ڈیموکریٹس نے بہت سخت استفسارات کیے۔ اور کہا کہ ہم عوام کی آوازیں ہیں۔ اس لیے ہمیں بہت کچھ پوچھنے کا حق ہے۔

وہ بتا رہے ہیں کہ اسوقت بھی سوالات پوچھے جا رہے ہیں۔ افغانستان میں کاروائی کے سلسلے میں۔ پاکستان بھارت میں دہشت گردی کے خاتمے کے لیے جو اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ ان پر بھی بحث ہوتی رہتی ہے۔ ایٹمی ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کے لیے جنوبی ایشیا میں کیا ہو رہا ہے۔ مسئلہ کشمیر بھی ایجنڈے میں ہے۔ مگر طویل المیعاد والے میں۔

کانگریس اور سینٹ کے ارکان امریکی انتظامیہ پر اس سلسلے میں بہت ناراض ہیں کہ افغانستان میں تعمیر نو کے لیے 343 ملین ڈالر منظور کیے گئے تھے۔ لیکن انتظامیہ نے انہیں پوری طرح خرچ نہیں کیا۔ قانون بنایا گیا۔ لیکن عمل نہیں ہوا۔ سینٹر ہیگل کہتے ہیں کہ افغانستان کو مزید امداد دی جانی چاہیئے۔ وہ انتظامیہ سے کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے افغانستان سے وعدے تو بہت کیے تھے۔ لیکن اب کیا کر رہے ہو۔ ڈاکٹر جونا کہہ رہے ہیں کہ ہماری کمیٹی متعلقہ شعبوں سے مسلسل رابطے میں رہتی ہے۔ کہ جو بھی سیاسی، اقتصادی پروگرام منظور کیے گئے۔ ان پر عملدر آمد کس حد تک ہو رہا ہے۔ پروگرام کی منظوری بھی پوری چھان بین کے بعد دی جاتی ہے۔ کمیٹی کے افسر متعلقہ ملکوں کا دورہ کرتے ہیں۔ وہاں موجود امریکی سفارت کاروں سے متعلقہ موضوع پر معلومات حاصل کرتے ہیں۔ اس ملک کی چیدہ چیدہ شخصیتوں سے تفصیلی ملاقاتیں کرتے ہیں۔ ضروری ہو تو سینیٹر صاحبان خود بھی جاتے ہیں۔ اس کے بعد پروگرام پر بحث کر کے منظوری دی جاتی ہے۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود یہ انتظامیہ پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اس رقم کو کب اور کیسے

استعمال کرے۔ اس سلسلے میں ان ملکوں کے اخبارات میں چھپنے والے کالموں، مضامین، تجزیوں اور متعلقہ سیاسی بیانات کے تجزیے بھی کیے جاتے ہیں۔ کمیٹی کے ارکان ہر زیر بحث مسئلے پر زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر کے باخبر ہونا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ جب فیصلہ کریں تو انہیں مکمل اعتماد ہو کہ ان کا نقطہ نظر متوازن ہے۔ اور ان کا انداز فکر درست ہے۔

وہ یہ بھی بتا رہے ہیں کہ آج ہی ان سے پاکستان کے سابق وزیر اطلاعات سینٹر مشاہد حسین بھی ملنے آئے تھے۔ وہ بھی ہماری اطلاعات کا ایک اچھا ذریعہ ہیں۔

کانگریس کی ریسرچ سروس بھی اطلاعات یکجا کرنے کا ایک اچھا مرکز ہے۔ یہاں سینٹ کی طرف سے کوئی استفسار بھی جائے۔ ہر سطح پر ماہرین بیٹھے ہیں۔ وہ بھرپور اور جامع جواب فراہم کرتے ہیں۔

ہم پوچھ رہے ہیں کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں سینیٹر پاکستان نواز ہے۔ بھارت نواز ہے۔ یہ کیا صحیح ہے۔

وہ کہہ رہے ہیں کہ امریکہ میں انتخابات سے قبل فنڈز۔ اور عطیات کی روایت ہے۔ امیدواروں پر اس کا اثر تو ہوتا ہے۔لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ فلاں پاکستان کا حامی ہے۔ فلاں بھارت کا یا کسی دوسرے ملک کا۔ یہ غلط ہے۔ یہ بہرحال امریکی ووٹرز ہیں۔ یہ اگر اپنے امیدوار اور بعد میں منتخب رکن سے کسی مسئلے کے لیے رجوع کرتے ہیں تو وہ اس کا ہمدردانہ جائزہ لیتا ہے۔لیکن وہ تنہا یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ فلاں ملک کو کتنی امداد دی جائے۔ کمیٹی کے ارکان ہر مسئلے کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ مانیٹر کیا جاتا ہے۔ یہ فیصلہ ہوتا ہے ۔ اب جیسے افغانستان میں تعمیر نو کے سلسلے میں بھی کہا جا رہا ہے۔ اور جنوبی ایشیا میں دہشت گردی کے خلاف کاروائیوں کے لیے بھی سینٹ اور کانگریس انتظامیہ سے کہہ رہے ہیں کہ وہ جتنا کچھ کرنا چاہیئے۔نہیں کر رہے ہیں۔ امریکہ کو مزید کچھ کرنا چاہیئے۔

افغانستان کے سلسلے میں سوال پر وہ اتفاق کر رہے ہیں کہ حقیقی صورت حال کچھ مایوس کن ہے۔ اتحادی افواج کی کاروائی سست ہے۔ اسی لیے سینٹ اور کانگریس دونوں کی طرف سے انتظامیہ پر زور دیا جا رہا ہے کہ وہ رفتار تیز کریں۔

عراق کی صورت حال پر بھی انتظامیہ سے سختی سے پوچھ گچھ کی گئی ہے۔ متعلقہ سیکرٹریز (وزراء)۔ سفیروں اور انتظامیہ کے دوسرے عہدیداروں کو کمیٹی کے روبرو پیش ہونا پڑتا ہے۔ اور ہر سوال کا واضح جواب دینا پڑتا ہے۔ جواب سے گریز نہیں کیا جاسکتا۔ پوچھا جا رہا ہے کہ ان رپورٹوں سے انتظامیہ کس حد تک متاثر ہوتی ہے۔ کیا وہ اپنا رویہ تبدیل کرتی ہے۔

وہ بتا رہے ہیں کہ امریکی رائے عامہ ان رپورٹوں پر بہت اعتماد کرتی ہے۔ اگر انتظامیہ کے رویے یا پالیسی میں تبدیلی نہ آئے۔ تو ان رپورٹوں کو اخبارات تفصیل سے شائع کرتے ہیں ٹی وی چینلوں پر بحث چلتی ہے۔ اس طرح انتظامیہ پر دباؤ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ ان کمیٹیوں کی مانیٹرنگ اور رپورٹوں کو انتظامیہ نے بالکل ہی نظر انداز کیا ہو۔ حکومت کو سیدھے راستے پر چلانے میں سینٹ اور کانگریس کی کمیٹیاں بہت موثر کردار ادا کرتی ہیں۔

ایوانِ نمائندگان

اب ہماری منزل ہے۔ رے برن ہاؤس آفس بلڈنگ، جہاں جناب ہلل وبنیرگ ہمارے منتظر ہیں جو پروفیشنل اسٹاف ممبر اور کونسل ہیں۔ ادارہ ہے۔ کمیٹی آن انٹرنیشنل ریلیشنز۔ پہلے ہم جہاں سے ہوکر آرہے ہیں۔ وہ سینٹ کے ارکان پر مشتمل فارن ریلیشنز کمیٹی تھی۔ کمیٹی آن انٹرنیشنل ریلیشنز میں ایوان نمائندگان کے ارکان شامل ہوتے ہیں۔ امریکہ اور دوسرے ملکوں کے درمیان تعلقات کے حوالے سے اس کمیٹی کا دائرہ کار اور موضوعات قریباً وہی ہیں۔ جو سینٹ کی کمیٹی کے ہیں۔

یہاں موضوع ہے۔ مشرق وسطٰی پر امریکی پالیسی۔ کانگریس کے نقطۂ نظر سے

ہلل وبنرگ ڈاکٹر جونا اور کم دونوں کی نسبت کچھ عمر رسیدہ، تجربہ کار ہیں۔ وہ بتارہے ہیں کہ کانگریس میں پراکسی ووٹنگ نہیں ہوتی۔

گفتگو کے دوران وہ اس امر سے اتفاق کررہے ہیں کہ کانگریس کے ارکان عام طور پر اسرائیل سے ہمدردی کا رجحان رکھتے ہیں۔ اکثر پاکستان اور بھارت سے بھی ہمدرد رہے ہیں۔ انتظامیہ تو زیادہ ہی دوستانہ ہے۔ مشرق وسطٰی کے معاملات مں احتیاط پیش نظر رہتی ہے۔ وہ بتارہے ہیں کہ انہیں بنگلہ دیش، مصر، ترکی، لبنان جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ یورپی یونین کے قریباً تمام ممالک کا دورہ کرچکے ہیں۔

وہ بتارہے ہیں کہ کانگریس کے ارکان انہیں فون کرتے ہیں۔ استفسار کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں زیادہ تر کوشش ہوتی ہے کہ جذباتی نہ ہوں۔

ہم میں سے کسی کے پوچھنے پر وہ جواب دے رہے ہیں کہ کانگریس کا ایک رکن کم از کم 6لاکھ افراد کی نمائندگی کرتا ہے۔ کل ارکان کی تعداد 435 ہے۔ اس کمیٹی کی ذمہ داری فالواپ اور مانیٹرنگ بھی ہے۔

ان سے دریافت کیا گیا ہے کانگریس کی یہ کمیٹی کسی بین الاقوامی مسئلے پر جب غور کرتی ہے۔ یا کسی نامزد سفیر کی پیشی پر سوال جواب کرتی ہے۔ تو اس کے لیے معلومات اور اطلاعات کا ذریعہ کیا ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے متعلقہ ارکان ان ملکوں کا سفر کرتے رہتے ہیں۔ یا کمیٹی کا اسٹاف ان ملکوں میں جاتا ہے۔ اس ملک کی اہم متعلقہ شخصیات سے بھی ملتے ہیں۔ اور وہاں امریکی سفارت خانے کے افسروں سے بھی ملاقاتیں کی جاتی ہیں۔

یہ کمیٹی بعض مخصوص امور یا مسائل پر رپورٹیں بھی جاری کرتی ہے۔ بجٹ دستاویزات کی تیاری سے پہلے بھی سوالات جوابات ہوتے ہیں۔

ہلل وینیرگ ہمیں کمیٹی کے میٹنگ روم میں لے جاکر میٹنگوں کی کارروائی کے بارے میں بھی عملی طور پر بتارہے ہیں کہ کاروائی کیسے چلتی ہے۔ کون کہاں بیٹھتا ہے۔ اسی طرح جب نامزد سفیر پیش ہوتے ہیں تو چیئرمین اور ارکان ان سے کس کس طرح پوچھ گچھ کرتے ہیں۔

پینٹا گون میں ایک دن

ایک اور مصروف دن شروع ہو رہا ہے۔ ہمیں شام کو واشنگٹن سے سنسناٹی بھی روانہ ہونا ہے۔ اس لیے یہ طے ہوا ہے کہ صبح صبح ہوٹل سے حساب کتاب کر لیا جائے۔ اگر کچھ سامان یہاں چھوڑنا چاہیں تو چھوڑ سکتے ہیں۔ اگلے تین چار روز کے لیے ضروری سامان ساتھ لے سکتے ہیں۔ پھر واپس اسی ہوٹل میں آنا ہے۔

پینٹا گون جانے کی خواہش کسے نہیں ہوتی۔ کب سے سنتے آ رہے ہیں۔ کہ فیصلے یہیں ہوتے ہیں۔ کس ملک پر کب چڑھائی کرنی ہے۔ کتنے لاؤ لشکر کے ساتھ۔

صدر پرویز مشرف کے کیمپ ڈیوڈ کے دورے میں جب ساتھ آنا ہوا تھا۔ تو ہم کئی بار دریا کے اس پار سے گزرے تھے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ یہ پینٹا گون کی عمارت ہے۔ اس پر بھی حملہ ہوا تھا۔ لیکن اب انہوں نے اسے تعمیر کر لیا ہے۔ پینٹا گون کی عمارتیں اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ یا دوسرے وفاقی محکموں کی طرح بلند و بالا نہیں ہیں بلکہ یہ فوجی بیرکوں کا تاثر دیتی ہیں۔ دور سے یہ صرف ایک منزلہ ہی لگتی ہے۔

ہم دریا عبور کر کے پینٹا گون کے سلسلۂ عمارات میں داخل ہو گئے ہیں۔

یہاں سیکورٹی چیک دوسرے دفاتر کی نسبت کچھ زیادہ ہی ہے۔ ان مراحل سے گزر کر ہم برآمدوں میں سے گزر رہے ہیں۔ دونوں اطراف امریکی فوجیوں کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔

کہیں کوریا کی جنگ کے مناظر ہیں۔ کہیں ویت نام کے معرکوں کی تصاویر ہیں۔ طے یہ ہوا ہے کہ ہمیں ایک سارجنٹ کی معیت میں چلنا ہے۔ وہ ہمیں متعلقہ آفیسر تک پہنچا کے واپس چلا جائے گا، اس کے بعد واپسی بھی اسی طرح سے ہوگی۔

ہم پینٹا گون کے پریس روم میں بیٹھے ہیں۔ اخبار نویسوں کے امور سے تعلق رکھنے والے آفیسرز بتا رہے ہیں کہ پینٹا گون میں قریباً چھ سو صحافیوں کو ایکریڈیشن کارڈ جاری کیے ہوئے ہیں اپنا شناختی کارڈ لگا کر وہ وزارت دفاع میں کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ وہ اخبار نویس جو ایکریڈیشن کارڈ نہیں رکھتے۔ وہ کاؤنٹر پر پہنچ کر رجسٹریشن کے لیے درخواست دے سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ بھی کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ اخبارات، ٹی وی چینل، نیوز سروس سے تعلق رکھنے والے سب صحافی درخواست دے سکتے ہیں۔ اب الجزیرہ ٹیلی ویژن کے نمائندے ایکریڈیشن کارڈ لے چکے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ ایکریڈیشن کارڈ کے حامل صحافی کو ہفتے میں دو بار ضرور آنا ہوگا۔ اگر نہ آ سکے تو اس کا کوئی معقول عذر بتانا ہوگا۔ ورنہ یہ ایکریڈیشن منسوخ بھی ہو سکتا ہے۔

ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ ایک گروپ ایسے صحافیوں کا ہے۔ جو پینٹا گون کے دفاتر میں ہی پورا وقت گزارتے ہیں۔ ان کی تعداد 45 کے قریب ہے۔ ان میں سی این این، فوکس، بی بی سی بھی ہیں جن کے اپنے اسٹوڈیو ہیں۔ دوسرے اخبار نویسوں کے لیے چھوٹے چھوٹے کمرے بنائے ہوئے ہیں۔ ان سے کوئی پیسہ نہیں لیا جاتا۔ ایک بڑی تعداد ایسی ہے۔ جو صرف بریفنگ میں شرکت کے لیے آتی ہے۔ پھر واپس چلی جاتی ہے۔

نائن الیون کے بعد پریس سے عملی تعلق زیادہ بڑھ گیا ہے۔ ایک بڑی تعداد ایکریڈیشن لینے کی منتظر ہے۔ دہشت گردی کے بعد جب امریکی جنگ کا آغاز ہوا اور افغانستان سے اچانک کاروائی شروع ہوئی تو صحافی نہیں لے جائے گئے تھے۔ خود جو پہنچ سکے وہی گئے تھے۔ اس پر امریکہ میں کافی تنقید ہوئی۔ پھر عراق پر حملے کے بعد اخبار نویس لے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اور embedded کی اصطلاح سننے میں آئی، ویت نام میں بھی صحافی خود آتے جاتے رہے ان کو جنگی کاروائی کے لیے تربیت بھی نہیں دی جاتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد صحافیوں اور فوج کے درمیان فاصلے بڑھ رہے تھے۔ عراق میں اسے کم کیا

گیا۔ جب فوجی لازمی بھرتی ہوتی تھی تو اس میں سب برابر تھے۔ یہ بھی زیر بحث آیا کہ دو سال
کی جبری فوجی ملازمت کافی نہیں ہے۔فوج اور صحافیوں میں عدم اطمینان اتنی تیزی سے پھیلا
کہ کوئی دلیل نہ دی جا سکی۔ اس دور کی فوجی تاریخ بھی نہیں لکھی جا سکی۔ اس لیے عراق میں
سینکڑوں صحافی لے گئے۔ جہازوں میں ٹینکوں میں اور دوسرے معرکوں میں قریباً 600 امریکی
صحافی فوجیوں کے ساتھ ساتھ تھے۔ 120 محاذوں پر موجود تھے۔

یہ بھی گفتگو ہو رہی ہے کہ اخبار نویس عام طور بریفنگ کے بارے میں شکوک و شبہات
ظاہر کرتے ہیں۔ چاہے وہ وزیر دفاع کر رہے ہوں۔ سیکرٹری یا ترجمان۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ
جو بھی فیصلے کیے جاتے ہیں۔ وہ انتہائی اعلیٰ سطح پر ہوتے ہیں۔ پنٹاگون کا رابطہ ہر روز ہی وہائٹ
ہاؤس سے ہوتا ہے۔ سیکرٹری ڈیفنس (وزیر دفاع) ڈونلڈ رمسفیلڈ روزانہ صدر سے گفتگو کرتے
ہیں۔

اخبار نویسوں اور پینٹاگون کے درمیان بعض امور پر تکرار بھی رہتی ہے۔ جن میں آج
کل زیادہ تر یہ ہیں جنیوا کنونشن، جنگی قیدیوں کے حقوق، امریکہ کیوں جنگوں میں الجھ رہا ہے۔
صدام زندہ گرفتار ہونا چاہیئے یا ہلاک کر دیا جانا چاہیئے۔

پوچھا جا رہا ہے کہ پینٹاگون کی اطلاعات کے ذرائع کیا ہوتے ہیں۔ وہ بتا رہے ہیں کہ
یہاں پریس سیکشن میں لوگ روزانہ اخبارات پڑھتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر دیکھتے ہیں۔ دوسرے ملکوں
سے بھی معلومات لی جاتی ہیں۔ ہر ملک میں امریکی سفارت خانے میں لوگ اخبار پڑھنے پر
مامور ہیں۔ وہ صبح 9 بجے ہی پہنچ جاتے ہیں اخبارات پڑھتے ہیں۔ پریس اتاشی تک پہنچاتے
ہیں۔ وہ پینٹاگون کو براہ راست یہ تراشے بھیج دیتے ہیں۔ فیکس، ای میل، سب ذرائع استعمال
ہوتے ہیں۔ بتایا جا رہا ہے کہ امریکن اخبارات سے بھی وزارت دفاع میں متعلقہ تراشے اخذ
کیے جاتے ہیں۔ ویب سائٹوں اور اخبارات کے انٹرنیشنل ایڈیشنوں سے بھی معلومات حاصل کی
جاتی ہیں۔ پینٹاگون میں بھی نائن الیون ایک حیرت، اور ایک صدمہ کے طور پر دیکھا گیا تھا۔
عام طور پر خیال یہ تھا کہ امریکیوں پر اگر حملہ ہوگا تو دوسرے ملکوں میں سفارت خانے بحری جہاز
یا کسی ہوائی جہاز پر ہوگا۔ یہ کسی کو یقین نہیں تھا کہ کچھ لوگ امریکہ کے اندر حملہ کرنے میں

کامیاب ہو جائیں گے۔ 11 ستمبر کے یہ واقعات پینٹاگون کو بھی پریشان کر گئے ہیں۔ اس لیے
یہاں ہر سطح پر یہ سوچ غلبہ پا رہی ہے کہ پینٹاگون کو اپنے طریق کار میں تبدیلی کرنا ہوگی۔ بلکہ
اپنے ہتھیاروں کی ڈیزائننگ، دیگر ممالک میں افواج کی تعیناتی، دشمن سے مقابلے کے انداز بھی
بدلنا ہوں گے۔

اس لیے وزارت دفاع کے پرنسپل ڈپٹی انڈر سیکرٹری برائے پالیسی جناب ریان ہنری
سے گفتگو کا موضوع ''مستقبل کے لیے منصوبہ بندی! ایک تبدیل شدہ امریکی فوج کا کردار'' رکھا
گیا ہے۔

سرکاری طور پر وزارت دفاع کا دائرہ کار یہ بتایا جا رہا ہے کہ امریکی سلامتی کے تحفظ
اور جنگ روکنے کے لیے فوجی طاقت فراہم کرنا وزارت دفاع کی ذمہ داری ہے۔ فوجی طاقت
کے بڑے عناصر، بری فوج، بحریہ، میرین کور اور فضائیہ ہیں۔ جو باقاعدہ ڈیوٹی پر مامور قریباً 14
لاکھ مردوں اور خواتین پر مشتمل ہے۔ ان میں سے قریباً 5 لاکھ امریکی سرحدوں سے باہر خدمات
انجام دے رہے ہیں۔ کسی ہنگامی صورت حال میں انہیں 9 لاکھ محفوظ فوجیوں کا تعاون بھی حاصل
ہو جاتا ہے۔ وزارت دفاع میں قریباً 8 لاکھ سول ملازمین ہیں۔ امریکی صدر تمام مسلح افواج کے
کمانڈر انچیف بھی ہیں۔ ان کی سرکردگی میں سیکرٹری محکمہ دفاع (وزیر دفاع) اس محکمے پر اپنے
اختیارات استعمال کرتے ہیں ضروری ہدایات دیتے ہیں۔ اور منصوبہ بندی کرتے ہیں۔

بتایا جا رہا ہے کہ دنیا صنعتی دور سے اطلاعاتی دور میں داخل ہوئی۔ دو طاقتی نظام سے ایک
طاقتی نظام آ گیا۔ اس لیے عالمی اور علاقائی سیاسی صورت حال کے تناظر میں محکمۂ دفاع کی
تنظیم نو بھی ناگزیر ہے۔ ماضی قریب کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ افغانستان میں کاروائی
اچانک شروع ہوئی۔ وزارت دفاع اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس لیے منصوبہ بندی میں بہت
سی خامیاں رہ گئیں۔ بہت کچھ فوری طور پر کرنا پڑا۔ یقیناً نقصانات بھی زیادہ ہوئے۔ اور کئی بار
حکمت عملی میں تبدیلیاں بھی لانا پڑیں۔

لیکن افغانستان کی صورت حال سے پینٹاگون نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ عراق کی آزادی
کا آپریشن جب شروع ہوا تو وقت کافی تھا...... اس کے لیے ہر زاویے سے منصوبہ بندی کی گئی۔

جس میں لچک بھی تھی۔ تحرک بھی۔ عراق میں کاروائی سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امریکی افواج نے بہت سرعت کا مظاہرہ کیا۔ اور جدید ترین عسکری حکمت عملی اختیار کی۔ کانگریس کو بھی پہلے سے آگاہ کیا گیا۔ مزید فنڈز بھی منظور کیے گئے۔

افغانستان کی صورت حال میں تینوں مسلح افواج مشترکہ کاروائی سے قاصر رہی تھیں۔ لیکن عراق میں فضائیہ، بحریہ میرینز اور بری افواج کے درمیان اشتراک قابل رشک تھا۔ افغانستان میں صرف ناٹو فوجی تھے۔ عراق میں ناٹو کے رکن ممالک کے علاوہ دوسری افواج بھی شریک ہیں۔

تبدیلی کے لیے نقطہ آغاز امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کی 9 ستمبر 1999ء کی تقریر کے اس اقتباس کو بنایا گیا ہے۔

''میں سیکرٹری دفاع (وزیر دفاع) کو وسیع انتداب (مینڈیٹ) دوں گا کہ وہ موجودہ حالت کو چیلنج سمجھیں۔ اور آنے والے کئی عشروں کے لیے امریکی دفاع کے آرکی ٹیکچر کا تصور پیش کریں۔ ہم کچھ موجودہ ہتھیاروں اور جنگی سازو سامان کو جدید بنائیں گے جو رواں کاروائیوں کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن حقیقی منزل یہ ہے کہ چھوٹی موٹی تبدیلیوں اور بہتریوں سے آگے نکلتے ہوئے موجودہ پروگراموں کی جگہ نئی ٹیکنالوجیوں اور نئی حکمت عملیوں کو لے آئیں۔

''تبدیلی کیا ہے۔''

انگریزی میں ٹرانسفارمیشن کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ تبدیلی اس کا پورا مفہوم ادا کررہی ہے یا نہیں یہ بحث طلب ہے۔

2003ء ٹرانسفارمیشن پلاننگ گائیڈینس کے مطابق۔

ٹرانسفارمیشن (تبدیلی):

''ایسا عمل ہے۔ جو فوجی تقابل اور تعاون کی بدلتی ہوئی نوعیت کی صورت گری کرتا ہے۔
تنظیم، عمل لوگوں اہلیتوں اور خیالات کے نئے اشتراکوں کے ذریعے۔
ٹرانسفارمیشن کا تقاضا ہے۔

فوجی کامیابیوں کے لیے معیار کی نئی تعریف کا تعین، وہ ایسے فوجی مشنوں کی تکمیل کے ذریعے جو ماضی میں ناقابل تصور تھے یا ناممکن تھے۔ بجز امتناعی خطرات اور قیمت پر۔

ڈیپارٹمنٹ کی ٹرانسفارمنگ میں ایک مسلسل ٹرانسفارمیشن کے تمدن کا احیا شامل ہے۔ جس سے ہمارے سوچنے۔ تربیت دینے.... مشقیں کرنے اور لڑنے سب کے انداز بدل جاتے ہیں۔

ٹرانسفارمیشن کیوں۔

''مستقبل کے دامن میں بہت سے نامعلوم خطرات ہیں۔ ان مقابلے کے لیے تیار ہونے میں ناکامی میں ہماری اپنی تباہی ہے۔''

ڈونالڈ رمسفیلڈ

حکمت عملی تقاضا کررہی ہے۔ اور ہمیں سرگرم کار ہونا چاہیے۔

1۔ جو ہے سو ہے کی مشکل۔

ہمارے مخالفین اطلاعاتی انقلاب سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ہم ایسا کریں یا نہ۔

2۔ بڑھتے ہوئے Asymmetric عدم توازن سے خطرات

مخالفین بھرپور فوجی کاروائیوں میں غیر متوازن Asymmetric ذرائع استعمال کررہے ہیں۔

3۔ طاقت بمقابلہ طاقت کا ابھرتا ہوا چیلنج

مخالفین امریکی افواج سے براہ راست تصادم کی اہلیتوں کو بہتر بنارہے ہیں۔

4۔ ایک تاریخی موقع

موجودہ فوجی سبقت Advantage مستقبل کے ابھرتے ہوئے چیلنجوں کے مقابلے کے لیے تیاری کا نادر موقع فراہم کررہی ہے۔

5۔ بھاری خطرات

ٹرانسفارم کرنے میں ناکامی.... فوجی برتری برقرار رکھنے کی لاگت بڑھا سکتی ہے۔ بلکہ میدان جنگ میں کسی بڑی پسپائی کی طرف بھی لے جاسکتی ہے۔

ٹرانسفارمیشن کا اسکوپ

1۔ ہم کس طرح لڑتے ہیں۔ کی ٹرانسفارمیشن

.....معرکوں کی وسیع تر Range کے لیے اہلیتوں کی بنیاد کو وسیع تر کرنا۔

.....نئی دفاعی حکمتِ عملی پر عمل درآمد

2۔ ہم کاروبار کیسے کرتے ہیں کی ٹرانسفارمیشن

..... کاروباری طور طریقوں میں اصلاح

.....شفاف عمل اور حساب میں اضافہ۔

3۔ ہم دوسروں کے ساتھ کیسے کام کرتے ہیں میں ٹرانسفارمشن۔

..... قومی طاقت کے تمام عناصر میں یکجہتی پیدا کرنا۔

..... کثیر القومی حصہ داروں (Partners) کے ساتھ تعاون کو بہتر کرنا۔

ٹرانسفارمنگ کی حکمت عملی

1۔ تمدن کی ٹرانسفارمنگ

..... فوجی طاقت کس طرح آگے بڑھتی ہے۔ اور اس کا اطلاق کیسے ہوتا ہے۔ ان دونوں رجحانات کے سلسلے میں رویوں کی تشکیل۔

.....ایک نئی صورت حال کی طرف منتقلی

2۔ تشکیل کے عمل کی ٹرانسفارمنگ

.....اہلیتوں پر مبنی منصوبہ بندی کی طرف پیش قدمی۔

.....Input کی بجائے آؤٹ پٹ کی پیمائش اور اس کی روشنی میں سرمایہ کاری

3۔ اہلیتوں کی ٹرانسفارمنگ۔

..... مشترکہ آپریشنز (کاروائیوں) کو تقویت پہنچانا۔

.....امریکی خفیہ سروسز کی سبقت سے بھرپور فائدہ اٹھانا۔

..... جنگ لڑنے کے نئے تصورات کی تشکیل

..... ٹرانسفارمیشن کی اہلیتوں میں سرمایہ کاری

ٹرانسفارمیشن۔ عملی مظاہرہ

نئے جغرافیائی حالات

حکمت عملی

دفاعی تبدیلیاں
ڈیفنس ٹرانسفارمیشن

حکمت عملی اور رہنمائی
بہتر کردہ جنگی منصوبہ بندی
مشترکہ کاروائی کے تصورات
مشترکہ تجرباتیت
آئندہ دور کے نظاموں میں
سرمایہ کاری
تیار رہنے کی سرمایہ کاری
تجارتی عمل

بعد از جنگ تخمینہ
سبق جو سیکھے۔
عالمی دفاع! Petune
Unifid کمان کا منصوبہ
امکانات کے اعتبار سے
منصوبہ بندی کی رہنمائی
دفاعی منصوبہ بندی کی رہنمائی

کاروائی کی اہلتیں

کارروائی کی بصیرتیں

محکمے کی ٹرانسفارمنگ

"کوئی ایسا خاص لمحہ نہیں ہوگا۔ جب محکمے کو ٹرانسفارم کیا جائے۔ بلکہ ہم ایک جاری و ساری، ٹرانسفارمیشن کے تمدن کی تعمیر کر رہے ہیں۔ تاکہ ہماری مسلح افواج اپنے ممکنہ مخالفین سے متعدد قدم آگے رہیں۔ ایسا کرنے کے لیے ہمیں مستقبل کا آج ہی تصور کرنا چاہیئے۔ اور آج ہی سرمایہ لگانا چاہیئے۔ تاکہ ہم آنے والی کل میں اپنی مادر وطن اور آزادیوں کا دفاع کر سکیں۔ محکمۂ دفاع اس کام کے لیے پوری طرح مصروف ہے۔"

ڈونالڈ رمسفیلڈ

ٹرانسفارمیشن کے لیے سرمایہ کاری (مالی سال 2004)

1۔ محکمہ دفاع کا آر ڈی ٹی اور ای بجٹ میں مالی سال 2002ء کے مقابلے میں 65 فی صد اضافہ

.....آر ڈی ٹی اور ای میں سرمایہ کاری کے تناسب میں اضافہ۔ تاکہ قریب المیعاد خطرات کو تسلیم کرنے کی آمادگی ظاہر ہو۔

2۔ بری افواج کا محکمہ۔

..... 24 نظام بلاک۔ ختم۔ 24 میں تخفیف..... نئے ڈھانچے۔

..... ایف سی ز..... سمندر کے ذریعے تیز رفتار سے فوجوں کو پہنچانا..... ایکس کیبلر..... زمینی لڑاکا۔ چال چلنے والے UAV'S

بحریہ کا محکمہ

..... 26 بحری جہاز پہلے ہی فارغ (مالی سال 2003ء میں 13 مزید جہاز فارغ) 259 طیارے فارغ۔

.....سی وی این 21۔ littoral combatant ۔UCAV : STOVL JSF

فضائیہ کا محکمہ

.... 114 لڑاکا طیارے فارغ۔ 115 موبیلیٹی رتیل بردار طیارے فارغ۔

.....فضائی لیزر۔ UCAV۔ خلا پر مبنی راڈار.....ٹرانسفارمیشنل کمیونیکیشنز سسٹم

یہ تو آئندہ چند برس کے لیے دفاعی اخراجات، حکمت عملی، اور تصورات میں تبدیلیاں ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم ہر لڑائی سے سبق سیکھتے ہیں۔ کویت سے سبق سیکھے ہیں۔ افغانستان سے اور اب عراق میں جنگ اور مابعد جنگ حالات سے بھی ہم بہت کچھ سیکھ رہے ہیں۔

سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ دنیا میں کہیں بھی امریکی مفادات یا اثاثوں کو خطرہ لاحق ہو۔ تو ہم وہاں کس طرح جلد از جلد اپنی افواج کو پہنچا سکتے ہیں۔ ہماری ساری دفاعی منصوبہ بندی اور سرمایہ کاری اب اسی ایک نکتے پر مبنی ہوگی۔ آئندہ 5 سال کے لیے دفاعی اخراجات کا اندازہ بالکل صحیح ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ آنے والے منظر ناموں کو ہم جتنی زیادہ تفصیل سے اور مختلف پہلوؤں سے دیکھ سکیں گے اتنی ہی بہتر منصوبہ بندی ہم کر سکیں گے۔

ان سے پوچھا گیا کہ اتنی منصوبہ بندی کے وعدے اپنی جگہ، اور پیشگی فکر اور تصورات کا سلسلہ بھی درست ہے۔ لیکن عراق میں کاروائی سے امریکہ کے خلاف جو نفرت پھیل رہی ہے۔ دنیا بھر میں امریکہ کے خلاف جو مظاہرے ہو رہے ہیں۔ اس کا آپ نے کیا تصور کیا تھا۔

وہ بڑی رعونت سے جواب دے رہے ہیں۔ کونسی نفرت، کیسے مظاہرے، عالم عرب کی شاہراہیں بازار پرامن ہیں۔ وہاں کوئی ہنگامے نہیں ہو رہے ہیں۔ تل ابیب پر کسی عرب ملک نے میزائیل نہیں داغے، البتہ عراق میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ غیر متوقع نہیں ہے۔ وہاں بعث پارٹی گزشتہ 21 سال سے حکومت کر رہی تھی۔ ان کے عہدیدار کارکن بڑی تعداد میں ہیں۔ وہ کچھ نہ کچھ تو کریں گے۔ لیکن امریکہ نے عراق کے لیے جو منصوبے بنا رکھے ہیں۔ جن میں وہاں عام انتخابات کے ذریعے عوام کو یہ موقع دینا سرفہرست ہے کہ وہ اپنی مرضی کے نمائندے چنیں۔ اس سے پہلے ان کے اپنے لوگوں پر مشتمل گورننگ کونسل کا قیام۔ پھر اقتصادی شعبے میں قرضوں کی معافی کی سہولت ہے۔ امریکہ عراق کو ایک فعال روشن خیال جدید جمہوریہ بنا کر عوام کے حوالے کرے گا۔

"ہر مہینے امریکہ وہاں چار ارب ڈالر خرچ کر رہا ہے۔ یہ آپ کب تک برداشت کریں گے۔"

سوال کیا گیا ہے۔ وہ جواب دے رہے ہیں کہ ہر ماہ چار ارب ڈالر یقیناً بہت زیادہ ہے۔ لیکن ہم اسے بتدریج کم کریں گے۔ ہمیں ہمیشہ عراق پر قابض نہیں رہنا ہے۔ اس لیے ہماری فوج کی تعداد کم ہوتی رہے گی۔

خود امریکہ میں عراق میں کاروائی کی مخالفت ہو رہی ہے۔ بعض سینیٹرز تو بہت سخت تنقید کر رہے ہیں "سینٹ کی ایک کمیٹی کی حالیہ کاروائی بہت مخالفانہ تھی۔"

یہ درست ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کی صدارتی انتخابی مہم کچھ قبل از وقت شروع ہوگئی ہے۔

افغانستان کے بارے میں وہ بتا رہے ہیں کہ ہم اپنے وعدے پورے کر رہے ہیں۔ وہاں ملکی تعمیر نو تیزی سے جاری ہے۔ یہ سب کچھ وہاں مرکزی حکومت کو تقویت پہنچا کر ہو رہا ہے۔ افغانستان سے آئی ہوئی ایڈیٹر کہہ رہی ہیں۔ کہ مرکزی حکومت تو بہت کمزور ہے۔ پھر وہاں

امریکہ اور مرکزی حکومت دونوں جنگجو سرداروں کو پھر سے مضبوط بنا رہی ہیں۔ انہیں پھر فنڈز دیئے جارہے ہیں۔ اس کا جواب دیا جارہا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ جنگجو سرداروں کو ہم مضبوط نہیں کر رہے ہیں۔ ہم تو اسکول کھول رہے ہیں۔ افغانستان میں نوجوانوں کو بھرتی کیا جارہا ہے۔ فوج اور پولیس کے لیے تربیت دی جارہی ہے۔ یہ افغان خود اپنے ملک کو سنبھالیں گے۔

افغانستان کی شکریہ بارک زئی جہاں یہ حقیقت بیان کرتی ہیں۔ انہیں یہ تیار اور رٹا رٹایا جواب ملتا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ممکنہ سوالات کے لیے تمام افسروں کو پہلے سے تیاری کروائی ہوئی ہے۔ اور کوشش کی جاتی ہے کہ ہر جگہ ایک جیسا جواب ملے۔ ان سے پوچھا جارہا ہے کہ امریکہ کی مستقبل کی دفاعی منصوبہ بندی میں کیا اپنے دوست ممالک کی فوجوں کی تربیت بھی شامل ہے۔

وہ کہہ رہے ہیں کہ سوال کی وضاحت کریں۔

ان سے کہا جارہا ہے کہ امریکہ اپنی فوجوں کو تو مستقبل کے لیے ہر پہلو سے تیار کررہا ہے۔ جن ملکوں میں وہ امریکی مفادات کے تحفظ کے لیے جائے گا۔ اور جہاں کی حکومتیں اس سے تعاون بھی کریں گی وہاں کی فوجوں کی اہلیت کو بہتر بنانے کا کوئی پروگرام بھی اس ٹرانسفارمیشن میں شامل ہے۔ پینٹا گون کے یہ افسر اس سوال کے جواب دینے کے لیے تیاری کرکے نہیں آئے تھے۔ یا پھر ان کا تصور اب صرف امریکی فوج کی قوت تک ہی محدود رہ گیا ہے۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں صرف پروگرام یہی ہو کہ صرف امریکی فوج ہی زیادہ سے زیادہ تربیت یافتہ ہو۔ جدید سے جدید اسلحہ رکھتی ہو۔ دوسرے ملکوں کی افواج کمزور ہوتی چلی جائیں۔ چاہے وہ دوست ممالک کی افواج ہی کیوں نہ ہوں۔

یہ افسر کہہ رہے ہیں کہ ٹرانسفارمیشن پلان میں ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ البتہ امریکہ میں جن ملکوں کے فوجی تربیت کے لیے آتے ہیں وہ اسی طرح آتے رہیں گے اور امریکی افواج مختلف ملکوں میں جاکر ان کے ساتھ مشترکہ فوجی مشقوں میں جو حصہ لیتی ہیں۔ وہ اپنے طور پر جاری رہیں گی۔

ان سے پھر پوچھا جارہا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں جو ممالک آپ کے اتحادی ہیں۔ کولیشن فورسز میں شامل ہیں۔ ان کے فوجیوں کو بھی کسی قسم کی تربیت کا ارادہ نہیں ہے۔ وہ پھر یہی جواب دے رہے ہیں کہ ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے۔

محکمۂ دفاع کی ٹرانسفارمیشن کی گفتگو اپنے انجام کو پہنچ رہی ہے۔ اب ایک وقفہ ہے۔ پھر بریفنگ کا دوسرا حصہ شروع ہونا ہے۔ اس اثنا میں ہمیں موقع دیا جارہا ہے کہ ہم اس ہال کا دورہ کرلیں جہاں وزیر دفاع صحافیوں کے سوالات کے جوابات دیتے ہیں۔ یا پینٹا گون کے ترجمان بریفنگ کرتے ہیں۔ اس وسیع وعریض ہال میں تمام ملٹی میڈیا پریزنٹیشن کے انتظامات موجود ہیں۔ سی این این، بی بی سی اور امریکہ کی کئی ایجنسیوں کو یہیں سے براہ راست ٹرانسمیشن کی سہولتیں بھی میسر ہیں۔ ہم میں سے سب باری باری ڈائس پر کھڑے ہوکر تصویریں بنوا رہے ہوں ..... جانے کب پھر پینٹا گون آنے کا موقع ملے۔

میں ان میزبان افسروں سے کہہ رہا ہوں۔ کہ میں تو اس اصول کی خاطر پینٹا گون آیا ہوں

Visit Pentagon, before it visits you.

پینٹا گون ہو آؤ اس سے بیشتر کہ وہ آپ کے ہاں آئے۔

افسر کھل کر ہنس رہے ہیں۔ جان دار قہقہے۔ یہ داد دینی پڑتی ہے کہ ظالموں میں حس مزاح اب بھی باقی ہے۔

میرے ذہن کے پردے پر کوریا، ویت نام کے بے گناہ قافلہ در قافلہ گزر رہے ہیں۔ کتنی بڑی بڑی شخصیتوں کے ہیولے نظر آرہے ہیں۔ افغانستان، عراق ..... کہیں ظاہری طور پر پینٹا گون ذمہ دار ہے۔ کہیں خفیہ طریقے سے ..... اپنے فوجیوں کی یادگاریں تو اس نے واشنگٹن میں قائم کرلی ہیں۔ اس کا شکار ہونے والے ملکوں نے بھی اپنے ان شہدا کی الگ یادگاریں قائم کی ہیں یا نہیں ۔ جو پینٹا گون کی منصوبہ بندی اور حکمت عملی کی نذر ہوگئے۔ معلوم نہیں کبھی امریکہ میں ایسی کوئی نسل آئے گی یا نہیں ..... جو ان جرائم کا اعتراف کرے گی۔ اور جو اپنے ان محکموں کے گناہوں کا شمار کرے گی۔

اب موضوع ہے۔ ”جنوبی ایشیا میں ..... امریکی سلامتی کے خدشات اور پالیسی، بشمول ایٹمی عدم پھیلاؤ۔“

گفتگو رہے گی۔ جناب پیٹر فلوری سے ..... یہ بھی امریکی محکمہ دفاع کے پرنسپل ڈپٹی اسسٹنٹ سیکرٹری برائے پالیسی ہیں۔

ہمیں بتایا جارہا ہے کہ جنوبی ایشیا سے امریکہ کے روایتی تعلقات بہت قدیم ہیں۔ یہ علاقہ 11 ستمبر کی وجہ سے نہیں پہلے سے ہی ہمارے لیے بہت اہم اور حساس رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کا مسئلہ بھی ہے۔ اس لیے بھی اس خطے میں امریکہ کی دلچسپی تھی۔ یہاں کے لوگ بہت محنتی اور باصلاحیت ہیں۔ پورے علاقے سے ہی تعلقات بہتر کر رہے ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے تناظر میں بھی یہاں کے ممالک ہمارے لیے توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ افغانستان میں تو گزشتہ دو سال سے امریکہ فوجی اور سیاسی طور پر موجود ہے۔ فوجی کاروائی کے بعد اب وہاں تعمیر نو کے پروگرام جاری ہیں۔ وہاں بہت کچھ کرنے کے لیے ہے..... طالبان کا افغانستان تو دہشت گردی کے لیے جنت بنا ہوا تھا۔ اب امریکہ کا ہدف جدید اور جمہوری افغانستان کا قیام ہے۔ ایسی حکومت اور سوال سوسائٹی جو اپنے علاقے کو کنٹرول کر سکے۔ ہمارے پروگرام میں وہاں مقامی فوج اور مقامی پولیس کے لیے تربیت شامل ہے۔ اس کا عمل جاری ہے۔ افغانستان کی تاریخ مشکلات سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں ہمیشہ ہی آس پاس کے ملکوں سے خطرات رہے ہیں۔ اس طرح آس پاس کے ملکوں کو افغانستان سے خطرات رہے ہیں۔

11 ستمبر کے واقعات کے بعد اسامہ بن لادن کی افغانستان میں موجودگی.....اور طالبان حکومت کی طرف سے اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کرنے سے انکار کے بعد افغانستان امریکہ اور اتحادیوں کی فوجی کاروائی کا نشانہ بن گیا۔ یہیں سے دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کا آغاز ہوا۔ پھر یوں معاہدے کے بعد امریکہ اور اس کے اتحادی افغانستان میں امن اور جمہوریت کے قیام کے لیے مصروف عمل ہیں۔

پاکستان سے تعلق کے حوالے سے وہ بتا رہے ہیں کہ امریکہ کے تعلقات روایتی بھی ہیں دوستانہ بھی ان روابط میں اتار چڑھاؤ آتے رہے ہیں۔ لیکن پاکستان پہلے بھی ہمارا اتحادی رہا ہے۔ اب دہشت گردی کے خلاف جنگ میں بھی ہمارا اتحادی ہے۔ جون میں صدر پاکستان

جنرل پرویز مشرف کا دورہ امریکہ کامیاب رہا ہے۔ صدر بش نے انہیں ذاتی طور پر کیمپ ڈیوڈ آنے کی دعوت دی۔ اس دورے سے دونوں ملک اور قریب آئے ہیں۔ امداد کا ایک پیکج منظور ہوا ہے۔ یہ امر قابل قدر ہے کہ ایک طرف پاکستان نے افغانستان کی ملحقہ سرحد پر القاعدہ کے خلاف متعدد کاروائیاں کی ہیں۔ القاعدہ کے مرکزی عہدیداروں کو گرفتار کر کے امریکہ کے حوالے کیا ہے۔ دوسری طرف بھارت کی طرف سے بار بار عائد کیے جانے والی سرحد پار دہشت گردی کے الزام کا جواب بھی دیا ہے۔ ہمیں ان یقین دہانیوں پر اعتماد ہے جو انہوں نے جہادی کیمپوں کے خاتموں اور پاکستان کی طرف سے لائن آف کنٹرول پار کرنے والے لوگوں پر پابندی کے سلسلے میں کروائی ہیں۔ امریکہ ان اقدامات کو انتہائی اہم بھی کہتا ہے۔ اور اس سے پاکستان کے ماحول اور فضا میں مثبت تبدیلیاں بھی آرہی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ امریکہ اور پاکستان اسی طرح مل جل کر ایک سمت میں آگے بڑھتے رہیں گے۔ سب سے زیادہ اہم امر یہ ہے کہ صدر جنرل پرویز مشرف مستقبل کے پاکستان کو جدید تر اور محفوظ تر بنانے کے لیے کوشاں ہیں۔ ہمیں اعتماد ہے کہ وہ اپنے ان اقدامات پر عملدرآمد میں کامیاب ہوں گے۔ یہ پاکستان کے لیے بھی بہتر ہوگا۔ اور امریکہ سے تعلقات میں بھی اس سے پیش رفت ہوگی۔ افغانستان میں القاعدہ کی سرگرمیوں کا خاتمہ..... پاکستان میں انتہاپسند رجحانات کی سرکوبی بھارت کے لیے بھی مفید ہوگی۔

وہ کہہ رہے ہیں کہ امریکہ بھارت تعلقات میں اس عرصے میں معنی خیز تبدیلیاں آئی ہیں۔ سرد جنگ میں یہ تعلقات کبھی بھی اچھے نہیں رہے تھے۔ بلکہ یہ ڈیپ فریزر میں رکھ دیئے گئے تھے۔ اب امریکہ بھارت تعلقات بہت آگے چلے گئے ہیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان دفاعی تعاون پر اعلیٰ سطح کے اجلاس ہوئے ہیں۔ جن کا پہلے کبھی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ان بڑھتے ہوئے تعلقات کو یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ یہ کسی تیسرے ملک سے دوستی کی قیمت پر ہورہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ نہ یہ بھارت کی طرف جھکاؤ کہلا سکتا ہے.....ہم سب اپنی اپنی اقدار کے لیے کام کریں.....اپنے مسائل کے حل کے لیے آگے بڑھیں اسی تناظر میں اپنے تعلقات میں پیش رفت حاصل کریں.....سب ملکوں کے درمیان دو طرفہ تعلقات کی بنیاد پر بات آگے بڑھے

گی۔ یہ ضروری نہیں کہ بھارت کے لیے اگر امریکہ اچھا کرے تو یہ پاکستان کے لیے برا ہوگا۔ اور نہ ہی یہ کہ پاکستان کے لیے اگر کچھ اچھا ہو تو وہ بھارت کے لیے برا ہو۔

وہ واضح طور پر بتا رہے ہیں کہ اگر صدر جنرل مشرف جدید جمہوری پاکستان قائم کر رہے ہیں تو یہ بھارت کے لیے بری خبر نہیں ہے۔ یہ اس کے لیے بھی اچھی خبر ہے۔ یہ بالکل واضح بات ہے کہ ہم کسی ایک ملک کی طرف نہیں جھک رہے ہیں۔

بنگلہ دیش سے بھی امریکہ کے تعلقات بہتر ہیں۔ بنگلہ دیش نے دنیا میں قیام امن کے لیے اپنی فوجیں بھیجی ہیں۔ انہوں نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ امریکہ اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ ہمارے وفد میں شامل ایڈیٹر کے متعلقہ ممالک سے امریکہ کے تعلقات پر باری باری اظہار خیال کر رہے ہیں۔

پھر انہوں نے بات شروع کر دی ہے۔ اسلامی انتہا پسندی کی۔ وہ اپنی رو میں کہے جا رہے ہیں کہ اسلامی انتہا پسندی نے دنیا کے لیے بہت خطرات پیدا کر دیئے ہیں۔

یہاں ہم نے ان کی گفتگو میں مداخلت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ اصطلاح غلط ہے۔ انتہا پسندی تو انتہا پسندی ہے۔ یہ ہر مذہب میں ہر معاشرے میں پائی جاتی ہے۔ یہودیوں میں بھی انتہا پسند موجود ہیں۔ عیسائیوں میں بھی۔ ہندوؤں میں بھی۔ ان کے لیے صرف انتہا پسند کی ترکیب استعمال ہوتی ہے۔ لیکن مسلمانوں میں جو انتہا پسند ہیں۔ انہیں اسلامی انتہا پسند کہا جاتا ہے۔ ہمارے وفد میں سے اکثریت نے اس انداز فکر کی مذمت کی ہے۔ ہم کہہ رہے ہیں کہ امریکی سرکاری عہدیداروں دانشوروں کو اپنی اصلاح کرنی چاہیئے۔ اسلام بطور مذہب انتہا پسندی..... دہشت گردی اور تشدد کی کہیں بھی حمایت نہیں کرتا ہے۔ جب اہل مغرب اسلامی انتہا پسندی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو پورے مسلمان اس ترکیب سے مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح دہشت گرد..... اور انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے جو کوششیں کی جارہی ہوتی ہیں۔ انہیں نقصان پہنچتا ہے۔

یہ امریکی عہدیدار اس امر سے اتفاق کر رہے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں کہ وہ واقعی غلطی پر تھے۔ آئندہ وہ یہ اصطلاح استعمال نہیں کریں گے۔

ان کی گفتگو کی روانی اس قطع کلامی سے ٹوٹ چکی ہے۔ اور اب وہ مختلف امور پر اظہار خیال کر رہے ہیں۔ بھارتی ایڈیٹران سے پوچھ رہے ہیں کہ امریکہ پاکستان پر دباؤ ڈال کر سرحد پار دہشت گردی ختم نہیں کر رہا۔ ہماری پارلیمنٹ پر حملہ ہوا۔ جو ہماری جمہوریت کی علامت ہے۔ ان کا سوال طویل ہے۔ لیکن امریکی عہدیدار بہت اطمینان اور قطعیت سے کہہ رہے ہیں کہ ہم انتہائی سنجیدگی سے صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف کی ان یقین دہانیوں پر اعتماد کر رہے ہیں جو انہوں نے سرحد پار دہشت گردی کے خلاف کروائی ہیں۔ ہمیں پورا بھروسہ ہے کہ اب یہ سلسلہ رک چکا ہے۔

افغانستان سے متعلقہ سوال پر وہ کہہ رہے ہیں کہ امریکہ اپنے طویل المیعاد وعدے پورے کرے گا۔ اور وہاں امن قائم ہوگا۔ جدید جمہوری افغانستان کی تعمیر ہوگی۔

افغانستان میں تعمیر نو کے لیے کوششیں جاری ہیں۔

ان سے کہا جا رہا ہے کہ اب تک امریکہ نے مختلف ممالک میں مختلف مواقع پر جمہوریت اور امن کے قیام کے لیے فوجیں بھیج کر جو کوششیں کی ہیں۔ ان میں کامیابی کا تناسب بہت کم رہا ہے۔ کارنیگی انسٹی ٹیوٹ کی ایک رپورٹ میں اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔

وہ بڑی سادگی سے جواب دے رہے ہیں کہ ایسی کوئی رپورٹ ان کے علم میں نہیں ہے ہم کہہ رہے ہیں کہ ہمیں امریکی فوجیوں سے پوری ہمدردی ہے کہ وہ دور دراز ملکوں میں جا کر اپنی حکومت کے کہنے پر جانیں دے رہے ہیں۔ لیکن یہ اختیار امریکہ کو کس نے دیا ہے۔ اب تک عراق کے لوگ امریکہ کو اپنا نجات دہندہ کیوں نہیں کہہ رہے ہیں۔

وہ کہہ رہے ہیں کہ یہ تو طویل بحث ہے کہ امریکہ کو ایسا اختیار کس نے دیا ہے..... اب امریکہ کا اصول یہ ہے کہ کسی بھی ملک میں امریکی مفادات کو خطرہ ہوگا، امریکہ وہاں کارروائی کر سکتا ہے۔

تو کیا اقوام متحدہ کی اب کوئی اتھارٹی نہیں ہے؟

"اتھارٹی ہے۔ اسی کے چارٹر کے تحت امریکہ ایسا کر رہا ہے۔ جہاں تک عراق کے لوگوں کا سوال ہے وہ اب تک خوفزدہ ہیں کیونکہ اب تک ایسا کوئی ثبوت ان کے سامنے نہیں آیا

کہ صدام حسین واقعی ختم ہوگیا ہے۔ اب وہ دوبارہ حکومت میں نہیں آئے گا۔ جس دن صدام حسین پکڑا جائے گا امریکہ کی بڑی کامیابی ہوگی۔ اسی طرح اسامہ بن لادن کی گرفتاری بھی بڑا کارنامہ ہوگی۔ القاعدہ کے سخت جان مجاہدؔ بھی ابھی تک سرگرم ہیں اسی طرح بعث پارٹی کے سخت جان کارکن بھی عراق میں کاروائیوں میں مصروف ہیں۔

پینٹاگون کی بریفنگ مکمل ہورہی ہے۔ واقعی یہاں امریکی ذہن کو پڑھنے کا موقع ملا ہے تمام عہدیداروں نے کھل کر اپنا موقف بیان کیا ہے۔ ہمیں صحیح معنوں میں یہ جاننے کا اتفاق ہوا ہے کہ امریکہ کیا سوچ رہا ہے۔

باتیں ایک جہاندیدہ سفارت کار کی

پینٹاگون سے ہم پھر انہی تصویروں کے درمیان سے گزر رہے ہیں۔ کوریا، ویت نام، ہیٹی، صومالیہ، سیرالیون ہمارے اردگرد ہیں۔ افغانستان، عراق کا اضافہ ابھی ہونا ہے..... ایک سارجنٹ ہمیں اپنی معیت میں لے کر چل رہا ہے۔ کہیں کوئی اِدھر اُدھر نہ ہوجائے۔

ہوٹل سے تو ہم چیک آؤٹ کر چکے ہیں۔ اگلی ملاقات اڑھائی بجے ہے۔ دوپہر کے کھانے کے لیے طے ہوا ہے کہ یونین اسٹیشن پر قسمت آزمائیں گے۔ جو امریکہ کا مرکزی ریلوے اسٹیشن ہے۔ ریل امریکہ کا سب سے زیادہ عوامی وسیلہ سفر ہے۔ واشنگٹن کا یہ ریلوے اسٹیشن اپنی طرز تعمیر کے حوالے سے بھی منفرد ہے۔ اس کا ہال تو ایک وسیع جلسہ گاہ لگتی ہے۔ جہاں ہر لمحے سینکڑوں لوگ آجا رہے ہوتے ہیں۔ مقامی ٹرینیں بھی یہاں رکتی ہیں..... دوسرے شہروں اور ریاستوں کو جانے والی ٹرینیں بھی یہیں سے آتی جاتی ہیں۔

انتظار گار میں ہر قسم کی سہولت ہے۔ ہر طرح کی نشستیں ہیں۔ آرام سے بیٹھیں۔ انتظار کریں، گفتگو کریں..... یہ مقام ملاقات بھی ہے..... ایک طرف دکانوں کا سلسلہ ہے..... تحائف اور سوغاتیں دستیاب ہیں..... جیولری کی کئی خوبصورت دکانیں ہیں..... ملبوسات..... کتابوں کے اسٹور، عام اسٹور..... خوشبوئیں..... بچوں کے کھلونے.....

ایک پورا حصہ ریستورانوں کا ہے..... ہر طرح کا ہر ملک کا کھانا دستیاب ہے.....

میکڈونلڈ ..... کے ایف سی ..... امریکن فوڈ ..... چینی ریستوران ..... انڈین ..... پاکستانی ..... تھائی ..... عربی ..... ایرانی ..... یونانی ..... افغانی ..... صرف سلاد ..... ڈائننگ کرنے والوں کے لیے ..... ہم سب اپنے اپنے کھانے لے کر بیٹھ گئے ہیں سب خوش ہیں مطمئن ہیں کہ سب کو اپنی اپنی پسند کی ڈشیں مل گئی ہیں۔ خواتین ایسے موقع پر بڑی دریا دلی کا مظاہرہ کرتی ہیں ..... دوسروں کے لیے بھی کھانے لے آتی ہیں ..... کم پڑے تو خود بھاگتی ہیں یہاں بہت ہی کم ریستورانوں میں ویٹرز کی سروس ملتی ہے۔ زیادہ تر خود ہی قطار میں کھڑے ہوکر نقد ادائیگی کے بعد ٹرے میں روٹی ..... سالن ..... پانی ..... کولڈ ڈرنک اٹھانا پڑتا ہے۔ پھر بیٹھنے کے لیے جگہ تلاش کرنی ہوتی ہے۔ رش زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری نہیں ہے کہ پوری پارٹی یا وفد کو ایک میز مل سکے۔ تقسیم بھی ہوجانا پڑتا ہے ..... سب اپنی اپنی دنیا میں اتنے مگن ہوتے ہیں کہ کوئی ایک دوسرے کی طرف دیکھتا ہے نہ فکر کرتا ہے۔ سب اپنے اپنے کام پر ہیں درمیان میں کچھ وقت کھانے کے لیے ملا ہے۔ اس سے فوراً فارغ ہوکر واپس دفتر پہنچنا ہے۔ گپ شپ کے لیے وقت نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے کہ افسر کا ڈر ہے۔ دفتر دیر سے پہنچیں گے تو ڈانٹ پڑے گی یا شرمندہ ہونا پڑے گا۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ تصور ہی نہیں ہے کہ دفتر دیر سے بھی پہنچا جاسکتا ہے۔

کھانا کھانے کے بعد طے ہوا ہے کہ سب گھوم پھر لیں۔ شاپنگ کرنا ہوتو تو کرلیں ..... لیکن 2.15 پر اسٹیشن کے باہر کھڑی لیموزین میں پہنچ جانا ہے ..... ورنہ گاڑی چھوڑ کر چلی جائے گی۔

میں نے سیدھے یک اسٹور کا رخ کیا ہے ..... دیگر تحائف ..... سوغاتیں ..... کپڑے ..... جوتے ..... خوشبوئیں تو پاکستان میں بھی مل جاتی ہیں۔ مگر تاریخ ..... سیاسیات ..... حالات حاضرہ پر تازہ ترین کتابیں تو وہاں نہیں ملیں گی۔ اسلام جہاد پر ریسرچ ہورہی ہے ..... یہاں کتابیں اہتمام سے لکھی جاتی ہیں ..... احتیاط سے شائع کی جاتی ہیں۔ پاکستان بھی اس وقت امریکی محققین اور مصنفین کا پسندیدہ موضوع ہے۔ یہاں کی مذہبی انتہا پسندی ..... دینی مدارس القاعدہ کی سرگرمیاں ..... فوج کا سیاسی کردار، اکثر اسکالرز اور جرنلسٹوں کی کتابوں کا محور ہیں۔

موجودہ امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کو عام طور پر بہت کم ذہین بلکہ غبی کہا جاتا ہے۔ یہ بھی کسی نے حساب لگایا ہے کہ جتنے امریکی صدر اب تک گزرے ہیں۔ ان میں سے سب سے

کم ذخیرۂ الفاظ رکھنے والے موجودہ صدر ہیں۔ ان کے خلاف بھی کتابیں مارکیٹ میں آگئی ہیں۔ ٹی وی چینلوں پر تو ان سے متعلق کئی کامیڈی اور پیروڈی پروگرام چلتے ہیں۔ میں نے اسٹور کی سیلز خاتون سے کہا ہے کہ مجھے صدر بش کے خلاف کتابیں چاہئیں۔ وہ بہت خوش ہوئی ہیں۔ دوڑتی بھاگتی ایسی کتابیں تلاش کررہی ہے۔ "It is still the economy" stupid۔ پال بیگالا نے یہ کتاب جارج بش کو مخاطب کرکے لکھی ہے کہ احمق یہ اب بھی معیشت ہی ہے۔ ایک کتاب صدر کی بدحواسیوں سے متعلق ہے۔ جس میں ان کی مخصوص زبان کے حوالے سے ایسے اقوال جمع کیے گئے ہیں۔ جو غلط زبان کا شاہکار ہیں۔ جس میں تمام اقتباسات اور اقوال کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ یہ تقریر کہاں اور کب ہوئی تھی۔

امریکہ میں خود تنقیدی بھی ہوتی ہے۔ اس حوالے سے بھی بہت کتابیں دستیاب ہیں "امریکی طاقت کا مخمصہ ..... بدمعاش ریاست"

ان سب میں امریکی حکومت کی غلط پالیسیوں، بے وقت بے محل فیصلوں کے بارے میں تفصیل سے لکھا گیا ہے ایک کتاب مجھے یہ اچھی لگی ہے۔ یہ بھی اسی خاتون نے ڈھونڈ کر دی ہے۔ "Coloring the news" اخبارات و رسائل اور ٹیلی ویژن خبروں میں اپنا تعصب کیسے بھرتے ہیں۔ ایک تجربہ کار صحافی نے امریکہ کی جدید تاریخ میں سے کئی ایسے واقعات تلاش کیے ہیں۔ جہاں بڑے بڑے ممتاز اخبارات نے خبروں میں حاشیہ آرائی کی۔ اپنے نقطہ نظر سے سیاق و سباق میں رنگ بھرے۔

وقت ہوگیا ہے۔ اس لیے میں اب لیموزین کی طرف بھاگ رہا ہوں۔ میں تو ڈر رہا ہوں کہ میں سب سے آخر میں پہنچا ہوں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خواتین ابھی نہیں پہنچی ہیں۔ ہمارے وفد میں تو خاتون ایک ہی ہے۔ لیکن ہماری میزبان بھی خاتون ہیں۔ اسے ہمیشہ اس خاتون کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ افغانستان تو غریب ملک ہے۔ مگر یہ افغان ایڈیٹر کافی متمول ہے۔ ان کے احباب، رشتے دار کافی تعداد میں ہیں وہ ہمیشہ کسی نہ کسی کے لیے کوئی سوغات پسند کرنے اور خریدنے میں دیر لگادیتی ہیں۔ جولیانہ پریشان ہوتی ہے۔

ہم سب لیموزین میں بیٹھ چکے ہیں ..... جس کا ڈرائیور فلسطینی ہے ..... اسے ملک چھوڑے

ایک عرصہ ہو چکا ہے..... لیکن خبروں سے دلچسپی ہے... جب موقع ملتا ہے وہ پاکستان کے بارے میں بھی بہت کچھ پوچھتا ہے ..... کبھی کبھی اسے یروشلم کی یاد آتی ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھی بھر آتے ہیں .....

میریڈیان سینٹر سے تو اس لیموزین کی پرانی یاری لگتی ہے۔ ڈرائیور کے موڑے بغیر بھی یہ خود ادھر مڑ جاتی ہے۔

میریڈیان ہاؤس لائبریری نے ہمیں پھر اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ پرانی کتابیں الماریوں کے شیشوں سے جھانک جھانک کر ہمیں بلا رہی ہیں ..... یہاں پینٹنگز بھی بڑی نایاب آراستہ ہیں۔ ایک طرف کافی چائے اور بسکٹ رکھے ہیں۔ تازہ دم ہونے یا گفتگو کے دوران نیند کے جھونکوں سے بچنے کے لیے کافی مدد ملتی ہے۔

ابھی بات چیت رہے گی۔ دی آنریبل رابرٹ اوکلے سے جو اس وقت نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی کے معزز فیلو ہیں.....

رابرٹ اوکلے ہم پاکستانیوں کے لیے کوئی اجنبی نام نہیں ہے۔ وہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے پہلے دور میں ہمارے ہاں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سفیر رہ چکے ہیں۔ بلکہ تاریخ یہ کہتی ہے کہ جب امریکہ نے اپنا سفیر اور پاکستان جنرل ضیاء الحق کے طیارے کے حادثے میں ان کے ساتھ ہی کھو دیا تھا۔ تو اگست 1988ء میں اوکلے سفیر مقرر ہوئے۔ اور ستمبر 1991ء میں یہیں ریٹائر بھی ہوئے۔ ہمیں یاد ہے کہ ان دنوں اپوزیشن پارٹیاں کہا کرتی تھیں کہ امریکی سفیر اسلام آباد میں ایک وائسرائے کی طرح گھومتے پھرتے ہیں۔

رابرٹ اوکلے کا اپنی محکمۂ خارجہ کی ملازمت کے دوران زیادہ تر افریقہ.....مشرق وسطیٰ اور ایشیا کے امور سے تعلق رہا۔ ستمبر 1974ء میں وہ نیشنل سیکورٹی کونسل کے اسٹاف میں مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کے امور کے سینئر ڈائریکٹر بنے۔ فروری 1977ء میں ڈپٹی اسسٹنٹ سیکرٹری برائے مشرقی ایشیا اور پیسفک .....نومبر 1979ء میں زائر میں امریکی سفیر..... اگست 1982ء میں صومالیہ میں امریکی سفیر..... ستمبر 1984ء میں محکمۂ خارجہ کے دہشت گردی کے دفتر کے ڈائریکٹر..... یکم جنوری 1987ء میں نیشنل سیکورٹی کونسل اسٹاف میں مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا

کے لیے صدر کے معاون بنے یہیں سے وہ اگست 1988ء میں پاکستان میں امریکی سفیر بن کر آئے جب پاکستان ایک عبوری دور سے گزر رہا تھا۔ یہیں سے وہ ستمبر 1991ء میں محکمہ خارجہ سے ریٹائر ہوئے۔ دسمبر 1992ء میں صدر بش نے انہیں صومالیہ میں خصوصی ایلچی بنا کر بھیجا۔ جہاں بحالی امید کے آپریشن میں انہوں نے مارچ 1993ء تک خدمات انجام دیں۔ یہ بھی ایک اہم مشن تھا۔ اکتوبر 1993ء میں انہیں صدر کلنٹن نے پھر صومالیہ میں خصوصی ایلچی کی حیثیت سے مقرر کیا۔ مارچ 1994ء تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے۔

صومالیہ میں اپنے تجربات و شواہد پر مبنی ایک کتاب کے وہ معاون مصنف ہیں اس کتاب کا نام Operation Restore Hope ہے۔ کارروائی برائے بحالی امید۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس انسٹی ٹیوٹ آف پیس نے یہ کتاب 1995ء میں شائع کی۔ ایک اور کتاب میں وہ معاون ایڈیٹر تھے۔ جو قیام امن میں پولیس کی شمولیت پر لکھی گئی۔ نئے عالمی نظام میں پولیس کا استعمال ..... یہ نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی نے 1998ء میں شائع کی۔ کتابوں کے علاوہ بڑی تعداد میں مختلف موضوعات پر ان کے مضامین اور تقاریر قابل ذکر ہیں۔

ان کی گفتگو کا موضوع ہے:

11 ستمبر کے بعد جنوبی ایشیا میں امریکی خارجہ پالیسی میں تبدیلیاں اور مستقبل کی ممکنہ جہات۔

رابرٹ اوکلے اب بہت معمر ہو چکے ہیں۔ لگتا ہے کہ اپنی صحت اور جسم کی حفاظت کے لیے بہت محنت کر رہے ہیں..... جھریوں نے چہرے کو پوری طرح لپیٹ میں لے لیا ہے۔ آنکھیں بتاتی ہیں کہ کتنے مشاہدے کتنے تجربے ان جھیلوں میں تیر رہے ہیں۔

ہم سب ہمہ تن گوش ہیں۔ ہمیں یہ قوی احساس ہے کہ آنریبل رابرٹ اوکلے کی گفتگو سے ہم بہت کچھ حاصل کریں گے۔ یہ بات چیت ہمارے علم میں یقیناً اضافہ کرے گی۔ انہیں صومالیہ کی یاد بھی آ رہی ہے۔ وہاں قیام امن کی کوششوں کے دوران امریکی فوجیوں کے ساتھ جو سلوک ہوا۔ انہیں کوئی بھی یاد کرنا نہیں چاہتا ہے۔ اس لیے پہلے چند منٹ کے ساتھ ہی اس جہاندیدہ سفارت کار کی گفتگو کا رخ جنوبی ایشیا کی طرف ہو گیا ہے۔

وہ بتا رہے ہیں کہ جنوبی ایشیا ہمیشہ ہی امریکہ کے نزدیک ایک اہم اور حساس خطہ رہا

ہے۔ بھارت اور پاکستان ایک دوسرے کے شدید حریف ممالک ہیں۔ افغانستان اب 11 ستمبر کے بعد پھر ایک اہم ملک بن گیا ہے۔

بھارت کے حالیہ ایٹمی دھماکے کے بعد امریکہ اور بھارت کے دوطرفہ تعلقات پھر سے پرجوش ہوئے ہیں۔ کیونکہ امریکہ نے اپنی پالیسی پر نظرثانی کی۔ ٹالبوٹ مذاکرات نے بھارت امریکہ تعلقات میں تبدیلی میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی وقتاً فوقتاً بڑھتی رہی ہے۔

11 ستمبر کے دہشت گردی کے واقعات کے بعد پاکستان امریکہ کے لیے ایک بار پھر اہمیت اختیار کرگیا۔ یہ عین اس وقت ہوا جب امریکہ اور بھارت ایک دوسرے کے بہت قریب آرہے تھے۔ 11 ستمبر کے بعد امریکہ کو ضرورت تھی۔ پاکستان نے سیکورٹی اور انٹلی جینس کے تبادلے میں بہت تعاون کیا۔ اس طرح پھر امریکہ نے سوشل سیکٹر، معیشت، سیاسی اصلاحات، تنازعات کے تصفیے اور دہشت گردی کے انسداد میں پاکستان کو باقاعدہ امداد دی۔ یوں تو جنوبی ایشیا کے دوسرے ممالک سری لنکا، نیپال، بنگلہ دیش، بھارت بھی اس سلسلے میں بہت بامعنی تعاون کررہے تھے۔ لیکن پاکستان کا حصہ بہت گرانقدر اور مثالی تھا۔

وہ بتارہے ہیں کہ وہ جب پاکستان میں بطور سفیر موجود تھے۔ اس وقت کے پاکستان اور اب کے پاکستان میں بہت فرق ہے۔ انہیں تشویش بھی تھی کہ پاکستان کی سیاست اور طرز زندگی میں جو تبدیلیاں آرہی تھیں وہ منفی تھیں۔ لیکن یہ اطمینان کی بات ہے کہ صدر جنرل پرویز مشرف نے ایک راستہ اختیار کیا۔ ایک واضح راستہ ...... ایک قطعی راستہ ...... اور وہ پاکستان کی پالیسیوں میں بڑی نمایاں تبدیلیاں لائے ہیں۔ یہ اگرچہ مکمل تبدیلی نہیں ہے لیکن یہ تبدیلی ہے۔

یہ بہت مشکل اور متنازع معاملہ ہے ...... القاعدہ کی سرگرمیوں کو ختم کیا جائے۔ طالبان کے ایسے افراد کے خلاف کاروائی جو القاعدہ کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں۔ صرف افغانستان میں ہی نہیں کشمیر میں بھی۔ پاکستان کی فوج نے کشمیر میں اسلامی تنظیموں کو متعارف کروایا...... کشمیری قوم پرستوں کو امداد دی ...... جس سے بھارت کے کشمیر میں ایک پنڈورا باکس کھل گیا۔ کشمیر پاکستان کے نزدیک بنیادی مسئلہ ہے ...... ادھر سرحد پار دہشت گردی کو بھارت نے بنیادی مسئلہ بنالیا ہے۔ پاکستان کی کشمیریوں کی حمایت سے قطع نظر القاعدہ کے طالبان اور پاکستان میں اسلامی تنظیموں سے روابط رہے ہیں۔ القاعدہ جنوبی ایشیائی تنظیم تو نہیں ہے۔ لیکن اسے فنڈز ملتے رہے ہیں۔ یہ بھی یہاں کی جہادی تنظیموں کو فنڈز فراہم کرتی رہی ہے۔

ہم القاعدہ کے خلاف کوششوں میں مصروف تھے۔ ہمارے اہداف طویل المیعاد تھے۔ یہ کوششیں اگرچہ مکمل طور پر کامیاب نہیں رہی ہیں۔ لیکن پھر بھی آگے بڑھ رہی ہیں۔ پاکستان میں صدر پرویز مشرف 11 ستمبر سے پہلے سے ہی ملکی معیشت کو مستحکم کرنے کے لیے میکرو اکنامک اصلاحات کررہے تھے۔ ادھر بھارت اور امریکہ کے درمیان بھی تعلقات بڑھ رہے تھے، انفارمیشن ٹیکنالوجی میں باہمی تعاون سب ہی جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی معیشت میں بہت سے شعبوں میں تعاون بڑھ رہا تھا۔ بھارت کے چین کے بارے میں شکوک وشبہات بھی پہلے سے تھے۔ پھر امریکہ بھی چاہتا تھا کہ بھارت چین کے مقابلے میں ایک اقتصادی طاقت بنے۔

وہ کہہ رہے ہیں کہ یہ اچھی بات ہے کہ گیارہ ستمبر کے بعد بھارت آگے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ امریکہ کی ترجیح یہ ہے کہ جنوبی ایشیا ...... جنوب مشرقی ایشیا یعنی افغانستان، ایران میں امن قائم ہو ...... خوشحالی ہو ...... سول سوسائٹی قائم ہو ...... اس لیے ہم پاکستان اور بھارت کے درمیان مذاکرات کی بحالی چاہتے ہیں۔ بھارت، افغانستان تعلقات قائم ہورہے ہیں۔ بھارت، عراق تعلقات کا ماضی بھی ہمارے پیش نظر ہے۔

سرحد پار دہشت گردی ...... پاکستان سے لائن آف کنٹرول کے ذریعے مسلح افراد کی کشمیر میں مداخلت بھارت اور امریکہ کی مشترکہ فکر ہے۔ اس سلسلے میں کوششیں جاری ہیں۔ پاکستان نے اس ضمن میں جو یقین دہانیاں کروائی ہیں۔ امریکہ کو کافی حد تک اطمینان ہے۔ بھارت بھی کسی حد تک مطمئن ہورہا ہے۔ صدر پرویز مشرف کی کوششیں یقیناً قابل قدر ہیں ان کا دم غنیمت ہے۔ یہ طے شدہ امر ہے اور بھارت کو بھی اس امر کا احساس ہے کہ پاکستان میں اگر طالبان جیسی حکومت قائم ہوگئی تو یہ اس کے لیے بھی خطرناک ہوگا۔

ہمیں بتایا جارہا ہے کہ امریکہ کو جنوبی ایشیا کے تمام ممالک کے اندرونی مسائل کا احساس بھی ہے۔ اور اس کی نظر بھی ان امور پر رہتی ہے۔ پاکستان. بھارت میں 13 ماہ پہلے جنگ چھڑ

سکتی تھی۔ دونوں کی فوجیں سرحدوں پر آمنے سامنے کھڑی تھیں۔ دونوں ایٹمی ملک ہیں...... دنیا بھر کو خطرہ تھا...... اسی لیے مداخلت کی گئی...... یہ خطرہ مشکل سے ٹلا...... کشمیر میں بھی اب تصفیے کی کوششیں کی جارہی ہیں ......لیکن پاک بھارت تعلقات اپنی عجیب نوعیت کے ہیں۔ یہاں اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔

بھارت اور پاکستان دونوں کو مل جل کر کچھ کرنا ہوگا۔ یہ دونوں کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ علاقے میں ہی نہیں دنیا بھر میں امن اور ہم آہنگی کے لیے دونوں ملکوں کے درمیان مفاہمت ضروری ہے۔ بھارت ...... وسطی ایشیا اور پاکستان میں کھلی آمدورفت ہو...... تجارت ہو......اس میں کے لیے طویل عرصہ درکار ہے۔ افغانستان بھی اب جنوبی ایشیا ہی کا حصہ ہے۔ یہاں باقاعدہ جمہوری حکومت کا قیام اور اقتصادی ترقی عالمی برادری کی منزلیں ہونی چاہئیں۔ افغانستان کا شدت پسندی کا منظر ایران کی طرف منتقل ہورہا ہے۔ بش انتظامیہ کا مفاد بھی اس میں ہے کہ افغانستان میں جلد از جلد ایک جمہوری نظام قائم ہوجائے۔

سری لنکا کے بارے میں وہ کہہ رہے ہیں کہ اس وقت کوئی بڑی تشویش کی بات نہیں ہے۔ اقتصادی طور پر کچھ معاملات بہتر ہورہے ہیں۔

بنگلہ دیش میں بھی ایسی زیادہ تشویشناک صورت حال نہیں ہے۔ عالمی قیام امن کی کوششوں میں بنگلہ دیش تعاون کررہا ہے لیکن یہاں بھی وہی اسلامی تنظیمیں ہیں۔ یہ انتہا پسندی کے رجحانات رکھتی ہیں۔ بنگلہ دیش سے بھی لوگ جہاد افغانستان میں شامل رہے ہیں۔

کشمیر ایک اہم مسئلہ ہے۔ سفارت کار اس پر کام کررہے ہیں۔ کشمیر سٹڈی گروپ قائم ہوئے ہیں۔ جو بہت گہری تحقیق کررہے ہیں۔ سفارشات مرتب کررہے ہیں۔ امریکہ کسی ایک فریق کا حامی نہیں ہے۔ بھارت پر بھی زور دیا جارہا ہے کہ وہ کشمیر میں شہریوں کی جان و مال کی حفاظت یقینی بنائے۔ حقوق انسانی کی پامالی روکے۔ صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف اب بارہا یقین دلارہے ہیں کہ اب سرحد پار کچھ نہیں ہورہا ہے۔ مداخلت نہیں ہورہی ہے۔ پاکستان بھارت کے درمیان فضائی، زمینی اور ریل کی سروس بحال ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک دوسرے پر اعتماد قائم ہو۔

وہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کے حوالے سے یہ تشویش ہے کہ یہاں مسلح افواج مذہبی عناصر کے ساتھ اقتدار میں شریک ہیں۔ مذہبی شدت پسندوں کے ساتھ مسلح افواج کا اشتراک خود پاکستان کے لیے خطرناک ہے کیونکہ وہاں قائم ہوتی ہوئی سول سوسائٹی اس کی زد میں آسکتی ہے۔ بتایا جارہا ہے کہ امریکی انتظامیہ دونوں ملکوں سے تعلقات بہتر رکھنا چاہتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ صدر کلنٹن نے اپنے تناظر میں بھارت کو زیادہ اہم قرار دیا۔ صدر بش کا خیال بھی یہی تھا۔ اس کی وجہ بھارت کا ایٹمی دھماکہ تھا۔ اس کے بعد امریکہ میں یہ فکر نمو پائی کہ بھارت سے تعلقات پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ لیکن یہ سوچ 11 ستمبر سے پہلے تھی۔ اس کے بعد پاکستان کی اہمیت پھر بڑھ گئی۔ بھارت سے یکطرفہ طور پر تعلقات بڑھانا اب مناسب نہیں تھا۔ اس لیے 11 ستمبر کے بعد یہ سوچ تیزی سے امریکی انتظامیہ اور رائے عامہ میں آگے بڑھی کہ پاکستان اور امریکہ دونوں کے درمیان کشیدگی کم کروائی جائے۔ پاکستان بھارت دونوں ایٹمی ممالک ہیں۔ اس لیے ایٹمی اثاثوں کی سلامتی بھی اہم مسئلہ ہے۔ دونوں کے درمیان کشمیر سب سے متنازع معاملہ ہے۔ اس لیے اس کا حل ناگزیر ہے اس لیے اس ضمن میں اب سنجیدگی سے کوششیں بھی کی جارہی ہیں۔

امریکی انتظامیہ کے نزدیک ایک سنگین مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان اور شمالی کوریا کے درمیان ایٹمی ٹیکنالوجی کی منتقلی کے معاملات ہوئے ہیں۔ پاکستان اس سے انکار کرتا ہے۔ لیکن عالمی برادری اور ایجنسیوں کے پاس کچھ شواہد موجود ہیں۔

1994ء کے بعد چین کی خارجہ پالیسی میں تبدیلیاں آئی ہیں۔ کارگل میں جو کچھ ہوا۔ چین نے پاکستان کی حمایت نہیں کی۔ اسے آگے بڑھنے سے روکا۔ چین اس وقت بھارت سے تعلقات کو معمول پر لارہا ہے۔

ایک سوال پر کہا جارہا ہے کہ کشمیر کے مسئلے کے حل میں امریکہ معاونت کرسکتا ہے۔ سہولتیں پہنچاسکتا ہے۔ لیکن وہ کوئی روڈ میپ جاری نہیں کرسکتا۔ بھارت اور پاکستان اس مسئلے کو جس اچھی طرح سمجھتے ہیں اور کوئی نہیں سمجھتا۔ اس لیے اس کے حل کے لیے کیا وہی دونوں ٹھوس اقدامات کرسکتے ہیں۔

ایک اور سوال پر وہ کہہ رہے ہیں۔ کشمیری یقیناً اس مسئلے کے فریق ہیں۔ لیکن جب حق خودارادیت کی بات ہوگی تو پھر سارے کشمیریوں کو اس دائرے میں لانا ہوگا۔ وہ لوگ بھی جو پاکستان میں شمالی علاقوں میں رہتے ہیں۔

بھارت سے اشتراک کے ضمن میں وہ بتا رہے ہیں کہ بھارت سے امریکہ کا اقتصادی، سیاسی تعاون جاری رہے گا۔۔ نومبر میں امریکہ میں الیکشن ہوں گے۔ اس کے بعد ہی صورت حال میں تبدیلی کی کوئی توقع نہیں ہے۔

وہ انتہائی سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں .....ان کی آنکھوں میں چمک اس بات کی دلالت کر رہی ہے کہ وہ اپنے طویل تجربے کی روشنی میں جائزہ لے رہے ہیں کہ بھارت میں داخلی مسائل حل ہو رہے ہیں ان کی صورت حال بہتر ہے۔ لیکن پاکستان میں اندرونی مسائل کے حوالے سے حالات خراب ہیں۔ ان سے اس تاثر کی وضاحت کے لیے کہا گیا ہے۔ تو وہ مزید زور دے کر بتا رہے ہیں کہ پاکستان کے سنگین مسائل یہ ہیں۔

1۔ میکرو اکنامک .....توجہ نہیں ہے۔

2۔ نئی سرمایہ کاری نہیں ہو رہی ہے۔ روزگار کے مواقع بہت کم ہیں۔

3۔ سماجی مسائل حل نہیں ہو رہے ہیں۔

4۔ اسلامی پارٹیوں کی زیادہ حمایت ہو رہی ہے.....جبکہ سیکولر سیاسی پارٹیوں سے فاصلے بڑھ رہے ہیں۔

ان سے دوبارہ سوال کیا گیا ہے کہ کیا آپ پاکستان کو ایک ناکام ہوتی ہوئی ریاست کہتے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ بالکل نہیں۔ میں قطعی اور واضح طور پر یہ کہتا ہوں کہ پاکستان ناکام ہوتی ہوئی ریاست نہیں ہے۔ لیکن پاکستان کو ایسی صورت حال سے بچنے کے لیے بہت کچھ کرنا ہوگا اور انتہائی سنجیدگی سے کرنا ہوگا۔ مذہب کو سیاست میں داخل کرنا انتہائی خطرناک ہے۔ اس سے گریز کرنا ہوگا۔

امریکہ میں پیٹریاٹ ایکٹ کے حوالے سے بات ہو رہی ہے کہ اس سے تو امریکی شہریوں کی آزادیاں خطرے میں پڑ رہی ہیں۔ معمر، جہاندیدہ، سفارت کار انتہائی تاسف سے

کہہ رہے ہیں کہ میں غمزدہ ہوں..... فکرمند ہوں..... سیکورٹی کے نام پر آزادی، تحریر و تقریر کو محدود کیا جا رہا ہے۔ نجی زندگی میں مداخلت کی جا رہی ہے۔

پہلے دو عالمی جنگوں کے بعد جرمنوں اور جاپانیوں کو امریکہ میں مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ انہیں الگ کیمپوں میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

اب امریکہ میں مسلمان بھی کچھ ایسی کیفیت سے دوچار ہیں .....ان کو الگ کیمپوں میں تو نہیں بھیجا جا رہا ہے۔ لیکن ان کے ساتھ امتیازی سلوک ہو رہا ہے۔ جو ہم جیسے امریکیوں کے لیے تشویش انگیز ہے۔ انہیں پاکستان میں قیام کے حوالے سے یاد آ رہا ہے کہ 1979ء میں کچھ مسلح عناصر نے مسلمانوں کے مقدس ترین مقام خانہ کعبہ پر قبضہ کیا تو مسلم دنیا میں شدید ردعمل ہوا تھا۔ پاکستان میں بھی جلوس نکلے۔ اس وقت جنرل ضیاء کی حکومت تھی۔ اسلام آباد میں امریکی سفارت خانہ کو نذر آتش کر دیا گیا تھا۔ بعد میں اس کا معاملہ تو طے ہو گیا۔ لیکن بے نظیر بھٹو کے دور میں سلمان رشدی کے خلاف مظاہرین امریکی سنٹر پر حملہ کرنے والے تھے.....لیکن بے نظیر بھٹو نے سخت پالیسی اختیار کی۔ امریکن سنٹر کو جلنے نہیں دیا تھا۔ امریکی سفارتی حلقوں میں یہ بات بالعموم کی جاتی ہے کہ افغانستان کے حوالے سے جنرل ضیاء امریکہ کے منظور نظر تھے لیکن ان کے دور میں امریکی سفارت خانہ جل کر راکھ ہو گیا۔ بے نظیر بھٹو جو امریکہ کی منظور نظر نہیں تھیں۔ انہوں نے امریکن سنٹر کو بھی جلنے نہیں دیا تھا۔

اس بزرگ تجربہ کار سفارت کار کی گفتگو سے بھارت، پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش سب کے ایڈیٹر متاثر ہوئے ہیں..... کھری کھری باتیں ..... غیر جذباتی تجزیہ ..... ہر سوال کا جواب دیا..... کہیں گریز نہیں کیا۔ ہم سب ان کا شکریہ ادا کر رہے ہیں کہ انہوں نے کھل کر وقت بھی دیا۔ اور سنجیدگی سے حقائق سے انتہائی اہم اور سنگین امور پر بات بھی کی۔

اب ہم واشنگٹن سے روانہ ہو رہے ہیں۔ سنسناٹی ہماری منزل ہے۔

ہمیں پہلے ہی خبردار کر دیا گیا ہے کہ آج کل فضائی سفر اپنی سیکورٹی کے اعتبار سے بہت پریشان کن ہے..... تلاشی بڑی ہوتی ہے.....اس سے امریکی غیر امریکی کوئی مستثنیٰ نہیں ہے چیک آؤٹ ہم پہلے ہی کر چکے ہیں ہم میں سے اکثر مختصر سامان کے ساتھ ایئرپورٹ روانہ ہیں۔

واشنگٹن سے روانگی

واشنگٹن میں تین چار دن انتہائی مصروف گزارنے کے بعد اس کی شاہراہوں اور گلی کوچوں سے ایک انس سا ہوگیا ہے ایسا لگ رہا ہے کہ ہم برسوں سے یہاں رہ رہے ہیں۔

واشنگٹن مرکزی شہر کی آبادی پانچ لاکھ بہتر ہزار ہے۔ لیکن ملحقہ میٹروپولیٹن علاقہ 72 لاکھ 59 ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ یہ صرف امریکہ کا ہی نہیں اپنے اثرورسوخ کے حوالے سے پوری دنیا کا دارالحکومت ہے۔ امریکی حکومت کی اہم شخصیتیں تو یہاں فیصلہ سازی کے لیے موجود ہوتی ہی ہیں۔ دنیا کے کسی نہ کسی ملک کا کوئی نہ کوئی اہم عہدیدار بھی یہاں امریکی محکموں کے دفاتر میں میٹنگوں میں مصروف ہوتا ہے۔

یہ امریکی قوم کی ذہانت ....صلاحیتوں اور استعداد کا مظہر ہی ہے کہ ایشیا، افریقہ، یورپ، آسٹریلیا سے کٹا ہوا دور دراز گوشے میں واقع یہ شہر پوری دنیا کے سیاسی ، اقتصادی اور سماجی فیصلوں پر اثر انداز ہورہا ہے۔ واشنگٹن کا مزاج، کردار بین الاقوامی ہوگیا ہے ......اس کی زندگی میں دنیا بھر کے ثقافتی رنگ جھلکتے ہیں۔

واشنگٹن کا بنیادی کاروبار سیاست ہے۔ قومی بھی اور بین الاقوامی بھی۔ دیکھا جائے تو حکومت.....واشنگٹن کی سب سے بڑی صنعت ہے۔ وفاقی حکومت شہر کی سماجی اور اقتصادی زندگی پر پوری طرح غالب ہے۔ یہاں ایسے بہت سے تجارتی اور پیشہ ورانہ ادارے ہیں..... غیر

منفعت بخش تنظیمیں ہیں جو یا تو حکومت کے لیے کام کررہی ہیں۔ یا اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ سیاست یہاں کی دوسری بڑی صنعت ہے۔

واشنگٹن وفاقی ضلع کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کسی ریاست کا حصہ نہیں ہے۔ امریکی آئین نے اسے یہ درجہ دے رکھا ہے۔ پہلے تو کئی سال تک واشنگٹن کے شہریوں کو ووٹ دینے کا حق بھی حاصل نہیں تھا۔ صرف چالیس برس قبل یعنی 1964ء سے انہیں صدارتی انتخابات میں اپنی رائے استعمال کرنے کا موقع دیا گیا ہے۔ محدود مقامی حکومت کے لیے بھی واشنگٹن کو یہ اختیار 1975ء میں ملا ہے۔ اب واشنگٹن کی قیادت ایک میئر اور 13 سٹی کونسل ارکان کو میسر ہوئی ہے۔ ضلع کے ووٹرز امریکی کانگریس کے لیے ایک نمائندہ منتخب کرتے ہیں۔ لیکن اسے وہاں ووٹ دینے کا حق نہیں ہوتا۔

اسلام آباد کے شہریوں کو تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ وہ قومی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیتے ہیں اور ان کے نمائندے کو قومی اسمبلی میں ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ ان کو تو ایک سینٹر بھی ملا ہوا ہے وہ بھی ووٹ دے سکتے ہیں۔ سٹی گورنمنٹ ان کے پاس نہیں ہے۔ تو واشنگٹن کو بھی یہ 1975ء میں ملی ہے قریباً دو صدیوں بعد ......اسلام آباد والے تیں پینتیس سال میں ہی بے صبر ہورہے ہیں۔

کیپٹل کی عمارت کا سنگ بنیاد 1793ء میں رکھا گیا تھا۔ اس کے لیے کانگریس 7 سال تک بحث کرتی رہی تھی کہ ''وفاقی شہر'' کہاں ہونا چاہیئے۔ ایک فرانسیسی فوجی اور انجینئر نے پیرس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہاں کھلی کھلی سڑکیں۔ اور چوراہوں کو تعمیر کروایا۔ 1812ء کی جنگ میں شہر برطانوی فوجوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ وائٹ ہاؤس ،کیپٹل بلڈنگ اور دوسری وفاقی عمارات تباہ ہوگئی تھیں۔ خانہ جنگی شروع ہونے تک واشنگٹن 75 ہزار نفوس پر مشتمل ایک جیتا جاگتا شہر بن چکا تھا۔ شہر میں توسیع اور ترقی کے بڑے کام انیسویں صدی کے آخر میں شروع ہوئے اور اب تک جاری ہیں۔

واشنگٹن عجائب گھروں کا شہر ہے۔ یونیورسٹیوں کا مرکز ہے۔ اکثر امریکی صدور کی یادگاریں ان کے دور کی کامیابیوں اور اہم واقعات کی یادیں تازہ کرتی ہیں۔ ابھی تو ہم ان کے

درمیان سے ویسے ہی گزر رہے ہیں۔ آپ کو ان میں سے بعض مقامات پر لے کر چلوں گا۔ دیکھئے گا کہ یہ اپنے سابق حکمرانوں کو کتنے احترام اور محبت سے یاد رکھتے ہیں اور ہم اپنے سابق حکمرانوں سے کیا سلوک کرتے ہیں...... واشنگٹن میں ہی امریکہ کی سپریم کورٹ اور نیشنل کیتھڈرل (قومی گرجا گھر) واقع ہے۔ ان سب سے بھی اہم ہے۔ لائبریری آف کانگریس اور قومی آثار قدیمہ..... لائبریری آف کانگریس میں صرف امریکہ میں شائع ہونے والی کتابیں ہی نہیں۔ دنیا بھر کی زبانوں کی اہم کتابیں دستیاب ہیں۔

ہم ریگن نیشنل ایئر پورٹ پہنچ چکے ہیں۔ پرواز میں ابھی کافی وقت ہے ڈیلٹا ایئر لائن سے ہماری روانگی ہے۔ ہمیں پہلے ہی خبردار کردیا گیا ہے کہ تلاشی کے سخت مراحل سے گزرنا ہوگا۔ یہاں قطعی طور پر نفسانفسی ہوگی۔ نہ کوئی اس کا خیال کرے گا کہ ہم امریکی محکمہ خارجہ کے مہمان ہیں۔ نہ یہ کہ ہم اخبار نویس ہیں۔ اور جب آپ کے پاس یکطرفہ ٹکٹ ہو۔ تو آپ اور زیادہ مشکوک ہوجاتے ہیں۔ ہمیں اپنی منزل مقصود سنسناٹی سے واشنگٹن واپس نہیں آنا ہے۔ آگے بوسٹن جانا ہے اس لیے ہم یکطرفہ ٹکٹ والے شمار ہوں گے۔ جب چیک ان ہوتے ہیں۔ اس وقت اگر کمپیوٹر نے "S" یا "SSS" لکھ دیا۔ تو خصوصی طور پر چیکنگ ہوگی۔

ہم نے جوتے اتار کر ٹرے میں رکھ دیئے ہیں۔ موبائیل فون، سکے، اور دیگر ایسی اشیا جن میں دھات استعمال کی گئی ہے۔ وہ سب جیبوں سے نکال کر رکھنی ہوتی ہیں۔ اگر بیلٹ استعمال کرتے ہیں تو وہ بھی۔ اس کے بعد بھی اگر مشین کچھ بولے تو آپ کی پوری تلاشی لی جاسکتی ہے۔ آپ اگر ایشیائی ہیں۔ شکل سے مسلمان لگتے ہیں تو مشین کچھ نہ بھی بولے تو بھی آپ کی پوری تلاشی ہوتی ہے۔ بڑے بڑے مضحکہ خیز مناظر سامنے ہیں۔ بہت ہی معزز لگنے والے اور معمر سوٹڈ بوٹڈ گورے اپنے جوتے کوٹ اتار کر، قمیصیں پینٹ سے باہر نکال کر دونوں بازو فضا میں بلند کر کے کالے سپاہیوں کے سامنے کھڑے ہیں۔ ایک زمانے میں عامل معمول کو یہ کھیل کھیلتے دیکھا کرتے تھے۔ گھوم جا...... اب بیٹھ جا۔ سن کر معمول یہی کچھ کرتا تھا... اب فضائی کمپنیوں کے مسافر کسی بھی درجے کے ہوں۔ اسی طرح احکام بجالاتے ہیں۔ ہم تلاشی کے مراحل سے سرخرو ہوکر اپنا کوٹ پہن کر اور جوتے چڑھا کر چیکنگ زون سے باہر آرہے ہیں

لیکن ہماری میزبان جولیانہ ابھی وہیں بیٹھی ہیں جوتوں سے محروم ہیں......کافی دیر بعد وہ ہم سے آملنے میں کامیاب ہوئی ہیں تو بتارہی ہیں کہ انہوں نے جوتے اتارنے سے انکار کردیا تھا۔ کیونکہ کچھ روز ہی پہلے ہی سرکاری طور پر کہا گیا تھا کہ کوئی مسافر اگر جوتے اتارنا نہ چاہے تو انکار کرسکتا ہے..... انہوں نے اپنا یہ حق استعمال کیا...... تو تلاشی پر مامور عملے نے اپنے اختیارات استعمال کیے۔ مشین سے تو جوتے پہن کر آنے دیا۔ لیکن چیکنگ ایریا میں انہیں جوتے کوٹ اتارنے کے لیے کہا۔ پھر پرس کی بار بار تلاشی لی گئی۔ جامہ تلاشی بھی ہوئی۔

ہم سب ایشیائی ایک طرف امریکیوں کے سب سے یکساں سلوک کے قائل ہورہے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی سوچ رہے ہیں کہ یہ دراصل ہمارے لیے ایک تنبیہ ہے۔ کہ ہم جب امریکیوں سے یہ سلوک کرسکتے ہیں تو آپ کس باغ کی مولی ہیں۔

ہم یہ درس عبرت حاصل کرتے ہوئے جہاز کی طرف روانہ ہورہے ہیں۔ امریکی حکومت کے مہمان کی حیثیت سے یہ ہمارا اندرون امریکہ پہلا سفر ہے۔ قدم قدم نصیحت، اور یہ احساس کہ امریکہ اب وہ سرزمین نہیں ہے۔ جہاں آزادی ہے۔ جہاں خوابوں کو تعبیر ملتی ہے.... سیکورٹی کے لیے فکرمند..... خطرات سے خوفزدہ امریکہ تلاشیوں کے مراحل بڑھاتا جارہا ہے...... سب سے زیادہ ڈر فضائی سفر سے ہی وابستہ ہے۔

ڈیلٹا ایئر لائنز فلائٹ فضاؤں میں محو پرواز ہے۔ زیادہ تر مسافر امریکی اور سفید فام ہی ہیں۔ 6.25 پر روانہ ہوئے ہیں..... آٹھ بجے پہنچ جائیں گے..... اپنی قومی ایئر لائن پی آئی اے میں تو اندرون ملک پرواز میں اکثر ناشتہ بھی ملتا ہے... لنچ اور ڈنر بھی...... اگر ان کا وقت نہ ہو تو اسنیکس بھی اچھے خاصے ہوتے ہیں۔ ٹھنڈے مشروبات، چائے کافی، سموسہ، پیسٹی یا سینڈوچ ..... یہاں ایسا نہیں ہے۔ کینیڈا سے امریکہ آتے ہوئے بھی پانی کی چھوٹی بوتل..... ایک چھوٹا سا لفافہ نمکو کا..... یہاں بھی یہی صورت حال ہے۔ یہ نمکو ایک امریکی اداکار پال نیومین کی کمپنی کی ہے۔ جس نے یہ دعوئ کر رکھا ہے کہ ماحول کو مزید محفوظ بنانے کے لیے اس کمپنی کا منافع کسی چیرٹی کو دیا جارہا ہے۔

اسی سفر کے دوران ہماری میزبان یہ بتارہی ہے کہ ریگن نیشنل ایئر پورٹ سے اڑنے

والی پروازیں پینٹا گون کے قریب سے گزرتی ہیں۔ اس لیے اس دوران کسی مسافر کو سیٹ سے اٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ وہ ٹائیلٹ بھی جانا چاہے تو اسے جانے نہیں دیا جاتا۔ ہم سب نے ان پابندیوں پر سختی سے عمل کیا ہے۔ کیونکہ ہم امریکہ میں ہیں۔ اپنے ملک میں ایسی کسی پابندی کی ہم پروا نہیں کرتے۔ بلکہ اسے حکومت کی سازش قرار دے دیتے ہیں۔ یا کہتے ہیں کہ اقتدار کو طوالت دینے کے لیے ایسے حربے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ حوائج ضروریہ پر پابندی عائد کی جا رہی ہے۔ حقوق انسانی پامال کیے جا رہے ہیں۔

سنسناٹی امریکہ کے مرکزی شہروں میں سے نہیں ہے۔ لیکن اس کی ایئر پورٹ بھی انتہائی وسیع و عریض ہے۔ جدید ترین سہولتیں نظر آ رہی ہیں۔ کتنے ہی طیارے کھڑے ہیں۔ مسافروں کی بڑی تعداد آ جا رہی ہے۔

ہم میں سے اکثر کے پاس تو سامان ہاتھ ہی کا ہے۔ کچھ کا بک بھی ہوا ہے۔ تمل کا سوٹ کیس راستے میں ٹوٹ گیا ہے۔ جلد ہی اس کا کلیم تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اور متبادل نیا سوٹ کیس مل گیا ہے۔ وہ بھی اعلیٰ ترین کمپنی سیمسو نائٹ کا........ ہم سب اس وقت پشیمان ہیں کہ ہم نے بھی خراب حال۔ پرانے سوٹ کیس کیوں نہیں لیے۔

اس کلیم کے داخل کرنے اور متبادل ملنے میں دیر لگی ہے۔ ہماری یہاں کی میزبان میریان کروٹی بھی اسی میں مصروف ہو گئی تھی۔ اب وہ سب سے متعارف ہو رہی ہیں۔ ان کی ننھی منی بیٹی بھی ساتھ ہے۔ میریان سنسناٹی میں انٹرنیشنل وزیٹرز کی پروگرام منیجر ہیں۔ بہت خوش دل..... ہنس مکھ ..... جہاندیدہ..... عمر رسیدہ.....

ایئر پورٹ سے باہر نکلتے ہیں۔ گرم ہوا خیر مقدم کرتی ہے۔ ایگزیکٹو ٹرانسپورٹیشن کی دو کوچز ہماری منتظر ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ یہ ریاست اوہائیو کے ساحلی شہر سنسناٹی میں قیام کے دوران ہمارے ساتھ رہیں گی۔

سنسناٹی ایئر پورٹ صرف اوہائیو ریاست ہی نہیں کینٹکی اور انڈیانا کی ریاستوں کے مسافروں کے بھی کام آتا ہے۔ اسے تین ریاستوں کا سنگم کہہ سکتے ہیں۔ سنسناٹی اوہائیو کی سرحد سے ذرا پہلے واقع ہے۔ ساتھ ہی کینٹکی اور انڈیانا کی سرحدیں ہیں۔ مجھے صوبہ سندھ کا

علاقہ کشمور یاد آ رہا ہے۔ جس کی ایک طرف پنجاب اور دوسری طرف بلوچستان کی سرحدیں ہیں۔ لیکن یہاں جس طرح تین ریاستوں کے سنگم پر ہونے سے سنسناٹی کو تجارتی اہمیت ملی ہے..... مواصلاتی رابطے میسر ہیں..... کاروبار ہے..... خوشحالی ہے..... کشمور کو ایسی کوئی اہمیت نہیں مل سکی ہے کسی نے سوچا بھی نہیں ہے..... اپنے لوگوں کی آسانیاں ہماری ترجیحات میں ہی شامل نہیں ہیں۔

سنسناٹی دریائے اوہائیو کے اس پار ہے۔ ہریالی..... سرسبز درخت..... کھلی شاہراہوں سے ہوتے ہوئے اوہائیو کا گرجتا گنگناتا دریا ہم عبور کر کے شہر میں داخل ہو چکے ہیں۔ عمارتیں آسمان کو ہاتھ لگانے کے لیے بے تاب نظر آتی ہیں۔ زندگی دوڑ رہی ہے۔

یہاں ہمارا قیام ہلٹن میں رہے گا۔ ہلٹن نیدرلینڈ پلازا..... شام کے سائے گہرے ہو چکے ہیں۔ رات دنیا کو اپنی آغوش میں لینے والی ہے۔ روشنیاں رات کو چیلنج دے رہی ہیں۔ بکنگ پہلے سے ہی ہو چکی ہے۔ باری باری اپنے کارڈ بھر کر ہم کمروں کی چابیاں حاصل کر رہے ہیں۔ مجھے 29 ویں منزل پر کمرہ ملا ہے۔ شہر یہاں سے اور بھی حسین لگ رہا ہے۔ کمرہ بہت وسیع ہے۔ کھلا باتھ روم..... ڈریسنگ روم الگ..... جس میں استری..... اور استری اسٹینڈ بھی ہے۔ ڈبل بیڈ..... کھانے کی میز..... دو تین کرسیاں..... اخبار..... کتابیں پڑھنے کے لیے ایک صوفہ جس کے آگے پاؤں رکھنے کی الگ جگہ ہے۔

ہمارا دن پہلے ہی بہت طویل ہو چکا ہے..... کیوں نہ کچھ آرام کر لیا جائے۔

مگر بزنس سینٹر کہاں ہے..... کچھ خبریں بھی تو ارسال کرنی چاہئیں۔ ہوٹل والے مہرباں ہیں..... وہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کا فیکس کسی چارج کے بغیر آپ کے ملک پہنچ جائے گا..... اگر آپ کو انٹرنیٹ سروس چاہیئے۔ تو ہماری چوتھی منزل پر یہ سہولت بھی میسر ہے۔ یہ بھی کسی چارج کے بغیر ہے۔ چوتھی منزل پوری ہی بزنس سے وابستہ ہے۔ سیمینار ہال..... جہاں سینکڑوں سامعین بیٹھ سکتے ہیں..... میٹنگ رومز الگ ہیں..... انٹرنیٹ کی رفتار بہت تیز ہے..... ہائی اسپیڈ..... لمحوں میں براعظموں کو عبور کیا جا سکتا ہے نیچے ڈسکو ہال ہے۔ بار ہے..... ڈائننگ ہالز ہیں..... سب ہی خلقت سے معمور ہیں۔ نئی امریکی نسل ہنستے کھیلتے .....

ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے۔ ہالوں میں داخل ہورہی ہے۔ نکل رہی ہے۔ سینئر شہری بھی اپنی رات رنگین کرنے کے لیے موجود ہیں۔

سنسناٹی میں پہلی رات ہی بہت سے فسانے سنارہی ہے۔ گیتوں کی مدھر سریں بلند ہورہی ہیں۔ اگلی صبح سات بجے ہی لابی میں جمع ہونا ہے۔

کمرے کی کھڑکی سے شہر کی روشنیاں آواز دیتی محسوس ہوتی ہیں۔ سنسناٹی کے بارے میں معلومات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم اس شہر طلسمات میں خوابوں کی وادیوں میں اتر گئے ہیں۔

دریائے اوہائیو کے کنارے

سنسناٹی میں پہلی صبح ..... کمرے کی کھڑکی سے شہر کا افق بہت حسین دکھائی دے رہا ہے۔ وسیع شاہراہیں..... بلند عمارتیں ..... لفٹ کے قریب 29 ویں منزل کی کھڑکی سے دریائے اوہائیو بالکل نزدیک آتا محسوس ہوتا ہے دریا پر بڑے بڑے خوبصورت ڈیزائنوں کے پل بنے ہوئے ہیں..... ہمارے ہاں دریا سیلاب ، طوفان..... تباہی بربادی کی علامت بنے رہتے ہیں ..... اکثر بے قابو ہوجاتے ہیں..... کیونکہ ان کی صفائی نہیں ہوتی۔ ان کا ظرف کم ہوتا رہتا ہے۔ جیسے ہم سب کم ظرف ہوگئے ہیں..... ذراسی بات پر بپھر جاتے ہیں یہاں دریا شہروں کے ساتھی ہیں۔ ان کی ترقی میں شانہ بشانہ چلتے ہیں۔ مواصلات کا ذریعہ بھی ہیں۔

ہمیں لابی میں 8 بجے جمع ہونا ہے۔ اس سے پہلے ناشتہ کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں۔

سنسناٹی شہر کی آبادی 3 لاکھ 31 ہزار ہے۔ لیکن میٹروپولیٹن علاقہ 19 لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ اسے امریکہ کے مغرب کی طرف جانے کے لیے دروازہ کہا جاتا ہے۔ یہ ساحلی شہر بھی ہے صنعتی مرکز بھی۔ بتایا جارہا ہے کہ اس کا اصل نام لوسانٹی ول تھا۔ 1788ء میں اس کی بنیاد رکھی گئی ایک رومن فوجی کے نام پر انقلابی فوج کی تنظیم کا نام سوسائٹی آف سنسناٹی تھا۔ اسی تنظیم نے 1790ء میں اسے سنسناٹی سے موسوم کیا۔ مغربی علاقے میں سنسناٹی ایک اہم فوجی مقام رہا۔ اب اسے "Queen city of west" مغرب میں شہروں کی دلہن، کہہ کر پکارا جاتا ہے

سنسناٹی صنعتی مرکز ہے۔ جہاں مصنوعات تیار بھی ہوتی ہیں۔ تھوک اور پرچون میں بکتی بھی ہیں۔ یہاں انشورنس اور فنانس کا کاروبار بھی عروج پر ہے۔ ایک اور خوبی اس شہر کی یہ ہے کہ ماحولیاتی بیداری اور تشویش کے لیے بھی یہاں بہت کام ہوتا ہے۔ مقامی طور پر کوئلے کے جلنے سے تیزابی بارش ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ فکر اس کی ہے۔ صنعتیں اور درس گاہیں دونوں ہی ان امور کے سلسلے میں تحقیق کررہی ہیں اس اعتبار سے یہ شہر پیش پیش ہے۔ سنسناٹی میں چھوٹے اخبارات تو بہت نکلتے ہیں..... لیکن سنسناٹی انکوائرر..... سنسناٹی پوسٹ بڑے نیوز پیپر ہیں..... تعلیم میں بھی یہ شہر بہت آگے ہے..... یونیورسٹی آف سنسناٹی..... زیویر یونیورسٹی۔ کالج آف ماؤنٹ سینٹ جوزف نمایاں ہیں۔ سنسناٹی آرٹ میوزیم..... نیچرل ہسٹری میوزیم..... سنسناٹی چڑیا گھر..... ولیم ہاورڈ..... ٹینلٹ میوزیم..... کروہن کنزرویٹری..... قابل دید مقامات ہیں۔ سنسناٹی کا چڑیا گھر امریکہ میں دوسرا سب سے قدیم ہے۔ کروہن کنزرویٹری دنیا کے چند بڑے سبزہ زاروں میں سے ہے۔

میریان کردٹی اور مارک ریٹاک لابی میں استقبال کے لیے موجود ہیں۔ یہ دونوں انٹرنیشنل وزیٹرز کونسل آف گریٹر سنسناٹی سے وابستہ ہیں۔ جس کا دعویٰ ہے کہ وہ سنسناٹی کو دنیا سے جوڑتی ہے۔

غیر ملکی مہمانوں کو قومی سطح پر میریڈیان انٹرنیشنل رابطے میں رکھتا ہے۔ مقامی سطح پر انٹرنیشنل وزیٹرز کونسلیں قائم ہیں۔ جن میں شہر کی مختلف صنعتی، تجارتی کمپنیوں، بنکوں، ہوٹلوں کے نمائندے ٹرسٹیوں (متولیوں) کے طور پر شامل ہیں۔ ذرا ان کا تنوع ملاحظہ کیجیے۔ پراکٹر اینڈ گیمبل کے سٹیون میکبائی صدر ہیں۔ لندا اپیل بانی، نائب صدر..... گین گنکل..... سیکرٹری ہیں۔ دونوں کا تعلق ٹینڈم مارکیٹنگ سروسز سے ہے۔ دوسرے ٹرسٹیوں میں متعدد صنعتی و تجارتی ادارے شامل ہیں۔ جن میں یو ایس بینک..... ففتھ تھرڈ بینک..... ایرفرانس ہمارے لیے کچھ مانوس نام ہیں۔ سنسناٹی بار ایسوسی ایشن بھی ہے۔ گرجا گھروں کی فاؤنڈیشن ہے۔ یونیورسٹیاں ہیں۔ ماہر نفسیات بھی ہیں۔ صنعتی اقتصادی ماہرین بھی۔ سٹی گورنمنٹ سرکاری طور پر رکن ہوتی ہے۔ اس سے یہ اندازہ کرلیں کہ اپنے شہر میں آنے والے غیر ملکی مہمانوں کے لیے یہاں کے

ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے انتہائی سنجیدگی اور ذمہ داری سے شامل ہیں۔ تمام ادارے اس میں رضاکارانہ حصہ لیتے ہیں۔ اخراجات بھی اسی طرح مل جل کر ادا کیے جاتے ہیں۔ ناشتے پر ہمیں گریڈن ہیڈ اینڈ رشے نے مدعو کیا ہے۔ میزبان ہیں۔ رچرڈ لاجیونیس۔ یہ عمارت ہوٹل سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ایسے شہروں میں پیدل چلنے میں بھی بہت لطف آتا ہے۔

واشنگٹن کی نسبت سنسناٹی زیادہ مہمان نواز معلوم ہورہا ہے۔ ناشتے میں سب کچھ ہے۔

آملیٹ..... ڈونٹ۔ بسکٹ..... مکھن..... چائے..... کافی..... دودھ۔

ناشتے کے بعد گول میز کانفرنس شروع ہوگئی ہے۔ ایمل ڈلسیکر میٹنگ کے سہل کار Facilitator ہیں۔ امریکی بادشاہ ہیں۔ یہی کام کرنے والے کو کبھی ماڈریٹر کہتے ہیں۔ کبھی کوارڈی نیٹر، کبھی فیسلیٹیٹر..... یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے ہاں یہ سب کام مختلف نوعیت کے ہوں۔ ہم ان کا فرق نہ سمجھ پاتے ہوں۔ ایمل صاحب کافی عمر رسیدہ ہیں وہ سنٹرل اسٹیٹ یونیورسٹی کے جرنلزم اور کمیونیکیشن کے ریٹائرڈ پروفیسر ہیں۔ اس سے پہلے وہ کئی اخبارات کے رپورٹر بھی رہ چکے ہیں جن میں سنسناٹی انکوائرر..... اور ڈیٹن ڈیلی نیوز جیسے معروف روزنامے شامل ہیں۔ اس سے پہلے وہ باؤلنگ گرین یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے لیے گئے۔ وہاں پڑھاتے بھی رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہ یونیورسٹی آف سنسناٹی، ولبروس..... سنٹرل اسٹیٹ یونیورسٹی میں تدریس میں مصروف ہیں۔ حال ہی میں انہیں پروفیشنل جرنلسٹس ہال آف فیم کی سنسناٹی سوسائٹی کی رکنیت کا اعزاز دیا گیا ہے۔ شرکاء میں ڈیوڈ ویلز، ایڈیٹر، ادارتی صفحہ روزنامہ سنسناٹی انکوائرر..... سٹیو ہارش برگ نیوز ڈائریکٹر ڈبلیو وائی ایکس یز..... جان فاکس ایڈیٹر..... سٹی بیٹ..... میزبان فرم کی خوبرو وکیل کرسٹائن آلیور اسی فرم کے جواں سال وکیل ڈینیل ای رٹیز..... سنسناٹی پوسٹ کے بیری ہارٹمین۔

سوسائٹی آف پروفیشنل جرنلسٹس کو ملک کی ایک بڑی وسیع البنیاد صحافتی تنظیم بتایا جارہا ہے جس کے باضابطہ ارکان کی تعداد امریکہ بھر میں چودہ ہزار کے قریب ہے۔ یہ غیر منفعت بخش تنظیم ہے جس سے پیشہ ور اخبار نویس بھی وابستہ ہیں۔ اور صحافت کے طلبہ بھی.....

برصغیر میں جس طرح مختلف شہروں کے بارے میں مختلف کہانیاں..... لطائف.....

مشہور ہوتے ہیں اس طرح سنسناٹی جو شہروں کی ملکہ ...... بلیو چپ سٹی ...... اور مغرب کا دروازہ کہلاتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ یہاں ہر کام دس سال تاخیر سے ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ممتاز ادیب مارک ٹوین آخری عمر میں یہاں چلا آیا تھا۔ کہ یہاں موت بھی دس سال تاخیر سے آئے گی۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اگر وہ پاکستان چلا آتا تو پچاس سال اور مل جاتے۔

کسی اخبار کی اشاعت یہاں دو لاکھ سے کم نہیں ہے۔ بڑی تعداد میں نکلتے ہیں۔ اِدھر اُدھر کی بات کرتے ہوئے یہ طے ہوا ہے کہ 11 ستمبر کے حوالے سے سب اپنے تاثرات بتائیں۔ سنسناٹی والے واشنگٹن کی طرح نفسیاتی طور پر اس واقعے سے مغلوب نظر نہیں آتے ہیں۔ وہ کھل کر بات کررہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں سنسناٹی میں ایسے واقعات نہیں ہوئے کہ مسلمانوں ایشیائیوں ...... عربوں یا پاکستانیوں سے امتیازی سلوک ہوا ہو۔ بعض شہری کچھ شکوک وشبہات رکھتے تھے۔ بعد میں ان کے ذہن بھی صاف ہوگئے۔ یہاں کی تاریخ بالعموم ایک کھلے معاشرے کی رہی ہے۔ چھوٹے بڑے اخبارات نے کافی ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ بلکہ اب سیکورٹی کے پیش نظر جو نئے قوانین آرہے ہیں۔ نئے حفاظتی اقدامات ہورہے ہیں اس سے بہت زیادہ پریشانی ہے۔ وہیل چیئر پر بیٹھے لوگوں کی بھی تلاشی لی جاتی ہے۔ پیٹریاٹ ایکٹ پر قانون دان سخت تنقید کررہے ہیں۔ امریکی معاشرہ ایک کھلا معاشرہ ہے۔ یہاں یہ اچھی بات ہے کہ ہر مسئلے پر خوب مباحثہ ہوتا ہے۔ ہم سے پوچھا جارہا ہے کہ آپ کے ہاں اخبارات نے ان معاملات پر کس طرح پالیسیاں اختیار رکھی ہیں۔ وہاں امریکیوں کے خلاف جذبات کیسے ہیں۔

جنوبی ایشیا کے ایڈیٹرز اپنے اپنے انداز سے بتارہے ہیں۔ ہماری طرف سے یہ کہا جارہا ہے کہ امریکیوں کے خلاف نفرت بہت زیادہ بڑھ رہی ہے۔ لوگ یہ کہتے ہیں کہ امریکہ کو یہ اختیار کس نے دیا کہ وہ دنیا میں کسی بھی ملک میں اپنی فوج لے کر چلا جائے۔ اور جب اس ملک میں حالات قابو میں نہ آئیں تو وہاں اپنے وعدے پورے کیے بغیر اپنے مقاصد کی تکمیل کی بناہی دوسرے کسی ملک میں جاپہنچے۔ افغانستان میں طالبان کے دور میں شہریوں کے جان مال تو محفوظ

تھے۔ امن اور سلامتی تو تھی...... اب وہاں کابل میں بھی کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ دیگر صوبوں کا تو برا حال ہے۔ جنگجو سرداروں کو پھر سے مسلط کیا جارہا ہے انہیں ڈالرز اور اسلحہ دیا جارہا ہے۔ افغانستان میں امریکہ کو ناکامی ہورہی تھی۔ دنیا بھی تنقید کررہی تھی امریکیوں نے بھی اعتراضات شروع کیے۔ تو امریکی صدر نے عراق میں فوجیں اتار دیں۔ حالانکہ وہاں بڑے پیمانے پر تباہی کے ہتھیار نہیں ملے تھے۔ اب عراق میں ناکامی ہورہی ہے۔ تو معلوم نہیں امریکہ کہاں کا رخ کرتا ہے۔

افغانستان، پاکستان، بھارت کے ایڈیٹرز بہت جذباتی انداز میں بات کررہے ہیں۔ میری باری آتی ہے۔ تو میں یہ کہتا ہوں۔ کہ 11 ستمبر کو جب دہشت گردی ہوئی۔ تو ہم نے تو اسے انسانیت پر حملہ خیال کیا تھا۔ لیکن امریکنوں نے اسے صرف امریکیوں پر حملہ قرار دیا۔ اس طرح انسانیت اور تقسیم ہوکر رہ گئی۔ ہم اب بھی کہتے ہیں کہ یہ دہشت گردی پوری انسانیت کے خلاف تھی۔ اور انسانیت کو متحد ہوکر اس کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد میں کہہ رہا ہوں کہ ہم صحافی تو بہت عرصے سے باتیں کرتے آرہے ہیں۔ لکھتے بھی رہتے ہیں۔ میرے خیال میں بہتر یہ ہوگا کہ اس وقت یہاں جو دو نوجوان وکیل بیٹھے ہیں جن میں ایک خاتون بھی ہے۔ ہمیں ان کی سوچیں جاننی چاہئیں۔ کہ یہ موجودہ معاملات کو کس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ مستقبل تو ان کا ہی ہے۔ انہیں ہی معاملات نمٹانے ہیں۔ سب اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کیونکہ اس طرح ہمیں بھی امریکہ کے ایک چھوٹے شہر کی سوچ سے آگاہی ہوگی۔

جواں سال خاتون وکیل کرسٹائن اولیور کہتی ہیں۔ کہ ہم اسلامی دنیا کی تاریخ سے بے خبر ہیں۔ سب سے زیادہ محرومی اسی ضمن میں ہوئی کہ جب یہ خبریں شروع ہوئیں۔ مسلمان ممالک اور مسلمان تہذیب کا بار بار ذکر ہوا تو ہم نوجوان آپس میں بات کرتے تھے کہ اندازہ ہوتا تھا کہ ہم اسلامی تاریخ اور اسلامی ملکوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ کیونکہ ہمارے اسکولوں، کالجوں میں اسلامی تاریخ نہیں پڑھائی جاتی...... یہ انتہائی اہم نکتہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اب ہم اپنے طور پر کچھ کوشش کررہے ہیں۔ اب بھی ہمارے ٹی وی چینلوں اور ...... اخبارات میں مسلم تاریخ ...... تہذیب اور تمدن پر کچھ زیادہ پڑھنے اور سننے کو نہیں ملتا ہے ......

سب سے زیادہ ضرورت یہی ہے کہ امریکی شہریوں کو مسلمانوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہوں۔

دوسرے جواں سال وکیل ڈینئیل یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے بارے میں کسی حد تک جانتے ہیں۔ یہاں بھی ان کے کلاس فیلوز میں مسلمان ہیں۔ ان کی بہن پاکستان میں رہی ہے۔ اس لیے انہیں اسلام آباد، لاہور میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ یہ 11 ستمبر سے پہلے تھا۔ ہر جگہ لوگ اچھی طرح بہت محبت سے ملتے رہے ہیں۔ وہ بہت شاندار تہذیب ہے۔ مجھے کوئی تلخ تجربہ نہیں ہوا۔ اب مجھے علم نہیں ہے کہ 11 ستمبر کے بعد جو دنیا بدلی ہے۔ اب یہ لوگ کس طرح ملیں گے۔ ان دوستوں سے ای میل پر تو رابطہ رہا ہے لیکن وہاں جانے کا سوچ کر میں ذرا سا گھبراتا ہوں۔ کہ معلوم نہیں اب وہ ہمارے بارے میں کیا تاثرات رکھتے ہوں۔ اس طرح ملیں گے کہ نہیں۔

یہ تو ہیں امریکہ کے مرکزی شہروں واشنگٹن اور نیویارک سے ہٹ کر ایک دور دراز شہر کی نوجوان نسل کے خیالات...... یہ بالکل براہ راست ہیں۔ ان میں کچھ لگی لپٹی نہیں ہے۔ کہ اگر دہشت گردی کے حوالے سے موضوع بحث مسلمان ہیں۔ تو امریکی معاشرے اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ امریکیوں کو اسلام کے صحیح تناظر سے آگاہ کرے۔ مارک کہہ رہے ہیں کہ سٹیزن ڈپلومیسی اس کا حل ہے۔ شہریوں کی اپنی سفارت کاری...... امریکی خاندان کیا سوچتے ہیں...... ایشیائی خاندان کیا محسوس کرتے ہیں ان کا آپس میں رابطہ ہونا چاہیئے۔

ناشتے پر گفتگو اچھی رہی ہے۔ اتنی صبح سویرے تو کسی میٹنگ کا ہم اپنے ہاں تصور بھی نہیں کر سکتے۔ دس بجے ہم یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ ہماری اب ملاقات ٹم اوپلے سے ہے۔ جو نیشنل ہوم لینڈ سیکورٹی ریسرچ سنٹر کے ڈائریکٹر ہیں۔

ہوم لینڈ سیکورٹی...... کیا ہے

آج کا دن لگتا ہے۔ کافی طویل ہو جائے گا۔

ہوم لینڈ سیکورٹی کا محکمہ تو پہلے سے قائم تھا۔ لیکن 11 ستمبر کے بعد اس کا دائرہ وسیع کر دیا گیا ہے۔ ماحولیات کے تحفظ کا محکمہ بھی اس میں شامل ہو گیا ہے۔ پانی کی فراہمی، فائر بریگیڈ، ریڈ کراس اور دیگر ہنگامی خدمات بھی اس سے وابستہ کر دی گئی ہیں اس کے بجٹ میں بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ اسے امریکی انتظامیہ کے خوف پر محمول نہیں کرنا چاہیئے بلکہ یہ ایک طویل المیعاد منصوبہ بندی ہے۔ اور مملکت کی طرف سے اپنے شہریوں کی زندگی کی حفاظت کا احساس اور نئے دور کے خطرات پر پہلے سے تحفظ کے انتظامات...... اب دہشت گردوں کی طرف سے نت نئے تجربات کیے جاتے ہیں۔ اس لیے کچھ خبر نہیں کہ وہ زیادہ بڑی تعداد کو خوفزدہ کرنے کے لیے کس وقت کیا کر گزریں۔

لوتھر کنگ ڈرائیو نامی سڑک پر ہم تحفظ امریکی ماحولیات کے ادارے کے ڈائریکٹر ای ٹموتھی اوپلے کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہیں۔ دلچسپ آدمی لگتے ہیں۔ بات تازہ ہوا...... خالص پانی سے شروع ہو رہی ہے۔ امریکہ میں پانی کے محفوظ ذخائر ہر شہر میں ہیں۔ پانی کو شفاف رکھنے کے بعد اس میں کیمیکل اور دوسرے آلودگیوں کی مقدار کا معائنہ کرتے رہنے کے لیے سنسناٹی میں تین بڑی لیبارٹریاں قائم ہیں۔ اس قسم کی تجربہ گاہیں اسی محکمے کے تحت ملک بھر میں ہیں۔ خطرات...... تابکاری

کے اثرات سب سے تحفظ ماحولیاتی ادارے کی ذمہ داری ہے۔ گیارہ ستمبر کے بعد اینتھر یکس کے واقعات بڑھے۔ خلائی شٹل کا حادثہ ہوا اس وقت بھی ای پی اے...... انیوائرنمنٹ پروٹیکشن ایجنسی نے ہی ذمہ داریاں نبھائیں۔ ای پی اے دہشت گردی کے مقابلے میں کیسے شامل ہوئی۔ اس سوال پر وہ بتارہے ہیں کہ کانگریس نے ہمیں ایسا کرنے کے لیے کہا ہے۔ اوہائیو دریا پر آلودگی کی تحقیق تو 1912ء میں شروع ہوگئی تھی۔ لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ دہشت گردنئ نئی شکلیں اختیار کررہے ہیں حملے کا مقام کہیں بھی ہوسکتا ہے۔ اس لیے ان چیلنجوں کے پیش نظر اب کھلے مباحثے ہورہے ہیں۔ پہلے جو بہت سی اطلاعات خفیہ رکھ کر کاروائی کی جاتی تھی۔ اب یہ پابندی نہیں ہے۔ اب تحفظ کے مراحل کلاسیفائیڈ نہیں ہیں۔ اب شہریوں میں بیداری اور آگاہی ضروری ہے۔ اس لیے نئے قوانین بھی منظور کرلیے گئے ہیں۔ ہمارے ادارے تک اب عام شہریوں کی رسائی بھی بڑھ گئی ہے۔

وہ کہہ رہے ہیں کہ اب ہماری ترجیح عوام سے رابطہ اور عوام تک اطلاعات پہنچانا ہے۔ اس لیے اب زیادہ تر اسی پر توجہ ہے۔ میڈیا سے بھی تعلق پہلے سے زیادہ ہے۔ اب ہم ایٹمی تابکاری، اور اسی قسم کے دوسرے حساس معاملات پر خفیہ کاروائی نہیں کرتے۔ بلکہ لوگوں کو باخبر کرنے کے لیے پمفلٹ شائع کررہے ہیں مقامی ریڈیو...... ٹی وی پر مذاکروں میں حصہ لے رہے ہیں۔ یونیورسٹیوں کو 110 ملین ڈالر دیئے گئے ہیں کہ وہ خطرات کی تشخیص پر تحقیق کریں۔ آلودگی کے سلسلے میں دہشت گردی سے ملحق جو خطرات ہیں۔ ان پر تحقیق ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً 1۔ پانی کی فراہمی میں کچھ گڑ بڑ ہوسکتی ہے۔ 2۔ ایسی بلڈنگیں جہاں شہری بڑی تعداد میں رہتے ہیں یا کام کرتے ہیں۔ وہاں کچھ ہوسکتا ہے۔ 3۔ آثار قدیمہ یا اور ایسے سیاحتی مراکز، یہاں کیمیکل یا بائیو لاجیکل پھیلا کر صحت عامہ کو خطرے میں ڈالا جاسکتا ہے۔ آگ لگائی جاسکتی ہے۔ گیس خارج کی جاسکتی ہے۔ گندے پانی کی نکاسی میں کچھ کیا جاسکتا ہے۔ ان سب خدشات سے محفوظ رہنے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی ہے۔ اور یہ سب کچھ ہوم لینڈ سیکورٹی کے دائرہ کار میں آتا ہے۔ ای پی اے کے ڈائریکٹرز کے اختیارات میں بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ وہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کا کام بھی کرسکتے ہیں۔ ان کی سفارش پر موم بتیوں کی درآمد بند کی گئی ہے۔ لوبان بھی اب نہیں لایا جاسکتا۔ موم میں حساس نوعیت کا سکہ پایا گیا۔ اگربتی میں بھی یہ عنصر شامل ہے۔ اس لیے ان کی درآمد بھی ممنوع ہوگئی ہے۔ اس طرح کی

تحقیق ہوتی رہتی ہے۔ ای پی اے سفارشات دیتی رہتی ہے۔

اسی دفتر میں عجلت میں ایک ہلکا پھلکا لنچ کرنے کے بعد ہم پینے کے پانی کی تجربہ گاہ کی طرف روانہ ہیں۔

یہ ٹیسٹ اور ایویلوایشن فیسلیٹی ہے۔ جانچ اور پڑتال کی سہولت۔

The National Risk Management Research Laboratary

Test and Evaluation Facility.

آسانی کے لیے اسے ٹرل کہا جاسکتا ہے۔ کتنا آسان...... جیسے کسی لڑکی کا نام...... میرے خیال میں ایسے نام ہوتے بھی اسی لیے ہیں۔ یہ نام تو ہمارے بروشر میں لکھا ہے۔ لیکن یہاں بلڈنگ پر یہ نام درج ہے۔

واٹر اور ینیس ٹیکنالوجی ایویلوایشن ریسرچ سوسائٹی سنٹر...... جس کا مخفف واٹرز بنتا ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ پانی کے شفاف اور صاف ہونے کے بارے میں بیداری پیدا کی جائے بتایا جارہا ہے کہ اس مرکز سے پانی کی تقسیم کا 17 ہزار میل طویل نظام وابستہ ہے۔ آنکھوں کو آلودگی سے بچانے کے لیے ہمیں پلاسٹک کے بڑے چشمے دیئے جارہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہیلمیٹ بھی۔ انجینئر وں سے تعارف کروایا جارہا ہے۔ بھارتی نژاد نوجوان بھی ہیں اور پاکستانی بھی۔ یہ لیبارٹری انتہائی حساس نوعیت کے تجربات کرتی ہے۔ پانی کے اس نظام سے لاکھوں امریکی پیاس بجھاتے ہیں۔ اس لیے ان کے لیے پانی کو صاف اور شفاف رکھنا قومی ذمہ داری ہے۔ پہلے تو یہ کام ریاستی (صوبائی) سطح پر تھا۔ اب ہوم لینڈ سیکورٹی میں جانے کے بعد یہ قومی یا وفاقی درجہ حاصل کرگیا ہے۔ مرحلہ وار دیکھا جاتا ہے کہ پانی میں کیا کیا کثافتیں شامل ہورہی ہیں۔ کلورین ضرورت کے مطابق ہے یا نہیں۔ کتنی کلورامین ہے...... پانی میں مٹی کتنی مل گئی ہے۔

پانی تو ہم سب کے لیے ضروری ہے۔ صرف امریکیوں کے لیے ہی نہیں۔ ایشیائیوں کو بھی پانی شفاف ملنا چاہیئے۔ پوری دنیا میں اب یہ ایک مسئلہ ہے کہ پینے کے پانی کو صاف کیسے رکھا جاسکتا ہے۔ اکثر ملکوں میں تو یہ مسئلہ بھی ہے کہ پینے کا پانی ضرورت کے مطابق میسر نہیں ہے۔ اس لیے وہاں تو پانی کی فراہمی بھی ایک مسئلہ ہے۔ جہاں پانی موجود ہے۔ وہاں یہ مشکل ہوتی

ہے کہ اسے لوگوں کے گھروں تک صاف اور شفاف حالت میں کیسے پہنچایا جائے۔ اس مرکز میں یہی ناگزیر اور مشکل فریضہ انجام دیا جارہا ہے۔ ہمارے میزبان اسی مقصد کی خاطر ہمیں یہاں لائے بھی ہیں کہ ہم ان تجربات کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ یہ ٹیکنالوجی کسی حد تک سمجھیں...... اور پھر اپنے اپنے ممالک میں لوٹ کر اس کے بارے میں بیداری اور آگاہی کی اشاعت کا اہتمام کریں۔ لیکن ہمارے ساتھی ایشیائی مدیر زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔ وہ اس مرکز سے جلد از جلد نکلنا چاہتے ہیں۔ جہاں امریکہ...... عراق...... افغانستان کی سیاسی باتیں ہورہی ہوں۔ پالیسیوں پر تنقید کا موقع ملے...... وہاں ہم سب بہت دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ امریکہ سپر طاقت ہے۔ ایمپائر کیوں بن رہا ہے۔ ان سب امور میں ہم خوب الجھتے ہیں۔ لیکن امریکہ سپر طاقت کیسے بنا ہے۔ وہ اپنے شہریوں کی ضروریات کا کیسے خیال رکھتا ہے۔ اس کے لیے کیا کیا اہتمام کرتا ہے۔ اور ہمارے ملک ان معاملات میں کیوں پیچھے ہیں۔ یہ ہم جاننا نہیں چاہتے۔ یہی فرق ہے۔ ان ذمہ دار ترقی یافتہ قوموں اور ہم میں۔ انہوں نے بنیادی مسائل اور وسائل دونوں طرف پہلے توجہ دی۔ ان کو حل کیا۔ پھر مسلسل ان کا خیال رکھے ہوئے ہیں۔ ان بنیادی ضرورتوں کی فراہمی کے بعد وہ قومی اور بین الاقوامی سیاست کی طرف آتی ہیں۔

یہ سنسناٹی کے استعمال شدہ پانی کو دوبارہ قابل استعمال بنانے کا پلانٹ ہے۔ جو 1979ء میں قائم ہوا تھا۔ اب اس میں کئی سہولتیں بڑھادی گئیں۔ اب پبلک اور پرائیوٹ سیکٹر کے مختلف اداروں کو بھی پیشکش ہے کہ وہ اپنے لیے پانی پر تجربات کروانا چاہیں تو کرسکتے ہیں۔ مختلف یونیورسٹیاں بھی اپنے بعض تحقیقی مقالوں کے لیے یہاں رجوع کرتے ہیں۔

جہاں پانی کی فراہمی کی نگرانی کی جاتی ہے۔ پانی کو درست کیا جاتا ہے۔ تقسیم کا سلسلہ دیکھا جاتا ہے کہ صحیح جارہا ہے۔ کہیں رکاوٹ تو نہیں ہے۔ گندے پانی کا نکاس...... اس میں تیزاب، کیمیکل کی ملاوٹ کا جائزہ، آب و ہوا، ماحول کی آلودگی، صنعتی آلودگی یہاں یہ گنجائش بھی رکھی گئی ہے کہ نئی نئی ٹیکنالوجی کو بھی شامل کیا جاسکے۔ اس لیے یہ مرکز امریکہ میں ایک خصوصی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔

انجینئر حضرات اور خواتین بہت شوق اور دلچسپی سے ہمیں ہر مرحلے پر ہونے والی تحقیق

سے آگاہ کررہے ہیں۔ 24 گھنٹوں میں مختلف شفٹوں میں یہاں انجینئر اور دوسرے ماہرین موجود رہتے ہیں۔ مختلف مراحل پر پانی کے نمونے لیے جاتے ہیں۔ کمپیوٹر سے ان کا تجزیہ ہوتا رہتا ہے۔ نتائج ملتے رہتے ہیں۔ کمپیوٹر اگر اچانک کوئی تبدیلی دیکھتا ہے تو وہ ریڈ الرٹ کردیتا ہے۔

خالصتاً ٹیکنالوجی کی اصطلاحات تو نہ میری سمجھ میں آئیں گی۔ نہ آپ کی۔ یہ کاغذات اور دیگر معلومات میں محفوظ کررہا ہوں۔ کسی وقت کراچی واٹر بورڈ کے حوالے کردیں گے۔ شاید اس کی روشنی میں کراچی والوں کو صاف اور شفاف پانی میسر آسکے۔

یہاں بعض مختلف مراحل جو طے کیے جاتے ہیں۔ ان کو میں انگریزی میں لکھے دے رہا ہوں۔ ہمارے متعدد انجینئرز اس سے یقیناً کچھ مدد حاصل کرسکیں گے۔ وہ اگر چاہیں تو ان کے ساتھ دی گئی ویب سائٹس سے مزید معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔

1- Simulated Water Distribution System Demonstration.
meckes. mark @ epa.gov./ radh. krishnan @ shawgrp. com
2- Evaluation of a Package Plant Advanced Oxidation (Uv/Ozone) Process to remove MTBE from drinking water.
haught.roy @ epa.gov ---- craig.patterson @ shawgrp.com
3- Small package plant systems- research
goodrich. james @ epa.gov rajih.siwbha @ shawagrp.com
4- Chlorine consumption in dead end pipes:
Roles of dynamic flow conditions
majid. dosani @ shawrge.com
5- Member techologies for recovery of volatile organic compounds
vane. bland @ epa.gov
6- Product recovery from biomass fermentation process by pervaporation.
carig. patterson @ shawgrp.com
7- Phytoremediation studies in environmental chambers
sri. panguluri @ shawgrp.com
8- Phytormediation of land fill gas in environmenteal chambers.

rock. steven @ epa.gov----- don.schupp @ shawgrp.com
9- Bioslurry treatmant of contaminated soils and sediments
mccauley. paul @ epa.gov --------- glaser.john. epa.gov
10- Composting treatment of contaminated soil and sediment.
11- Phy torcmediatiation of soil and sediment pesidues from composting and land treatment evaluations
brenner.richard@ epa.gov
12- Kinetics of comatabolic biodergradation of chlorinated ethylenes in unsaturated sol
salyes. gregory @ epa.gov----- alan. zafero@ shawgrp.com
13- Remote water quality monitoring of drinking water treatment systems.
14- Remote water quality monitaring and control of small drinking water treatmant systems.
15- Source water early warning monitoring and detection-technology evaluation and demonstration.

یہ 15 مختلف مراحل ہمیں وہاں دکھائے اور سمجھائے جا رہے ہیں۔ آپ بھی دیکھیں کہ یہ کتنے اہم اور ضروری ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ہمارے ہاں بھی ان میں سے سب یا کچھ طے کیے جاتے ہیں۔ ہمیں اپنے ہاں تو کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے کچھ اعتماد سے نہیں کہہ سکتے۔ میں تو امریکیوں کی اس محنت اور تحقیق سے متاثر ہو رہا ہوں کہ یہ اپنے شہریوں کی زندگی کو محفوظ اور آسان بنانے کے لیے کتنی دلچسپی لیتے ہیں۔ اور اب دہشت گردی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کے پیش نظر انہوں نے پینے کے پانی کو لاحق ہونے والے ممکنہ خطرات کو بھی ہوم لینڈ سیکورٹی کے محکمے کے ماتحت کرلیا ہے۔ یہ سب کچھ پہلے سے ہوتا رہا ہے۔ لیکن اب اس میں خصوصی توجہ شامل ہوگئی ہے۔ اور دوسری طرف وفاقی حکومت سے مزید فنڈز بھی ملنے سے یہ سہولتیں اور زیادہ جدید ہو رہی ہیں۔ مزید ماہرین بھی رکھے جا رہے ہیں۔ تحقیق کا دائرہ بھی وسیع کردیا گیا ہے۔

میں تو کافی معلومات لے کر یہاں سے رخصت ہو رہا ہوں۔ ہیلمیٹ ہم نے واپس کردیے ہیں۔ پلاسٹک کے چشمے وہ کہہ رہے ہیں کہ لے جانا چاہیں تو لے جاسکتے ہیں۔ یہ ایک سوغات سمجھ لیں۔

زیوئیر یونیورسٹی۔ ایک پورا شہر

ہماری منزل اب زیوئیر یونیورسٹی ہے۔ سنسناٹی میں پہلا دن ہی کتنا طویل ہوتا جا رہا ہے۔ زیوئیر یونیورسٹی کا دورہ باضابطہ پروگرام نہیں ہے۔ یہاں ہماری ملاقات پہلے بزرگ پروفیسر ایمل ڈینکسر سے ہو رہی ہے۔ جو ناشتے پر گول میز بحث کے میزبان بھی تھے۔ یہاں وہ ایک مقامی ریڈیو پر ہمارے وفد کے دو ارکان شکریہ بارک زئی اور ایمبیڈر ضمیر سے گفتگو کر رہے ہیں۔ پاکستان اور بھارت کے صحافیوں کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ کہیں وہ ریڈیو پر نہ لڑ پڑیں اس انٹرویو کے دوران ہمیں یہ موقع دیا گیا ہے کہ ہم اس یونیورسٹی میں گھوم پھر لیں۔ جواں سال پاکستانی منیر شریف جو یہیں زیر تعلیم ہیں۔ وہ ہمارے رہنما ہیں۔ یونیورسٹی کے ایڈمنسٹریشن بلاک میں دفاتر دیکھنے کے بعد ہم جمنیزیم اور اسپورٹس اسٹیڈیم دیکھ رہے ہیں۔ جہاں چھ ہزار طلبہ بیک وقت بیٹھ کر باسکٹ بال دیکھ سکتے ہیں۔ دیواروں پر کالج کے نمایاں کھلاڑیوں کی بڑی بڑی تصاویر آویزاں ہیں۔ اسٹیڈیم کے ساتھ ریستوران، کینٹین بھی ہیں۔ بار بھی ہے۔ لیکن اس اسپورٹس کمپلیکس سے باہر مشروبات نہیں لے جائے جاسکتے۔ باہر نکلنے والے دروازوں پر لکھا ہے۔ No drinks beyond this point۔ ہمیں ہوسٹل کے کمرے بھی دکھائے جا رہے ہیں۔ کتنے صاف ستھرے، ملحقہ غسل خانوں والے بھی ہیں۔ اور وہ بھی جہاں ایک حصے کے لیے مشترکہ غسل خانے ہیں۔ بوائز ہاسٹل الگ ہیں۔ گرلز ہاسٹل الگ۔ یونیورسٹی کا مرکزی کیفے ٹیریا،

ریستوران، ایک الگ حصے میں لائبریری کے ساتھ ہیں۔ یہاں مختلف دکانیں بھی ہیں۔ جن میں کتابوں اور سوونیرز کی دکان سب سے زیادہ بڑی اور کشادہ ہے۔ دکان کہاں ہے مکمل مارکیٹ ہے۔ اسلام کا یہاں بھی الگ شیلف ہے۔ جنوبی ایشیا کا بھی...... پاکستان پر کتابیں بھی دستیاب ہیں۔ کسی شعبے کی کتابوں میں دقت ہو۔ تو گائیڈز موجود ہیں۔ وہ فوراً کمپیوٹر پر دیکھ کر بتا رہی ہیں کہ یہ کتاب دستیاب ہے یا نہیں۔

زیوریر یونیورسٹی کا یہ مختصر سا دورہ ہے۔ لیکن جی خوش ہوتا ہے کہ یونیورسٹی نہیں یہ ایک پورا شہر ہے جہاں مختلف مضامین کے الگ الگ بلاک ہیں۔ کھیلنے کی سہولتیں۔ وسیع لائبریری اور یونیورسٹی بڑے گراؤنڈز...... کھلے باغات...... صبح ورزش اور سیر کے لیے الگ الگ جگہیں...... یونیورسٹی کا اپنا ریڈیو ہے۔

یہ تو زیوئیر یونیورسٹی ہے۔ سنسناٹی یونیورسٹی الگ ہے۔

امریکہ کی زندگی میں یونیورسٹیوں کا ایک مقام ہے۔ یہ ملک کی سول سوسائٹی کے قیام اور پھر پیشرفت میں اپنی ریسرچ اور مباحثوں کے ذریعے تبدیلیاں لاتی رہتی ہیں۔ آج شام کو کوئی پروگرام نہیں ہے۔ ہم اپنی مرضی سے کہیں جانا چاہیں...... جاسکتے ہیں...... لیکن اس اجنبی سرزمین میں کہاں جائیں...... آج ویسے بھی دن اتنا طویل ہوگیا ہے کہ اب کسی مزید سیاحی کی تاب نہیں ہے۔ اگلے روز پھر صبح ہی چل پڑنا ہے۔ اس لیے آج اتنا ہی سہی۔ ہوٹل کی 29 ویں منزل سے شہر کو رات کی زلفوں میں کھوتے ہوئے دیکھتے ہوئے ہم بھی نیند کی آغوش میں پناہ لے رہے ہیں۔

امریکن ریڈکراس کی آغوش

چلنا چلنا مدام چلنا...... اب تو یہی ہمارا چلن ہے۔ پانچویں گلی کی سمت میں ہوٹل سے نکلیں۔ ہوٹل سے باہر نکلنے کے کئی راستے ہیں۔ پانچویں گلی میں دائیں، پھر میکامور پر بائیں...... یہ آ گیا ریڈکراس سنسناٹی چیپٹر۔

آج جمعہ ہے۔ ہم کل سے کہہ رہے ہیں کہ جمعہ مسجد میں ادا کرنا ہے۔ میزبانوں کو فکر تو ہے۔ لیکن مسجد کہیں نزدیک نہیں ہے۔ شہر کے دوسرے حصے میں ہے۔ وہاں جانے سے یہ پروگرام متاثر ہوگا۔ یہیں ریڈکراس کی بلڈنگ میں ایک کمرہ نماز کے لیے مخصوص کردیا گیا ہے۔ میٹنگ کے آغاز سے پہلے ہی بتادیا گیا ہے کہ نمازیوں کے لیے اپنی اپنی نماز پڑھنے کا اہتمام ہے۔

ریڈکراس میں ہماری ملاقات ہورہی ہے۔ گیری جی ملر، ڈائریکٹر ڈساسٹر پلاننگ، اینڈ ریلیف ڈیپارٹمنٹ۔ میں تھوڑا سا حیرت زدہ ہوں کہ یہ ڈساسٹر یعنی تباہی کی منصوبہ بندی کے ڈائریکٹر ہیں۔ یا تباہی روکنے کی منصوبہ بندی کے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ایک ہی بات ہے۔ امریکی انگریزوں کی طرح زبان کے اتنے ضابطے پورے نہیں کرتے بات سمجھ میں آنی چاہیئے۔ ملر صاحب ایمرجنسی منیجر ہیں۔ یعنی ہنگامی حالات کا انتظار کرتے ہیں۔ یہ امریکی نیشنل ریڈکراس کے ان 7 اہم افراد میں سے ہیں جنہیں لیول، فائیو کے نیشنل ڈساسٹر یعنی تباہی کی اعلیٰ ترین

نوعیت میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرنے کی اہلیت ملی ہوئی ہے۔ امریکن ریڈکراس فضائی ٹیم کے ایڈمنسٹریٹو ڈائریکٹر ہیں جو فضائی کمپنیوں کو پیش آنے والے بڑے حادثوں کی صورت میں بلائی جاتی ہے۔ جہاں خدانخواستہ زیادہ انسانی جانوں کا ضیاع ہوجاتا ہے۔ وہ 25 ایسے ہنگامی حادثوں میں امدادی کام انجام دے چکے ہیں۔

جاب ڈائریکٹر کی حیثیت سے انہوں نے آخری ذمہ داری ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں دہشت گردی کے بعد امدادی کاموں کے دوران انجام دی تھی۔ ملر صاحب کے سر پر ایک وقت میں کئی ٹوپیاں ہیں۔ سنسناٹی میں کسی ہنگامی حالت کا مقابلہ کرنے والی فضائی، بحری اور سماجی کئی تنظیموں کے وہ رکن ہیں۔ شہریوں کی مصیبت میں وہ مسیحائی کے کئی عہدے رکھتے ہیں۔ اپنی طویل خدمات کے سلسلے میں وہ سمز ٹاؤن شپ اوہائیو سے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ بھی حاصل کرچکے ہیں۔ ٹی وی پر اسی سلسلے کی آگہی بیداری پھیلانے کے لیے تیار کردہ پروگراموں میں آچکے ہیں کئی مضامین بھی لکھ چکے ہیں۔ ایسے حالات میں دل پر کیا گزرتی ہے۔ سانس کیوں رک جاتی ہے۔ ان کیفیتوں سے بھی واقف ہیں۔ ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیئے۔ اپنے تجربے کی روشنی میں اس کے ماہر ہیں۔ لوگ ان کی بات سنتے بھی ہیں۔ مانتے بھی ہیں۔

گیری بتارہے ہیں کہ ہم عالمی ریڈکراس کے رکن ہیں۔ ہمارا بنیادی فریضہ کسی تباہی کے دوران اور بعد میں انسانیت کے تحفظ کے لیے فوری منصوبہ بندی کرنا ہے۔ تباہی کو روکنے یا حفظ ماتقدم کے طور پر تو ہمیشہ تیاریاں جاری رہتی ہیں۔ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہمارے ہاں ریڈکراس کا تصور اور دائرہ کار زیادہ وسیع ہے۔ ہم حکومت کا ادارہ نہیں ہے اور صرف حکومت سے فنڈز وصول نہیں کرتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ڈاکٹرز بھی ہیں۔ ٹرانسپورٹ بھی...... اور خون کے عطیات کے مراکز بھی۔ زیادہ تر یونیورسٹیوں سے خون کا عطیہ ملتا ہے۔ تجارتی حلقوں کو ابتدائی امداد، اور دیگر حفاظتی اقدامات کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ تباہی کے دوران خدمات کی ادائیگی تو نہیں لی جاتی۔ البتہ عطیات کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ کچھ ادارے باقاعدہ فنڈز دیتے ہیں۔ سالانہ یا ماہانہ بنیادوں پر، کچھ جب چاہے جتنا چاہے دے دیتے ہیں۔ لیکن جب کوئی واقعہ رونما ہوجائے۔ اس دوران لوگ بڑی فراخدلی سے مالی مدد کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سنسناٹی بنیادی طور پر ایک مخیّر معاشرہ ہے۔ کسی ہنگامی حالت میں لوگ تقریباً تمام ضرورتیں پوری کردیتے ہیں۔

فنڈز کس طرح جمع کیے جاتے ہیں۔ یہ پوچھنے پر وہ بتاتے ہیں کہ جب کوئی حادثہ یا سانحہ ہوجائے۔ تو ریڈکراس کی طرف سے ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات میں اپیلیں کی جاتی ہیں۔ اور درخواست کی جاتی ہے کہ فوری مالی امداد کی ضرورت ہے۔ خون چاہیئے۔ لوگ جوق درجوق آتے ہیں۔ 11 ستمبر کو صرف سنسناٹی میں ایک ارب ڈالر جمع ہوئے تھے۔ یہ رقم مرکزی امریکی ریڈکراس کو بھجوادی گئی تھی۔ ہلاک ہونے والوں میں سے کم از کم 9 کا تعلق سنسناٹی سے تھا۔ ان خاندانوں سے اظہار ہمدردی کے لیے بہت لوگ جاپہنچے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ 11 ستمبر نے ہم سب کے ذہن تبدیل کردیئے ہیں۔ امدادی خدمات انجام دینے والے اداروں میں بھی بہت سی تنظیمی تبدیلیاں آئی ہیں۔ پہلے بھی کسی ہنگامی صورت حال میں مختلف ادارے اپنا اپنا کام شروع کردیتے تھے۔ لیکن ان کے درمیان ہم آہنگی نہیں ہوتی تھی۔ اب ہوم لینڈ سیکورٹی ان سب کا محور بن گئی ہے۔ ہوم لینڈ سیکورٹی کے سیکرٹری (وزیر) پولیس، ریڈکراس، فائر بریگیڈ، ای پی اے، سب کے درمیان رابطہ رکھتے ہیں مقامی ریڈیو اسٹیشنوں، ٹی وی چینلوں کے درمیان بھی اب ایک تعلق ہے۔ سب سے زیادہ کام اب رضا کاروں کی تربیت پر کیا گیا ہے۔ سنسناٹی میں پہلے صرف 870 ایسے رضا کار تھے۔ جو کسی ہنگامی حالت میں دستیاب ہوتے تھے۔ اب یہ تعداد چھ ہزار ہوگئی ہے۔ اب تناسب یہ ہے کہ ہنگامی صورت حال سے نمٹنے والوں میں سے دوتہائی رضا کار ہیں۔ اور صرف ایک تہائی سرکاری یا دوسرے اداروں کے ملازمین ہیں۔ رضا کاروں کو اب قومی سطح پر بھی تربیت دی جارہی ہے اور مقامی سطح پر بھی۔ ہمارے پوچھنے پر وہ بتارہے ہیں کہ سنسناٹی ریڈکراس 24 گھنٹے کے نوٹس پر 5 ہزار متاثرین کو کھانا فراہم کرسکتا ہے۔ اس سے متعلقہ اور مطلوبہ تمام انتظامات کیے جاسکتے ہیں۔

سوال کیا گیا ہے کہ دریا کے سیلاب سے کبھی خطرات لاحق ہوئے ہیں۔ بتارہے ہیں کہ ایک دو بار دریا نے بپھر کر غصے کا اظہار کیا ہے۔ امریکہ کا سب سے زیادہ تباہ کن سیلاب یہاں آچکا ہے۔ طوفان بادوباراں بھی 1974ء میں بہت تباہی مچاچکے ہیں۔ پہلے مقابلے کے لیے

اتنے انتظامات نہیں تھے۔ اب طوفان سے پہلے کی وارننگ کے بھی یقینی انتظامات ہیں۔ ایسے طوفان اب بھی آسکتے ہیں...... جو پہلے سے کچھ زیادہ تیاری کا موقع نہیں دیتے ہیں۔ تاہم اب پورے علاقے میں ٹیلی فون کا نظام ہے۔ اس لیے جب کسی خطرے کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ تو دور دراز مقامات پر ٹیلی فون سے اطلاع دی جاتی ہے۔ سائرن بجائے جاتے ہیں۔ لوگوں کو پہلے سے پتا ہے کہ خطرے کی کس سطح پر کیا کرنا ہے۔ علاقہ خالی کرنا ہے۔ تو اس کے لیے ٹرانسپورٹ فراہم کی جاتی ہے۔ گشتی مکان بھی دیئے جاتے ہیں۔ بڑے پیمانے پر مکانات کو خطرہ ہو یا تباہ ہوجائیں تو عام طور پر اسکولوں میں کیمپ قائم کیے جاتے ہیں۔

وہ یہ بھی بتا رہے ہیں کہ اگر بڑے پیمانے پر ہلاکتیں اور تباہی ہو۔ اس کے لیے تمام منصوبہ بندی موجود ہے۔ پورا میڈیکل سسٹم ہے۔ ایک جہاز ہے جس میں یہ سارا ساز و سامان موجود ہے۔ شہری آبادی کو بھی اس کے لیے تربیت دی ہوئی ہے۔ یونیورسٹی ایرکیئر کا بھی اہتمام ہے۔ ان کے ہیلی کاپٹر ہیں جو کسی بھی ہسپتال میں اتر سکتے ہیں۔ بنیادی مقصد زندگی بچانے کے لیے امداد فراہم کرنا ہے۔ اس میں ہر پہلو سے طے کیا جاتا ہے کہ کسی سڑک پر اتنا ہجوم نہ ہوجائے کہ عام ٹریفک رک جائے۔ ایک مرکز ایسا قائم ہوجاتا ہے۔ جو امدادی ٹیموں، ہسپتالوں، ریڈیو، ٹی وی اور دوسرے اداروں کے درمیان رابطہ رکھتا ہے۔ ہر ایک کو باخبر رکھتا ہے۔ وہی یہ دیکھتا ہے کہ کس ہسپتال میں کتنے زخمی یا مریض پہنچ گئے ہیں کتنے مزید جاسکتے ہیں یہ نہ ہوکہ ایک ہی ہسپتال پر سارا دباؤ پڑجائے۔ اس کے لیے رضا کاروں کو سال میں چار بار تربیت دی جاتی ہے۔ مشقیں کی جاتی ہیں۔ رضا کاروں کو مطلع کرنے کے لیے ان کے فون نمبروں پر، پیجر پر یا گھر پر کسی کو بھیج کر اطلاع دی جاتی ہے۔ جب تک کوئی جواب نہ آئے پیغام جاتا رہتا ہے۔ رابطے کے لیے جدید ترین آلات استعمال کیے جاتے ہیں۔ دستی ریڈیو ہیں، سیٹلائٹ سسٹم ہیں۔

سنسناٹی کا واشنگٹن سے بھی فعال رابطہ ہے۔ ایف بی آئی کے اعلیٰ افسر آتے رہتے ہیں۔ وہ جدید ترین حالات سے آگاہ رکھتے ہیں۔

بتایا جارہا ہے کہ دہشت گردی کے نیٹ ورک بھی اپنی منصوبہ بندی کرتے رہتے ہیں۔" اپنی وارداتوں کے طریقے بدلتے رہتے ہیں۔ پہلے کیمیکل استعمال کیے جارہے تھے۔ پھر بائیولاجیکل استعمال ہونے لگے۔ اینتھریکس اس کا ہی ایک حصہ تھا۔ اب ریڈیو لاجیکل حملوں کا خطرہ ہے۔ ہمارے رضا کار ظاہر ہے کہ ایک ہی رات میں پروفیشنل نہیں بن سکتے۔ ہوم لینڈ سیکورٹی تربیت کا انتظام کررہی ہے۔

سب سے زیادہ زور عام شہریوں میں بیداری اور آگاہی پھیلانے پر دیا جارہا ہے۔ ریڈکراس نے باقاعدہ awareness packet تیار کیے ہیں۔ جن میں مختلف پہلوؤں سے اجتماعی تدابیر بتائی گئی ہیں۔ کیا کیا سہولتیں موجود ہیں۔ وہ بھی درج کی گئی ہیں۔ ریڈکراس کا ایک رسالہ "People" کے نام سے بہت خوبصورت انداز میں شائع کیا جاتا ہے۔ جس میں رضا کاروں، میڈیکل عملے کی اہم خدمات کی خبریں اور تصاویر بھی دی جارہی ہیں۔ تازہ ترین واقعات سے بھی باخبر کیا جاتا ہے۔

عام شہریوں کو ہنگامی حالت میں تیار رکھنے کے لیے ہوم لینڈ سیکورٹی ایڈوائزری سسٹم کی سفارشات امریکن ریڈکراس کی طرف سے تقسیم کی جاتی ہیں۔ جس کا نعرہ یہ ہے۔ مل جل کر ہم ایک زندگی بچا سکتے ہیں۔ خطرے کی پانچ سطحیں رکھی گئی ہیں۔ سب سے کم (سبز) محتاط (نیلا) بڑھتا ہوا (پیلا) اونچا (نارنجی) شدید (سرخ) ان کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ آپ کو کیا کرنا چاہیئے۔ فرد کو کیا کرنا ہے۔ خاندان کو کیا کرنا ہے۔ اسکولوں کو کیا کرنا ہے۔ تجارتی اداروں کو کیا کرنا چاہیے۔ ہمسایوں کو کیا کرنا چاہیئے۔ یہ تمام ہدایات اور احتیاطی تدابیر بڑے دلکش انداز میں، اچھے قیمتی کاغذ پر، خوبصورت ڈیزائن کے ساتھ چھاپ کر ایک پیکٹ میں دیئے جاتے ہیں کہ آپ انہیں پڑھنے پر مجبور بھی ہوں۔ خراب کاغذ اور بے دلی سے چھاپے ہوں تو ویسے ہی پھینک دیا جاتا ہے۔ کوئی انہیں پڑھنے کی زحمت بھی نہیں کرتا۔

امریکن ریڈکراس کا ایک شعبہ ان خاندانوں کی دلجوئی کا اہتمام کرتا ہے۔ جن کے اقارب مختلف محاذوں سے لوٹتے ہیں۔ یا جن کے پیارے لڑائی میں مارے جاتے ہیں۔ یا گم ہوجاتے ہیں۔

کمیونٹی ایمرجنسی ریسپونس ٹیم (کرٹ، کسی علاقے میں بڑی تباہی کی صورت میں سرگرم

ہوجاتی ہے اس کے لیے باقاعدہ تربیت دی گئی ہے۔ رضا کاروں کا اندراج کیا گیا ہے۔ تباہی کی صورت میں خاندان کے لیے منصوبہ۔ کیا کیا سازوسامان تیار رکھنا چاہیئے۔ تباہی کے لیے خدمات دینے والے اداروں کے بارے میں پوری معلومات، کیمیکل ، بائیولاجیکل حملے کی صورت میں پناہ گاہیں کہاں کہاں ہیں۔ اینتھریکس، یا دہشت گردی کی صورت میں کیا کرنا ہے۔ کس سے رابطہ کرنا ہے۔ یہ تمام معلومات پمفلٹوں میں درج ہیں۔

ریڈکراس کی یہ تیاریاں یقیناً متاثر کن ہیں۔ ان کے نتیجے میں کسی حادثے یا دہشت گردی کی صورت میں ہلاکتوں اور تباہی کی شدت میں کمی آتی ہوگی۔ ایسے سانحوں میں بھگدڑ مچنے یا افراتفری میں زیادہ نقصان ہوجاتے ہیں۔ کسی بھی قوم کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ متوقع یا غیر متوقع حادثات کے لیے تیار رہے۔ آفات ناگہانی کے لیے تمام تیاریاں کرکے رکھیں۔ حکومت اپنے طور پر جو کچھ کرسکتی ہے۔ وہ کرے۔ غیر سرکاری ادارے جو کرسکتے ہیں۔ وہ انتظامات کریں۔ کوئی ادارہ ہو جو یہ خدمات انجام دینے والے اداروں کے درمیان رابطہ رکھے۔ اسے علم ہو کہ کس جگہ کتنے لوگوں کو امداد مل سکتی ہے۔ تباہ ہونے والے گھروں کے مکینوں کو عارضی طور پر کہاں رکھا جاسکتا ہے۔ یہ تمام معلومات پہلے سے مستند انداز میں درج ہوں۔ تو افراتفری پریشانی بھی کم ہوسکتی ہے۔ اور امداد دینے کی رفتار بھی تیز ہوسکتی ہے۔

لنچ کا انتظام بھی یہیں ہے۔ جو اپنے پیسوں سے کرنا ہے۔ خصوصی سہولت یہ ہے کہ ویسے یہاں صرف متعلقہ افراد ہی داخل ہوسکتے ہیں۔ ہمیں اس کی اجازت دے دی گئی ہے۔ لنچ کے بعد ہمیں بعض امریکی فوجیوں سے ملنا ہے۔ جو کویت، عراق اور افغانستان میں جنگی محاذوں پر خدمات انجام دے کر واپس آئے ہیں۔ یقیناً یہ باتیں دلچسپ بھی ہوں گی...... اور چشم کشا بھی۔

محاذ سے واپس آنے والوں سے گفتگو

کھانا یہ بھی عجلت میں ہے۔ اس کے بعد ایک اچھی نشست ہونے والی ہے۔ کویت، عراق اور افغانستان سے واپس آنے والے فوجیوں سے بات چیت ہوگی۔ امریکہ میں باقاعدہ فوجی بھی ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک بڑی تعداد محفوظ فوجیوں کی ہوتی ہے۔ وہ بھی محاذ جنگ پر جاکر خدمات انجام دیتے ہیں۔ پہلے تعارف ہورہا ہے۔ ہم لوگ بھی اپنے اور اپنے ملک کے بارے میں بتارہے ہیں۔ فوجی اپنا نام، عہدہ اس کے بعد شادی شدہ یا غیر...... اور بچے بتارہے ہیں۔ سٹیزن سولجر..... (شہری فوجی) کا تصور ہمیں دلچسپ اور عجیب لگ رہا ہے...... مثلاً عراق سے آنے والا بتارہا ہے کہ شہری زندگی میں کمپیوٹر انجینئر ہے...... لیکن محاذ پر وہ فلاں بٹالین کے ساتھ لڑرہا ہے۔

کویت سے واپس آنے والے ایک ذرا متوسط عمر کے صاحب بتارہے ہیں کہ 11 ستمبر کے بعد ہم سیکورٹی کی بہت زیادہ فکر کرنے لگے ہیں۔ ایئرپورٹس پر چیکنگ بہت بڑھ گئی ہے۔ وہ اپنا بزنس کرتے تھے اس سلسلے میں انہیں بہت نقصان ہوا۔ ان کا ایک منیجر پروجیکٹ ٹریڈ ٹاور سے ٹکرانے والے ایک طیارے میں ہلاک ہوگیا تھا۔ اپنے بزنس کی بحالی کے لیے انہیں بہت کوششیں کرنی پڑیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سیکورٹی چیکنگ سے ہم پچاس کے عشرے میں واپس چلے گئے ہیں۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ ان دنوں میں بھی ایسی سختیاں نہیں

تھیں۔ ادھر کویت میں قیام کے دوران میں سمجھتا ہوں کہ میرے علم میں اضافہ ہوا ہے۔ میں نے دیکھا کہ مسلمان کیسے زندگی گزارتے ہیں۔ وہ اپنی اقدار...... ثقافت پر بہت فخر کرتے ہیں...... مجھے تو مسلمانوں کی خاندانی روایات اچھی لگی ہیں...... میں نہیں مانتا کہ سب عراقی دہشت گرد تھے...... کچھ لوگ ہوں گے۔

ایک صاحب بتا رہے ہیں کہ 11 ستمبر کو انہیں پہلے تو لگا کہ کسی اور ملک نے حملہ کردیا ہے۔ ہم بہت گھبرا گئے تھے...... لیکن میں تیار تھا کہ جب بھی طلبی ہوئی میں فوجی خدمات کے لیے جاؤں گا۔ ان واقعات سے شہری زندگی بہت متاثر ہوئی۔ مالیاتی شعبہ اور بالخصوص اسٹاک ایکسچینج کو زیادہ نقصان پہنچا ہے۔ بے روزگاری بہت بڑھی ہے میں نے عراق میں دیکھا کہ وہاں عام عراقی اس صورت حال سے پریشان ہیں۔ لیکن وہ اسے آمریت کے خلاف ایک مدد بھی سمجھتے ہیں۔ اور وہ اب اس سے فائدہ اٹھانے کی سوچ رہے ہیں۔

یہ سیاہ فام فوجی کچھ زیادہ جذباتی ہورہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ دہشت گردوں کو ہر صورت میں ختم کردینا چاہیئے۔ یہ اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔ کیا ہمیں یرغمال بنالینا چاہتے تھے۔ پانچویں صاحب نے 1992ء سے 8 سال تک میرین کورٹ ڈیوٹی کی تھی۔ گیارہ ستمبر کو ریزروسنٹر سے فون آیا۔ اور میں اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گیا۔ ایک صاحب کہہ رہے ہیں کہ میرے دادا نے ویت نام کی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ میں جنگ کی تباہ کاریاں جانتا ہوں۔ لیکن گیارہ ستمبر کو جو کچھ ہوا۔ اس نے مجھے مجبور کردیا کہ میں میرین کور میں بھرتی ہوگیا۔ تاکہ اس دشمن کا مقابلہ کرسکوں۔ پھر دوبارہ ایسا کوئی واقعہ ہوتو میں پھر جانے کو تیار ہوں گا۔ ایک جوان بتا رہے ہیں کہ 11 ستمبر کے بعد تو دنیا ہی بدل گئی۔ فون بجنے لگے۔ ریزروسینٹر کہہ رہے تھے کہیں بھی ڈیوٹی لگ سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی پورے ذہنی رویے تبدیل ہوگئے۔ بہت فکرمندی تھی۔ میری بیوی نے بھی نیشنل گارڈز میں حصہ لیا ہے۔ اس وقت ہم نے سب کچھ طے کرلیا۔ بیمہ بھی کروالیا۔ وصیت بھی لکھ دی۔ کیونکہ اندازہ نہیں تھا کہ کب کیا ہوگا۔ میں نے عراق میں چار ماہ گزارے۔ عراقی بہت اچھے لوگ ہیں۔ بڑی اچھی طرح بات کرتے تھے۔ بچے ہمیں ہیرو سمجھتے تھے۔ ہمارے ساتھ تصویریں بنواتے تھے۔ انگریزی بولنے کی کوشش کرتے تھے۔ میں ذاتی طور پر اپنی

کارکردگی سے مطمئن ہوں۔ کیونکہ جتنے عراقی ملے۔ وہ کہتے تھے کہ امریکہ نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا ہے۔ وہ 100 فی صد میرے ساتھ تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ امریکی فوجی ہلاک ہوں گے تو امریکی قوم دباؤ ڈالے گی۔ فوج کو واپس آنا ہوگا۔ ایسا نہیں ہے۔ اتنے امریکی تو لاس اینجلز کے نسلی فسادات میں ہلاک ہوجاتے ہیں۔ جان کسی کی بھی ضائع ہو۔ امریکی کی یا عراقی کی۔ یہ افسوسناک ہے۔

ان سے کہا گیا کہ فوج کہیں کی بھی ہو۔ اسے جب حکومت کہیں بھیجتی ہے۔ تو یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ فوجی اپنی حکومت کے آرڈر نہیں مانیں گے۔ سوال جواب کریں گے۔ امریکی فوجی بھی ظاہر ہے کہ خاندان رکھتے ہیں۔ اپنے والدین کے پیارے ہیں...... ان کی موت بھی اندوہناک ہے۔ لیکن دنیا یہ سوال تو کرسکتی ہے کہ امریکی حکومت کو یہ اختیار کس نے دیا ہے کہ وہ کسی بھی ملک میں مداخلت کے لیے پہنچ جائے امریکی ایک استعماری طاقت بن رہا ہے۔ پہلے استعماری طاقتوں کا کیا انجام ہوتا رہا ہے۔ یہ شاید بھول گیا ہے۔ عراقی حکومت پر الزام تھا کہ یہاں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہیں۔ وہ تو نہیں ملے ہیں۔ امریکی یہ کہہ رہے ہیں کہ دنیا یہ بھی جانتی ہے کہ طالبان اور صدام حسین کو ہٹانا ضروری تھا کیونکہ طالبان افغانستان میں انسانیت پر ظلم کررہے تھے۔ اور صدام حسین بھی ہزاروں عراقیوں کو قتل کررہا تھا۔ عراق کے لوگ اسے اپنے طور پر نہیں ہٹا سکتے تھے۔ ہم جنوبی ایشیائیوں اور امریکی فوجیوں کے درمیان اس صورت حال پر بحث چھڑ گئی ہے۔ اور وہ یہ ماننے پر تیار ہوگئے ہیں کہ یہ تاثر بالکل غلط ہے کہ تمام مسلمان دہشت گرد ہیں۔ دہشت گرد، دہشت گرد ہے۔ اس کی کوئی خاص نسل یا مذہب نہیں ہوتا۔ ان سے پوچھا جارہا ہے کہ آپ کے خیال میں صدام کو زندہ گرفتار کرنا چاہیئے یا اسے ہلاک کردینا بہتر ہوگا۔ ایک کا کہنا ہے کہ زندہ گرفتار کیا جائے۔ عالمی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔ تین چار کا کہنا یہ ہے کہ یہ ہمارا نہیں یہ فیصلہ عراقی عوام کو کرنا چاہیئے۔ اور انہیں ہی صدام کی قسمت طے کرنے کا حق ہونا چاہیئے۔ ایک کہہ رہے ہیں کہ صدام زندہ گرفتار ہو یا ہلاک کردیا جائے۔ میرے لیے یہ اہم نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اصل بات یہ ہے کہ عراقی عوام کے مسائل حل ہوں۔ مجھے صدام کے محلات دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ خود شہنشاہوں کی طرح رہتا تھا۔ لیکن

بے چارے عوام روٹی، پانی، بجلی کو ترستے تھے۔ صدام بھی عراقیوں کے لیے ہٹلر کی طرح تھا۔

فوجی کہیں کے بھی ہوں۔ وہ اپنی حکومت کے احکامات کے پابند ہوتے ہیں۔ چوں چرا تو ہوتی ہی نہیں ہے۔ لیکن داد دینی چاہیئے امریکیوں کو کہ انہوں نے اپنے فوجیوں سے اس طرح تبادلہ خیال کرنے دیا ہے۔ شروع میں تو امریکی فوجی یہ ضروری سمجھ رہے تھے کہ انہیں عسکری جوش وجذبے کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔ لیکن جب ہماری طرف سے حقائق بیان کیے گئے۔ تو وہ عسکریت سے اتر کر انسانیت میں آ گئے ہیں۔

سٹی حکومتوں کی وفاقی حکومت سے شکایات

آج کا دن بھی بہت طویل ہوتا جا رہا ہے۔ امریکی فوجیوں سے ملاقات سے اندازہ ہوا ہے کہ وہ کس جذبے اور ذہن کے ساتھ لڑ رہے ہیں۔ مسز گرٹروڈ فلیگ امریکن ریڈ کراس میں خاندانوں کی اعانت پر مامور ہیں۔ وہ تفصیلات بتا رہی ہیں کہ محاذ پر گئے ہوئے فوجیوں کے گھروں کی خبر خیر کیسے لی جاتی ہے۔ امریکہ میں تو مرد اور عورتیں سبھی ایسی ڈیوٹی پر جاتی ہیں۔ اس لیے یہ اعانت صرف بیویوں تک محدود نہیں ہے۔

یہیں سنسناٹی میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ ہم امریکی مقامی حکومتوں کی ایک جھلک بھی دیکھ لیں ہوٹل سے ہم پیدل ہی سٹی ہال کی طرف چل رہے ہیں۔ سٹی ہال کی عمارت بڑی پرشکوہ ہے۔ جس کے ساتھ ہی ایک پرانا گرجا گھر تھا۔ اور سامنے یہودیوں کی عبادت گاہ ہے۔

سٹی ہال میں ایک کمیٹی روم میں ملاقات تو دو سٹی کونسل ممبرز سے رکھی گئی ہے۔ لیکن آثار یہ نظر آ رہے ہیں کہ ایک رکن کرس مونزل پہنچ نہیں سکے ہیں۔ ان کا تعلق ری پبلکن پارٹی سے ہے۔ اس وقت ہم محو گفتگو ہیں۔ جناب ڈیوڈ پیپر سے جو ڈیموکریٹ ہیں۔ سٹی آف سنسناٹی کے کونسل ممبر جواں سال بھی ہیں جواں عزم بھی لگتے ہیں۔ سات ماہ سے وہ کونسل کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کی بنیادی توجہ زندگی کا معیار بہتر بنانے پر ہے وہ پیر ہڈز کمیٹی کے وائس چیئرمین ہیں۔ پیشہ ان کا وکالت ہے۔ سنسناٹی یوتھ کولیبریٹو کے بھی رکن ہیں۔ ورلڈ افیئرز کونسل

کے بورڈ میں بھی ہیں۔1993ء سے 1996ء کے دوران انہوں نے واشنگٹن کے ایک تھنک ٹینک کے لیے ڈاکٹر برزنسکی کے ریسرچ انٹرن کے طور پر کام کیا۔ پھر سینٹ پیٹربرگ روس میں سٹی لیڈرز کے ہمراہ سرمایہ کاری اور اقتصادی ترقی کے لیے حصہ لیا۔

وہ بالکل کھل کر بول رہے ہیں...... اور وفاقی حکومت ان کا ہدف ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کا شور بہت ہے۔ ہم اپنے طور پر بہت کچھ کر رہے ہیں لیکن ہوم لینڈ سیکورٹی نے جس گرانٹ کا وعدہ کیا تھا۔ وہ ہمیں نہیں ملی ہے۔ وفاقی حکومت زیادہ پیسہ فراہم نہیں کر رہی ہے۔ بیوروکریٹک رکاوٹیں بہت ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سٹی لیڈرز بالعموم مایوس ہیں۔ جہاں ری پبلکن گورنرز ہیں۔ ری پبلکن میئر ہیں۔ وہاں تو گرانٹ باقاعدگی سے ملتی ہے۔ دوسرے شہروں کے ساتھ بہتر سلوک نہیں ہوتا۔ سٹی گورنمنٹ کو چلانے کے لیے زیادہ تر تو ایسے ٹیکس ہوتے ہیں۔ کہ ریاست سے مدد ملتی ہے۔ کچھ وفاق سے لیکن سٹی حکومتوں کے پاس پیسہ باقاعدگی سے نہیں پہنچتا۔ اس لیے کام رک جاتے ہیں۔ یقیناً ہم کہہ سکتے ہیں کہ امتیازی سلوک ہو رہا ہے۔

سٹی گورنمنٹ کے نظام کے بارے میں وہ بتا رہے ہیں کہ میئر چار سال کے لیے براہ راست منتخب ہوتا ہے۔ کمیٹیاں ہیں ممبر کونسل ہے۔ میئر کے پاس ویٹو ہوتا ہے۔ لیکن ووٹ نہیں ہے۔ میئر کو ہٹانے کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ ہمارے پوچھنے پر وہ بتا رہے ہیں کہ سٹی کونسل کے اختیارات میں تعلیم اور صحت نہیں ہے۔ ریاستیں اسکول بورڈ قائم کرتی ہیں۔ تعلیم کا نظام اسکول بورڈ چلاتے ہیں۔ صحت زیادہ تر پرائیویٹ سیکٹر میں ہے۔ سٹی کونسل کے پاس پولیس ہے...... فائر بریگیڈ ہے...... پراپرٹی ٹیکس ہے...... سڑکیں ہیں...... دوملین ڈالر کا دو سال کا بجٹ ہے...... جس میں جرائم کے مقابلے میں شہریوں کو تحفظ دیا جاتا ہے...... اقتصادی اصطلاحات بھی سٹی کونسل کے ذمے ہیں...... اب بھی زیادہ غور اس بات پر ہو رہا ہے کہ سٹی حکومتوں کو اپنے آمدنی کے ذرائع بڑھانے یا چاہئیں۔ سٹی لیڈرز سال میں دو مرتبہ امریکہ میں کسی ریاست میں ملتے ہیں۔ یہ سٹی لیڈرز کی قومی کانفرنس ہوتی ہے جہاں سٹی حکومتوں کو وفاق اور ریاستوں کی طرف سے درپیش مسائل کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ مقامی ٹیکسوں کا نظام مشکل ہے۔ کسی سٹی میں زیادہ ٹیکس

ہیں۔ کسی ریاست میں زیادہ ہیں۔ اس طرح لوگوں کو پریشانی ہوتی ہے۔

ڈیوڈ پیپر ڈیموکریٹ ہیں اس لیے صدر بش کے سخت مخالف ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ گیارہ ستمبر پر تو سب متفق تھے۔ افغانستان میں کاروائی پر بھی اختلافات نہیں تھے۔ لیکن عراق میں کاروائی سے اختلافات ہوئے ہیں...... واشنگٹن کو تنقید کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ہم محسوس کر رہے ہیں کہ عراق کی صورت حال کے باعث صدر کی مقبولیت میں کمی آ رہی ہے۔ صدر پر تنقید میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

ان کا جوش وجذبہ...... شعلہ بیانی دیکھ کر میں ان سے کہہ رہا ہوں کہ لگتا ہے آپ خود بھی کبھی نہ کبھی صدارتی امیدوار ہوں گے۔ ڈیوڈ نے اس سے انکار نہیں کیا ہے۔ سٹی ہال بند ہے۔ ہم اسے دیکھ نہیں سکے ہیں۔ پھر ہوٹل واپسی، ڈنر ایک امریکی خاندان کے فارم ہاؤس میں رکھا گیا ہے۔

جھیل کنارے بار بی کیو

سنسناٹی تین ریاستوں کا سنگم ہے۔ خود یہ اوہائیو میں ہے۔ ایئرپورٹ کینٹکی میں ہے۔ اور اب چند کلومیٹر کے فاصلے پر ویسٹ ہیریسن جا رہے ہیں۔ وہ انڈیانا میں ہے۔

یہ ہمارے دورے کا ایک مختلف اور دلچسپ پروگرام ہے۔ امریکہ کے ہر شہر میں غیر ملکی مہمانوں کی پذیرائی کے لیے شہری کونسلیں قائم ہیں۔ ان کے ارکان میں سے ہی بعض یہ پیشکش کرتے ہیں کہ باہر سے آنے والے مہمان ان کے گھر غیر رسمی ڈنر پر آئیں۔

ہم تذبذب میں ہیں کہ گیارہ ستمبر کے بعد دنیا جس کیفیت سے گزر رہی ہے۔ امریکنوں کو جنوبی ایشیائیوں سے جو خدشات ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے دوستی اور خلوص کے جذبات کیسے ممکن ہوں گے۔

شاہراہ کتنی کھلی ہے۔ دونوں طرف کتنے ہرے ہرے پیڑ ہیں۔ اب ہماری وین دیہی علاقے کی چھوٹی سڑکوں پر رواں ہے۔ یہاں بھی جگہ جگہ ٹریفک اشارے ہیں۔ ملحقہ گلیوں کے باہر مکانات کے نمبر لکھے ہوئے ہیں۔ ایک گلی میں ہم مڑ گئے ہیں۔ یہاں ایک ہی گھر ہے۔ وگنز ہمارے میزبان ہیں۔ لارا خاتون خانہ ہیں کین صاحب خانہ......

گاڑی رک رہی ہے۔ ایک دوشیزہ سفید اسکرٹ میں ملبوس کچھ کھانے پینے کا سامان اٹھائے اس طرح رواں ہے۔ جیسے ہیر رانجھے کے لیے روٹی لے کر کھیتوں میں جا رہی ہو۔ وہ

رک گئی ہے۔ خوش آمدید۔ میں وگنز کی بیٹی ہوں۔ ہیدر۔ پاپا ماما آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایک بلند قامت امریکی۔ بالکل ویسٹرن فلموں کے ہیرو کی طرح۔ اس کے پیچھے پیچھے برطانوی فلموں کی لیڈی۔ ہمارا پرجوش خیر مقدم کرتے ہیں۔ تعارف...... مصافحے...... جوش اور محبت کا تبادلہ...... آیئے پہلے میں آپ کو اپنا گھر دکھادوں...... یہ ہمارا Living room ہے۔ یہ کچن...... یہ ٹیرس ہے...... یہ ندی پیچھے سے گزر رہی ہے...... ہم شام کو یہیں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں...... یہ ہماری خواب گاہیں ہیں...... آیئے تہ خانے میں چلتے ہیں...... یہاں مے خانہ ہے...... کارڈ روم ہے...... یہ مشترکہ باتھ روم ہے۔ یہ ہمارا ڈائننگ روم ہے...... یہ چھوٹی سی لائبریری...... کمپیوٹر......

یہ گھر جب تک آپ رہنا چاہیں آپ کے لیے کھلا ہے۔

بار بی کیو کا اہتمام ساتھ ہی ایک چھوٹے سے جنگل میں ہے۔ جس کے پیچھے ایک اور ندی گزر رہی ہے۔ ادھر ان کی ایک اپنی جھیل ہے۔ جہاں چھوٹی سی کشتی بھی ہے۔ ادھر ایک فوارہ ہے۔ اوپر چاند بھی چمک رہا ہے۔ ایک پل بھی بنایا ہوا ہے۔ جسے عبور کرکے ندی کے اس طرف جاسکتے ہیں۔

میزبان کے علم میں ہے کہ مہمانوں میں زیادہ تر وہ ہیں جو ان کے پسندیدہ گوشت سے گریز کرتے ہیں۔ اپنے عقیدے کے مطابق نہیں کھاسکتے۔ دوسرے گوشت کے بارے میں حلال...... حرام کا مسئلہ بھی ہے۔ اس لیے انہوں نے مچھلی کی ڈشز کا اہتمام کر رکھا ہے۔ سبزیاں بھی ہیں...... سب کچھ سامنے تیار ہو رہا ہے...... چاول بھی ہیں...... پینے کو بھی حرام حلال سب ہے...... لیکن سب سے لذیذ...... وہ ماحول اور فضا ہے...... جو محبت اور صرف محبت میں گندھی ہے۔ گیارہ ستمبر کے سائے یہاں نہیں پڑ رہے ہیں۔ بہت سے لوگ تحائف لے کر آئے ہیں یہ ہماری مشرقی روایت ہے کہ کسی کے گھر پہلی بار جائیں تو خالی ہاتھ نہیں جاتے ہیں۔ محبتوں کا تبادلہ محبتوں سے۔

یہ وگنز کی دوسری صاحبزادی ہیں۔ اپنے جڑواں بچوں کو لیے بیٹھی ہیں۔ یہ سب مہمانوں کی نگاہوں کا مرکز بھی ہوئی ہیں۔ اس کا نام نکول ہے۔ ہم میں سے کوئی نکول کڈمین کا ذکر کر رہا

ہے۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ وہ تو بہت دولت مند ہے۔ میرے پاس اتنے پیسے ہوں تو میں دنیا کی سیر کرتی پھروں۔

لارا اور کین کی دوسری صاحبزادی ہیدر...... بھٹکی ہوئی روح لگتی ہے۔ وہ ہندوستان میں سچائی کی جستجو میں گھومتی رہی ہے۔ چار پانچ ماہ وہاں اکیلی رہی ہے۔ ہندو دیو مالا کی کہانیوں سے گہری دلچسپی رکھتی ہے۔ ہندو تہذیب اسے دلکش لگتی ہے۔ وہ پوچھ رہی ہے کہ آپ نے کبھی خدا سے باتیں کی ہیں۔ یہ درخت بھی بولتے ہیں۔ کبھی ان سے بغل گیر ہوکر دیکھو۔ میں صوفیائے کرام کے بارے میں بتا رہا ہوں۔ درویشوں کے رقص یاد دلا رہا ہوں۔ وہ تھوڑی تھوڑی ہندی بھی بول سکتی ہے۔

لارا اور کین مہمان نوازی میں مصروف ہیں۔ چھوٹی سی جھیل بھی اس ماحول میں بہت پرکشش لگ رہی ہے۔ یہ بھرپور فارم ہاؤس 131 ایکٹر پر محیط ہے۔ لارا کے ساس سسر بھی ساتھ ہی والے مکان میں رہتے ہیں۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا بھی یہیں رہتے ہیں۔ کھیت میں ٹماٹر ہیں سبزیاں ہیں...... سیب اور چیری کے پیڑ بھی ہیں۔

یہاں سب چہروں پر خوشی کے رنگ بکھر رہے ہیں۔ نائن ہے نہ الیون ہے۔ نہ ہی عراق، افغانستان کے سنگین واقعات کا ذکر۔ رومان پرور ماحول میں سب کھو گئے ہیں۔ کھانا سب نے سیر ہوکر کھایا ہے۔ اب چلنے کا وقت آ گیا ہے۔ الوداع، خدا حافظ۔

واپسی میں میرے اندر کا شاعر بیدار ہوگیا ہے۔ سطریں اتر رہی ہیں۔ آپ کے لیے یہ تاثرات اردو اور انگریزی دونوں میں۔

خوشبوؤں میں بسی ہوئی راہیں	Pavements, roads perfumed
چہرے دمکے ہوئے کھلی بانہیں	Beeming faces, open arms
مسکراتی ہوئی حسیں آنکھیں	Smiling beautiful eyes
گرم جوشی، دعائیں، دلداری	Warmth, blessings, caring
اک عجب سحر ہر طرف طاری	An astonishing spell every where

خوب فطرت نے کی فسوں کاری	Exquisit networking by nature
پیڑ سرگوشیوں کو جھکتے تھے	Trees bending to whisper
پاس جگنو بھی آ کے رکتے تھے	Flying fires stopping by
آسماں سے ستارے تکتے تھے	Stars peeping from sky
مہرباں، مہرباں فضائیں تھیں	Surrounding very loving
بھیگتی، بھیگتی ہوائیں تھیں	Breeze soaked with dew
گنگناتی ہوئی صدائیں تھیں	Rythem, symphony, echoes
قربتوں کا نشہ کچھ اتنا تھا	Intimacy intoxicating so much
اجنبیت کا رنگ ماند ہوا	Colors of strangership faded
فاصلوں کا اثر تمام ہوا	Distances lost influence
چاندنی بھی ملن کو اتری تھی	Moonlight decended to embrace
جھیل سے بھی تو گفتگو کی تھی	Had a chat with lake
ذہن میں کتنی تازگی سی تھی	How the minds refreshened up
کہیں دہشت تھی اور نہ گردی تھی	There was no terror or ism
کوئی چیکنگ تھی اور نہ ہی وردی تھی	No checkings no uniforms
اک محبت دلوں میں بھر دی تھی	Only love, and love, in
	hearts, minds and eyes

ہیریسن شہر۔ اپنی مدد آپ کی مثال

ہم پھر انہی راستوں میں پر رواں ہیں۔ جن سے کل شام گزر رہے تھے۔ اب ہماری منزل ہیریسن ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے صرف 9ہزار نفوس پر مشتمل۔ قصبے گاؤں ملا کر بھی صرف 12 ہزار۔ امریکہ کے نویں صدر ولیم ہیری ہیریسن کے نام پر نام رکھا گیا تھا۔ انتہائی پرسکون، ٹریفک بھی زیادہ نہیں ہے لوگ بھی اپنے آپ میں مگن ہیں۔ پہلا قیام یہاں ایک ریستوراں مارکیٹ اسٹریٹ گرل میں ہے۔ جہاں لنچ پر شہر کی انتظامیہ سے ملاقاتیں ہیں۔ میئر ڈینئیل گیرنگر پولیس چیف چارلس لینڈ سے۔ وائس میئر رابرٹسن، کونسل کے ارکان ڈیبورا آ کرا، انتھونی برکارٹ، رتھ گلاسکوک، نینڈی شینک، ٹرسٹی ولیم نوز، فائر چیف ایلن کینٹ، ڈاکٹر ڈینئیل لاکر، سپرنٹنڈنٹ ساؤتھ ویسٹ لوکل اسکول ڈسٹرکٹ، نارب کویمیل سراغرساں، ٹموتھی سنڈر سراغرساں، کھانا بھی ہورہا ہے۔ باتیں بھی۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اس چھوٹے سے شہر نے بھی کھل کر حصہ لیا ہے۔ وفاق کو فنڈز بھیجے ہیں۔ اگرچہ اس شہر میں ایسا کوئی واقعہ نہیں رونما ہوا۔ پولیس چیف بتارہے ہیں کہ گیارہ ستمبر سے بعد جاسوسی اور سراغرسانی پر توجہ زیادہ مرکوز ہوئی ہے۔ نئے نئے طریقے بھی سوچے جارہے ہیں۔ آلات اور ٹیکنالوجی میں بھی بڑی ترقی ہوئی ہے۔ مقامی انتظامیہ کی ذمہ داری پولیس، پانی اور آگ سے حفاظت ہے۔ سٹی کونسل ہی مقامی قوانین بناتی ہے۔ بجٹ منظور کرتی ہے۔ صحت اور تعلیم ریاست کے شعبے ہیں۔

وہی اس سلسلے میں قانون بھی بناتی ہے۔ اور بجٹ بھی۔ صحت زیادہ تر پرائیویٹ شعبے میں ہے۔ حیرت اس بات پر ہورہی ہے کہ اس شہر میں کوئی ہسپتال نہیں ہے۔ علاج کے لیے قریبی شہروں میں جانا پڑتا ہے۔ ان شہروں تک جانا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

سٹی آف ہیریسن کی مقامی حکومت میئر کونسل کی طرز پر ہے۔ سات رکنی سٹی کونسل حکومت کی قانون ساز شاخ کے طور پر کام کرتی ہے۔ ہر مہینے کے پہلے اور تیسرے منگل کو لازمی اجلاس ہوتا ہے۔ کونسل کے ارکان چار سال کے لیے منتخب ہوتے ہیں۔ الیکشن ہر دو سال بعد ہوتے ہیں۔ میئر کی معیاد بھی 4 سال ہے۔

ہیریسن کے شہری اپنے شہر پر بہت فخر کرتے ہیں۔ اس کی تاریخی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں اور اپنی مدد آپ کے ذریعے آنے والی نسلوں کے لیے اپنی ماضی کے آثار کو محفوظ کررہے ہیں۔ پرانے شہر کے مرکزی چوک کو ''نیشنل ہسٹورک ڈسٹرکٹ'' (قومی تاریخی ضلع) کا اعزاز ملا ہوا ہے۔ اس کے آس پاس بڑی تاریخی عمارتیں واقع ہیں۔ جو سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں تعمیر ہوئی تھیں۔ اپنے ہاں تو اس سے پرانے شہر واقع ہیں ان کی تاریخ بھی اس طرح محفوظ نہیں رکھی جاتی۔ یہ بتارہے ہیں کہ 1787ء میں یہاں کے علاقے منظم کیے گئے۔ میامی دریا کی مغربی زمین فروخت کی گئی۔ کب کس سال میں ڈاک خانہ بنا۔ آٹے کی مل، پہلا اسکول، کمہار نے کب کام شروع کیا۔ گرجا گھر کب تعمیر ہوا۔ 1921ء میں ہیریسن شہر اور گاؤں کا نام ملا۔ 1937ء میں سیلاب نے تباہی مچائی۔ 1947ء میں ایئرپورٹ 1950 میں صد سالہ تقریبا۔ 1953ء میں ہیریسن ٹیلی فون کمپنی نے اپنا دو ہزارواں فون کنکشن دیا۔

مین اسٹریٹ ہیریسن کا آغاز 1991ء میں ہوا۔ جس کا مقصد پرانے شہر کی توسیع، تجدید اور تزئین ہے۔ یہ ادارہ غیر منفعت بخش بنیادوں پر قائم ہے۔ مقامی تاجر، صنعتکار اس کے رکن ہیں۔ یہ عہد کی اقتصادی ترقی، ایوان صنعت و تجارت، سیاحت سب کے لیے کام کرتا ہے اس کے اجلاس ہر مہینے کے چوتھے منگل کو ہوتا ہے۔ زندہ قومیں اس طرح اپنا ماضی یاد رکھتی ہیں۔ قدم بقدم ترقی کے اعداد وشمار از بر کرتی ہیں۔ تاکہ آئندہ بھی یہ رفتار قائم رہے۔ ایک اہم بات یہ معلوم ہوئی ہے کہ شہر کے پاس اپنے قوانین بنانے کا چارٹر ہے۔ یعنی بعض حالات میں مقامی

قوانین، وفاق اور ریاست کے قوانین پر فوقیت حاصل کر جاتے ہیں۔

''ہیریسن پریس'' یہاں کا واحد مقامی اخبار ہے...... ہماری آمد کی خبر شہ سرخی کے طور پر بنی ہے مگر ہمیں مشرق وسطیٰ کے صحافی لکھا گیا ہے۔ اور لوگوں کو خاص طور پر فوجیوں کو دعوت دی گئی ہے۔ کہ وہ گول میز تبادلہ خیال میں شرکت کرنا چاہیں تو فون کریں ایڈیٹر اور مالک اوگی رو ہم اس لاعلمی پر معذرت کررہے ہیں۔ ہمارے نام نہیں دیئے گئے ہیں کیونکہ امریکی محکمۂ خارجہ نے اس کی اجازت نہیں دی ہے۔ شہر کی مرکزی سڑک پر ہی ہیریسن پریس کا چھوٹا سا دفتر ہے، مختصر سا اسٹاف ہے ایک لیڈی رپورٹر ہے ٹینا۔ وہی فوٹوگرافر بھی ہے۔ ایک کمپیوٹر آپریٹر، اور بس، یہ خالصتاً مقامی اخبار ہے۔ صرف اسی شہر کے لیے۔ شہر کے اندر ایک ہی پولیس والا ہے۔ جو بائیسکل پر گشت کررہا ہے۔ ٹریفک بھی وہی دیکھ رہا ہے۔ امن و امان بھی۔ اگلے روز ہیریسن پریس میں ہماری تصویریں بھی شائع ہوئی ہیں۔ لیکن نام نہیں دیئے۔ کیونکہ محکمہ خارجہ نے منع کیا ہے۔ مقامی لوگوں کے نام دیئے ہیں۔ اس امر پر فخر کیا گیا ہے کہ ہیریسن شہر ان چند شہروں میں سے ہے جسے ان اہم شخصیتوں کے دورے کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔

یہاں ہمارے خطے کے لوگ بہت کم آتے ہیں۔ اس لیے دکاندار ہمیں حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ خلوص سے مل رہے ہیں۔

یہ کمیونٹی سینٹر ہے۔ یہاں ایک گول میز مباحثہ ہے۔ سب لوگ دہشت گردی کے حوالے سے اپنی یادیں تازہ کررہے ہیں۔ اسکولوں سے متعلق بتایا جارہا ہے۔ گیارہ ستمبر کے دن اور بعد میں بچوں کا تجسس بڑھ گیا تھا۔ ٹاور پر آگ بجھانے میں مصروف فائر بریگیڈ کے عملے کے لیے سب انتہائی پرجوش تھے۔ ادھر اسکولوں میں بچے سب سے زیادہ یہ سوال کررہے تھے۔ یہ مسلمان کون ہیں۔ جو جان دینے کے لیے بے تاب ہیں۔ شہادت پر فخر کرتے ہیں۔ بچے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں سوالات کرتے تھے۔ لیکن ان کو جواب نہیں ملتا تھا۔ کیونکہ ٹیچرز کو بھی زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ ان کو پڑھائی جانے والی کتابیں بھی اس سلسلے میں خاموش تھیں۔ ہم ان سے جو پوچھ رہے ہیں کہ نصاب تعلیم میں تبدیلی کب کی جاتی ہے۔ وہ بتا رہے ہیں کہ ہر چھ سال بعد ردوبدل ہوتا ہے۔ حالات حاضرہ نہیں پڑھائے جاتے۔ نصاب وفاقی سطح پر تبدیل ہوتا ہے گریڈ 12 تک کے امریکی بچے اسلام سے ناواقف ہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد اسکولوں میں اساتذہ کو سب سے زیادہ انہی سوالوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ بچے ٹی وی دیکھتے ہیں۔ جس طرح یہ واقعات دکھائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد قدرتی طور پر ان کے ذہنوں میں سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کہ یہ کون لوگ ہیں۔ جو موت سے نہیں ڈرتے۔ اور امریکہ جیسی بڑی طاقت سے ٹکرا رہے ہیں۔ اسکول ڈائریکٹر سے بار بار ہم لوگ پوچھ رہے ہیں۔ لیکن وہ انتہائی اعتماد سے یہی بتا رہے ہیں کہ بچے مستقل سوالات کررہے ہیں۔ لیکن مقامی انتظامیہ ریاستی حکومت اور وفاق ان سوالات کے جواب دینے کے لیے کوئی اہتمام نہیں کررہا ہے۔

پولیس چیف کہہ رہے ہیں۔ امریکہ اب بھی جمہوریت کا نشان ہے۔ اور اب بھی جمہوری انداز میں ہی کام ہورہا ہے۔ دنیا میں اب بھی زندگی کا سب سے بہتر معیار یہیں ہے۔ ایک صاحب کو تشویش ہے کہ موجودہ حالات میں جو نئے قوانین وضع کیے جارہے ہیں اس کی بدولت شہریوں پر ریاستی کنٹرول بڑھ رہا ہے۔ میرین کہہ رہی ہیں۔ گیارہ ستمبر کو جب یہ واقعہ پیش آیا تو مجھے سب سے زیادہ تشویش اپنی بیٹی کی تھی جو اسکول گئی ہوئی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ اسے لینے اسکول جاؤں یا نہیں۔ لیکن اسکول والوں نے خود ہی اس کا انتظام کردیا۔ ہمارے شہر میں کوئی کشیدگی نہیں ہوئی۔ ہم نے اسلامک سینٹر سے بھی رابطہ کیا۔ انہیں یقین دلایا۔ کہ یہاں ایسے مسائل پیدا نہیں ہوں گے۔ تمام طلبہ و طالبات اپنی تعلیم جاری رکھے رہے۔ مشرق و مغرب کے درمیان تفریق زیادہ نہیں بڑھی۔ ایک بھارتی نژاد تاجر ہوٹل کے مالک کپتان پٹیل کہہ رہے ہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد کاروبار گر گیا تھا۔ لوگوں نے سفر کرنا چھوڑ دیا۔ میری بیگم اوشا پٹیل، استقبالیے پر بیٹھتی ہیں ان سے اکثر پوچھا جاتا ہے آپ کہاں کی ہیں۔ لوگ انگلیاں اٹھاتے، کہ یہ دہشت گرد ہیں۔ بن لادن کے آدمی ہیں۔ شروع شروع میں ہماری طرف انداز بہت جارحانہ تھے۔ لیکن تین یا چار ماہ بعد کچھ کمی آئی۔ اب ایسا نہیں ہے۔ لیکن بہرحال ہمارے جذبات مجروح ہوئے۔ لبنانی نژاد سیم ہیریش بتا رہے ہیں۔ میں یہاں پچیس تیس سال سے زیادہ عرصے سے رہ رہا ہوں۔ سب جانتے ہیں لیکن گیارہ ستمبر کے بعد دھمکیاں ملنے لگیں۔ بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ اپنی ڈاڑھی شیو کردوں۔ سب کا رویہ ایسا نہیں تھا۔ یہ جو کچھ تعصب، شدت پسند امریکی

ہیں۔ انہیں کچھ سکھانا پڑھانا ہوگا۔

37 سالہ جیری ماس کچھ مختلف انداز سے جائزہ لے رہے ہیں۔ میں نے زندگی میں کوئی جنگ نہیں دیکھی تھی۔ اوکلاہاما کا بم دھماکہ اور تباہی دیکھی۔ ایک ہی دن میں اتنی بربادی۔ اتنے جنازے اٹھائے گئے۔ لیکن حب الوطنی زوروں پر تھی۔ امریکن اکٹھے ہوگئے۔ ایک خاندان بن گئے۔ نسل پرستی دنیا بھر میں ہے۔ لیکن اب امریکہ میں بھی آ گئی۔ اس سے تجارت متاثر ہوئی ہے۔ ایئرپورٹوں پر چیکنگ نے بہت پریشان کردیا ہے۔ سب کچھ اتروا لیتے ہیں۔ پرس، بیگ، جوتے، بہت خفت محسوس ہوتی ہے۔

لنڈا ہارن ایک کمپنی کی مالک ہیں ان کی بیٹی ایئر ہوسٹس ہیں۔ گیارہ ستمبر کی خبروں نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہم سب کی صحت گر گئی۔ ہم اب تک دو سمندروں کے درمیان اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے۔ گیارہ ستمبر نے ہمیں خواب غفلت سے بیدار کردیا۔ اسامہ تیرا شکریہ۔

ڈینس باک وایو ماحولیاتی تحفظ کے ادارے میں کام کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اب ہم دہشت گردی کے مقابلے کی تربیت بھی دے رہے ہیں۔ ہمارے باس پاکستانی ہیں۔ ڈاکٹر محمد عالم، اب ہم پہلے کی طرح یہ نہیں سوچتے کہ امریکہ ناقابل تسخیر ہے۔ ناگزیر ہے۔

ہم سب کو بھی سنا جارہا ہے۔ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں بھی دکھ ہوتا ہے جب امریکن فوجی افغانستان یا عراق میں مارے جاتے ہیں۔ وہ بھی کسی ماں کی آنکھ کے تارے ہیں۔ کسی باپ کے دل کا سکون ہیں۔ کوئی سہاگن ان کا انتظار کررہی ہے۔ اور فوجیوں سے تو جو کہا جاتا ہے وہ کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ کو یہ حق کس نے دیا کہ وہ جہاں چاہے فوج لے کر پہنچ جائے۔ قوموں سے تو برابری کی بنیاد پر سلوک کرنا چاہیئے۔ ہم جس علاقے سے آئے ہیں۔ وہاں اپنے اختلافات کے باوجود امریکہ کے ان اقدامات کو پسند نہیں کیا جارہا ہے۔ امریکیوں کو سوچنا چاہیئے کہ دنیا ان سے نفرت کیوں کرتی ہے۔ امریکہ اپنے دوست کم کرتا جارہا ہے۔ دشمن بڑھتے جارہے ہیں۔ دہشت گردوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا امریکہ کی طرف سے دہشت گردی کو اسلام سے نتھی کرنے کا ردعمل مسلمانوں میں اچھا نہیں ہوا ہے۔ جو معتدل مزاج مسلمان دہشت گردی اور شدت پسندی کے خلاف کوششیں بھی کررہے تھے۔ ان کو بھی اس سے

نقصان پہنچا ہے۔

ہماری طرف سے یہ بھی کہا گیا کہ اس کے باوجود یہ امر قابل تحسین ہے کہ امریکی حکومت اور معاشرہ اپنے آپ پر تنقید برداشت کرتے ہیں۔ سنتے ہیں۔ امریکی محکمہ خارجہ کے حکام ہمارے ساتھ سفر کررہے ہیں۔ ان کے سامنے ہم امریکی پالیسیوں پر تنقید کرتے ہیں۔ یہ ہمیشہ غور سے سنتے ہیں۔ برا نہیں مانتے۔ امریکہ میں تمام پالیسیوں اور کارروائیوں پر کھلی بحث ہورہی ہے۔ اسی لیے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ امریکہ اپنی جارحانہ اور شدت پسندانہ پالیسیوں پر نظر ثانی کرے گا۔

منتظمین سب اس گول میز تبادلہ خیال کی تعریف کررہے ہیں۔ امریکی کہہ رہے ہیں کہ ہمیں جنوبی ایشیا کے خیالات کا اتنا زیادہ علم نہیں تھا۔ آج کی نشست سے بہت سی نئی باتیں سننے کو ملی ہیں۔

اسی محفل میں ایک دو صاحبان نے کلائیوں پر لوہے کے کڑے پہن رکھے تھے۔ ان کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ یہ ان فوجیوں کی یاد کی علامت ہوتے ہیں جو جنگ کے دوران گم ہوگئے تھے۔ MIA مسنگ ان ایکشن Missing in Action ان دو صاحبان میں سے ایک کے بھائی کا اب تک پتہ نہیں ہے۔ دوسرے صاحب کے قریبی دوست گم ہوئے۔ اب تک کوئی سراغ نہیں لگا۔

ہیریسن کے خوبصورت قصبے، پیڑوں میں گھری سڑکوں سے ہم رخصت ہورہے ہیں۔ یہ چھوٹا سا شہر کتنا منتظم ہے۔ کتنی ترتیب سے بسا ہوا ہے۔ ماحولیات کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ سہولتوں کا بھی ہے۔ ہمارے چھوٹے شہروں کی حالت کتنی خراب ہوتی ہے۔ سب حکومت کی طرف دیکھتے ہیں۔ میونسپل کارپوریشن، پولیس کی شکایت کرتے رہتے ہیں۔ لیکن یہاں شہریوں نے مل جل کر اپنی بستی کو سنوارا ہے۔ اس کا خیال رکھتے ہیں۔

ہماری شام آج پھر ہمارے بس میں ہے۔ کوئی باقاعدہ مصروفیت نہیں ہے۔ ہوٹل نے ہمیں اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ سنسناٹی زیادہ بڑا شہر نہیں ہے۔ لیکن یہاں بے شمار ہوٹل ہیں۔ اسی طرح کئی کئی منزلہ، تجارتی اعتبار سے یہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے صرف

امریکہ بھر سے ہی نہیں تاجر صنعت کار دنیا بھر سے آتے رہتے ہیں۔ اسی لیے ہوٹل آباد رہتے ہیں۔ تجارتی کانفرنسیں ماحولیاتی سیمینار، بھی سال بھر جاری رہتے ہیں۔

آج اتوار ہے۔ دوپہر 2 بجے روانگی ہے۔ ایئر پورٹ پر وہی تلاشی، جوتے اتروائی اور سب کچھ۔

بوسٹن۔ انقلاب اور فکری بیداری کی سرزمین

سنسناٹی ایئر پورٹ سے رخصت ہونے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔ اس شہر نے اتنی محبتیں اور چاہتیں دی ہیں اب جاتے جاتے بھی یہ دامن تھام رہا ہے۔

امریکی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کا کارڈ ابھی تک ہمارے سینے پر آویزاں ہے۔ ایئر ہوسٹس بڑے اشتیاق سے دیکھ رہی ہے۔ اور باآواز بلند دہرا رہی ہے۔ ڈیپارٹمنٹ آف اسٹیٹ۔ یہ امریکی جمہوریت کے بھی قائل ہیں۔ آزادیٔ تحریر وتقریر پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ اس کا علمی مظاہرہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اپنی مملکت، اپنی حکومت کا کتنا احترام کرتے ہیں۔ ہماری طرح حکومتی نشانات، سرکاری محکموں کا نہ تو مذاق اڑاتے ہیں نہ ان کو بے وقعت سمجھتے ہیں۔ میرے ہم سفر ایک امریکی انشورنس کمپنی کے ڈائریکٹر ہیں۔ جنوبی ایشیا سے تعلق ان کے لیے دلچسپی کا باعث بن گیا ہے۔ ان کی بیگم، والدہ بھی ساتھ ہیں۔ وہ ابتدا میں ان کی مجھ سے گفتگو کو اچھا نہیں سمجھ رہی ہیں اپنے ناول پڑھنے میں مگن ہیں۔ ہم کارڈوں کا تبادلہ کرتے ہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد امریکہ کی معیشت پر کیا اثر پڑا ہے۔ یہ ہمارا موضوع بن چکا ہے۔ انہوں نے اسی سلسلے میں حال ہی میں ایک رپورٹ تیار کی ہے۔ بوسٹن میں اسی سلسلے میں میٹنگ ہے۔ کاروبار کے حجم میں کافی کمی آئی ہے۔ انشورنس کی صنعت بھی متاثر ہوئی ہے لیکن ر۔ بتا رہے ہیں کہ اب انشورنس کمپنیوں نے باہمی مشاورت سے بہت سے نقصانات کی تلافی کر لی ہے۔ وہ کہہ رہے

ہیں کہ کہ کبھی کوئی معلومات درکار ہوں۔ تو میں انہیں فون بھی کرسکتا ہوں اور ای میل بھی۔ میں ان سے پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ اس وقت کون کون سے ناولسٹ زیادہ مقبول ہیں۔ یہ ان کا شعبہ نہیں ہے۔ وہ اپنی بیگم سے پوچھتے ہیں۔ وہ کچھ نام بتاتی ہیں۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ گیارہ ستمبر کے حوالے سے بھی کوئی ناول مقبول ہے۔ ان کا جواب نفی میں ہے۔ ان کو اس موضوع سے خاص دلچسپی نہیں ہے۔ وہ پھر اپنا ناول پڑھنے میں مصروف ہوگئی ہیں۔ امریکیوں کی یہ ادا ہمیں بہت بھاتی ہے۔ طیاروں، ٹرینوں، بسوں میں خواتین ہوں یا مرد ناولوں کے مطالعے میں کھوئے رہتے ہیں۔ ان کی اس عادت پر ٹی وی چینل، انٹرنیٹ کچھ اثر نہیں ڈال سکے ہیں۔

میرے ہم سفر پاکستان کی معیشت کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ میں انہیں تازہ ترین کوششوں سے باخبر کرتا ہوں کہ جنرل پرویز مشرف کی حکومت نے مالیاتی ڈسپلن قائم کیا ہے۔ اب ہمارے محفوظ ذخائر میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ لیکن امن و امان کی حالت مثالی نہیں ہے۔ اس لیے سرمایہ کاری اس طرح نہیں ہورہی ہے۔ وہ بتارہے ہیں کہ ان کا ابھی جنوبی ایشیا نہیں جانا ہوا ہے۔ دوبئی تک تو گئے ہیں۔ مشرق بعید میں بھی ایک دو بار جانا ہوا ہے ..... کسی وقت دیکھیں گے اگر کاروباری یا سیاحتی دورے کا امکان ہوا تو پاکستان ضرور آئیں گے۔

بوسٹن ہمارا خیر مقدم کررہا ہے۔ ہمارا قیام دی کلب کوارٹرز میں ہے۔ یہ باضابطہ ہوٹل نہیں ہے یہاں کوئی ریستوران بھی نہیں ہے۔ البتہ لائبریری ہے۔ جہاں سے آپ کتاب اپنے کمرے میں پڑھنے کے لیے لے جاسکتے ہیں ہر منزل پر ایک اسٹور موجود ہے۔ کمرے میں کسی چیز کی کمی ہے۔ تو آپ خود اسٹور سے لے سکتے ہیں۔ سکیورٹی کا سخت انتظام ہے۔ لفٹ بھی آپ کے کمرے کے کارڈ سے ہی چل سکتی ہے۔ یہ نہ ہو تو لفٹ آپ کو لے جانے سے انکار کرسکتی ہے۔

پہلی شام ہماری اپنی ہے۔ کیونکہ ہم اتوار کو یہاں پہنچے ہیں۔ شہر میں رونقیں، ہنگامے ہیں۔ کلب کوارٹرز کے ساتھ والے میخانے اور کلب میں بھی حسینوں کا اژدہام ہے۔

ہم اس شہر میں "ورلڈ بوسٹن" ...... بوسٹن کا عالمی ارتباط کے لیے وسیلہ کے مہمان ہیں۔ انٹرنیشنل وزیٹرز کی ڈائریکٹر کیٹ ہاروے نے اپنے خط میں ہمیں خوش آمدید کہتے ہوئے بتایا ہے کہ ورلڈ بوسٹن میں "ایمرجنگ لیڈرز پروگرام"۔ (ابھرتے ہوئے رہنماؤں کا پروگرام) کے تحت

امید ہے کہ ہم اپنے مقاصد اور اغراض کی تکمیل میں کامیابی حاصل کریں گے۔

امریکی اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ جذباتی قطعی نہیں ہوتے۔ ایئرپورٹ سے ہم ٹیکسی لے کر اس کلب تک پہنچے ہیں۔ خط میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ ورلڈ بوسٹن آفس کے اوقات کار 9 سے 5 ہیں۔ اس خاتون سے بہت ہی کسی ہنگامی مسئلے کی صورت میں موبائیل فون پر رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ ہفتہ اور اتوار کو یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ پیغام چھوڑا جاسکتا ہے۔ اور وہ اپنے پیغامات صرف 8 بجے صبح اور چھ بجے شام چیک کرتی ہیں۔

اسی خط میں ہمیں پبلک ٹرانسپورٹ کے سلسلے میں آگاہ کردیا گیا ہے۔ ریستورانوں کی فہرست الگ سے دے دی ہے۔

ہماری باقاعدہ مصروفیات پیر کی صبح 9 بجے شروع ہوگئی ہیں۔ کلب سے ہم پیدل چلتے ہوئے ایک ملک اسٹریٹ پہنچ گئے ہیں۔ ملک یعنی دودھ..... چائے کا لازمی جزو ہے۔ چائے کا بوسٹن سے خاص تعلق ہے۔ امریکہ آج کل جس آزادی کی نعمت سے مالا مال ہے۔ اس کے لیے جدوجہد کا آغاز بوسٹن میں ہی دو سو سال پہلے ایک چائے پارٹی سے ہوا تھا۔ تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ بوسٹن کا قیام پیورٹین عقیدے کے استعماری عمل میں لائے تھے۔ 1632ء میں مساچوسٹس کالونی کا دارالحکومت بنایا گیا۔ 1770ء میں برطانوی فوجیوں نے بوسٹن کے شہریوں پر فائر کھول دیا۔ اور قتل عام شروع ہوگیا۔ یہیں سے ٹیکس انقلاب کا آغاز ہوا۔ جس نے "بوسٹن ٹی پارٹی" کے نام سے تاریخ میں شہرت پائی۔ جس کے نتیجے میں برطانوی پارلیمنٹ 1773ء میں اس بندرگاہ کو بند کرنے پر مجبور ہوگئی۔

بوسٹن اب ریاست مساچوسٹس کا صدر مقام ہے۔ اپنے اوائل سے ہی یہ شہر تجارت..... تعلیم..... اور صنعت کا مرکز رہا ہے۔ اور اب ٹیکنالوجی کا سینٹر بھی ہے۔ دنیا کے مشہور اور اعلیٰ معیار کے حامل کالج اور یونیورسٹیاں یہاں موجود ہیں۔ جن میں ہارورڈ..... ایم آئی ٹی..... مساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی بھی شامل ہیں۔ یہ کینڈی خاندان کا آبائی شہر بھی ہے۔ یہاں سے بوسٹن گلوب..... بوسٹن ھیرالڈ..... اور کرسچین سائنس مانیٹر جیسے مقبول عام اخبارات بھی شائع ہوتے ہیں۔ انقلابی جنگ کا آغاز اسی شہر سے ہوا تھا اس لیے اس پورے راستے اور

نشانات کو محفوظ کیا گیا ہے۔ جہاں جہاں سے انقلابی گزرے تھے۔ امریکہ کا سب سے قدیم پارک ''بوسٹن کامن'' بھی یہیں ہے جو 1634ء میں بنایا گیا تھا۔

ادبیات عالیہ..... اور مصوری کے حوالے سے بھی بوسٹن کا اپنا مقام ہے۔ ایمرسن..... ہاتھورن لانگ فیلر اور تھوریو جیسی ممتاز ہستیاں یہیں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لیے اسے امریکہ کا ایتھنز بھی کہا جاتا ہے۔

شہر کی آبادی قریباً چھ لاکھ ہے لیکن میٹروپولیٹن علاقہ ملا کر چالیس لاکھ تک پہنچ جاتی ہے ورلڈ بوسٹن کے دفتر کے ایک کلاس روم میں ہم محو گفتگو ہیں۔ مسز تھیلیا سونگاس شیلسنگر سے جو شیلسنگر اینڈ ایسوسی ایٹس کی صدر ہیں۔ ان کے ایک بھائی پہلے کانگریس پھر سینٹ کے رکن رہے۔ اور صدارتی امیدوار بھی تھے۔ جم سیگل بروکلن سے اسٹیٹ کے نمائندے رہ چکے ہیں مساچسٹوس میونسپل ایسوسی ایشن کے سربراہ بھی رہے ہیں۔

تھیلیا کہہ رہی ہیں کہ گیارہ ستمبر کو جو طیارے ٹریڈ ٹاور سے ٹکرائے۔ وہ لوگان انٹرنیشنل ایئر پورٹ سے اڑے تھے۔ جو مسافر مارے گئے۔ جہازوں کا عملہ..... ان میں سے اکثریت بوسٹن کی تھی۔ کچھ ہمارے رشتے دار تھے، عزیز تھے..... دوست تھے..... اس لیے بوسٹن براہ راست متاثر ہوا۔ یہاں صف ماتم زیادہ بچھی۔ واقعہ یا سانحہ اگرچہ نیویارک میں ہوا۔ لیکن غم اور صدمہ بوسٹن میں زیادہ محسوس کیا گیا۔ ہم نہیں جانتے کہ لاس اینجلز نے کیا محسوس کیا۔ لیکن ہمارے ہاں کئی خاندان اس کی لپیٹ میں آئے۔ بوسٹن ویسے بھی ہمیشہ سیاسی طور پر بیدار رہا ہے۔ ڈیموکریٹس کا اثر زیادہ رہا ہے۔ کنیڈی خاندان یہیں سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر یونیورسٹیوں کی وجہ سے یہ احتجاجی تحریکوں کا مرکز رہا۔ ویت نام کے زمانے میں یہاں اکثر احتجاج ہوتے رہتے تھے۔ پہلے کہہ سکتے ہیں کہ یہ شہر بائیں بازو کی فکر کی طرف زیادہ جھکاؤ رکھنے لگا تھا۔ لیکن گیارہ ستمبر نے رخ بدل دیا ہے۔ اب فوج سے ہمدردیاں بڑھ گئی ہیں۔

ایئر پورٹس پر چیکنگ زیادہ ہوگئی ہے۔ یہاں خاص طور پر محسوس کی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ جہاز یہاں سے اڑے۔ اور اعتراضات ہوئے یہاں کی سیکورٹی میں خامیاں بتائی گئی ہیں۔ یورپ اور مشرق وسطیٰ سے نارتھ امریکہ جانے والے بوسٹن ایئر پورٹ کو زیادہ استعمال کرتے

ہیں۔ اس لیے بھی یہاں چیکنگ زیادہ ہوتی ہے۔ آدھ گھنٹہ کم از کم زیادہ لگ رہا ہے لیکن کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ پہلے جس طرح شہری آزادیاں..... نجی زندگی کے حقوق کے تحفظ کی بات ہوتی تھی۔ اب اس طرح نہیں ہورہی ہے۔ فکر تبدیل ہوئی ہے..... ان کا کہنا ہے کہ اسرائیل یورپ..... پاکستان بھارت میں تو ایسے واقعات ہوتے تھے۔ امریکہ میں کبھی نہیں ہوئے۔ کئی ہزار میل دور پرل ہاربر سانحہ ہوا..... لیکن پہلی بار گیارہ ستمبر کو ہم نے ایسے خونیں سانحے کا سامنا کیا..... اب تک ہم ذہنی طور پر اس سے مطابقت نہیں کر پائے ہیں۔ پہلے حماس اور اس قسم کے دوسرے گروپ ہم کسی نہ کسی وجہ سے برداشت کر لیتے تھے۔ لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ اب تو جہاں جائیں، تو یہی کہا جاتا ہے کہ یہ گروپ ختم کیے جانے چاہئیں۔ بوسٹن اگرچہ لبرل رہا ہے۔ صدر بش کو یہاں ووٹ نہیں ملے تھے۔ لیکن اب انہیں سیاسی حمایت حاصل ہورہی ہے۔ عراق کے مسئلے پر کچھ اختلاف ہے..... یہ بحث ہوتی ہے کہ کیوں لڑ رہے ہیں۔ یہاں ہونے والی دہشت گردی میں عراق کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ جنگ ہماری شہری آزادیوں کو متاثر کررہی ہے۔ ہماری نجی زندگی میں مداخلت کررہی ہے۔ ہمارے کریڈٹ کارڈز کی سکریننگ ہوتی ہے۔ قدامت پسند غالب آرہے ہیں۔ دہشت گردوں سے مالی سیاسی رابطے رکھنے پر جو تفتیش ہورہی ہے اس میں سب حدود اور قیود عبور کر لی جاتی ہیں۔ امریکی معاشرے کے لیے یہ اہم مسئلہ ہے کہ دہشت گردی کا نیٹ ورک بھی توڑنا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اگر تحریر و تقریر کی آزادی بھی رکھنی ہے نجی زندگی کو بھی محفوظ رکھنا ہے تو کیا طریقے اختیار کیے جائیں۔

اب جم سیگل نے اپنی بات شروع کی ہے وہ کہہ رہے ہیں کہ گیارہ ستمبر کے بعد فوری طور پر خطرہ یہ تھا کہ مسلم آبادیوں اور مساجد پر حملے نہ ہوں۔ وفاقی اور ریاستی حکومت دونوں نے کوشش کی کہ ایسا نہ ہو۔ ان کو hate crime نفرت کے جرائم کہا گیا۔ ایسے حملہ آوروں پر مقدمہ چلایا گیا۔ صدر بش اور مختلف گورنرز نے واضح طور پر کہا کہ یہ برداشت نہیں کیا جائے گا۔ وہ یاد دلا رہے ہیں کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپان کے حملے کے بعد تمام جاپانیوں کو امریکہ میں مختلف کیمپوں میں منتقل کر کے محدود کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس کا اچھا اثر نہیں ہوا تھا۔ خود امریکیوں نے اسے پسند نہیں کیا تھا۔ اسی لیے اب کے ایسا نہیں کیا گیا۔ البتہ مسلم آبادی اپنے آپ کو غیر

محفوظ سمجھتی رہی۔ وہ بتا رہے ہیں کہ ری پبلکن بین الاقوامی معاملات سے زیادہ تر الگ تھلگ رہتے ہیں۔ بش الیکشن سے پہلے عالمی لیڈروں کے نام تک نہیں جانتے تھے۔ وہ امن کی کوششوں میں شامل بھی نہیں ہوتے تھے..... لیکن اب ری پبلکن زیادہ انٹرنیشنل ہوگئے ہیں۔ وہ عسکری ذہن رکھتے تھے فوج کو زیادہ فنڈز دینے کے حامی تھے۔ اب میرے خیال میں ڈیموکریٹ بھی فوج کو زیادہ فنڈز فراہم کرنے کی حمایت کریں گے۔ جم اس خیال کا اظہار کررہے ہیں کہ امریکی عوام کی اکثریت امریکی حکومت کا ساتھ دے گی۔ اگر عراق کے بعد امریکہ شمالی کوریا..... ایران، مصر یا شام پر لشکر کشی کرتی ہے تو اسے امریکی عوام کی حمایت حاصل ہوگی۔

تھلیلیا کہہ رہی ہیں..... بڑے پیمانے پر تباہی کے ہتھیار ملنے نہ ملنے پر برطانیہ میں زیادہ بحث ہورہی ہے معلومات کہاں سے ملیں۔ ہتھیار ملے کہ نہیں۔ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ جن ملکوں میں دہشت گردی جنم لے رہی ہے وہاں کاروائی کی اقتصادی قیمت کیا ہے۔ فوجی کاروائی سے افغانستان میں کیا مطلوبہ مقاصد حاصل ہوئے ہیں کہ نہیں۔ عراق میں کاروائی سے کیا حاصل ہورہا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ امریکہ کا خسارہ بڑھ رہا ہے ترقیاتی کاموں میں کٹوتی کی جارہی ہے۔

عرفان صدیقی پوچھ رہے ہیں۔ کہ اقوام متحدہ کی شمولیت کے بغیر عراق پر حملے پر آپ کا کیا خیال ہے۔ خاتون کا کہنا ہے کہ اقوام متحدہ سے اجازت نہ لینے کا منفی اثر پڑا ہے۔ بائیں بازو کے اور لبرل خیالات رکھنے والے اس پر احتجاج کررہے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں بہت زیادہ منفی جذبات ہیں۔ یہ اتفاق ہے کہ وہاں غیر ملکی طلبہ و طالبات اور اساتذہ بھی زیادہ ہیں۔

جم کا کہنا ہے .....لوگ چاہیں گے کہ tactically اقوام متحدہ سے مدد لی جائے۔ نظریاتی طور پر نہیں۔ امریکہ کو حقیقی طور پر خطرات درپیش ہیں۔ عراق میں حالیہ واقعات سے ظاہر یہی ہورہا ہے لیکن دنیا میں زیادہ تر لوگ امریکی نقطہ نظر سے اتفاق نہیں کرتے۔ جن ملکوں نے پہلے امریکہ کی مدد کی۔ عراق میں وہ بھی امریکہ کی مدد کرنے کو آگے نہیں بڑھ رہے ہیں۔ اب تو ٹیڈ کنیڈی بھی یہ کہہ رہا ہے کہ امریکہ کو یہ حق کیسے مل گیا ہے امریکہ کو یہ آسائش حاصل تھی کہ وہ اسے سمندروں نے گھیر رکھا تھا۔ اس لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ مگر اب ایسا نہیں رہا ہے۔ لیکن جم کا خیال یہ ہے کہ اگر دنیا میں دہشت گردی کے مزید واقعات ہوں گے۔ تو اسرائیل سے ہمدردیاں بڑھیں

گی۔ اور جارج بش کو فائدہ ہوگا۔ ایک سوال پر خاتون کہہ رہی ہیں کہ ہم نے شہری آزادیوں کے لیے بہت جدوجہد کی تھی۔ لیکن اب ان کے لیے خطرات بڑھ گئے ہیں۔ نئے قوانین کو عوام قبول نہیں کررہے ہیں۔ شہری حقوق کے علمبرداروں میں اس سے تشویش پھیل رہی ہے۔ ڈیموکریٹ کہتے ہیں کہ اب امریکی حکومت ایشیائی آمروں کی طرح رویہ اختیار کررہی ہے۔ ان پالیسیوں سے امریکی معیشت بھی متاثر ہوگی۔ روائتی آزادیاں بھی..... ہماری ساکھ متاثر ہورہی ہے۔ فلسطین پر بھی ہماری پالیسی درست نہیں ہے۔ ہماری اکثریت نہیں چاہتی کہ امریکی حکومت ان معاملات میں اس طرح ملوث ہو اور ایک ایمپائر کا کردار ادا کرے۔ تھلیلیا کا کہنا ہے کہ میں تو چاہوں گی کہ امریکہ کا پیسہ اپنے ملک میں بھی صحت اور تعلیم پر خرچ ہو۔ دوسرے ملکوں میں بھی انہی مقاصد کے لیے استعمال ہو۔ لیکن گیارہ ستمبر نے سب کچھ الٹ دیا ہے۔ اب خفیہ ایجنسیوں کو مزید طاقت مل گئی ہے۔ اسی طرح کے قوانین بھی تشکیل دیئے جارہے ہیں۔

بوسٹن میں ہم اپنی پہلی ملاقات سے فارغ ہوکر پبلک سیفٹی کے دفتر کی طرف رواں ہیں جہاں ہمیں ایک اجمالی جائزہ میسر ہوگا کہ گیارہ ستمبر کے بعد ریاست کو کیا چیلنج درپیش ہیں۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ ایک آشیرٹن پلس میں داخل ہوکر چھٹی منزل پر چلے جائیں۔ ای او پی ایس کے اشارے دیکھتے ہوئے کمرہ نمبر 611 پہنچ جائیں ایک بلند قامت.....اور سرخ بالوں والی خاتون کرسٹائن کول آپ کی منتظر ہوگی۔

ایسا ہی ہوا ہے.....

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدیار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

گفتگو شروع ہورہی ہے۔ چھ سات لوگ موجود ہیں۔ رابرٹ ہاس، انڈر سیکرٹری برائے نفاذ قانون رچرڈ سوئینسن، انڈر سیکرٹری برائے ہوم لینڈ سیکورٹی، ڈیوڈ شا پبلک افیئرز ای او پی ایس، سیکرٹری ایڈورڈ فلن، کرسٹائن کول ڈپٹی، چیف آف اسٹاف، رجسٹری آف موٹر وہیکلز کے نمائندے، میجر رابرٹ سمتھ، مساچوسٹس اسٹیٹ پولیس، جیڈ نوسل ڈپٹی لیگل کونسل۔

رچرڈ سوئینسن بتا رہے ہیں کہ پبلک سیفٹی کا سیکرٹری گورنر مقرر کرتا ہے۔ اس میں 16

ادارے ہیں جو ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ اب اس کا نیا نام ہوم لینڈ سیکورٹی ہو گیا ہے۔ بنیادی مقصد دہشت گردی کے واقعات کو ہونے سے روکنا ہے۔ اس میں نیشنل گارڈز، آگ بجھانے کے ادارے ہیں۔ پولیس ہے۔ پولیس ٹریننگ سنٹر، میڈیکل ایگزامینر بھی شامل ہے۔ موٹر گاڑیوں کو رجسٹر کرنے والا ادارہ بھی اب پہلے کی طرح کام نہیں کر رہا ہے۔ یہاں دوسری ریاستوں، بلکہ ملکوں سے بھی لوگ گاڑیاں لے کر آ جاتے ہیں۔ پہلے اتنی زیادہ فکر نہیں کی جاتی تھی۔ لیکن اب ان سے سرٹیفکیٹ طلب کیے جاتے ہیں۔ اگر وہ کسی دوسری ریاست یا ملک میں رجسٹرڈ ہے تو ان سے کہا جاتا ہے کہ وہاں سے سرٹیفکیٹ منگوائیں۔ شناخت کی تصدیق ضروری ہے۔

پولیس والے کہہ رہے ہیں کہ پہلے ہم اپنے شہر کے وسائل سے ہی اخراجات پورے کر لیتے تھے۔ یہاں بجٹ ایک ارب ڈالر تھا۔ اب چونکہ دائرہ کار بڑھ گیا ہے۔ اس لیے اضافی رقوم کی ضرورت ہے..... یہ وفاقی حکومت ہوم لینڈ سیکورٹی کے لیے بھیج رہی ہے۔ پہلے وفاق کچھ نہیں بھیجتا تھا۔ اور یہ رقم ان معاملات کے لیے ہے جو پہلے نہیں تھے۔ ایئرپورٹ پر اسکریننگ پہلے نہیں تھی۔ بندرگاہ پر بھی اب کنٹینرز وغیرہ کی اسکریننگ ہوتی ہے۔ ڈرائیور لائسنس اور موٹر گاڑیوں کے کاغذات پہلے زیادہ چیک نہیں ہوتے تھے۔

نفرت پر مبنی جرائم کی روک تھام بھی بڑھ گئی ہے۔ بوسٹن میں یونیورسٹیوں میں مختلف ممالک اور مذاہب کے طلبہ و طالبات زیر تعلیم ہیں۔ اس لیے کشیدگی کا خطرہ رہتا ہے۔ مساجد پر حملے کے خدشات ہیں۔ کوئی دھمکی وغیرہ آئے تو پولیس مساجد کی انتظامیہ سے رابطہ کرتی ہے اگر وہ اجازت دیں تو وہاں جاتے ہیں۔ سیکورٹی کی ضرورت ہو تو اس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے یہ بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ مسلم کمیونٹی اور لوکل کمیونٹی مل کر نفرت پر مبنی جرائم کے چیلنج کا مقابلہ کریں۔ اب بھی یہ خطرہ ہے کہ حملے ہو سکتے ہیں۔ باہمی مشورے سے یہی سوچا گیا ہے کہ سیکورٹی کی فکر میں بالکل اسی میں محدود ہو کر نہ رہ جائیں۔ زندگی کے معمولات چلتے رہنے چاہئیں۔ آگہی ہونی چاہیے۔ اعتماد کی تعمیر ہوتی رہنی چاہیے۔ جیڈ بتا رہے ہیں کہ ہم نسلی مذہبی، لسانی برادریوں سے تواتر سے رابطے میں رہتے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں وہ بتا رہے ہیں

کہ ہم ہر روز گذشتہ کل سے بہتر ہو رہے ہیں۔ لیکن امریکہ ایک بڑا ملک ہے۔ لوگ سفر میں رہتے ہیں..... پھر سیکورٹی کے نام پر زیادہ اقدامات ہونے لگیں تو یہ ڈر بھی ہوتا ہے کہ شہریوں کے حقوق متاثر نہ ہونے لگیں ان کی نجی زندگی میں مداخلت نہ ہو جائے۔

سب شرکا کا یہ تاثر ہے کہ ہوم لینڈ سیکورٹی میں مختلف اداروں کی شمولیت سے دہشت گردی کے خلاف کارروائی زیادہ منظم ہو گئی ہے۔ دہشت گرد جس طرح نئے نئے پلان بنا کر، مختلف انداز سے حملہ آور ہو رہے ہیں ان کے مقابلے کے لیے بھی ضروری ہے کہ مختلف 'ادارے جہاں ایسی کوئی کارروائی ہو سکتی ہے۔ ان کا آپس میں رابطہ زیادہ فعال ہو۔ اور وہ پہلے سے الرٹ ہوں۔

اب ہماری منزل ہارورڈ فیکلٹی کلب ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی اپنے معیار کے لیے عالمی شہرت رکھتی ہے یہاں داخلہ۔ پڑھائی دنیا بھر میں نوجوانوں کا خواب ہوتا ہے۔ مختلف راستوں سے گزر رہے ہیں۔ کہیں نئی عمارتیں ہیں آسمان سے باتیں کرتی ہوئی۔ کہیں پرانے مکانات۔ جن کی دیواریں برفانی دنوں اور بارشوں کی کہانیاں سناتی ہیں۔ کہیں عشق پیچاں کی بیلوں نے نے دیواروں کے عیب چھپا لیے ہیں۔

یہ پرشکوہ عمارت میٹنگوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ جہاں ناشتہ، لنچ اور ڈنر کا بھی اہتمام ہو جاتا ہے۔ ہمارے میزبان ہیں رچرڈ ہنٹ جو ہارورڈ یونیورسٹی کے سابق مارشل ہیں۔ یہ گذشتہ سال ہی ریٹائر ہوئے ہیں۔ 24 سال تک یہ یونیورسٹی سے وابستہ رہے ہیں۔ ہارورڈ کے ان اینڈ آؤٹ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کی بیگم مسز پریسیلا ہنٹ ہیں۔ مسز جل چیمبرلین ہیں۔ جواب مارشل ہیں۔ کریگ لیمبرٹ ہیں۔ جو ہارورڈ میگزین کے ڈپٹی ایڈیٹر ہیں۔ اسٹیو لو مسفیلڈ ہیں جو شعبہ بین الاقوامی امور کے آج سے 40 سال پہلے سربراہ رہے ہیں۔

بتایا جا رہا ہے کہ کسینجر نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری یہاں سے لی تھی۔ ہارورڈ میگزین دو لاکھ بیس ہزار کی تعداد میں شائع ہو رہا ہے۔ پوچھنے پر پتہ چلا ہے کہ فیکلٹی میں بھارت کے 112 اور پاکستان سے 14 طلبہ ہیں۔ کل غیر ملکی طلبہ 350 کی تعداد میں ہیں۔ جن میں چین، جاپان، کینیڈا کے نوجوان بھی ہیں۔

اب آئندہ امریکی انتخابات کا ذکر شروع ہوا ہے۔ مارشل کا خیال یہی ہے کہ ڈیموکریٹس

حرکت میں ہیں لیکن ابھی اتنے مضبوط نہیں ہیں۔ ابھی بہت وقت ہے اس لیے ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان کشیدگی پر انہیں پریشانی ہے۔ یونیورسٹی میں مسلم طلبہ گروپ کافی سرگرم رہتے ہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد فوری طور پر اسٹڈیز میں کوئی تبدیلیاں نہیں آئی ہیں۔ لیکن بعد میں ہوسکتی ہیں وہ بتارہے ہیں کہ پاکستان کی سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو یہاں طالب علم تھیں۔ ان کے بھائی بھی یہاں زیرتعلیم رہے۔ وہ امید ظاہر کررہے ہیں کہ بھارت اور پاکستان مل کر کشمیر کے مسئلے کا پرامن حل تلاش کرلیں گے۔

رچرڈ ہنٹ کہہ رہے ہیں کہ سیاسی قوت اور استعماری قوت میں فرق پیش نظر رہنا چاہیئے۔ میں تو بنیادی طور پر مورخ ہوں۔ اس لیے حالات کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں۔ ہماری مشکل یہ ہے کہ معاملات سے ہمارا فوکس جلد بدل جاتا ہے۔ جس طرح افغانستان میں کچھ عرصہ بہت دلچسپی لی پھر فوکس بدل گیا۔ ایک دلچسپ امر وہ یہ ظاہر کررہے ہیں۔ کہ امریکہ سے باہر مطالعاتی تحقیق پر جانے میں امریکیوں کو اتنی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ اس لیے دوسرے ملکوں کے سیاسی، سماجی، اقتصادی امور پر مکمل معلومات نہیں ہوتی ہیں۔ سمندر پار تحقیق کے لیے زیادہ تر سیکنڈ جنریشن امریکن جاتے ہیں۔ خالص امریکی نہیں جاتے۔ سیکنڈ جنریشن بھی اس لیے کہ وہ اپنے اپنے ملکوں میں جاکر تحقیق کرنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن اس طرح امریکی نقطۂ نظر سے جو معلومات ضروری ہیں وہ نہیں ملتی ہیں۔ بش اور رمسفیلڈ کا فوکس بھی بیرونی دنیا پر نہیں رہا ہے۔ اس ساری گفتگو سے یہ ظاہر ہورہا تھا۔ جیسے دوسرے ملکوں میں موجود امریکی سفارت خانے ذمہ داری سے کام نہیں کررہے۔ ان سے یہ پوچھا جارہا ہے۔ تو وہ کہتے ہیں کہ یہ تاثر درست ہے جتنی گہری معلومات ان کو دینی چاہئیں۔ وہ نہیں مل رہی ہیں۔

ہارورڈ یونیورسٹی میں مختلف مذاہب کے طلبہ میں کوئی تصادم تو نہیں ہوا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ اس طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ ابھی تک ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا ہے۔ کشیدگی تو رہتی ہے۔ یہاں طلبہ کو اپنے اپنے مذاہب کے مطابق عبادت کی اجازت ہے۔ مسلم طلبہ کی اپنی مسجد ہے۔ یہودیوں کی عبادت گاہ بھی ہے۔

مساچوسٹس پورٹ اتھارٹی کیا کررہی ہے

لوگن ایئرپورٹ کی تجارتی اہمیت تو ہے ہی۔ لیکن یہ اس لیے بھی یاد رکھی جاتی ہے کہ 11 ستمبر کو ٹریڈ ٹاور سے ٹکرانے والے دو طیارے یہیں سے اڑے تھے۔ امریکہ کی ساری ایئرپورٹوں پر ہی سیکورٹی کے سخت ترین انتظامات کردیئے گئے ہیں۔ تاہم بوسٹن کی لوگن ایئرپورٹ ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ مساچوسٹس پورٹ اتھارٹی ایئرپورٹ اور بندرگاہ دونوں کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔ اس کا مخفف ہے ماس پورٹ۔ لوگن انٹرنیشنل ایئرپورٹ کے میڈیا روم میں ہم مخاطب ہیں جارج ناکا کارہ۔ فیڈرل سیکورٹی ڈائریکٹر میجر تھامسن روبنس، اسٹیٹ پولیس سے تعلق ہے۔ اس وقت قائم مقام ایوی ایشن ڈائریکٹر بھی ہیں۔ فل اورلینڈ یلا، ماس پورٹ کے ترجمان ہیں۔ بتایا جارہا ہے کہ امریکہ کی 429 کمرشل ایرپورٹوں کی سیکورٹی امریکی وفاقی حکومت نے سنبھال لی ہے۔ مسافروں اور ان کے سامان کی چیکنگ کے لیے ایک جدید اور مربوط نظام تشکیل دیا گیا ہے۔ نومبر 2001ء میں ایوی ایشن ٹرانسپورٹ سیکورٹی ایکٹ منظور کیا گیا تھا۔ جس کے تحت ٹرانسپورٹیشن سیکورٹی ایڈمنسٹریشن (ٹی ایس اے) کا ادارہ قائم کیا گیا۔ ٹی ایس اے کی بدولت ملک بھر میں 60 ہزار نئی نوکریاں نکلی ہیں۔ سامان کی سکریننگ کرنے والی ایک مشین ''ایگزامیز'' کی قیمت 1ء2 ملین ڈالر ہے اور ایسی کل گیارہ سو مشینیں اہم ایئرپورٹوں پر نصب کی گئی ہیں۔ جن میں سے 38 لوگون ایئرپورٹ پر ہیں۔ ہم ان خفیہ زیرزمین کمروں میں

ان مشینوں کو دیکھ رہے ہیں۔ جہاں سامان ان میں سے گزارا جارہا تھا۔ ایک دوسرے کمرے میں خواتین اور مرد ''اسکریزز'' کمپیوٹر کی اسکرینوں پر سامان کا ایکسرے دیکھ رہے ہیں۔ جارج ناکارہ بتارہے ہیں کہ اگر کسی بیگ میں دھماکہ خیز مواد کی موجودگی کا علم ہوتا ہے۔ تو فوراً پولیس کو اطلاع دی جاتی ہے۔ ممنوعہ اشیا کی فہرست تمام ایئر لائنوں کو بھی مہیا کردی گئی ہے۔ اب یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے مسافروں کو اس سلسلے میں خبردار کریں۔ کمپیوٹر کسی بھی ممنوعہ شے کی موجودگی پر الارم بجادیتا ہے۔ ضروری ہو تو متعلقہ ایئر لائن کو بتادیا جاتا ہے۔ اور وہ مسافر کو اطلاع دیتی ہے۔ دسمبر 2002ء سے مسافروں پر یہ پابندی بھی لگادی گئی ہے کہ جہاز میں چیک کیے جانے والے سامان کو تالا نہ لگائیں کیونکہ کسی وقت بھی اسے کھولنا پڑسکتا ہے۔ ''ایگزامنیر'' مشینیں امریکہ میں ہی تیار ہوتی ہیں۔ لیکن 9/11 سے پہلے یہ امریکہ میں زیر استعمال نہیں تھیں۔ بلکہ اسرائیل برطانیہ اور سنگاپور کی بعض ایئرپورٹوں پر استعمال کی جارہی تھیں۔ ہمارے پوچھنے پر بتارہے ہیں۔ کہ خفیہ کیمروں سے سکریننگ کی کاروائی کی فلمبندی کی جاتی ہے۔ اور یہ ریکارڈ ایک ماہ تک محفوظ رکھا جاتا ہے۔ کسی بیگ کو کھول کر اس میں سے ممنوعہ شے نکالنی پڑے تو اس میں ''ٹی ایس اے'' کی طرف سے اس سلسلے میں ایک اطلاعاتی کارڈ رکھ دیا جاتا ہے۔ ایک اور سوال پر یہ بھی معلومات ملیں کہ 429 ایئرپورٹوں پر 156 فیڈرل سیکورٹی ڈائریکٹرز متعین کیے گئے ہیں۔ جو 156 بڑے ایئرپورٹوں پر رہتے ہیں۔ وہاں سے نزدیکی چھوٹی ایئرپورٹوں کی بھی نگرانی کرتے ہیں۔ لوگون ایئرپورٹ پر روزانہ 1100 پروازیں آتی اور جاتی ہیں۔ قریباً 25 ہزار بیگ روزانہ سکرین ہوتے ہیں۔ 9/11 کے بعد مسافروں کی تعداد میں کمی آئی ہے۔ پہلے اس ایئرپورٹ سے 27 ملین مسافر سالانہ گزرتے تھے۔ اب یہ صرف 24 ملین رہ گئے ہیں۔ ایئر لائنوں کی تعداد میں کمی نہیں آئی ہے۔ ایئرپورٹ کی آمدنی میں بھی کمی ہوئی ہے۔ ہم پوچھ رہے ہیں کہ مسافروں کے حلیے، ڈاڑھی اور نام کے باعث زیادہ چیکنگ کیوں کی جاتی ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ مسافروں کے رویے اور حرکتوں کو قریب سے دیکھا جاتا ہے۔ کسی مسافر کا اگر رویہ خلاف معمول ہو۔ تو اسے مکمل چیکنگ کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ ہم دریافت کررہے ہیں کہ بچوں اور بزرگ شہریوں کی سی چیکنگ ہورہی ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں

کہ یہ بہت ضروری ہے۔ دہشت گرد ان کو استعمال کرسکتے ہیں۔ حال ہی میں ایک 10 سالہ بچے کے ''ٹیڈی بیئر'' سے اسلحہ برآمد ہوا تھا۔

ہمارے اس سوال کا جواب دینے سے یہ سب گریز کررہے ہیں کہ اب ان تمام انتظامات اور تیاریوں کے بعد کیا یہ معلوم ہوسکا ہے کہ لوگون ایئرپورٹ سے دہشت گرد 11 ستمبر کو کس کی کوتاہی کی وجہ سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ وہ اسے سیکورٹی عملے کی کوتاہی نہیں مان رہے ہیں۔ اور تفصیلات میں جانا نہیں چاہتے۔ وہ ہماری اس بات کی تائید کررہے ہیں۔ کہ امریکی شہری ان حفاظتی اقدامات اور چیکنگ کے طویل مراحل پر شروع شروع میں برہم ہوئے تھے۔ احتجاج بھی ہوا۔ پھر جب انہیں ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے خطرات سے آگاہ کیا گیا تو انہوں نے بھرپور تعاون شروع کردیا ہے۔ یہ سوال بھی ہورہا ہے کہ کیا 9/11 کے بعد سیکورٹی اسٹاف سے مسلمانوں کو نکالا گیا ہے۔ اور نئی بھرتی میں انہیں موقع دیا جارہا ہے۔ اس کا جواب بھی براہ راست نہیں ہے۔ یہ کہہ رہے ہیں کہ بھرتی کے باقاعدہ ٹیسٹ اور انٹرویو ہوتے ہیں۔ مذہب اور نسل کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس وقت سیکورٹی اسٹاف میں کتنے مسلمان ہیں؟ یہ اعداد وشمار بھی ان کے پاس نہیں ہیں۔

11 ستمبر کے بعد امریکی پریس کا امریکہ اور بیرونی دنیا میں کردار

ایک اور نیا دن.....امریکہ میں.....اور فکر.....فلسفے.....ٹیکنالوجی.....علم.....انقلاب کے شہر بوسٹن میں..... جہاں ہارورڈ یونیورسٹی بھی ہے۔ نیمان فاؤنڈیشن ایک اخبار ''ملواکی جرنل'' کے بانی لیوسیس ڈبلیو۔نیمان کی یاد میں ان کی بیگم ایگزتیز واہل۔نیمان نے 1938ء میں قائم کی تھی۔ یونیورسٹی نیمان فیلوز کا تقرر کرتی ہے۔ جو اپنی صلاحیتوں، خلوص اور جوہر کی بنا پر ایک مستقبل رکھتے ہوں۔ نیمان فاؤنڈیشن صحافتی شعبے میں تحقیق کی سرپرستی کرتی ہے۔ اسکالرشپ دیتی ہے۔ اسکالرز امریکہ سے بھی ہوتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ 50 فی صد امریکہ کے مختلف حصوں سے۔ 50 فی صد دوسرے ملکوں سے بیرونی دنیا سے آتے ہیں۔ انڈونیشیا، چین، ایران، فن لینڈ، روانڈا، کینیڈا، روس، نائیجریا، جنوبی امریکہ، الجزائر کے اسکالرز مصروف تحقیق رہ چکے ہیں۔ لیکن نیمان فیلو کے لیے امریکی شہریت ضروری ہے کسی اخبار، ریڈیو، ٹی وی، میگزین، نیوز ایجنسی کا ہمہ وقتی ملازم ہو۔ کم از کم تین سال کا تجربہ..... بعض اوقات فری لانس صحافیوں کو بھی زیر غور لایا جاتا ہے۔

ہماری ملاقات باب جائلز سے ہو رہی ہے۔ جو انتہائی سینئر ماہر ابلاغیات ہیں۔

فاؤنڈیشن کے کیوریٹر ہیں۔ وہ فاؤنڈیشن سے اسکالرشپ لینے کا طریقہ بتارہے ہیں۔ کہ اخباری ادارے، یا افراد خود رابطہ کرتے ہیں۔ فاؤنڈیشن کوئی سرکلر کسی ادارے کو نہیں بھیجتی۔ 35 سے 48 سال تک کی عمر ہونی چاہیئے۔ خط میں یہ لکھیں کہ آپ کس موضوع پر خصوصیت رکھتے ہیں۔ اگر پہلے کچھ مضامین تحریر کیے ہیں۔ تحقیق کی ہے تو وہ بھی ساتھ ارسال کریں۔ امیدوار کا انتخاب خالصتاً طے شدہ اصولوں پر ہوتا ہے۔ کل وظیفے کی رقم پچاس ہزار ڈالر تک ہے۔ بعض اسکالر اپنے ساتھ بیگم یا شوہر کو بھی لے آتے ہیں۔ آخر میں امتحان نہیں ہوتا۔ اپنا تحقیقی مقالہ جمع کروانا ہوتا ہے۔ قیام وغیرہ کا انتظام خود کرنا پڑتا ہے۔ فاؤنڈیشن اس کے لیے الگ سے کوئی فنڈز فراہم نہیں کرتی ہے۔ تحقیق کے لیے موضوع خود امیدوار بھی متعین کرسکتا ہے۔ فاؤنڈیشن بھی تجویز کرسکتی ہے۔ دوران تحقیق اسکالر، فیلو کہلاتا ہے۔ موضوعات منفرد اور للکارتے ہوئے ہونے چاہئیں۔ زبان پر خاص طور پر عبور ہونا چاہیئے۔ یہاں زور اس امر پر بھی دیا جاتا ہے کہ اسلوب تحریر موثر، عام فہم اور دلکش ہو۔ یہاں دو ٹیچرز خود ناول نگار ہیں۔ وہ صحافیانہ تحریریں بھی پیش کرتے رہے ہیں۔ بعض اوقات یہاں ناول کا مرکزی خیال بھی مل جاتا ہے۔

بتا رہے ہیں کہ ہر سال دسمبر میں صحافت پر بین الاقوامی کانفرنس بھی ہوتی ہے جس میں قریباً 1200 صحافی ہوتے ہیں۔

عمر رسیدہ، محترم ومکرم باب جائلز ایک خبر کے لیے بنیادی امور یہ قرار دے رہے ہیں۔ کہ اس کے لیے سب سے پہلے تو معلومات جمع کرنا ضروری ہیں۔ اس سے متعلقہ کون کون افراد ہوسکتے ہیں۔ کون سے ادارے ہیں۔ ان سے کیا کیا سوالات کیے جائیں گے۔ جن کی بدولت مطلوبہ معلومات ملتی چلی جائیں پھر ان اطلاعات کو ایک لڑی میں ترتیب سے پرونا کہ پڑھنے والے کی دلچسپی شروع سے آخر تک یکساں انداز میں برقرار رہے۔ زبان میں خوشبو اور چاشنی ہو۔ تحریر میں روانی ہو، کہیں الجھاؤ نہ ہو۔

یہ تو گفتگو ہو رہی ہے۔ خبر کیسے لکھی جائے۔ اب اصل موضوع پر بات شروع ہو رہی ہے کہ گیارہ ستمبر کے بعد امریکہ اور بیرون، پریس کا کیا کردار رہا ہے۔

باب جائلز دھیمے لہجے میں بات کرتے ہیں۔ لیکن ان کے اظہار خیال میں قطعیت اور

اعتماد بہت ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ امریکی صحافیوں کا نقطۂ نظر بہت محدود ہوگیا ہے۔ اخبارات، ٹیلی ویژن صرف امریکی مفادات کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ امریکی صحافی ہر معاملے کو امریکی عینک سے دیکھتے ہیں۔ ان کی اطلاعات کا ذریعہ امریکی حکومت ہوتی ہے اور زیادہ تر معلومات پینٹا گون اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی فراہم کردہ ہوتی ہیں۔ اس طرح اس کو مکمل خبر نہیں کہا جاتا اور یہ بھی کہ امریکی شہریوں کو اکثر صحیح اور پوری خبر نہیں ملتی۔ اگر ملتی ہے تو یکطرفہ۔

وہ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ابھی جب افغانستان، بعد میں عراق میں جنگ شروع ہوئی تو اکثر امریکی صحافی ایسے تھے جن کو جنگی رپورٹنگ کا تجربہ نہیں تھا۔ اور نہ ہی ان علاقوں کے بارے میں ان کے پاس پوری معلومات تھیں۔ بی بی سی کے نمائندے امریکیوں کے مقابلے میں زیادہ تجربہ کار تھے۔ امریکیوں کی رپورٹنگ جانبدارانہ تھی۔ وہ کہتے تھے ہماری فوجیں ..... ہمارے نوجوان..... یہ اصولاً غلط تھا..... ان کو ٹیلی ویژن پر اپنی حب الوطنی اور اپنے پرچم کو نہیں لہرانا چاہیئے تھا.....اور ان کی کوریج میں جذباتیت نہیں ہونا چاہیئے تھی۔

جائلز اپنے تجربے کی روشنی میں ایک اور اہم بات کہہ رہے ہیں۔ کہ سرد جنگ کے خاتمے اور سویت ایمپائر زمین بوس ہونے کے بعد امریکی نیوز چینلوں، بڑے اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں نے اپنے زیادہ تر ''فارن بیورو'' بند کردیئے تھے۔ اور یہ سوچ رہے تھے کہ اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔ اس طرح ان ملکوں سے مسلسل جو اطلاعات ملتی تھیں۔ اور یہ کہ وہاں امریکی پالیسیوں کے بارے میں کیا احساسات ابھر رہے ہیں۔ کونسی نئی سیاسی قیادتیں سامنے آرہی ہیں۔ ان کا ایجنڈا کیا ہے۔ یہ آہستہ آہستہ معلوم ہونا بند ہوگیا۔ اسی اثنا میں اسلامی شدت پسند گروپ بھی آگے بڑھے ہیں۔ جہادیوں کا غلبہ ہوا ہے۔ کبھی کبھی یہ اطلاعات تو آتی تھی کہ امریکہ سے نفرت بڑھ رہی ہے۔ لیکن کیوں، تمام اسباب کا علم نہیں ہوتا تھا۔ امریکی اخبار نویس ان علاقوں میں ہوتے اور رپورٹ کرتے کہ کیا ہورہا ہے۔ تو وہ زیادہ قریب سے ان رجحانات کو سمجھ سکتے تھے۔ اور امریکی عوام کو سمجھا سکتے تھے دہشت گردی کے آثار ہوتے تو ہم پہلے سے الرٹ ہوتے۔

باب جائلز ایک دلچسپ اصطلاح استعمال کررہے ہیں۔ پیراشوٹنگ صحافی، ان کی مراد یہ

ہے کہ اب کہیں کوئی واقعہ ہوتا ہے۔ تو امریکی صحافی تیزی سے وہاں پہنچتے ہیں۔ رپورٹنگ شروع کردیتے ہیں۔ معاملہ ختم ہو تو واپس آجاتے ہیں۔ اس طرح انہیں واقعات کے حقیقی اسباب کا نہ خود صحیح سے علم ہوتا ہے۔ نہ وہ اپنے قارئین کو بتا پاتے ہیں۔

ہمارے خیال میں ان کا تجزیہ بڑی حد تک درست ہے۔ ان تبدیلیوں سے یقیناً فرق پڑا ہوگا۔ جائلز ایک اور اہم پہلو کی جانب اشارہ کررہے ہیں کہ امریکہ میں مقامی اخبارات زیادہ پڑھے جاتے ہیں۔ ان کے قارئین بھی مقامی خبروں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ مقامی چینل ہو یا اخبار زیادہ جگہ تو کھیل لیتے ہیں۔ اس کے بعد تفریحات، پھر بزنس..... بین الاقوامی خبروں کے لیے جگہ بہت کم رہ جاتی ہے۔ یوں امریکی اخباری قاری بین الاقوامی امور سے باخبر نہیں رہتا۔

ان سے پوچھا جارہا ہے کہ کیا فارن بیورو دوبارہ کھولے جانے کے امکانات ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مشکل ہے ٹی وی چینلوں کی بھی یہی صورت حال ہے۔ زیادہ تر نیٹ ورک بیورو نہیں رکھتے۔ یا تو ان کا نمائندہ وقتی طور پر جاتا ہے۔ یا وہاں کسی مقامی نامہ نگار سے بات کرلیتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ امریکہ میں دیکھے جانے والے بڑے چینل دو ہی ہیں۔ سی این این..... اور فوکس..... یہ 24 گھنٹے نشریات جاری رکھتے ہیں۔ سی این این کافی حد تک پیشہ ورانہ ہے لیکن اس کے ناظرین کم ہورہے ہیں۔ فوکس خالص نظریاتی اور قدامت پسند ہے۔ اس کے دیکھنے والے بڑھ رہے ہیں۔ سی این این امریکہ میں فوکس بننے کی کوشش کررہا ہے۔ کافی حد تک جانبدارانہ ہورہا ہے۔ دوسرے ملکوں میں دیکھی جانے والی نشریات میں شاید یہ رجحان نہ ہو۔ سی این این کے بیورو آفس زیادہ ہیں خبریں جمع کرنے کا عمل بھی وسیع ہے۔ لیکن فرق وہی ہے کہ سی این این امریکہ کا اور زاویہ ہے۔ انٹرنیشنل کا اور.....اور ایشیا کا اور۔

اب بات پرنٹ میڈیا کی چلی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ بڑے اخبارات اب بھی کافی حد تک عوام سے تعلق رکھتے ہیں لوگوں کی اطلاعات کا ذریعہ ہیں۔ ان کے ہاں خبروں کے لیے جگہ بھی بہت ہے۔ نیویارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ کی رپورٹیں معاملے کی زیادہ گہرائی میں جاتی ہیں۔ لاس اینجلز ٹائمز، انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون، بھی اہم خبروں کو زیادہ تفصیل سے اور زیادہ جامع دیتے ہیں۔ اخبارات اپنے وسائل میں بھی اضافہ کررہے ہیں کراس میڈیا اونر شپ (مختلف

ذرائع ابلاغ کی ملکیت) کا مسئلہ یہاں بھی ہے۔ مقابلہ بڑھ رہا ہے۔ اخبارات اپنے ٹیلی ویژن چینل، ریڈیو رکھ رہے ہیں۔ قومی ریڈیو کمپنیوں ،قومی اخبارات اور قومی ٹی وی کمپنیوں کو، مقامی ریڈیو، مقامی اخبارات۔ مقامی ٹی وی خریدنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اس سے رفتہ رفتہ یہ محسوس ہوا کہ مقامی آواز بھی دب رہی ہیں۔ پہلے افریقی ایشیائی اور دوسرے قوموں کے نقطہ ہائے نظر مقامی ذرائع ابلاغ سے پیش ہوجاتے تھے۔ لیکن قومی کمپنیوں نے جب سے انہیں خرید لیا ہے۔ تو یہ نقطۂ نظر پہنچنا بند ہوگیا ہے۔ کانگریس اس صورت حال کو ختم کرکے پرانی صورت حال لانا چاہتی ہے۔ جبکہ صدر اسی پالیسی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

امریکی ذرائع ابلاغ کے حوالے سے یہ گفتگو بہت متنوع اور معلومات افزا رہی ہے۔ ایک تجربہ کار جہاندیدہ، سینئر ماہر ابلاغ کے ساتھ نشست سے یہ فائدہ یقینی ہے۔ ان کا انداز خالصتاً پیشہ ورانہ اور معروضی ہے۔ لیکن معلوم نہیں کہ امریکہ میں کتنے باب جائلز ہوں گے ابھی تو ''فوکسیے'' بڑھتے جارہے ہیں۔ امریکی معاشرہ کب تک ''باب جائلز'' کو برداشت کرے گا یا اس متعصب ہوتے ہوئے معاشرے میں کوئی کب تک باب جائلز رہنے کی سکت رکھ سکے گا۔

کثیر المذاہبی مطالعہ کے شعبے میں

ہم ابھی ہارورڈ یونیورسٹی میں ہی ہیں اور ایک خصوصی پروجیکٹ کے مشاہدے اور اس کے بارے میں گفتگو کے لیے جارہے ہیں۔ جسے انگریزی میں Pluralism Project کا نام دیا گیا ہے۔ مختلف مذاہب کا مطالعہ ایک قدیم علم ہے۔ اردو.....عربی و فارسی میں بھی اس کے لیے یقیناً اصطلاحات موجود ہوں گی۔ لیکن میری کم علمی کہ میں ان سے کماحقہٗ واقف نہیں ہوں۔ ابھی بعض لغت میں دیکھا ہے۔ تو ایک اسے تعددیت کہتی ہے۔ ایک میں کثرتیت کی اصطلاح بتائی گئی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ تمام مذاہب کا مجموعی مطالعہ کیا جائے۔ ان کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ بعض اوقات ایسی کوششیں بھی ہوتی رہی ہیں کہ تمام مذاہب کا ایک مذہب بنالیا جائے۔ ایک ''انٹرفیتھ'' کا سلسلہ بھی ہے۔

ایک کلاس روم کے دروازے پر ''یہودیت'' درج ہے۔ ایک پر عیسائیت..... بدھ مت.....جین.....اسلام۔

پلورلزم پروجیکٹ کو ''ڈیانا ایل ایک'' نامی خاتون نے شکل دی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ امریکہ میں نمو پاتے مذہبی تنوع کا مطالعہ بھی کیا جائے اور اس کے بارے میں معلومات کو دستاویزی صورت بھی دی جائے۔ تارک وطن مذہبی برادریوں کا خصوصی مشاہدہ کیا جائے۔

ڈیانا ایل ایک، اسی یونیورسٹی میں..... مذہبی اور بھارتی تقابلی مطالعے کی پروفیسر ہیں۔

لوئل ہاؤس کی ماسٹر اور پلومزم پروجیکٹ کی ڈائریکٹر ہیں۔ اس وقت وہ امریکہ سے باہر ہیں ورنہ ان سے ملاقات رہتی۔ انہیں اپنے مذہب عیسائیت سے گہرا لگاؤ ہے۔ یونائیٹڈ میتھوڈیسٹ چرچ..... ورلڈ کونسل آف چرچز..... اور ہارورڈ ڈیوینٹی اسکول کے معاملات سے بہت قریبی وابستگی رہتی ہے۔ ان کی ایک تصنیف ''خدا کے روبرو..... بوزمین سے بنارس..... ایک روحانی مطالعہ'' کو گراویمر بک ایوارڈ مل چکا ہے۔ 1998ء میں صدر کلنٹن نے پلولرزم پروجیکٹ میں امریکی مذہبی تنوع میں تحقیقی مطالعے پر ان کو نیشنل ہیومنیٹیز میڈل بھی دیا۔ بتایا جارہا ہے کہ گزشتہ تیس برسوں میں امریکہ کا مذہبی منظر نامہ تیزی سے تبدیل ہوا ہے۔ اسلامی سینٹر اور مساجد..... ہندو اور بدھ مت کے مندر..... روحانی سوچ کے مراکز امریکہ میں قریباً ہر بڑے شہر میں ہیں ہر شہر اور قصبے میں قدیم روایات کا آمنا سامنا ہوتا ہے۔ اور اب امریکہ میں یہ سب سے اہم اور حساس معاملہ ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے امریکی تیزی سے صورت پذیر یثبت تعددیت میں ایک دوسرے سے کس طرح ملیں جلیں۔ گفتگو کریں۔ آنے والے دنوں میں بھی یہ مسئلہ انتہائی مرکزی حیثیت رکھے گا۔

مسز گردو ہیرس ہماری منتظر ہیں۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ دس سال پہلے یہ ایک چھوٹا سا ریسرچ پروجیکٹ تھا۔ اب وقت کے ساتھ ساتھ یہ اہمیت اختیار کرتا جارہا ہے۔ ہم جس کمرے میں بیٹھے ہیں چاروں طرف کتابوں کی الماریاں ہیں۔ جن میں رسالے بھی ہیں اخبارات بھی۔ ان کی ترتیب اور حالت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس پروجیکٹ کو فنڈز زیادہ نہیں ملتے ہیں۔ مختلف حصوں میں سکھ ازم، اسلام، ہندو، بدھ، زرتشت لکھا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ رسالوں کے ڈھیر ہیں۔ نیوریلیجنس، کلچر، ہندوازم ٹوڈے، مسلم جرنلز، لٹل انڈیا، انڈیا ابروڈ ایک طرف وڈیو فلمز کی الماری ہے۔

خاتون بتارہی ہیں کہ مختلف اسکالرز تحقیق کے لیے آتے ہیں تو ہم انہیں ویب سائٹ بتاتے ہیں کہ ان سے رجوع کریں وہاں سے انہیں متعلقہ سوالات کے جوابات مل سکتے ہیں۔ تقابلی مطالعے کے سلسلے میں اب تک جو کام ہوا ہے۔ اس کا خلاصہ ہم مانگ لیتے ہیں۔ وہ یہاں دستیاب رہتا ہے۔ مختلف اداروں اور شخصیات سے ہمارا رابطہ رہتا ہے۔ ان سے بھی ہم یہ کہتے

رہتے ہیں کہ جن موضوعات اور مسائل پر مذاکرات، سیمینار کرتے ہیں۔ ان کی رپورٹیں ہمیں بھیجتے رہیں۔ تاکہ وہ یہاں اسکالرز اور محققین کے لیے موجود ہوں۔ گیارہ ستمبر کے بعد صورت حال زیادہ سنگین اور حساس ہوئی ہے۔ اس لیے ہمارے کام کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ 24 ملکوں میں ہمارے آٹھ مراکز ہیں۔ مختلف یونیورسٹیوں میں اس وقت پلولرزم سے سے متعلقہ 60 تحقیقی مطالعے جاری ہیں۔ مختلف ممالک کے تارکین وطن اس وقت امریکہ میں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ وہ اپنی اپنی مذہبی، سماجی، معاشرتی روایات روحانی اقدار اپنے ساتھ لائے ہیں۔ اکثریت ان کے معاملے میں جذباتی بھی ہے۔ اس لیے تصادم کا خطرہ رہتا ہے۔ بنیادی مقصد یہی ہے کہ جہاں ایسے اختلافات ہوں۔ شدت اختیار کررہے ہوں۔ وہاں کیا کیا جائے۔ کس طرح خطرات کو ٹالا جائے۔ پروجیکٹ سے متعلقہ ایک بورڈ آف ایڈوائزرز ہے۔ جو سب کے سب امریکہ میں ہی مقیم ہیں۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ اس وقت سب سے اہم کام ہمارے ہاں یہ ہورہا ہے کہ ہم نے اپنی سائٹ پر تمام مذہبی برادریوں سے رابطہ کرکے کہا ہے کہ وہ اپنی معلومات، اطلاعات ہمیں بھیجیں۔ تاکہ ایک دوسرے کے معاملات سے باخبر رہیں۔

اسی طرح امریکی اخبارات میں جو کچھ اس سلسلے میں شائع ہورہا ہے۔ خبریں، مضامین، وہ بھی ہم اس سائٹ پر دیتے رہتے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی بھی معاملے یا مسئلے کو اسی طرح پیش کیا جائے۔ جیسے متعلقہ مذہب کرتا ہے۔ تاکہ اس مذہب کے ماننے والوں کی سوچ۔ اپنی جذباتی نوعیت کے ساتھ دوسروں کے سامنے آئے۔ اور وہ اس کا خیال رکھیں۔

مختلف شہروں میں اور ریاستوں میں مختلف مذاہب کے پیروکار آپس میں کس طرح کے تعلقات رکھتے ہیں ایک دوسرے کے جذبات اور روایات کا احترام کررہے ہیں یا نہیں..... یہ بھی دیکھا جاتا ہے۔

ان کے خیال میں چرچ اور اسٹیٹ کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے میں ہی عافیت ہے۔ یعنی مذہب اور مملکت کو..... دین اور سیاست کو ایک دوسرے سے دور رکھا جائے تو تصادم کا خطرہ بھی نہیں رہتا اور ہر شہری کے حقوق کا تحفظ بھی ہوسکتا ہے۔ انہیں ایک دوسرے کا احترام کرنا چاہیے۔ تحمل اور برداشت سے کام لینا چاہیے۔

وہ کہہ رہی ہیں کہ ہم سب براہیمی ہیں۔ یہودیت، عیسائیت، اسلام سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ماننے والے ہیں۔

ایڈیٹرز کی طرف سے کہا جارہا ہے کہ یہ یقیناً ایک اچھی کوشش ہے۔ لیکن امریکہ اس وقت جو رویہ اختیار کررہا ہے وہ ایک جارح مسیحی کا ہے۔ اس سے دنیا بھر میں یہ تاثر پیدا ہورہا ہے کہ اسلام کو ہدف بنایا جارہا ہے۔ وہ اس سے اتفاق کررہی ہیں کہ ہمارے اسکالرز اس پہلو پر بھی نظر رکھے ہوئے ہیں۔ بعض اوقات امریکی قیادت نے بعض مذہبی اصلاحات کا غلط استعمال کیا۔ جس کا ردعمل خطرناک ہوا ہے۔ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ انتہاپسندی، شدت گیری ہر مذہب میں ہوتی ہے۔ ہر عقیدے میں کچھ لوگ زیادہ سختی سے عمل کرتے ہیں۔ لیکن صرف اسلامی انتہا پسندی، اسلامی بنیاد پرستی کے تراکیب استعمال کی جاتی ہیں۔ جس سے یہ تاثر پیدا کیا جارہا ہے کہ شدت پسندی صرف مسلمانوں میں ہے۔

وہ کہہ رہی ہیں کہ اس پروجیکٹ میں مختلف تحقیقی مطالعوں کے ذریعے ہماری کوشش یہی ہے کہ تمام مذاہب کے ماننے والے ایک دوسرے کے عقائد کا احترام کریں۔ نزاکتوں پر نظر رکھیں۔ اتنے قریب سے مطالعہ کریں کہ انہیں کوئی بھی قدم اٹھانے، اظہار خیال سے پہلے یہ بھرپور احساس ہو کہ کسی دوسرے مذہب کے پیروکار اس سے کس طرح متاثر ہوں گے۔ ہمارا بنیادی کردار امریکی معاشرے کو ان تمام مذاہب کے عقائد، شعائر اور تعلیمات سے باخبر کرنا ہے۔ جن سے تعلق رکھنے والے امریکہ میں موجود ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہم کسی حد تک اس میں کامیاب بھی ہیں۔

میں پوچھ رہا ہوں کہ اس یقیناً اہم اور وقیع تحقیق پر مشتمل کوئی کتاب بھی شائع ہوئی ہے۔ اگر تفصیلات مل جائیں تو ہم اس کا مطالعہ کرنا چاہیں گے۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ یہ معلومات آپ کو مختلف ویب سائٹس سے مل جائیں گی..... ہمارا کام اسکالرز کو متعلقہ معلومات فراہم کرنا ہے۔ ہمارا پروجیکٹ خود کتابیں وغیرہ شائع نہیں کرتا ہے۔ ہماری سائٹ

WWW.Pluralism.org

پر تمام معلومات کے لیے اشارے اور رابطے موجود ہیں۔ اس میں اس منصوبے کے

مشن، تاریخ، عملے کے بارے میں کوائف ہیں۔ موجودہ تحقیق کن موضوعات پر ہورہی ہے۔ پروجیکٹ نے اب تک جو مذاکرے کیے ہیں۔ سیمینار منعقد کیے ہیں ان کی تفصیلات..... مختلف مطبوعات اور آن لائن پروگراموں کے سلسلے میں اطلاعات..... امریکہ میں مختلف مذاہب کے مراکز کی فہرست، قریباً 4500 کی تعداد میں، دوسرے آن لائن ذرائع کے اعداد وشمار، تصاویر، سلیبس، کتابوں کی فہرست اس سائٹ میں ہر ہفتے کے آخر میں تازہ ترین معلومات شامل کی جاتی ہیں۔

اس پروجیکٹ کے دیگر مراکز میری لینڈ، الی نوائس، کیلی فورنیا، نیوجرسی، ورجینیا، واشنگٹن، اوہائیو، پنسلوانیا لوئیسانیا میں محققین کی دلچسپی کے لیے قائم ہیں۔

ہمیں ایک سی ڈی بھی دی گئی ہے۔ جس کا عنوان ہے۔

''مشترکہ بنیادوں پر امریکہ میں مذاہب عالم''

اس کے ذریعے اساتذہ، طلبہ، محققین اور مذہبی رہنماؤں کو پلولرزم پروجیکٹ کی تمام تحقیق کام کا مواد اور معلومات مل جاتی ہیں۔ اسے تین حصوں میں بانٹا گیا۔

1۔ ''مذہبی منظر نامے کی تلاش'' مختلف شہروں اور خطوں میں امریکہ کے نئے مذہبی منظرنامے کے بارے میں وسائل کی اطلاعات، جن میں مساجد، مندروں، گرجا گھروں، یہودی معبدوں کی تفصیلات اور پتے شامل ہیں۔

2۔ امریکہ میں مذاہب کی دریافت، اس حصے میں امریکی تناظر میں قریباً 15 مذاہب کی روایات اور زندگی کی تفصیلات ہیں۔ جن میں عیسائیت، یہودیت، بدھ مت، اسلام، ہندومت، سکھ ازم ..... امریکہ کے مقامی مذاہب۔ عیسائیت، کنفوشیں، جین، شنٹو، تاؤ، زرتشت وغیرہ ان کے گیت، عبادتیں، تہوار، مذہبی تعلیم وغیرہ سب دی گئی ہیں۔

3۔ مذہبی تنوع کے روبرو..... مذہبی تنوع کے حوالے سے امریکی شناخت کے بارے میں نئے اور پرانے سوالات، آج کے اسکولوں، برادریوں اور عوامی اداروں میں کیا سوالات اور چیلنج درپیش ہیں۔

اس پروجیکٹ کی یہ سب کوششیں اس لیے قابل قدر ہیں۔ کہ اس میں مستقبل کی فکر

ہے۔ ماضی کا تجزیہ ہے۔ حال کا آئینہ ہے۔ سنجیدگی سے یہ جانا جارہا ہے کہ مذاہب کی کثرتیت تنوع اور انضمام کے معانی کیسے تبدیل کررہی ہے۔ مذاہب کو ترک وطن کے سلسلے میں کن رکاوٹوں کا سامنا ہے۔ مختلف مذاہب کے ماننے والے جب ایک شہر اور ایک مقام پر رہتے ہیں تو انہیں مشترکہ ماحول کی تشکیل میں کن چیلنجوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ مذہبی عبادات اور دیگر رسوم ایک علاقے میں کس نقطۂ نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ نئے مذہبی تنوع سے کیا ظاہری اختلافات پیدا ہورہے ہیں اور کونسے اختلافات ابھی خفیہ طور پر ہیں۔ سب سے اہم اور دلچسپ یہ کہ کثیر المذہبی امریکہ میں امریکی ہونے کا کیا مطلب ہوگا۔

ان معلومات میں درج ذیل تنظیموں سے تعاون لیا گیا۔

1۔ آئی ایف اے فاؤنڈیشن آف نارتھ امریکہ

2۔ بہائی ورلڈ نیوز سروس۔

3۔ بدھ امن فیلوشپ۔

4۔ کنفوشین کلاسیکس۔

5۔ یونیٹرین یونیورسلسٹ ایسوسی ایشن

6۔ کونسل آف ہندو ٹمپلز آف نارتھ امریکہ

7۔ جین میڈیٹیشن انٹرنیشنل سینٹر

8۔ کرامہ مسلم وویمن لائیرز برائے انسانی حقوق۔

9۔ ربی نکل۔ کونسل آف امریکہ۔

10۔ نیشنل انڈین یوتھ کونسل۔

11۔ سبا کی گرینڈ شرائن آف امریکہ (شنٹو)

12۔ پنجابی امریکن ہیریٹیج سوسائٹی (سکھ)

13۔ زرتشترن اسمبلی (زرتشت)

یہ بھی قابل قدر امر ہے کہ پلولرزم پروجیکٹ کو اس کی افادیت کے پیش نظر اہم امریکی اداروں سے عطیات ملتے ہیں۔ جن میں فورڈ فاؤنڈیشن ..... للی انڈوومنٹ..... راک فیلر

فاؤنڈیشن، پیو چیریٹیبل ٹرسٹ نمایاں ہیں۔ دوسرے اداروں میں ہارورڈ یونیورسٹی، نیشنل اینڈاؤمنٹ فار ہیومینیٹیز، مساچسٹوس اینڈ اومنٹ فار ہیومینیٹیز، نارتھ اسٹار فنڈ، ٹیلملٹین فاؤنڈیشن بھی معقول فنڈز فراہم کرتے ہیں۔

اسی گفتگو کے دوران وہ کہہ رہی ہیں کہ اس پروجیکٹ کی بانی ڈیانا ایل ایک کی اپنی ایک تصنیف ہے۔

A new religious America

''ایک نیا مذہبی امریکہ'' یہ بھی اس موضوع پر دلچسپ کتاب ہے۔ یہ کسی اور پبلشر نے شائع کی ہے۔ پروجیکٹ نے نہیں۔ اس کی ایک جلد اس وقت دستیاب ہے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ یہ میرا حق بنتا ہے۔ کیونکہ میں نے ہی یہ فرمائش کی ہے۔ 404 صفحات کی یہ مجلد کتاب یقیناً آج کا حاصل ہے.....اس کا ذیلی عنوان ہے۔''ایک عیسائی ملک کس طرح دنیا کی مذہبی طور پر سب سے متنوع قوم بن گیا'' سرورق پر امریکی پرچم میں ستاروں کی جگہ مختلف مذاہب کے نشانات دیئے گئے ہیں۔

سات ابواب پر مشتمل یہ تحقیقی تصنیف امریکہ میں مختلف مذاہب کے مراکز.....تارکین وطن کے ساتھ آنے والی مذہبی روایتوں.....ان کے امریکی معاشرے پر اثرات کا معروضی جائزہ لیتی ہے۔ مختلف ادوار میں حکومتیں کیا کرتی رہی ہیں۔ یونیورسٹیوں میں کیا مطالعے ہورہے ہیں۔ زندگی کے مختلف مراحل، پیدائش، تعلیم، شادی، عدت پر متعلقہ رسوم کس طرح ادا کی جاتی ہیں۔ ایک دوسرے کی مذہبی روایات اور شعائر کو کس طرح برداشت کیا جاتا ہے۔ یہ سب انتہائی دلچسپ پیرایے میں بیان کیا گیا ہے۔ امریکی ہندوؤں، امریکی بدھوں، امریکی مسلمانوں پر الگ الگ ابواب ہیں۔ آخری باب پلوں کی تعمیر، ایک نیا کثیر المذہبی امریکہ پر ہے۔ امریکی مسلمانوں پر باب 71 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز بہت دلکش ہے۔

''جب سراج وہاج، امام مسجد تقوی بروکلن، 25 جون 1991ء کو ایوان نمائندگان میں کھڑے تلاوت کررہے تھے۔ پھر خطاب کرتے ہوئے انہوں نے قرآن کی بہت زیادہ دہرائی جانے والی یہ آیت

بسمہ اللّٰہ الرحمن الرحیم

یاایھاالناس۔ انا خلقنا کم من ذکرو انثیٰ و جعلنکم شعوباً و قبائل لتعارفوا۔ ان اکرمکم عنداللّٰہ اتقکم ان اللّٰہ علیم خبیر:

اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک (ہی) مرد و عورت سے پیدا کیا ہے۔ اور اس لیے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو۔ کنبے اور قبیلے بنا دیے ہیں۔ اللہ کے نزدیک تم سب میں سے باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ یقین مانو کہ اللہ دانا اور باخبر ہے۔

یہ لمحہ تاریخی تھا۔ اور ایک کثرتیت والے معاشرے میں یہ آیت متاثر کن تھی۔ اس کے بعد اسلام کو مزید اہمیت دی جانے لگی۔ مصنفہ نے اس باب میں نہ صرف امریکہ بلکہ پوری دنیا میں مسلمانوں کے رہن سہن، اعداد و عادات اور روزگار کے امور کے بارے میں لکھا ہے۔ شب قدر، عیدالفطر، عیدالاضحیٰ پر مسلمان کیسے مصروف رہتے ہیں۔ انہوں نے امریکہ میں مختلف اسلامی مراکز میں ائمہ اور خطیبوں سے ملاقات کی ہے۔ اور یہ جائزہ لیا ہے کہ مسلمان کی حیثیت سے تارکین وطن کو کیا معاشرتی اور شہری دشواریاں ہیں۔ اسلام کے بارے میں مغرب میں جو غلط فہمیاں ہیں ان کا بھی اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ توحید اور جہاد کے بارے میں بھی گفتگو ہے۔ مشرق بعید، جنوبی ایشیا، مشرق وسطیٰ سے آنے والے مسلمانوں کے باہمی روابط کیسے ہیں۔ مقامی امریکی افریقی مسلمان، باہر سے آنے والے مسلمانوں سے کیسا تعلق رکھتے ہیں۔ اسی میں فرا خان کے عقائد کا بھی تذکرہ شامل ہے۔ نیشن آف اسلام، علی جاہ محمد کے حوالے سے بھی کچھ معلومات ہیں۔ میلکالم ایکس نے سیاہ مسلمانوں کے حقوق کے لیے جو جدوجہد کی۔ اس کا خلاصہ بھی ہے۔

اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ (اسنا۔ ISNA) کا ہیڈکوارٹر۔ پلین فیلڈ انڈیانا میں ہے۔ اینٹوں سے بنی جدید مسجد، اس کے ساتھ مختلف دفاتر پر مشتمل وسیع کمپلیکس میں اسپیکر بیورو ہے۔ ٹیچرز کے لیے ورکشاپس ہوتی رہتی ہیں۔ کانفرنسوں کی منصوبہ بندی، ایک بڑا شعبہ مطبوعات ہے۔ شادی بیاہ کے لیے معلومات، اندراج، اسی طرح اموات کا اندراج، اسلامی وصیت نامے، سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ امریکہ میں رہائش پذیر مسلمانوں کے آپس میں رابطے

کے لیے یہ سب سے فعال مرکز ہے۔ اس کے علاوہ بھی ہر ریاست میں شہروں میں مقامی طور پر مسلمانوں کی بنائی گئی انجمنوں کے بارے میں معلومات ہیں۔

اسلام کے پانچویں ارکان کا بھی تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ بعض مقامی امریکنوں کے قبول اسلام کی کہانیاں بھی دی گئی ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ میں مقیم مختلف نسلوں اور علاقوں کے مسلمانوں کی اچھی عادات نے کس طرح سچائی کی تلاش میں سرگرداں امریکیوں کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرلیا۔

ہم پلولرزم پروجیکٹ سے روانہ ہو رہے ہیں۔ وہی کمرے جہاں یہودیت، عیسائیت، جین، بدھ مت اور اسلام پر تحقیق ہو رہی ہے۔ مستقبل کا امریکی معاشرہ اس مذہبی تنوع کے تناظر میں کیا شکل اختیار کرے گا۔ یہ دیکھا جا رہا ہے۔

ہمارے ہاں ایسی کوئی کوشش نہیں ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرے پر بھی تو باہر سے آنے والی لہریں اثر ڈال رہی ہیں۔ اندر سے جو لہریں ابھر رہی ہیں۔ وہ بھی سوچیں بدل رہی ہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد دنیا میں تیزی سے جو تبدیلیاں آئی ہیں۔ وہ پاکستانی ذہنوں کو بھی متاثر کر رہی ہیں۔ مستقبل کے پاکستانی کا ذہن کیا ہوگا۔ مستقبل کا پاکستانی معاشرہ کیا خدوخال رکھے گا۔ ہمیں یہ تجزیہ کرنا تو چاہیئے۔

بوسٹن کے پروفیشنلز کیا کہتے ہیں

آج کا دن طویل ہوتا جارہا ہے۔ لیکن ہمارے ذہن کے آفاق وسعت پا رہے ہیں۔ تاریک گوشے روشن ہورہے ہیں۔ اب ہماری منزل ون فنائشل سینٹر ہے۔ جہاں 41ویں منزل پر اٹارنی جیفرے رونیز ہمارے میزبان ہیں۔ محض گفتگو نہیں ہوگی۔ ظہرانے کا بھی اہتمام ہے۔ بڑے اور چھوٹے شہروں میں یہی فرق ہے۔ واشنگٹن میں تو وہ پانی بھی نہیں پوچھتے تھے۔ یہاں لنچ بھی پیش کیا جارہا ہے۔ اسے آپ ''ورکنگ لنچ'' کہہ لیں۔

اپنے اپنے لنچ لے کر ہم مقررہ نشستوں پر بیٹھ گئے ہیں۔ گفتگو بھی جاری ہے۔ یہاں وکیل بھی ہیں۔ فوجی بھی۔ سرکاری محکموں کے ملازم، تاجر، پرائیوٹ سیکٹر میں کام کرنے والے۔ اور ہر عمر کے لوگ ہیں اس سے مختلف انداز فکر سامنے آئیں گے۔ ہمارے میزبان کہہ رہے ہیں۔ 11 ستمبر بہت غمگین دن تھا۔ لوگ اپنے پیاروں کی تصویریں لے کر کھڑے تھے۔ میں نہیں برداشت کرسکتا تھا۔ آخر یہ لوگ ہمیں پسند کیوں نہیں کرتے نفرت کیوں کرتے ہیں۔ ہمیں اپنا ہدف کیوں بنالیا ہے۔ میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔ یہ لوگ مارے گئے۔ انہوں نے تو ان کے خلاف کچھ نہیں کہا تھا۔ ان کا کیا گناہ تھا۔ یہ جو کچھ ہوا ہے۔ اس کے بعد امریکہ اپنے شہریوں اور دوسرے ملکوں میں اپنی مارکیٹوں کے تحفظ کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے۔ جو کرے گا اس میں حق بجانب ہوگا۔

ایک صاحب کہہ رہے ہیں کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ جہاں انہوں نے پناہ لی ہے۔ وہیں حملے کررہے ہیں۔ انہوں نے ہمارے خلاف اعلان جنگ کردیا ہے۔ بن لادن نے 1995ء سے یہ مہم شروع کی ہے۔ امریکہ دنیا میں زیادہ توجہ دیتا رہا۔ انہوں نے امریکہ کے اندر حملہ کردیا۔ یہ تو امریکہ کے کسی بھی حصے پر یلغار کرسکتے ہیں۔ پاکستان نے یقیناً متوازن اور معقول پالیسی اختیار کی ہے۔ مشرف ملک کو آگے لے جانا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں میں تشدد کی طرف کچھ رجحانات محسوس ہوتے ہیں۔ جیسے بالی میں بم کا دھماکا بش کو قدم اٹھانے پڑے۔ افغانستان جانا پڑا۔ افغان عوام کی مدد کے لیے۔

ایک صاحب کہہ رہے ہیں۔ کہ ہم تو ہمیشہ اسی خیال میں رہے کہ دو سمندر، بحرالکاہل، اور بحراوقیانوس ہماری حفاظت کریں گے۔ کوئی ہم پر حملہ آور نہیں ہوسکتا۔ لیکن 11 ستمبر کو یہ اعتماد ختم ہوگیا۔ حملہ آور نیویارک یعنی امریکہ کے قلب میں پہنچ گئے۔ پینٹاگون پر حملہ ہوگیا۔ وہ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ہمارے سامنے عرب نژاد امریکیوں سے ناانصافی ہوتی رہی ہے۔ ایک نوجوان امریکی یہ کہتا ہے کہ یہ تو ہونا ہی تھا ہم افریقہ، ایشیا، مشرق وسطیٰ میں جو پالیسیاں اختیار کرتے رہے ہیں۔ اس سے لوگوں میں امریکہ کے خلاف سخت نفرت ہے۔ ہمیں پہلے اس نفرت کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے تھی۔ اب بھی امن امر کی ضرورت ہے۔ ایک خاتون یہ بتارہی ہیں کہ وہ اس روز بیجنگ میں تھی واپس گھر آنے میں انہیں پورے 5 دن لگے۔ اور ہر وقت ایک خوف اور پریشانی تھی۔ لیکن راستے میں جنوبی ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں لوگ ملے۔ خاندان ملے۔ جو زیادہ تر مسلمان تھے۔ انہوں نے امریکہ سے ہمدردی کی۔ اور کہا کہ ہمیں ان دہشت گردوں کے حوالے سے نہ دیکھیں۔ ایک خاتون بتارہی ہیں کہ ان کے بھائی اور والد کے دفاتر ٹریڈ ٹاور میں تھے۔ وہ تو بچ گئے۔ لیکن ان کے رفقائے کار اس کی نذر ہوگئے۔ جبتک ہمیں بھائی اور والد کی محفوظ رہنے کی اطلاع نہیں ملی۔ ہم ایک شدید کرب میں مبتلا رہے۔ ہمیں اپنی خارجہ پالیسی بدلنی پڑے گی۔ انتہائی تشویشناک ہے کہ اسلامی انتہا پسند امریکہ میں کام کررہے ہیں۔ دنیا اس دن سے بہت بدل گئی ہے۔ میری نسل کے لیے تو سب کچھ تبدیل ہوگیا ہے۔ ہم پہلے دنیا سے بالکل بے خبر ہوتے تھے۔ اب ہمیں دوسری دنیا کے معاملات کا بھی احساس ہوا ہے۔ ایک

نوجوان امریکی بحریہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم نے دوسرا طیارہ ٹکراتے ہوئے دیکھا۔ مجھے بیوی کا فون آیا۔ وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ ہم 38 روز تک کھلے سمندر میں رہے۔ ہم جو کچھ کر رہے تھے۔ وہ اہم تھا۔ بتانے والا نہیں ہے۔ ان 38 دنوں میں ہمیں تو اپنی ذات کی بھی خبر نہیں تھی۔ یہ معلوم تھا کہ ملٹری میں کیا ہو رہا ہے۔ اور جب ہم امریکہ واپس پہنچے۔ تو یہ قریباً پولیس اسٹیٹ بن چکا تھا۔ زندگی معمول کی نہیں رہی تھی۔ 38 دن بعد دنیا ہی بدل گئی تھی۔ میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ سیکورٹی کے پیش نظر اب باقی زندگی جنگی حالت میں رہے گی۔ خفیہ معلومات حاصل کی جائیں گی۔ نگرانی ہوگی۔ وہ جذباتی ہو رہے ہیں۔ سب امریکی فوج کی حمایت کرتے ہیں۔ لیکن وہ صدر بش کی خارجہ پالیسی کے حامی نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فوج صحیح طور پر جانتی ہے کہ کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے۔ وہ بتا رہے ہیں کہ ہم 1998ء میں کراچی کے پاس کھلے سمندر میں کھڑے تھے۔ ہمیں اسامہ بن لادن کے بارے میں معلومات تھیں۔ لیکن اس وقت ہم نے حملہ نہیں کیا۔ وہی وقت تھا۔ اب ہم میزائیل پھینک رہے ہیں۔ ہم کہاں تک جاسکتے ہیں۔ توازن آخر کہاں ہے۔ جنگ در جنگ جاری ہے۔ دہشت گردی جاری ہے کچھ علم نہیں کہ ہم اسے کیسے روک سکیں گے۔ اگر کچھ محفوظ رہے گا تو کیا ہم سیز فائر کریں گے کیا سیز فائر کے بعد ہم محفوظ رہیں گے۔ اس نوجوان امریکی فوجی کی آنکھوں میں خوف بھی ہے۔ اور اشتعال بھی۔ اور وہ بہت زیادہ متذبذب لگ رہا ہے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس عمر کے امریکیوں کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی۔

اب یہ بات چل پڑی ہے کہ امریکہ، سعودی عرب سمیت دوسری عرب بادشاہتوں اور امارتوں میں اتھارٹی کا ساتھ دیتا رہا۔ کبھی اس وقت جمہوریت کی بات نہیں کی۔۔ صدام حسین سے بھی امریکہ کی دوستی رہی۔ رمسفیلڈ اور صدام کا آپس میں یارانہ تھا۔ سعودی شہزادوں سے گہرے تعلقات تھے۔ اسامہ بن لادن بھی امریکہ کا دوست تھا۔ اور اب یہ نوبت آ گئی ہے کہ ایف بی آئی کی رپورٹ سے سعودی وزیر خارجہ کو کلاسیفائیڈ انفارمیشن (خفیہ معلومات) والے صفحات نہیں دیئے جا رہے ہیں۔ کیا امریکہ کی یہ پالیسی دانشمندانہ اور متوازن ہے۔ صدام حسین نے 3000 سے زیادہ لوگ ہلاک کیئے۔ اس وقت ہم اس کا ساتھ دیتے رہے۔

جب یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ تو کیا 2004ء میں صدارتی الیکشن متاثر ہوں گے۔ اس پر یہاں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے خواتین وحضرات میں سے اکثر کا خیال ہے کہ صدر بش دوبارہ الیکشن جیت جائیں گے۔ ڈیموکریٹس میں کوئی قد آور شخصیت بھی نہیں ہے۔ پھر حب الوطنی کا جذباتی پہلو غالب رہے گا کہ صدر بش نے بڑی ہمت کی ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ بڑے حوصلے سے جاری رکھی ہے۔

بوسٹن گلوب کے دفتر میں چند لمحے

امریکیوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہم جنوبی ایشیائی ایڈیٹرز کو کسی اخبار کے دفتر میں بھی لے جائیں گے۔ واشنگٹن اور نیویارک میں تو اسکا انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ یہاں ''بوسٹن گلوب'' سے وقت طے ہوا ہے۔ بوسٹن گلوب نیویارک ٹائمز کمپنی کا ایک ذیلی ادارہ ہے۔ روزانہ اشاعت ہمارے پروگرام کے کتابچے میں پانچ لاکھ سے اوپر بتائی گئی ہے۔ اتوار کو یہ آٹھ لاکھ تک جا پہنچتی ہے۔

ہماری ملاقات اخبار کے فارن ایڈیٹر جیمز سمتھ سے ہو رہی ہے۔ بلڈنگ کا استقبالیہ بہت پرشکوہ، چھت بہت اونچی، خالی جگہ بہت، صرف ایک میز کرسی، استقبالیہ پر مامور ایک صاحب اور ایک طرف سیکورٹی۔ دیوار پر اخبار کی تاریخ جلی لفظوں میں، اور ایک طرف اخبار کے بانی کے کوائف۔

جیمز سمتھ استقبالیہ میں ہی مل گئے ہیں۔ وہ بتا رہے ہیں کہ امریکہ میں سرکولیشن کے اعتبار سے یہ اخبار تیرھویں نمبر پر ہے۔ وہ اس کی اشاعت روزانہ 475000 بتا رہے ہیں۔ اتوار کو 700000 ہو جاتی ہے۔ ایشیا کے لیے بیورو ہانگ کانگ میں ہے۔ دوسرے غیر ملکی بیورو، ماسکو، مانٹریال، یروشلم، لاطینی امریکہ میں ہیں۔ ایک بیورو اب جوہانسبرگ جنوبی افریقہ میں کھولا گیا ہے۔ دہلی میں باقاعدہ نمائندہ ہے۔ پاکستان اور افغانستان کے لیے نامہ نگار ہے جو اسلام آباد

میں مقیم ہے۔

وہ بتا رہے ہیں کہ ہمارے قارئین نئی ابھرتی ہوئی مارکیٹوں کے بارے میں پڑھنا چاہتے ہیں اس لیے ہم اس کے مطابق ہی اپنی ترجیحات کا تعین کرتے ہیں۔ ہمارے علاقے میں ساری بڑی یونیورسٹیاں ہیں۔ تعلیم کا معیار بہت بلند ہے۔ اس لیے ہمیں اعلیٰ سطحی قارئین کے مزاج کو سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ زیادہ تر اخبارات تو گیارہ ستمبر کے بعد بین الاقوامی خبروں کی طرف راغب ہوئے۔ ہم تو 1980ء اور 1990ء کے عشروں میں بھی غیر ممالک کے بارے میں خبریں اور مضامین دے رہے تھے۔ مشرق وسطیٰ میں ہمارے نمائندے اور فوٹوگرافر اکثر جاتے رہے ہیں۔ اسرائیل اور فلسطین سے ہمارے اپنے نمائندوں کی خبریں ہمیشہ شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ہم بیماریوں کے حوالے سے بھی افریقہ اور لاطینی امریکہ کی رپورٹیں دیتے رہتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ ہماری سب سے زیادہ ریڈرشپ اسپورٹس کے صفحات کی ہے۔ دس بجے رات تک کی خبریں ہم اخبار میں شامل کرتے ہیں۔ اس کے بعد اگر کوئی خبر لی جاتی ہے تو وہ عام طور پر اسپورٹس ہی کی ہوتی ہے۔

اپنا معمول وہ یہ بتا رہے ہیں کہ وہ صبح سویرے اٹھ کر تمام اخبارات کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں۔ پھر نیشنل پبلک ریڈیو سنتے ہیں۔ اس کے بعد بی بی سی 9 بجے صبح کا بلیٹن سن کر وہ غیر ممالک میں اپنے نمائندوں کو فون کرتے ہیں۔ صورت حال بھی پوچھتے ہیں ان کی ڈیوٹی بھی لگاتے ہیں۔ ساڑھے دس بجے صبح ایڈیٹر کے ساتھ میٹنگ ہوتی ہے۔ جس میں تمام ادارتی شعبوں کے سربراہ شریک ہوتے ہیں۔

ہمارے پوچھنے پر وہ بتا رہے ہیں کہ بوسٹن میں ان کے رپورٹرز کی تعداد 60 کے قریب ہے۔ جن میں عام شہروں کی کوریج کرنے والے شامل ہیں۔ سرکاری محکموں، سیاسی پارٹیوں، کاروبار، تجارت، اسپورٹس زندگی کے مختلف اطوار۔ آرٹس، فنون لطیفہ، سبھی دلچسپیاں خاص طور پر دیکھی جاتی ہیں۔ واشنگٹن بیورو میں ان کے دس رپورٹر ہیں۔ نیویارک، سان فرانسسکو اور دیگر ریاستی دارالحکومتوں میں بھی اسٹاف موجود ہے۔ مشرق وسطیٰ میں ہر وقت دو

رپورٹر موجود رہتے ہیں۔

ساڑھے 3 بجے سہ پہر ایڈیٹر مختلف شعبوں کے سربراہوں کے ساتھ میٹنگ کرتے ہیں اور یہ جائزہ لیا جاتا ہے کہ اب تک کون کون سی خبریں آچکی ہیں۔ کیا کیا واقعات ہوئے ہیں۔ کون سے واقعات ابھی تک آگے بڑھ رہے ہیں۔ تصویریں کون کون سی ہیں۔ اس میٹنگ میں ہم بھی شریک ہیں۔ یہ لوگ اپنی خبروں کو بجٹ قرار دے رہے ہیں۔ صفحہ نمبر 1 کے انچارج اپنی خبریں بتا رہے ہیں۔ ہر شعبے نے اب تک کی خبریں بتائی اور یہ طے ہو رہا ہے کہ کیا ڈسپلے ہوگا۔ کیا سائز ہوگا۔ آخر میں فوٹو ایڈیٹر اپنی تصویریں اسکرین پر دکھا رہی ہیں۔ اور یہ مشاورت ہو رہی ہے کہ یہ تصویر کہاں اور کتنے کالم شائع ہونی چاہیئے۔ اس میٹنگ کے ذریعے تمام صفحات کے انچارجوں کے علم میں آجاتا ہے کہ کیا کیا چھپ رہا ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں صفحہ انچارج صرف اپنے صفحے کے مندرجات سے باخبر ہوتا ہے۔ اس میٹنگ میں کل 18 افراد شریک ہیں جن میں ایڈیٹر کے علاوہ فارن ایڈیٹر، ڈپٹی فارن ایڈیٹر، ڈپٹی نیشنل ایڈیٹر، سٹی ایڈیٹر، صحت، سائنس، بزنس اسپورٹس کے انچارج، گرافکس اور فوٹو ایڈیٹر نمایاں ہیں۔ اس میٹنگ کے بعد صفحے تیار کیے جاتے ہیں۔ یہ بتا رہے ہیں کہ ساڑھے سات بجے شام ڈسک سے سب کچھ کاپی ڈسک میں چلا جاتا ہے۔ پہلا ایڈیشن (ہمارے ہاں انہیں ڈاک ایڈیشن کہتے ہیں) ساڑھے نو بجے پریس میں چلا جاتا ہے۔ دوسرا 30-10 تیسرا 12 بجے اور لیٹ ایڈیشن یا سٹی فائنل 1.30 بجے شائع ہو جاتا ہے۔ زیادہ تر ایڈیشن ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ کسی دن کوئی بڑی خبر آجائے تو تبدیلیاں ہوتی ہیں ورنہ بالعموم کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اضافہ اگر ہوتا بھی ہے تو اسپورٹس کی خبروں میں۔ جیمز سمتھ عام طور پر 7.30 بجے شام گھر واپس چلے جاتے ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ کیا حکومت کی طرف سے پالیسی یا خبروں میں مداخلت ہوتی ہے۔ وہ بڑا خوبصورت جواب دے گئے ہیں کہ ہمیں کسی مداخلت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ بلکہ بڑی نفاست سے اپنے موقف کا غلبہ کروایا جاتا ہے ہم اپنی ویب سائٹ کو لمحہ لمحہ اپ ڈیٹ کرنے کی شہرت نہیں رکھتے۔

ایک سوال کے جواب میں وہ کہہ رہے ہیں کہ کسی خبر کے سلسلے میں اگر شک وشبہ ہو تو ہم خبر کے بارے میں اپنے رپورٹر سے بات کرتے ہیں اور اسے اپنے ذریعہ سے دوبارہ بات

کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ ساڑھے تین بجے کی میٹنگ اخبار کا نقشہ مرتب کر دیتی ہے۔ ہمارے ہاں کی طرح یہ نائٹ شفٹ میں اور اصل شفٹ بلکہ لیٹ نائٹ تو بہت کم لوگ رکھتے ہیں۔ عام طور پر اخبار ساڑھے دس بجے تک مرتب ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد زیادہ تر ایڈیشن پہلے ایڈیشن کی بنیاد پر نکلتے ہیں۔ اور تمام مرکزی اسٹاف ساڑھے دس بجے چلا جاتا ہے۔ حساس خبروں کے لیے ایڈیٹر حضرات کمپیوٹر پر رابطہ رکھتے ہیں۔

دفتر میں میٹنگ روم بڑی تعداد میں بنائے گئے ہیں۔ ایک میٹنگ روم ایسا ہے جہاں سارا ادارتی اسٹاف بیک وقت بھی بیٹھ سکتا ہے۔

اخبار کی لائبریری بھی بہت وسیع و عریض ہے۔ اس کے علاوہ اپنا ریکارڈ بھی بہت بڑی تعداد میں محفوظ رکھا گیا ہے۔

یہ میٹنگ پیشہ ورانہ اعتبار سے کم از کم میرے لیے تو بہت مفید رہی ہے۔ میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔

جنگ ہوتو معیشت بحال ہوجاتی ہے

ہمیں بتایا گیا ہے کہ اگست میں منگل کی شامیں زیادہ سرگرمیاں نہیں رکھتی ہیں۔ ہمیں موقع دیا گیا کہ ہم اپنے اپنے پروگرام بناسکتے ہیں۔ بوسٹن کامن میں میکبتھ اوپن ایئر چل رہا ہے اور مفت ہے۔ دوسرا پروگرام یہ ہوسکتا ہے کہ ہم کسی لانچ میں بیٹھ کر سمندر میں نکل جائیں۔ میں نے سمندر کا انتخاب کیا ہے۔ جولیانہ بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ بھارت کے تمل ہیں۔ ٹکٹ اپنے اپنے خریدنے پڑتے ہیں کہ یہ ہمارے زاد راہ میں شامل کیے گئے تھے۔ بنگلہ دیش کے ضمیر ہیں۔ پاکستان کے عرفان صدیقی ہیں۔ افغانستان کی شکریہ اپنے کسی عزیز کی طرف گئی ہیں۔ یہ بندگارہ اور سمندر امریکہ کی تاریخ میں اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ انقلاب یہیں سے شروع ہوا تھا۔ لانچ چلتی ہے۔ تو ایک گائیڈ کی آواز بھی ساتھ ہی ابھرتی ہے۔ اور وہ اس سمندر اور بندرگاہ کی تاریخ سناتی رہتی ہے۔ کب کیا ہوا ہے۔ بچے بھاگ رہے ہیں۔ جوڑے بھیگے ہوئے موسم کا لطف اٹھارہے ہیں۔ سینئر شہری اپنی عمر کے آخری لمحوں میں مزید یادیں سمیٹ رہے ہیں۔ سمندر جب بھی بلاتا ہے تو یہ لمحے آپ کی زندگی کے چند خوبصورت واقعات میں سے ہوتے ہیں۔ سمندر کی آواز سننی چاہیئے۔ بلکہ وقت ہوتو اس سے ہم کلام ہونا چاہیئے۔ آپ کو خود اپنے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوسکتا ہے۔ کبھی کسی شام سمندر کنارے جابیٹھئے۔ اور سورج کو دور کہیں لہروں میں اترتے اور ڈوبتے ہوئے دیکھئے۔ آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ خود اپنی ہستی میں کھو گئے ہیں۔

کیا عجب کہ وہ گوہر مقصود آپ کو مل جائے۔ جس کی تلاش آپ کو مدتوں سے تھی۔

رات گئے ہم سمندری سفر سے واپس ہورہے ہیں۔ کچھ اور مسافر اسی خوبصورت سفر کے لیے آرہے ہیں۔ یہ سلسلہ شب وروز چلتا ہے۔

ایک نئی صبح، نئے عزائم، بوسٹن میں یہ ہمارا آخری دن ہے۔ ہم نے گزارش کی تھی کہ 11 ستمبر کے بعد امریکی معیشت میں جو اتار چڑھاؤ آئے ہیں۔ ان کے بارے میں بھی کچھ معلوم ہوجائے تو اچھا ہے۔ اس میں زیادہ دلچسپی تمل کو تھی کیونکہ ان کا اخبار ''بزنس اسٹینڈرڈ'' ہے ہی معیشت سے متعلق۔ آج اس کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے۔ ایسٹرن بینک کے چیف اکنامسٹ اور سینئر پریذیڈنٹ جان میئر، کو زحمت دی گئی ہے کہ وہ ہماری معلومات کو مکمل کریں۔ ان کے ہمراہ ہیں جان مارکس۔ فارن ایکسچینج ڈیپارٹمنٹ کے۔ موضوع ہے'' معیشت پر گیارہ ستمبر کا اثر'' ایسٹرن بینک گریٹر بوسٹن میں چوتھا بڑا ہمہ خدمت کمرشل بینک ہے۔ 1818ء میں اس کا آغاز ہوا تھا۔ ساڑھے چار بلین ڈالر کے اثاثے رکھنے والا یہ بینک نیو انگلینڈ میں باہمی ملکیت کا سب سے بڑا، اور خودمختار ادارہ ہے۔ اپنے گاہکوں، ملازموں اور کمیونٹی کی خدمات پر توجہ مرکوز رکھتا ہے۔ بوسٹن میں ہیڈ کوارٹر ہے۔ اور نیو بری پورٹ سے براکٹن تک 50 شاخیں ہیں۔

جان ڈبلیو بیٹیز بینک کے سینئر وائس پریذیڈنٹ ہیں۔ اور ایسٹرن انوسٹمنٹ ایڈوائزرز کے چیف انوسٹمنٹ آفیسر ہیں۔ جو ایسٹرن بینک کا ٹرسٹ اور انوسٹمنٹ مینجمنٹ ڈویژن ہے۔ اس ڈویژن کے لیے انوسٹمنٹ کی پالیساں، اور حکمت عملی ترتیب دینا اور ان پر عملدرآمد جان کی ذمہ داری ہے۔ وہ 1984ء سے اس بینک کے ساتھ ہیں۔ پہلے کئی دوسرے اہم بینکوں سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ معیشت کی روداد بتانے کے لیے وہ اکثر نیو انگلینڈ کیبل نیوز، سی این بی سی، بوسٹن کے بزنس ریڈیو ڈبلیو بی آئی ایکس پر مبصر کی حیثیت سے آتے رہتے ہیں۔ معیشت وتجارت کے سلسلے میں ان کے کئی مضامین اور انٹرویوز اس علاقے کے تجارتی رسائل اور اخبارات میں شائع ہوچکے ہیں۔ وہ جان ولے اینڈ سنز انکارپوریشن نیویارک کی ایک مشہور کتاب'' بینک اثاثوں اور واجبات کی کامیاب انتظامیہ'' Succeful Bank Asset/Liabilty

Management کے پہلے مصنف بھی ہیں۔

ہم اب تک یہ سمجھتے آ رہے ہیں کہ ماحول میں کشیدگی ہو۔ ہنگامی حالات ہوں تو معیشت بیٹھ جاتی ہے۔ لیکن یہاں ہمیں بالکل ہی نئی باتیں سننے کو مل رہی ہیں۔ وہ بتا رہے ہیں۔ کہ 11 ستمبر کی دہشت گردی سے پہلے معیشت روبہ زوال تھی۔ خریداروں کا اعتماد کمزور ہورہا تھا۔ پھر جب یہ واقعات ہوئے تو ایک ٹھہراؤ آ گیا۔ خریداروں کا اعتماد بحال ہوا جب صدر امریکہ نے افغانستان میں جنگی کاروائی کا اعلان کیا تو معیشت بحال ہونا شروع ہوگئی۔ زبردست خریداری ہوئی۔ اسی طرح عراق پر حملے سے پہلے پھر اعتماد گرنا شروع ہوا۔ حملہ ہوگا یا نہیں۔ بے یقینی مارکیٹ کو متاثر کررہی تھی۔ لیکن امریکی برطانوی فوجوں نے حملے شروع کیے۔ تو اعتماد تیزی سے اوپر جانے لگا۔ وہ اپنے ان تبصروں کو گراف اور سلائیڈز کی مدد سے بھی ظاہر کررہے ہیں۔ یہ گراف آپ کی دلچسپی کے لیے میں بھی یہاں شامل کررہا ہوں۔

معیشت ہمارا مضمون نہیں رہا ہے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ آج کی سیاست اور تمام جوڑ توڑ کی بنیاد اکنامکس ہی ہے۔ اس لیے سمجھنا تو چاہیئے، وہ ہمیں قائل کررہے تھے کہ گیارہ ستمبر کے فوراً بعد جب کچھ واضح نہیں تھا تو بازاروں میں خریداروں کی آمد قریباً ختم ہوگئی تھی۔ یعنی کاروبار رک گیا تھا۔ جب افغانستان پر حملہ ہوا۔ جنگ شروع ہوئی۔ تو خریداری بڑھ گئی۔ لوگوں کو خوف ہوتا ہے کہ جنگ کے بعد مارکیٹ سے اشیائے ضرور یہ غائب نہ ہوجائیں۔ تو وہ زوروں سے خریداری شروع کردیتے ہیں۔ اسی طرح جنگ میں مصروف حکومتیں بھی دفاعی خریداریاں کرنے لگتی ہیں۔ اس لیے جنگی صورت حال میں بازار گرم ہوجاتے ہیں۔ اسٹاک ایکسچینج میں بھی یہی ہوتا ہے۔ جنگ شروع ہو تو اس کے انڈیکس بڑھنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ اگر جنگیں طویل ہوجائیں تو اس کا اثر بھی منفی ہوتا ہے۔ جب آپ مسلسل دفاعی اخراجات کررہے ہوں تو آپ سڑکوں، تعلیم اور صحت پر خرچ نہیں کررہے ہوتے۔ اس طرح آپ کا انفراسٹرکچر ترقی نہیں کرتا۔ وہ بتا رہے ہیں کہ مسلسل دفاعی اخراجات نے روس کو تباہ کیا۔

میں یہ سنتے سنتے وطن واپس پہنچ گیا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ ہم تو کب سے جنگ لڑنے میں مصروف ہیں۔ 1948ء سے کشمیر کے لیے لڑ رہے ہیں۔ 1978ء سے افغانستان کے

لیے، یوں ہمارے دفاعی اخراجات مسلسل جاری ہیں۔ یہیں مجھے یہ احساس ہورہا ہے۔ اور مجھ پر یہ منکشف ہورہا ہے کہ ہمارا انفراسٹرکچر کیوں ترقی نہیں پاسکا۔ اور یہ ہماری ضروریات کے مطابق کیوں نہیں ہے۔ ہماری بڑی چھوٹی سڑکیں ساتھ ساتھ کیوں نہیں بن سکی ہیں۔ اب تک اکثر علاقوں میں جانے سے اس لیے گریز کیا جاتا ہے کہ اچھی ہموار پختہ سڑکیں نہیں ہیں۔ سیاحت کیوں ترقی نہیں کرسکی ہے۔ پرفضا مقامات تک جانے کے لیے سڑکیں نہیں ہیں، تاریخی مقامات، آثار قدیمہ تک جانے کے لیے پختہ راہیں نہیں ہیں۔ اسی طرح تعلیم ہمارے ہاں پوری طرح نہیں پھیل سکی ہے۔ شرح خواندگی کم ہے۔ کیونکہ جب پیسہ دفاع پر خرچ ہورہا ہے۔ تو تعلیم کے لیے نہیں نکل سکتا۔ لوگ پڑھ نہیں رہے۔۔ ان کے ذہن روشن نہیں ہورہے ہیں۔ ان کو اپنے آپ پر اعتماد نہیں۔ سر اٹھا کر نہیں کھڑے ہوسکتے۔ اسی طرح صحت پر بھی پورے اخراجات نہیں ہورہے ہیں۔ سرکاری ہسپتال کم ہیں۔ ڈسپنسریاں ہیں۔ ڈاکٹر نہیں ہیں دوائیں نہیں ہیں۔ کیونکہ اس کے لیے بجٹ کم ہے۔ پیسہ کم ہے کیونکہ اتنے برسوں سے مسلسل دفاع پر اخراجات ہورہے ہیں۔

اپنی غربت، بدحالی اور پسماندگی کے حقیقی اسباب میرے ذہن میں یہاں ہزاروں میل دور بیٹھے نظر آرہے ہیں۔ اگر ہمیں خوشحال ہونا ہے۔ تعلیم کی روشنی میں اضافہ کرنا ہے۔ صحت کی سہولتیں معقول کرنا ہیں تو ہمیں جنگی صورت حال ختم کرنا ہوگی، دفاعی اخراجات کم کرنے ہوں گے۔

ادھر جان بٹلر بتا رہے ہیں کہ گیارہ ستمبر نے سب سے زیادہ فضائی کمپنیوں کی صنعت کو متاثر کیا ہے یہاں اعتماد اب تک بحال نہیں ہوسکا۔ ٹریول انڈسٹری مایوس کن ہیں۔ ہوٹلوں کی دنیا میں بھی مایوسی ہے۔ بینک مدد کے لیے تیار ہیں۔ گزشتہ چند ماہ سے انحطاط کچھ کم ہوا ہے۔ لیکن پوری طرح بحالی نہیں ہوئی ہے۔

وہ بتا رہے ہیں کہ صدر بش نے 2001ء میں ٹیکس میں کٹوتی دی۔ جس سے بہت مدد ملی۔ اس لیے گیارہ ستمبر کا زیادہ منفی اثر نہیں پڑا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ گیارہ ستمبر کا اثر دور کردیا گیا ہے لوگوں کے پاس پیسہ

ہے۔ اور نسبتاً پہلے سے زیادہ ہے۔ اسی لیے اب حکومت نے بچوں کے لیے 400 ملین کا چیک بھی جاری کردیا ہے۔ وہ پھر اپنا تجزیہ دہرا رہے ہیں کہ تنازع اور تصادم ہو تو معیشت آگے بڑھتی ہے۔ کلنٹن کے دور میں معیشت کی ترقی بے مثال تھی۔ بغیر کسی مداخلت کے اکنامی آگے بڑھ رہی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ اسٹاک مارکیٹ کو بے یقینی سے نفرت ہے۔ کسی قسم کی بھی بے یقینی ہو تو یہ گرنے لگتی ہے۔ یا رُک جاتی ہے۔ معیشت بھی نفسیات رکھتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دو سے اڑھائی فی صد تک افراط زر تو رہنی چاہیئے۔ فیڈرل بینک یہاں مجبور کر رہا ہے۔ ریٹ کم کرنے پر۔ یورپی یونین بھی سنٹرل بینک کو ریٹ کم کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ اب کافی کم کردیا ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ فیڈرل بینک بالکل غیر متعلق ہوجائے گا۔ تیل کو محفوظ کیا جارہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یورپی یونین خود محسوس کرے گی کہ یورو کی قیمت گرے۔ ورنہ مسائل پیدا ہوں گے۔ امریکہ اب بھی سب سے طاقتور معیشت ہے یورپ ہم سے پیچھے ہے۔

ان کے تجزیے کے بعد ہم ان سے کہہ رہے ہیں کہ اس میں تو یہ لگتا ہے کہ اکنامی کو بہتر کرنے کے لیے آپ نے نائن الیون خود کروایا ہے۔ اگر معیشت تصادم اور تنازع سے ترقی کرتی ہے۔ افغانستان اور عراق پر حملے سے امریکی معیشت ترقی کرتی ہے تو امریکہ یقیناً اور ملکوں پر بھی حملہ کرے گا۔ تاکہ اس کی معیشت ترقی کرتی رہے۔ وہ کہہ رہے ہیں بات تو درست ہے۔ لیکن یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں ہے کہ امریکہ معیشت بہتر کروانے کے لیے لڑائیاں کرتا رہے گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جنگ کی کاروائی ہونے سے پہلے بے یقینی رہتی ہے۔ جنگ شروع ہوجائے تو بے یقینی ختم ہوجاتی ہے کیونکہ ایک فیصلہ ہوجاتا ہے۔

گفتگو میں ہی اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ میں ٹریژری ریٹ بڑھ رہا ہے۔ اس وقت دنیا میں 25 کے قریب ابھرتی ہوئی مارکیٹیں ہیں۔ مارکیٹ کے استحکام کے لیے قانونی استحکام ضروری ہے۔ بھارت کو بھی وہ ابھرتی ہوئی مارکیٹ قرار دے رہے ہیں۔ تعلیم کی شرح بہتر ہو رہی ہے۔ امریکی سرمایہ وہیں جارہا ہے۔ جہاں مزدور سستے ہوں۔ امریکہ میں اب بہت سی چیزوں کی مارکیٹ میں ضرورت نہیں ہیں لیکن مینوفیکچرنگ ہو رہی ہے۔ اس لیے یہ چیزیں ہمیں دوسروں ملکوں میں لے جانی پڑیں گی جیسے ٹیلی ویژن سیٹ ہیں۔ یہاں صارف مطمئن ہیں۔ اسے مزید

چیزیں نہیں چاہئیں۔

ان کا کہنا ہے کہ کساد بازاری Recession اب باضابطہ طور پر ختم ہوچکی ہے۔ نیشنل بیورو آف اکنامک ریسرچ ماہرین معیشت کا ایک گروپ ہے۔ جیسے امریکہ میں اقتصادی کساد بازاری کے آغاز اور خاتمے کی تاریخوں کی نشاندہی کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ انہوں نے حال ہی میں اعلان کیا ہے کہ کساد بازاری جو مارچ 2001ء میں شروع کی گئی تھی۔ وہ آٹھ ماہ بعد ختم ہوگئی۔ نومبر 2001ء سے اقتصادی بحالی کچھ ناہموار اور سست تھی اس سلسلے میں جو کوششیں کی گئیں اور مالیاتی محرکات دیئے گئے، جن میں گھروں اور کاروں کی ریکارڈ فروخت بھی شامل ہے۔ وہ مضبوط اقتصادی نمو تخلیق کرنے میں ناکام رہے۔ حقیقی مجموعی ملکی پیداوار 4ء2 فی صد کی درمیانی شرح سے اس سہ ماہی میں بڑھ سکی، جبکہ اس سے پہلی دو سہ ماہیوں میں یہ 4ء1 فی صد کی سست رفتار پر رہی۔ اس لیے یکم جولائی سے ٹیکس میں کٹوتی دے کر معیشت کو کچھ تحریک دی گئی۔ ہماری یہ گفتگو اگست 2003ء میں ہو رہی ہے۔ ان کے پاس 31 جولائی 2003ء تک کے اعداد و شمار ہیں اور ان کو امید ہے کہ سال رواں کے دوسرے حصے میں اقتصادی سرگرمیوں کی رفتار تیز ہوگی۔ صارفین کی خریداری جو دوسری سہ ماہی میں 3ء3 فی صد کی شرح سے بڑھی۔ وہ تیسری سہ ماہی میں گھروں کے رہن، اور سروسز فنانسنگ سے آگے بڑھے گی۔

ان کا کہنا ہے کہ موجودہ بحالی میں سب سے مایوس کن شعبہ سرمایے کا خرچ رہا ہے۔ اگر کاروبار میں انحطاط ہو۔ تو یہ حلقہ لامتناہی عرصے تک اپنے خرچے ملتوی نہیں کرسکتا۔ نتیجتاً سازو سامان فرسودہ ہوتا رہتا ہے اور سافٹ ویر آثار قدیمہ ہوجاتا ہے۔ پہلی سہ ماہی میں کاروباری حلقے کا خرچ 4ء4 فی صد تک گر جانے کے بعد دوسری سہ ماہی میں 9ء6 فی صد تک بڑھ گیا۔ سازوسامان اور سافٹ ویئر کی خریداری 5ء7 فی صد کی شرح تک جا پہنچی، آخر میں وہ توقع کر رہے ہیں کہ امریکہ کی معیشت اپنی طویل المیعاد ممکنہ شرح نمو حاصل کرلے گی۔ جو 5ء3 فی صد سے 4 فی صد کے درمیان ہوگی۔

بوسٹن کے اسلامک سینٹر میں

امریکی معیشت کی تیز رفتاری کی خبریں سننے کے بعد اب ہمارا رخ بوسٹن کے اسلامک سینٹر کی طرف ہے۔ ہمیں وہاں کے امام سے تبادلہ خیال کے ذریعے یہ جاننا ہے کہ یہاں مسلمانوں کے شب و روز کیسے ہیں۔ مساجد کی صورت حال کیا ہے۔ وہ بتارہے ہیں کہ بوسٹن میں 70 ہزار مسلمان ہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد بعض چلے بھی گئے ہیں لیکن پھر بھی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے۔ امام دسیوتی نخیلہ مصر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جامعۃ الازہر کے فارغ التحصیل، 5 سال سے بوسٹن میں مقیم ہیں۔ اسلامک سوسائٹی آف بوسٹن (آئی ایس بی) 1981ء میں قائم کی گئی تھی۔ جب اس علاقے کے لیے مسلمانوں نے ضرورت محسوس کی کہ اپنا اسلامی تشخص برقرار رکھنے، دینی شعائر کی ادائیگی کی خاطر جمع ہونے کے لیے کوئی جگہ ہونی چاہیے۔ آغاز تو مساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں ایک ہال مخصوص کرنے سے ہوا۔ جہاں پانچ وقت روزانہ نماز، جمعہ اور ہفتہ وار کلاسز منعقد کی گئیں۔ جیسے وقت گزرا مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو آئی ایس بی نے ضروری سمجھا کہ ایک وسیع تر مقام ہونا چاہیے۔ موزوں جگہ کی تلاش ہوئی۔ کیمبرج کے مضافات میں بالآخر جگہ ڈھونڈ لی گئی۔ مسلم برادری نے دریا دلی کا مظاہرہ کیا۔ اور اس مقام کو اسلامک سوسائٹی آف بوسٹن میں تبدیل کردیا گیا۔

امام بتارہے ہیں کہ ہر نماز میں سو کے قریب خواتین و مرد آتے ہیں۔ جمعہ کو یہ تعداد

ایک ہزار ہوجاتی ہے۔ اس وقت بوسٹن میں سات یا آٹھ مساجد ہیں۔ عید پانچ مقامات پر ہوتی ہے۔ جہاں قریباً ہر مقام پر 10 ہزار نمازی آتے ہیں۔ عید قربان پر ذبیحہ کا بھی انتظام ہوتا ہے۔ اس وقت 7 مکمل اوقات کے ہائی اسکول چل رہے ہیں۔ جہاں اسلامی تعلیمات اور حفظ قرآن کا اہتمام بھی ہے۔

امریکہ کی معاشرتی ضروریات کے مطابق مسلمانوں کو تربیت دینے کے لیے مختلف تنظیموں کی طرف سے لیکچرز کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جن میں فریم فاؤنڈیشن، سول رائٹس، آئی سی این اے، آئی ایس این اے اور کئیر نمایاں ہیں۔ ایسے لیکچرز کے دوران مرد اور خواتین دونوں شریک ہوتے ہیں۔

امام صاحب بتارہے ہیں کہ ایک ہماری Outreach Committee بیرونی رسائی کمیٹی ہے، جس کا مقصد دوسرے مذاہب سے رابطہ رکھنا ہے۔ ہم ایک اوپن ہاؤس (کھلا اجتماع) منعقد کرتے ہیں۔ جس میں سب مذاہب کے ماننے والے نمایاں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ عیسائی، یہودی اور بدھ مت وغیرہ جو بھی یہاں بوسٹن میں ہیں۔ عام طور پر 800 کے قریب تعداد ہوجاتی ہے۔ مختلف امور پر کھل کر بات ہوتی ہے۔ اسلام کے بارے میں سوالات کیے جاتے ہیں جن کا ہم جواب پورے اعتماد سے دیتے ہیں۔

انٹرفیتھ۔ (بین العقائد) کے تحت باقاعدہ میٹنگیں ہورہی ہیں۔ امام صاحب نے یہ دلچسپ بات بھی بتائی ہے کہ موجودہ کشیدگی اور مسلمانوں پر دباؤ کے باوجود اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے۔ اس کی محض وجہ یہ ہے کہ وہ جب یہاں مسلمانوں کا رہن سہن دیکھتے ہیں۔ انہیں اپنے عقائد پر عمل پیرا بھی پاتے ہیں۔ کام میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ ان کے خاندانی حالات بھی اطمینان بخش ہیں۔ اس لیے پریشان حال غیر مسلم اسلام کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ جمعرات کو ایک کلاس صرف نومسلموں کے لیے رکھی گئی ہے۔

گیارہ ستمبر کے بعد چونکہ ہنگامی حالات رہے ہیں۔ اس لیے سٹی کونسل سے ہمارا رابطہ رہا ہے۔ ان واقعات کے فوراً دو ہفتے بعد مسلم کمیونٹی کی مدد کے لیے ایک ادارہ قائم کیا۔ جس کے ارکان کی تعداد 1500 ہوگئی تھی۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم سب شامل تھے۔ اس ادارے کی اپنی

ویب سائٹ تھی۔ جس پر تمام معلومات اور اطلاعات موجود تھیں۔ کسی مشکل صورت میں ان سے فوراً رابطہ کیا جاسکتا تھا۔

ہم دریافت کررہے ہیں کہ اسلامک سوسائٹی آف بوسٹن بچوں اور خواتین کے تربیت کے لیے کیا کررہی ہے۔ امام ابونجیلہ بتارہے ہیں کہ تدریسی پروگرام تو اپنی جگہ ہیں۔ اس کے علاوہ سماجی سرگرمیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ ایک شادی کونسل ہے۔ جو رشتے تلاش کرنے میں بھی مدد کرتی ہے اور شادی کی تقریب میں بھی معاونت کرتی ہے۔ ایک ریلیف کمیٹی ہے۔ مختلف ضروریات پورا کرتی ہے۔ مسلمانوں کے خاندانی مسائل میں تصفیے کے لیے بھی ایک کمیٹی مصروف عمل ہے۔ ایک کمیٹی غیر مسلموں سے رابطے کے لیے ہے۔ ایک کمیٹی اس مقصد کے لیے ہے کہ مختلف براعظموں سے آئے ہوئے مسلمانوں کو امریکی معاشرے میں جن تضادات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہاں وہ کیا کریں جس سے ان کا عقیدہ بھی محفوظ رہے۔ یہاں کے قوانین یا اختیار سے بھی تصادم نہ ہو۔ یہ سارے امور بہت حساس اور بہت ذمہ داری کے ہیں۔ امریکی میڈیا مسلمانوں کی مثبت خبریں نہیں دیتا۔ جس سے عام امریکی ناواقف رہتے ہیں۔ اس لیے ہم مختلف ذرائع سے امریکی برادری کو اپنی سرگرمیوں اپنی اقدار سے باخبر رکھتے ہیں۔

ایک سوال پر امام صاحب کہہ رہے ہیں کہ اسلام کے حوالے سے حقوق نسواں ایک اہم موضوع ہے۔ اس سلسلے میں یہاں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ انہیں دور کرنے کے لیے حقوق نسواں پر خصوصی کلاسز منعقد کی جاتی ہیں۔ اسلام میں خواتین کو جو خصوصی حیثیت اور عزت دی گئی ہے۔ اس سے آگاہ ہوکر بہت سی امریکی خواتین نے اسلام بھی قبول کیا ہے۔ ایک امریکی خاتون نے کہا کہ میں اپنے آپ کو بالکل غیر محفوظ سمجھتی تھی۔ جب میں نے اسلام میں خواتین کو دیا گیا مقام دیکھا تو میں مسلمان ہوگئی۔ اب مجھے وہ سب کچھ میسر ہے جو میں چاہتی تھی۔ مرد، خواتین یکساں ہیں لیکن ان کی ذمہ داریاں مختلف ہیں۔

گیارہ ستمبر کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے لیے تجسس بڑھ گیا ہے۔ بہت سے سوالات کیے جاتے ہیں۔ یہاں مقامی ٹی وی پر ہر ہفتے ایک گھنٹے کا پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں ان سوالات کے جواب دیے جاتے ہیں۔ سوال فون پر بھی ہوتے ہیں۔ ای میل سے بھی۔

ہمارے پوچھنے پر وہ بتارہے ہیں۔ کہ گیارہ ستمبر کے بعد صرف ایک یا دو واقعات ہوئے جب مسجد پر حملے کا خطرہ بڑھا۔ یا شہر میں کہیں مسلمانوں کو نشانہ بنایا گیا۔ ایسے میں کیمبرج پولیس ازخود آ گئی۔ اور دو پولیس افسروں کو بھی یہاں تعینات کردیا گیا۔ اس کے علاوہ الحمدللہ کبھی کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

امام صاحب کہہ رہے ہیں کہ یہ مرکز کرایے کی جگہ پر ہے۔ 10 ہزار ڈالر ماہانہ کرایہ ہے۔ اب نمازیوں کی تعداد بڑھ جانے کے بعد اور مزید تعلیمی پروگرام شروع کرنے کے لیے یہ جگہ کم پڑرہی ہے۔ اس لیے بوسٹن سٹی میں ایک جگہ دیکھ لی ہے۔ قریباً 7 ہزار مربع فٹ پر ایک بڑی مسجد تعمیر کی جارہی ہے۔ غیر مسلموں کے لیے بھی ایک ہال بنائیں گے۔ جہاں وہ آئیں بیٹھیں اور اسلام کے بارے میں جانیں۔

امام صاحب نے اس سلسلے میں ایک بروشر بھی دیا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ:

دی آئی ایس بی کلچرل سینٹر، تعمیر برائے مستقبل، گزشتہ چند برسوں سے بوسٹن اور اس کے آس پاس مسلمانوں کی آبادی میں ڈرامائی طور پر اضافہ ہوا ہے۔ تارک وطن طلبہ اور پروفیشنلز کی مسلسل آمد کے باعث اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب انتہائی متنوع مسلم کمیونٹی گریٹر بوسٹن میں 70 ہزار اور مساچوسٹس میں مجموعی طور پر ایک لاکھ تیس ہزار ہوگئی ہے۔ کمیونٹی میں اضافے کے پیش نظر ہم نے اس کی ضروریات پوری کرنے کے لیے متعدد کوششیں کی ہیں۔ مسجدیں تعمیر کی ہیں۔ اسکول قائم کیے ہیں۔ مختلف اقسام کی سماجی خدمات اور سیاسی تنظیموں کا بھی اہتمام کیا ہے اب ہمیں کمیونٹی کی ترقی کے لیے مرحلے کے لیے تیار ہونا چاہیئے۔ اب ہماری ذمہ داری ایسے اداروں کا قیام ہے۔ جو اسلام کو اس ملک کے سماجی تانے بانے کے ایک اٹوٹ انگ کے طور پر پیش کرسکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اسلامک سوسائٹی آف بوسٹن کلچرل سنٹر بنیادی کردار ادا کرے گا جہاں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے سہولتیں اور پروگرام دستیاب ہوں گے۔

اس بروشر کے مطابق اب وہ دن نہیں رہے جب گرجوں کے تہہ خانے، یا یونیورسٹی کلاس روم نمازیوں کے لیے کافی ہوتے تھے۔ ابھی ہر مسجد اور جائے نماز جمعہ کے روز کم پڑجاتی ہے۔ اور الحمد للہ ہماری برادری کمی کا کوئی اشارہ نہیں دے رہی ہے۔ نیا مرکز بیک وقت دو ہزار

نمازیوں کے لیے جگہ فراہم کرے گا۔ چونکہ یہ شہر کے مرکز میں واقع ہوگا۔ اس لیے انشاء اللہ بھرا رہے گا۔

ایک ایلمینٹری (ابتدائی) اسکول بھی قائم کیا جائے گا جہاں مسلمانوں کی نئی نسل کو ابتدائی اسلامی تعلیم اور تربیت دی جائے گی۔ تین منزلہ عمارت کے 16 کمروں میں 300 طلبہ و طالبات کو کنڈرگارٹن سے پانچویں گریڈ تک پڑھایا جائے گا۔ اپنے مذہب کی بنیادی تعلیمات ہمارے بچوں کو مستقبل کے تمام مراحل کا سامنا کرنے کے لیے معاون ثابت ہوں گی۔ ایک مکمل لائبریری بھی قائم کی جائے گی۔

یہاں کیفے ٹیریا اور ایک سوشل ہال بھی تعمیر کیا جائے گا۔ جس میں مسلم برادری کو شادی، عقیقہ اور دوسری تقریبات کے لیے عام طور پر اور رمضان میں افطار کے لیے خاص طور پر پوری سہولتیں میسر ہوں گی۔ اس طرح مسلم برادری پہلے سے زیادہ کثرت سے مل جل سکے گی۔ زیر زمین پارکنگ کی بھی سہولت ہوگی جہاں بیک وقت 100 گاڑیاں کھڑی کی جاسکیں۔ اسی طرح اپنی تعلیمات اور رسوم کے مطابق تدفین کے سلسلے میں بھی یہیں انتظامات ہوں گے۔ جس سے وہ پریشانیاں دور ہوجائیں گی جو اس وقت اس المناک صورت حال میں مختلف مقامات پر یہ رسوم ادا کرنے میں پیش آتی ہیں۔ بروشر میں یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ اسلامک سوسائٹی آف بوسٹن کا یہ ثقافتی مرکز بوسٹن کے روایتی انداز تعمیر اور اسلامی شناخت کا ایسا امتزاج ہوگا کہ یہ یہاں ے افق پر ایک نئے ستارے کی صرح چمکے گا۔ سیاحوں کے لیے بھی پرکشش ہوگا۔ مرکز کے انتظامی دفاتر مسلم کمیونٹی کی جدید ترین ضروریات بھی پوری کرسکیں گے۔ جن میں ای میل، فیکس، فون شامل ہیں۔ یہاں عطیات وصول کرنے والے رضاکاروں کے بیٹھنے کی جگہ بھی ہوگی۔ کوشش یہ کی جارہی ہے کہ امریکہ کے اس اہم ترین تعلیمی اور تجارتی مرکز بوسٹن کے معیار کے مطابق تمام سہولتیں فراہم کی جائیں۔ جس سے ایک طرف مسلمان اپنے آپ پر فخر کرسکیں دوسری طرف غیر مسلم بھی یہ محسوس کریں کہ مسلمان پسماندہ معاشرہ نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے ہماری بھی دعا ہے کہ یہاں کے مسلمانوں کی کوششوں اور خواہشوں کے مطابق یہ مرکز آنے والی نسلوں کے لیے سرچشمۂ ہدایت و تربیت ثابت ہو۔ ان کا یہ خواب

حقیقت میں تبدیل ہوجائے۔

کونسل آن امریکن اسلامک ریلیشنز

یہیں ہمیں مسلم برادری کی ایک سماجی تنظیم کیئر کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوئیں۔ جو پورے امریکہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا صدر دفتر واشنگٹن میں ہے۔ اپنی ویب سائٹ بھی ہے۔ اور ای میل ایڈریس بھی۔ Cair 1C ix.netcom.com

کیئر اسلام اور مسلمانوں کا مثبت تصور اجاگر کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ تاکہ امریکہ میں اسلام کے خلاف پھیلائے جانے والی غلط فہمیاں دور کی جاسکیں۔ کیئر اس مقصد کے حصول کے لیے امریکی میڈیا میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں شائع ہونے والی خبروں کو اچھی طرح مانیٹر کرتی ہے اور جہاں ضروری ہو وضاحت بھی جاری کرتی ہے۔ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر سیمینار اور کانفرنسیں بھی منعقد کی جاتی ہیں۔ جہاں غیر مسلموں کو بطور خاص دعوت دی جاتی ہے۔ کیئر کی طرف سے ایک سہ ماہی نیوز لیٹر کیئر نیوز بھی شائع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ حج اور رمضان کے دنوں میں تمام ضروری ہدایات اور معلومات پر مشتمل کتابچے بھی فراہم کیے جاتے ہیں۔

جہاں مسلمانوں کو کسی قسم کے خطرات کا سامنا ہو۔ وہاں کیئر مقامی وکلاء اور انسانی حقوق کے سرگرم کارکنوں کے ذریعے مطلوبہ اقدامات کرتی ہے۔ امریکی سیاسی رہنماؤں سے باقاعدہ رابطہ کرکے انہیں مسلمانوں کو درپیش معاملات سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ کیئر امریکی مسلمانوں، سرگرم کارکنوں اور رہنماؤں کو میڈیا اور عوام سے رابطوں، سیاسی لابی رنگ اور عوامی تقریروں کی تربیت بھی دیتی ہے۔ اس سلسلے میں جو نوجوان مہارت حاصل کرنا چاہیں۔ انہیں داخلہ بھی دیا جاتا ہے۔

براہیمی مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان اچھے روابط کے لیے اور بین العقائد تعاون کے لیے بھی کیئر مختلف طریقوں سے کوششیں کررہی ہے۔ کیئر کی رکنیت پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ فارم پر کرکے رکن بنا جاسکتا ہے۔ کسی علاقے میں کیئر کی شاخ بھی کھولی جاسکتی ہے اخراجات میں تعاون کے لیے عطیات بھی دیئے جاسکتے ہیں۔

امریکہ اور کینیڈا کے درج ذیل شہروں میں کیئر کے نمائندے یا شاخیں موجود ہیں۔ لاس اینجلز، سان فرانسسکو، شکاگو، ڈیٹرائٹ، انڈیانا پولس، نیویارک، ڈلاس ہوسٹن، سیٹل، فلاڈیلفیا، بوسٹن، واشنگٹن ڈی سی، اٹلانٹا، سنی پولس، میڈیسن، ملواکی، پیٹرسن، این جے، سینٹ لوئیس، ونڈسر اونٹاریو، ٹورنٹو اونٹاریو

مساچوسٹس میں مسلمان۔ مجموعی کیفیت

مساچوسٹس کی ریاست میں موجود مسلمان اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور یہاں کی سماجی سرگرمیوں میں پوری طرح شامل ہیں۔ سب سے زیادہ تعداد افریقی امریکیوں کی ہے۔ اس کے بعد جنوبی ایشیائی امریکی، پھر عرب امریکی، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پیشہ وارانہ مہارت کے سبب مسلمان گھرانوں کی اوسط آمدنی کی شرح امریکی قومی آمدنی کی شرح سے زیادہ ہے۔ ماشاء اللہ، اس وقت 9 ہمہ وقتی اسلامی اسکول مصروف تدریس ہیں۔ مزید درسگاہوں کی شدید مانگ ہے۔ مسلم برادری سیاسی طور پر بہت سرگرم ہے۔ انتخابی مہم میں بھر پور حصہ لیتی ہے۔ خط نویسی مظاہروں اور دوسری شہری تحریکوں میں پیش پیش رہتی ہے۔ اس کے علاوہ ورکشاپوں، سیمیناروں کے ذریعے دوسرے مذاہب کی تنظیموں سے فعال رابطہ رکھتی ہے۔

ایک مسلم تنظیم نے مسلمانوں کو باخبر رکھنے اور غیر مسلموں کو مسلمانوں کے بارے میں آگاہ کرنے کے لیے جس طرح جدوجہد کی۔ اس کا اعتراف مساچوسٹس برائے انسداد امتیاز نے بھی کیا۔ اب مسلمانوں کو یہاں کے اٹارنی جنرل کے دفتر، مقامی محکمۂ انصاف، ایف بی آئی اور دوسرے اداروں میں نمائندگی اور شراکت حاصل ہے۔

اعداد وشمار کے مطابق امریکہ کی کل آبادی اٹھائیس کروڑ میں سے 60 لاکھ مسلمان ہیں۔ بوسٹن اور اس کے آس پاس ایک لاکھ 30 ہزار آباد ہیں۔ زیادہ تر مسلمان نیویارک، کیلی فورنیا، مساچوسٹس، روڈز آئی لینڈ میں ہیں۔

ریاست میں مختلف اسلامی تنظیموں کی تعداد 71 ہے۔ مساجد 34، اسکول 9، مسلم اسٹوڈنٹس کی تنظیمیں 21 ہیں۔

یہ تو مساچوسٹس کی ریاست اور بوسٹن میں مسلمانوں کی تنظیم اور تربیت کا احوال ہے۔

پورے امریکہ میں مسلمان کیسے زندگی گزارتے ہیں۔ اور ان کو کیسے ماحول، گردوپیش اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ امریکی معاشرہ مجموعی طور پر انہیں کیسے قبول کررہا ہے۔ یہ ایک اہم موضوع ہے۔ کوشش کریں گے کہ اس پر ایک باب الگ سے شامل کیا جائے۔

اب تو ہم امریکہ میں تعلیم، ٹیکنالوجی، تحقیق اور انقلابی رجحانات کے حامل شہر سے رخصت ہورہے ہیں جہاں دیکھنے جاننے اور پڑھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ چند روز کیا، چند ماہ بھی کافی نہیں ہیں۔ عجائب گھر ہیں۔ یونیورسٹیاں ہیں، لائبریریاں ہیں، یہاں سے آزادی کی جنگ شروع ہوئی تھی۔ اس لیے انہوں نے The Freedom Trail آزادی کی پگڈنڈی، ترتیب دے رکھی ہے۔ جس میں ان تمام اہم عمارات مقامات کو شامل کیا گیا ہے۔ جہاں جنگ آزادی کے دوران کوئی نہ کوئی معرکہ ہوا۔ ہمارے ہاں بھی یہ سب کچھ ہے۔ لیکن ہمیں انہیں ترتیب دینے، ایک لڑی میں پرونے کی فرصت نہیں ہے۔ ہر سلسلے میں ہم کوئی نہ کوئی تنازع لے آتے ہیں۔ جس سے اتفاق رائے کو خطرہ لاحق ہوجاتا ہے۔ اور مثبت تصور پیدا کرنے والی ایسی کوششیں سبوتاژ ہوجاتی ہیں۔

یہاں ایک آزادی کی پگڈنڈی ہے۔ جس میں بوسٹن کامن، اسٹیٹ ہاؤس، پارک اسٹریٹ چرچ گریزی بری انگ گراؤنڈ، کنگز چیپل، فرسٹ پبلک اسکول، اولڈ کارنر بک اسٹور، پال ویوری ہاؤس اولڈ نارتھ، چرچ اولڈ ساؤتھ میٹنگ ہاؤس، لااولڈ اسٹیٹ ہاؤس، بوسٹن قتل عام کا مقام، فینوئل ہال، بحری جہاز، یو ایس ایس، دستور، بنکر ہل کی یادگار شامل ہیں۔ ایک پگڈنڈی امریکی سیاہ فاموں کی میراث کی ہے۔ ان کے اہم مقامات کو بھی تاریخی اہمیت دی گئی ہے۔

یادگاروں، یونیورسٹیوں، تحقیقی مراکز کے شہر بوسٹن الوداع، اس امید کے ساتھ کہ نئے استعماری رویوں کے خلاف بھی تحریک اسی شہر سے شروع ہوگی۔ جو امریکہ کی قابل فخر جمہوری، قانونی دستوری روایات کو کچلنے والے نئے قوانین اور نئے رجحانات کے سامنے دیوار مزاحمت بن جائے گی اب ہماری منزل واشنگٹن ہے۔

دہشت گردی کے مقابلے کا خصوصی شعبہ

واشنگٹن میں ایک اور رات گزر گئی ہے۔

ہماری منزل پھر اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ ہے۔ یہاں ہمیں ایمبیسڈر جے کوفر بلیک سے ملنا ہے۔ جو اس وقت انسداد دہشت گردی کے دفتر کے کوارڈی نیٹر ہیں۔

ہمیں لالچ تو دیا گیا ہے کہ کئی اہم عہدیداروں سے باضابطہ انٹرویو کرائے جائیں گے جو فوراً شائع بھی کیے جاسکتے ہیں۔ یہ آن دی ریکارڈ، آف دی ریکارڈ کی بحث شروع دن سے چلتی رہی ہے۔

آج کی ملاقات کا موضوع ہے: گیارہ ستمبر کے بعد دہشت گردی کے مقابلے کی پالیسی۔

کوفر، سینئر سفارت کار ہیں۔ کئی ممالک میں امریکہ کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ اسی سال انہوں نے اس عہدے کا حلف اٹھایا ہے۔ امریکہ میں یہ اچھی روایت ہے کہ ایسے عہدوں کے لیے صرف تقرری کافی نہیں ہوتی ہے۔ کانگریس اور سینیٹ کی کمیٹیوں کے سامنے پیشی ہوتی ہے۔ شخصیت کی اہلیت، کردار، ایمانداری سب چھانٹی جاتی ہے۔ پھر حلف بھی لیا جاتا ہے۔ حلف تو ہمارے ہاں بھی بار بار اٹھائے جاتے ہیں لیے جاتے ہیں۔ لیکن ان کا پاس شاید ہی کوئی کرتا ہو۔ قسم توڑنا، حلف توڑنا، پارٹیاں توڑنا، اور ایک آدھ بار ملک توڑنا ہماری گھٹی میں شامل ہے۔

کوفر صاحب دہشت گردی کے مقابلے کے لیے پرعزم بھی لگتے ہیں۔ اور خوش فہم بھی، وہ کہہ رہے ہیں کہ دہشت گردی کے مزاحمت میں پاکستان ہمارا اتحادی ہے۔ افغانستان سے ہم طالبان کو نکالنے میں کامیاب نہیں ہوسکتے تھے اگر پاکستان ہمارا ساتھ نہ دیتا۔ اب القاعدہ کو ختم کرنے کی کوششیں جارہی ہیں۔ جنہوں نے طالبان حکومت کو استعمال کیا۔ اب ہمارے سامنے ایک ہی منزل ہے کہ دنیا کو رہنے کے لیے ایک پرامن اور محفوظ جگہ کیسے بنایا جائے۔ افغانستان میں تعمیر نو کا عمل جاری ہے۔ عوام کو سیاسی نمائندگی دی جانی ہے۔ تعلیم کی اشاعت لازمی ہے۔ تاکہ افغانستان دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح پرامن اور ترقی یافتہ سرزمین بن جائے۔

ان کا کہنا ہے کہ امریکہ کی اولین ترجیح اپنے معصوم شہریوں کی جان و مال کی حفاظت ہے۔ اس لیے ہم دہشت گردوں کو روکنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو بھی ہمارا ساتھ دے رہا ہے۔ ہم اس کی قدر کرتے ہیں۔ ہمارا محکمہ خارجہ، اتحادیوں کے محکمۂ خارجہ سے قریبی رابطے میں ہے۔ امریکہ دوطرفہ تعلقات میں بھی بہتری لا رہا ہے۔ علاقائی تعاون کی تنظیموں کو بھی سرگرم رکھنے کا مشورہ دے رہا ہے۔

دہشت گردی کے خاتمے کے لیے نئے قوانین بھی وضع کیے گئے ہیں۔ ایف بی آئی دوسرے ملکوں کے تفتیشی اداروں کی بھی مدد کررہی ہے۔ سب سے زیادہ موثر اب یہ کام ہوا ہے کہ دہشت گردوں کو مالی فراہمی روکی جارہی ہے۔ کیونکہ انہیں یہ سپلائی ملتی رہے گی تو وہ آگ لگاتے رہیں گے۔ کئی حساس اور تنظیموں پر پابندی لگائی گئی ہے ان کے فنڈز منجمد کیے گئے ہیں۔ اس سے بہت فرق پڑا ہے۔

افغانستان کے بعد اتحادی فوجیں عراق میں بھی مصروف کار ہیں۔ ہم دنیا کو یہ بتادینا چاہتے ہیں کہ ہم ناکام نہیں ہوں گے۔ ہم تھکیں گے نہیں۔ ہم اس جنگ کو جاری رکھیں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ ایک لامتناہی جنگ ہے۔ ایک طویل کاروائی ہے۔ دہشت گردی کے مقابلے کا یہ محکمہ سیکرٹری اسٹیٹ کی قیادت میں عالمگیر مزاحمت میں متحرک ہے۔ دنیا بھر کے بے گناہ لوگوں کا تحفظ، نسل رنگ اور ملک سے وابستگی کا امتیاز کیے بغیر کرنا ہے۔ اور خاص طور پر وہ بے چارے غریب لوگ جو اپنا دفاع خود نہیں کر سکتے۔

بھارت سے آئے ہوئے تمل اپنا پرانا سوال پھر کرر ہے ہیں کہ آپ پاکستان کی اتنی تعریف کرتے ہیں۔لیکن دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کی علامت بھارتی پارلیمنٹ پر حملہ پاکستان ایجنٹوں نے کیا۔سرحد پار دہشت گردی جاری ہے۔

ایمبسیڈر کوفر غور سے ان کی بات سننے کے بعد کہہ رہے ہیں کہ امریکہ نے واضح طور پر پاکستان اور بھارت سے کہا ہے کہ آپس میں مذاکرات کریں۔کشمیر سمیت تمام مسائل کو بات چیت سے حل کریں۔سرحد پار دہشت گردی یا دراندازی پر ہم بار بار پاکستان سے کہتے رہے ہیں۔ہم مطمئن ہیں کہ صدر جنرل پرویز مشرف نے اس سلسلے میں بہت وعدے کیے ہیں۔اور متعدد اقدامات بھی کیے ہیں۔سیکریٹری خارجہ بھی کئی بار جنوبی ایشیا کا دورہ کر چکے ہیں۔دوسرے عہدیدار بھی جاتے رہتے ہیں۔پاکستان نے اپنے قانونی نظام میں بہت سی تبدیلیاں کی ہیں۔پاکستانی سیکورٹی فورسز افغانستان کی سرحد پر القاعدہ کی مزاحمت کے لیے کلیدی کردار ادا کر رہی ہیں۔پاکستان نے کئی جہادی تنظیموں پر پابندی عائد کی ہے۔ایک اور سوال پر وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم اپنی کاروائیوں پر مطمئن ہیں اور سمجھتے ہیں کہ گیارہ ستمبر کے بعد صدر بش نے جرأتمندانہ فیصلے کیے ہیں۔دنیا کو ساتھ لیا ہے۔دنیا بھر میں القاعدہ کے 3000 دہشت گرد گرفتار ہو چکے ہیں۔دنیا پہلے سے زیادہ محفوظ ہے۔صدر نے بالکل بجا کہا ہے کہ یہ جدوجہد طویل ہے۔صبر آزما ہے۔اس میں فنڈز بھی بہت لگیں گے۔یہ صرف امریکہ کا نہیں پوری دنیا کا مسئلہ ہے۔ایشیا میں بھی جانیں ضائع ہوئی ہیں۔وہ ملک جو دہشت گردی کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔وہاں القاعدہ ضرور کاروائی کرتی ہے۔القاعدہ مقامی دہشت گردوں سے بھی رابطہ کرتی ہے۔اور ان کے ذریعے وارداتیں کرواتی ہے۔

ہمارا شعبہ ان ملکوں سے رابطے میں رہتا ہے۔ان کی پالیسی سازی میں معاونت کرتا ہے دہشت گردی کی مزاحمت کی حکمت عملی مرتب کرنے میں بھی ساتھ دیتا ہے۔یہاں دہشت گردی کے طریقوں کا مشاہدہ اور مطالعہ کر کے ان کو ضروریات بناتے ہیں۔تربیت دیتے ہیں اور ان ملکوں کی تہذیب، مزاج اور روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان پالیسیاں بنواتے ہیں۔افغانستان سے متعلق ایک سوال پر وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم افغانستان کے معاشرے کو دوسرے

معاشروں کی سطح پر لانا چاہتے ہیں۔میں افغانستان حال ہی میں گیا تو مجھے خوشی ہوئی کہ بچیاں اسکول جارہی تھیں۔وہاں بچوں کو امریکن اسکول بیگ دیئے گئے ہیں۔نئے نئے اسکول قائم ہورہے ہیں۔سڑکیں بن رہی ہیں۔شکریہ بارک زئی کہہ رہی ہیں کہ یہ سب کچھ ہورہا ہے مگر اس کی رفتار سست ہے۔ادھر تیزی سے یہ ہورہا ہے کہ امریکہ علاقوں پر کنٹرول کرنے کے لیے انہی وارلارڈز (جنگجو سرداروں) کی مدد کر رہا ہے۔جو افغانستان کی ابتری اور خانہ جنگی کے ذمہ دار رہے ہیں۔اس سے عام شہری خوفزدہ ہیں صرف کابل کی حد تک حکومت نظر آتی ہے۔

کوفر کہہ رہے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ہماری کوشش ہے کہ افغانستان آزاد ہو۔خودکفیل ہو اس کی فیصلہ سازی میں عوام کی شرکت ہو۔مرکزی اتھارٹی ہی کسی ملک میں استحکام کی کلید ہے۔لیکن صوبائی وحدتوں میں سرداروں کا کردار ہے۔اور یہ امریکہ کا مسئلہ نہیں ہے۔ہم افغانستان کو اس کی قومی فوج،قومی پولیس،قومی صحت کے ادارے تعمیر کر کے دینا چاہتے ہیں۔اس کے بعد افغانستان خود اپنے اندرونی مسائل کو طے کرے۔

وزیر خارجہ کی ایک جھلک

ہمیں بتایا گیا ہے کہ امریکی وزیر خارجہ کولن پاول کی آن دی ریکارڈ پریس بریفنگ میں ہمیں شرکت کا موقع ملے گا۔ پہلے تو یہ بھی اطلاعات تھیں کہ ہمارے وفد کی الگ ملاقات بھی ہوگی۔ وزیر خارجہ کے علاوہ امور سلامتی کی مشیر کونڈا لیزا رائس سے گفتگو کا اشارہ بھی دیا گیا تھا لیکن واشنگٹن واپس آتے آتے یہ ساری اعلیٰ سطحی ملاقاتیں معدوم ہوتی جارہی ہیں۔

پہلے پروگرام یہ تھا کہ بوسٹن سے ہم نیویارک جائیں گے جہاں امریکہ کے سابق وزیر خارجہ ہنری کسنجر ہمیں حالات حاضرہ پر اپنے گرانقدر خیالات سے آگاہ کریں گے۔ ہمیں سوال جواب کا موقع بھی دیا جائے گا۔ معلوم ہوا کہ کسنجر صاحب امریکہ سے باہر جارہے ہیں اس لیے یہ ہائی پرو فائل میٹنگ منسوخ ہوگئی ہے، اس طرح رفتہ رفتہ ہم امریکی وی آئی پیوں سے ملاقات کے شرف سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔

اب کولن پاول کو قریب سے دیکھنے کی نوید سن کر ہم کشاں کشاں فارن پریس سینٹر کی طرف رواں ہیں۔ پہلے تو ہمیں یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ ہمیں سوال کا موقع نہیں مل سکے گا کیونکہ سنٹر کے ارکان ہی سوال کرسکتے ہیں۔ اور جب ہم پریس سینٹر پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم دیر سے پہنچے ہیں اس لیے ہم اس ہال میں بھی داخل نہیں ہوسکتے۔ جہاں یہ بریفنگ ہورہی ہے۔ اس لیے کسی اور کمرے میں بٹھایا جائے گا۔ جہاں اسکرین پر ہم وزیر خارجہ کو بریفنگ

دیتے دیکھ سکیں گے۔ فی زمانہ اس جھلک کی تو کوئی اہمیت نہیں رہی کیونکہ ٹی وی چینل اب ایسی پریس کانفرنسیں براہ راست دکھاتے ہیں۔ ساتھ کے کمرے میں دیکھ لیں۔ یا ہزاروں میل دور اپنی خواب گاہ میں دیکھیں۔ یہ ایک برابر ہے۔

بہرحال ہمارے میزبانوں کی پہنچ یہیں تک ہے۔ یا ہم جنوبی ایشیائیوں کی قدر یہیں تک ہے۔ ہمارے صدور اور وزرائے اعظم امریکہ کے انڈر سیکرٹریوں، اسسٹنٹ سیکرٹریوں سے مل کر خوش رہتے ہیں۔ ہمیں ڈائریکٹرز، ڈپٹی سیکرٹریوں پر قناعت کرنی چاہیے۔

امریکی وزیر خارجہ فارن سینٹر کے اراکین سے وعدہ کررہے ہیں کہ وہ آئندہ جلد آئیں گے۔ اس بار آنے میں کافی وقفہ ہوگیا ہے۔ موضوع دہشت گردی ہے۔ ہم عراق کے عوام کے ساتھ کافی دیر رہیں گے اس وقت تک جب وہ اپنے نمائندے منتخب نہ کرلیں۔ رفتہ رفتہ اب دوسرے ممالک بھی عراق میں اتحادیوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔

صدام حسین کے بیٹوں کی ہلاکت کے حوالے سے سوال ہورہا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ صرف ان کی موت سے سلامتی کی صورت حال بہتر نہیں ہوسکتی۔ اب بھی کچھ دہشت گرد آس پاس سے آرہے ہیں۔ ہم سیکورٹی کے خطرات سے نمٹتے رہیں گے۔ جو بھی بہتر ہو۔ ہم کریں گے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے فوجی اس علاقے اور لوگوں کے بارے میں زیادہ بہتر جان سکیں گے۔ ہم نے اپنے شامی دوستوں سے کہا ہے کہ دمشق کو دہشت گردوں کا مرکز نہیں بننا چاہیے۔ جن عناصر سے ہم اس وقت نمٹ رہے ہیں۔ ان تنظیموں میں سے اکثر کا مرکز دمشق ہے۔ ہم نے شام کو خبردار کیا ہے کہ یہ تنظیمیں امن کے خلاف ہیں۔ ان کو سرگرمیوں کی اجازت نہ دی جائے۔ ان کو وہاں سے نکالا جائے۔ اسی طرح ایران سے بھی کہا ہے کہ وہ ایسی دہشت گرد تنظیموں کی سرپرستی کیوں کررہا ہے۔ جو اسرائیل میں وارداتیں کررہی ہیں۔ ہم اسرائیل اور فلسطین سے مل کر امن کے لیے قائم کررہے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اب ہم صحیح سمت میں جارہے ہیں۔ عرب لیگ اس سلسلے میں جو بیان دے رہی ہے۔ وہ افسوسناک ہیں۔

امریکی وزیر خارجہ بریفنگ کے بعد ہال سے جب نکل گئے ہیں تو ہمیں موقع دیا گیا ہے کہ ہم اس ہال کو دیکھ لیں۔ اس سنٹر کے وہ سب نمائندے باقاعدہ رکن ہیں جو واشنگٹن میں

اپنے اپنے اخبارات، اور ٹی وی چینلوں کی طرف سے متعین ہیں۔ مقامی اخبارات کے وہ نمائندے یہاں رکنیت رکھتے ہیں جو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ سے متعلقہ خبریں فائل کرتے ہیں۔

ہم فخر سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب واحد سپر طاقت کے وزیر خارجہ بریفنگ کررہے تھے۔ تو ہم سنٹر کی اس منزل میں ساتھ والے کمرے میں موجود تھے۔

امریکی محکمۂ خارجہ پریس آفس اور اس کے میڈیا سے تعلقات

نمبر 2201۔ سی اسٹریٹ، این ڈبلیو۔

امریکی محکمۂ خارجہ..... ڈپٹی اسپوکسمین..... (نائب ترجمان) جناب فلپ ٹی ایکر سے گفتگو کا موضوع ہے۔

امریکی وزارتِ خارجہ کا پریس آفس اور اس کے میڈیا سے تعلقات۔

اس ہال میں کم از کم دو اڑھائی سو افراد کے لیے نشستیں ہیں۔ ہم صرف آٹھ ہیں۔ فلپ ٹی ایکر اسی طرح خطاب کررہے ہیں۔ جیسے وہ بھرے ہال سے محوِ سخن ہوں۔ وزارت خارجہ کا نشان دلچسپ ہے، ایک ہاتھ میں شاخ..... دوسرے میں تیر۔ کس کا استعمال کب ہونا چاہیئے۔ اسی سے امور خارجہ کی مہارت ظاہر ہوتی ہے۔ بات افغانستان سے شروع ہورہی ہے۔ ایک سوال پر وہ کہہ رہے ہیں کہ یہ تاثر غلط ہے کہ ہم افغانستان کو بھول گئے ہیں۔ ایسا قطعی طور پر نہیں ہے۔ میں خود تو ابھی وہاں نہیں گیا ہوں۔ لیکن اپنی معلومات کے مطابق کہہ سکتا ہوں کہ بون معاہدے کی روشنی میں کرزئی حکومت کو دنیا بھر کی حمایت مل رہی ہے۔ آئین سازی جاری ہے۔ نیٹو کے ارکان پہلی بار یورپ سے باہر جارہے ہیں۔ یہ تاثر میرے خیال میں درست نہیں

ہے کہ وہاں سیکورٹی کی صورت حال خراب ہے۔ وہاں امن و امان قائم ہو رہا ہے۔ اس لیے مہاجرین واپس آ رہے ہیں۔ نارکوٹکس کے خلاف بھی کاروائی ہو رہی ہے۔ پوست کی کاشت کی خبریں مل رہی تھیں۔ اس پر بھی اقدامات کیے گئے ہیں۔ امریکہ اور اتحادیوں کی کوشش یہ ہے کہ ہم افغانستان کی اپنی فوج اور پولیس فورس تیار کریں۔ انہیں تربیت دے رہے ہیں کہ وہ خود افغانستان کے امور سنبھال سکیں۔ امریکہ افغانستان سے اپنے وعدے پورے کرے گا۔ شکریہ بارک زئی ان وضاحتوں سے کچھ زیادہ مطمئن نظر نہیں آ رہی ہیں کیونکہ انہیں اس سوال کا جواب کہیں نہیں مل رہا ہے کہ افغانستان میں وار لارڈز کو پھر اہمیت دی جا رہی ہے۔ انہیں پھر فنڈز فراہم کیے جا رہے ہیں۔ حالانکہ مختلف ادوار میں افغانستان میں تباہی، بربادی اور خانہ جنگی کے ذمہ دار وہی رہے ہیں۔

امریکہ میں مسلمانوں اور اسلام کو درپیش صورت حال کے حوالے سے ایک سوال پر وہ کہہ رہے ہیں کہ اسلام کے ساتھ ہمارا کوئی تنازع نہیں ہے۔ امریکہ میں اسلام ایک مذہب کی حیثیت سے قابل قدر ہے۔ ہم سب کے مذاہب کی بنیاد ابراہیمی ہے جو برداشت، تحمل، رواداری سے عبارت ہے۔ میڈیا میں بعض اوقات غلط فہمیاں پھیلائی جاتی ہیں۔

ایک سوال پر وہ یہ موقف اختیار کر رہے ہیں کہ ''تہذیبوں کے تصادم'' کا نظریہ غلط ہے۔ ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ امریکہ کا اپنا ایک نظام ہے۔ جو کچھ امریکی ٹی وی چینل کہتے ہیں۔ یا امریکی اخبارات پیش کرتے ہیں۔ وہ ضروری نہیں کہ امریکی انتظامیہ کا موقف ہو۔ ہمارے ہاں خارجہ پالیسی پر بھی مباحثہ جاری رہتا ہے۔ صدر بش کی آئینی ذمہ داریاں ہیں۔ وہ ان کی روشنی میں اپنا موقف اختیار کرتے ہیں۔ امریکی عوام اس پر اپنا الگ الگ نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ امریکی وزارت خارجہ مشرق وسطیٰ، جنوبی ایشیا، افریقہ، صحارا سب کے بارے میں مطالعہ کرتی ہے۔ تجزیہ کرتی ہے۔ پھر اس کی روشنی میں سفارشات پیش کرتی ہے۔ کہاں امداد دینا ہے۔ کہاں پابندیاں لگانی ہیں۔ کانگریس، سینٹ اپنے قوانین اختیارات کے مطابق ان سفارشات پر اپنی رائے دیتے ہیں۔ پھر صدر اپنے اعلانات کرتے ہیں۔

ان سے پوچھا جا رہا ہے کہ کیا امریکی اس امر کا جائزہ لے رہے ہیں کہ دنیا امریکہ سے

نفرت کیوں کرتی ہے۔

ہم کیسے اس بات کو مان لیں کہ دنیا امریکہ سے نفرت کرتی ہے۔ کیونکہ دنیا کے قریباً ہر ملک میں ہی امریکی سفارت خانوں اور قونصل خانوں کے باہر مقامی افراد کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوتی ہیں جن میں ہر عمر کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ اور وہ سب امریکہ آنے کے لیے ویزے کی درخواستیں لیے کھڑے ہوتے ہیں۔

سوال کیا جا رہا ہے کہ جس طرح مشرق وسطیٰ میں امریکہ نے روڈ میپ دیا ہے۔ ہر اس پر عملدرآمد کے لیے کوششیں ہو رہی ہیں۔ اسی طرح جنوبی ایشیا میں پاکستان اور بھارت کے درمیان کشمیر سمیت تمام تنازعات طے کروانے کے لیے امریکہ کوئی روڈ میپ دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔

فلپ ٹی ریکر کہہ رہے ہیں کہ ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے کیونکہ دونوں پارٹیوں نے اس سلسلے میں ہم سے رجوع نہیں کیا ہے۔ جنوبی ایشیا نے جب کچھ کہا ہے تو ہم نے کیا ہے۔ ڈیڑھ سال پہلے اور گیارہ ستمبر کے بعد دونوں ایٹمی ہمسایوں کے درمیان کشیدگی بڑھ گئی تھی۔ فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہو گئی تھیں۔ ایٹمی تصادم کا خطرہ تیزی سے پیدا ہو رہا تھا۔ اس وقت امریکہ نے اپنا کردار ادا کیا۔ آرمیچ گئے کرسٹینا روکا گئیں۔ اور اس خطرے کو ٹالا گیا۔ امریکہ اپنا کردار جب ضرورت پڑی ادا کرے گا۔ امریکہ کی خواہش یہی ہے کہ دونوں ممالک اپنے تنازعات مذاکرات کے ذریعے طے کریں۔ امریکہ میں دونوں ممالک کے شہریوں کی بڑی تعداد ہے۔ ہم دونوں سے بہتر تعلقات رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی بار بار واضح کر چکے ہیں کہ پاکستان سے تعلقات بھارت کی قیمت پر نہیں ہیں۔ اور نہ ہی بھارت سے اچھے تعلقات کا مطلب پاکستان سے سرد مہری ہے۔ دونوں کی الگ الگ حیثیت ہے۔ دونوں سے ہم دو طرفہ تعلقات رکھنا چاہتے ہیں۔ پاکستان سے ہمارے تاریخی روائتی روابط ہیں۔ سرد جنگ میں دونوں بہت قریب رہے ہیں۔ بھارت سوویت یونین سے قریب رہا ہے۔ لیکن بھارت سے ہمارے تعلقات دو طرفہ بنیادوں پر تھے۔ دیکھنا یہی ہے کہ امریکہ اس خطے میں امن کے لیے کیا کر سکتا ہے۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد صدر کلنٹن جنوبی ایشیا میں پہلی بار گئے۔ چند گھنٹوں کے لیے پاکستان

بھی گئے۔

ان سے کہا جارہا ہے کہ سرد جنگ کے بعد امریکہ غیر ممالک میں اپنی موجودگی کم کرتا جارہا ہے۔ سفارت خانوں میں اسٹاف کم ہورہا ہے۔ لائبریریاں بند ہورہی ہیں۔ اس امر سے اتفاق کررہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ سیکورٹی کے خدشات نے یہ کرنے پر مجبور کیا ہے۔ معلومات کے لیے ویب سائٹ موجود ہیں۔ لیکن یہ انسانی گرمجوشی کا متبادل نہیں ہوسکتی۔ ویب سائٹ ہاتھ نہیں ملاسکتی۔ اس پر غور کیا جارہا ہے۔

بھارتی صحافی تمل پھر پاکستان کی طرف سے سرحد پار دہشت گردی کی بات کررہے ہیں۔ فلپ بڑے اعتماد سے جواب دے رہے ہیں کہ ہمارا پاکستانی حکومت سے رابطہ ہے۔ صدر پرویز مشرف سے امریکی وزیر خارجہ بات، کرتے رہتے ہیں۔ اور ہمیں یقین ہے کہ انہوں نے انتہائی اہم اقدامات کیے ہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد جو بھی ضروری تھا انہوں نے کیا ہے۔ دہشت گردی خود پاکستان کے خلاف تھی۔ پاکستانی بھی ہلاک ہورہے تھے۔ سرمایہ کاری متاثر ہورہی تھی۔ صدر پرویز مشرف کی حکومت کی توجہ دہشت گردی کے خاتمے پر ہے۔ تعلیم کی اشاعت میں وسعت ہورہی ہے۔ وہ دینی مدارس میں نصاب میں تبدیلیاں لارہے ہیں۔ جائزہ لے رہے ہیں کہ پاکستان کے نوجوان کیا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک مطلوبہ مالی امداد بھی فراہم کررہے ہیں۔ یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ وہاں اقتصادی اصلاحات کی گئی ہیں، ان پر عملدآمد جاری ہے۔ وہاں انتخابات ہوئے ہیں ان کے نتیجے میں سویلین حکومت بھی قائم ہوئی ہے۔ امریکہ مطمئن ہے کہ وہاں جمہوری اور آئینی عمل جاری ہے۔ ہم جمہوریت کا فروغ چاہتے ہیں۔ لیکن وہاں فیصلہ پاکستان کے عوام کو ہی کرنا ہے۔ ہم کسی پر اپنی رائے مسلط نہیں کرتے ہیں۔

حبّ الوطنی کے نام پر پابندیاں

ہم میریڈیان انٹرنیشنل سینٹر کے پراسرار ماحول میں پھر داخل ہورہے ہیں۔ لیکن اب موضوع انتہائی اہم ہے۔ ''دی پٹریاٹ ایکٹ'' جس نے امریکیوں کی شہری آزادیاں مسدود اور محدود کردی ہیں۔ یہ ایکٹ کیا ہے اور اس نے امریکہ کے اندر اور بین الاقوامی سطح پر کیا اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہ اس سہ پہر کا موضوع ہے۔ ہمارے میزبانوں نے دو قانونی ماہرین کو اس سلسلے میں مدعو کیا ہوا ہے۔

ایک سکاٹ نیلسن ہیں۔ جو پبلک سٹیزن لٹی گیشن گروپ (شہریوں کی طرف سے مقدمات کی پیروی کرنے والا گروپ) کے اٹارنی ہیں۔ اسے سے پہلے وہ متعدد قانونی کمپنیوں میں شریک رہ چکے ہیں۔ اپنی نجی وکالت میں اور یہاں اس ادارے میں ان کی قانونی پریکٹس کا محور دیوانی اور فوجداری اپیاسٹ کاروائی سے متعلقہ مقدمات رہے ہیں۔ ان کے موکلوں میں ایک سابق امریکی صدر، اور ایک امریکی ڈسٹرکٹ جج بھی شامل رہے ہیں۔ وہ ہارورڈ کالج سے Phi Beta Kappa گریجویٹ ہیں۔ اور انہوں نے میگنا کم لاڈ، کی قانونی ڈگری ہارورڈ لاسکول سے حاصل کی۔ اس کے بعد وہ امریکی سپریم کورٹ کے ایسوسی ایٹ جسٹس آنریبل بائرن آروائٹ کے لاء کلرک رہے۔

پبلک سٹیزن لٹی گیشن گروپ۔ شہریوں کے مفادات کی نگہبانی کرنے والے گروپ

پبلک سٹیزن کے مقدمات کی پیروی کرتا ہے۔ زیادہ تر مقدمات حکومت کی طرف سے اختیارات کے غلط استعمال کے خلاف ہوتے ہیں۔ یہ ایک عام فرد اور گروپ دونوں کی پیروی ایک سے جذبے سے کرتا ہے۔

دوسرے پال روزنبرگ ہیں۔ جو مشہور تھنک ٹینک دی ہیریٹج فاؤنڈیشن کے مرکز برائے قانونی اور عدالتی مطالعہ میں سینئر لیگل ریسرچ فیلو ہیں۔ اس ادارے سے وابستگی سے پہلے وہ اپنی نجی وکالت کر رہے تھے۔ انہیں وفاقی اپیلٹ اور کرمنل لاء اور قانونی اخلاقیات میں خصوصیت حاصل ہے۔ وہ کینتھ اسٹار کی سربراہی میں قائم آفس آف دی انڈیپنڈنٹ کونسل میں سینئر لٹی گیشن کونسل اور ایسوسی ایٹ انڈیپنڈنٹ کونسل میں رہ چکے ہیں۔ کینتھ اسٹار مونیکا لیونسکی کی طرف سے صدر کلنٹن کے خلاف وکیل تھیں۔ اس سے پہلے روزنبرگ صاحب ایوان نمائندگان کی کمیٹی ٹرانسپورٹیشن اور انفراسٹرکچر کے چیف انوسٹی گیٹو کونسل بھی رہے ہیں۔ اپنے پیشے میں ابتدائی سات برس انہوں نے وزارت انصاف کے ماحولیاتی جرائم کے شعبے میں اور پھر ایک قانونی فرم کوی، بائیڈ اینڈ سکن میں ایک ایسوسی ایٹ کے طور پر گزارے۔ انہوں نے کم لاڈ قانونی ڈگری..... یونیورسٹی آف شکاگو سے حاصل کی۔ اور گیارھویں یو ایس سرکٹ کورٹ کے جج آر لینیئر اینڈرسن کے ساتھ لاء کلرک رہے۔

بات یہاں سے شروع ہو رہی ہے کہ دی پٹریاٹ ایکٹ قانون سازی ایک الجھی ہوئی دستاویز ہے۔ جو انتہائی عجلت میں منظور کی گئی۔ اس قانون میں دہشت گردی سے متعلق کچھ حصے ہیں باقی زیادہ تر عمومی امور ہیں۔ امیگریشن سیکورٹی ایکٹ اس کے بہت چھوٹے حصے میں ہے۔ زیادہ تر شہری آزادیوں سے متعلق ہیں۔ یہ متعدد کاغذات کا پلندہ ہے۔ اس میں منی لانڈرنگ کے قواعد وضوابط بھی ہیں۔ تمام اداروں، کمپنیوں کی جانچ پڑتال ہو سکتی ہے کہ پیسہ صحیح استعمال ہو رہا ہے یا نہیں۔ گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد وفاقی حکومت کی یہ طویل المیعاد دلچسپی ہو گئی ہے کہ وہ دیکھے اندرون ملک یا بین الاقوامی سطح پر پیسہ دہشت گردی کے لیے منتقل نہ ہو۔ بیرون ملک پیسے کی منتقلی اب بغیر لائسنس کے نہیں ہو سکتی۔ پہلے امریکہ میں کام کرنے والے لوگ جنوبی ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے ملکوں میں اپنے گھروں میں بلا روک ٹوک پیسے بھیجا کرتے تھے اب اس

میں رکاوٹیں ہیں۔ اس سے انٹرنیشنل بینکنگ بھی متاثر ہو رہی ہے۔

وہ بتا رہے ہیں کہ اس وقت کینیڈا کی سرحد پر بہت سے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ جو امریکہ میں نئی پالیسیوں سے متاثر ہوئے ہیں۔

اس قانون میں بہت سے حصے ہیں جو اس وقت شدید تنقید کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔ پہلے بھی ایسی شقیں ہوتی تھیں جن میں ملکی دہشت گردی اور بین الاقوامی دہشت گردی کے حوالے سے قواعد وضوابط درج کیے جاتے تھے۔ کہ مشتبہ غیر ملکی عناصر کو اپنے ملک بھجوا دیا جائے۔ یا یہیں سزا دی جائے۔ دنیا میں دہشت گردی کی وارداتیں کرنے والوں، بم دھماکوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو کیا سزائیں ملنی چاہئیں۔ دہشت گردی کی تعریف میں ایک عجیب توسیع یہ کی گئی ہے کہ دو یا زیادہ افراد جو اس سلسلے میں گفتگو بھی کر رہے ہوں اسلحہ کا استعمال یا بم دھماکہ بھی ضروری نہیں ہے۔ اور وہ افراد جو انہیں رہائش فراہم کرتے ہیں۔ مالی اعانت کرتے ہیں۔ ان کو مقدمہ چلائے بغیر..... صفائی کا موقع دیئے بغیر امریکہ بدر کیا جا سکتا ہے۔ اب وکلا کے لیے تارکین وطن، اجنبی (Aliens) کی وکالت بھی مشکل ہو گئی ہے۔ کوئی بھی شخص اگر سیاسی طور پر ناپسندیدہ ہے۔ اور امریکی حکومت اسے دہشت گرد کہہ دیتی ہے۔ تو یہ اس فرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ ثابت کرے کہ وہ دہشت گرد نہیں ہے۔ اب مدعی یعنی امریکی حکومت کی قانونی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اپنے عائد کردہ الزام کے حق میں ثبوت پیش کرے۔

میں سوچ رہا ہوں کہ شہری آزادیوں کے دعویدار امریکی معاشرے کا کیا حال ہو رہا ہے۔ یہ آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے جا رہا ہے۔ پاکستان تو 1977ء کے مارشل لاء میں یہ قانون نافذ کر چکا ہے کہ حکومت پر ذمہ داری نہیں تھی کہ وہ یہ ثابت کرے کہ گرفتار شدہ پاکستانی مارشل لاء کے مقاصد کے خلاف اقدامات کر رہا تھا۔ بلکہ گرفتار شدہ شخص کو یہ ثبوت دینے تھے کہ وہ مارشل لاء کے اغراض و مقاصد کے خلاف ارتکاب نہیں کر رہا تھا۔ انصاف کا یہ الٹا عمل پاکستان جیسے ملکوں میں..... بادشاہتوں میں..... آمریتوں میں تو ہمیشہ رائج رہا ہے۔ لیکن امریکہ بھی اب اس نتیجے پر پہنچ رہا ہے۔

اسی طرح جن اداروں اور تنظیموں پر دہشت گرد یا دہشت گردوں کی امداد کا الزام

حکومت کی طرف سے لگ جائے تو وہ بھی حرف آخر ہوگا۔ چاہے ان تنظیموں کو دیا جانے والا پیسہ ہسپتالوں کی تعمیر کے لیے ہو، زخمیوں کی جان بچانے کے لیے ہو، وہ یہی سمجھا جائے گا کہ بم دھماکوں کے لیے دیا جارہا ہے، اب ایسے خیراتی اداروں اور تنظیموں کے لیے بھی خطرہ ہے کہ ان سے تعلق رکھنے والوں کو امریکہ بدر کیا جاسکتا ہے۔ پہلے بھی یہ شقیں موجود تھیں۔ لیکن پہلے یہ وفاقی پالیسی تھی کہ عدالت میں اسے ثابت کرنا پڑتا تھا۔ یہیں وکلا کی قانونی مہارت کام آتی تھی۔ اور حکومت کے لیے مشکل ہوتی تھی۔ کیونکہ کوئی عوامی شہادت نہیں ملتی تھیں۔ عدالتیں خفیہ ایجنسیوں کی طرف سے پیش کردہ حلفیہ بیان کو Affidavit ثبوت نہیں مانتی نہیں۔ اب یہ قانون ہے کہ اس ایجنٹ کا حلفیہ بیان ہی کافی بنیاد ہے۔ اب وکلا کے لیے مشکلات پیدا ہوگئی ہیں کیونکہ انٹلی جینس کے شواہد صیغہ راز میں رکھے جاتے ہیں۔ ان پر جرح نہیں ہوسکتی ہے۔ اس طرح ان شواہد کے غلط استعمال کے سخت خطرات ہیں۔ اب کوئی بھی غیر ملکی جس پر دہشت گردوں کی مدد کا شبہ ہے، اسے حراست میں لیا جاسکتا ہے۔ 7 دن تک نظر بند رکھا جاسکتا ہے۔ اس عرصے میں چارج شیٹ تیار کی جاسکتی ہے۔ اور یہ سب کچھ اٹارنی جنرل کی صوابدید پر ہے۔ یہ صورت حال تشویشناک ہے۔ اس وقت محکمۂ انصاف میں سینکڑوں غیر ملکی نظر بند ہیں۔ اٹارنی جنرل کے اختیارات میں امیگریشن قواعد کی خلاف وزری کے حوالے سے اضافہ ہورہا ہے۔ جس سے بے یقینی بڑھ رہی ہے۔ اور وہ غیر معینہ عرصے تک جاری رہ سکتی ہے۔

اس ایکٹ کا دوسرا تشویشناک حصہ اندرون ملک دہشت گردی کے الزام سے ہے۔ دہشت گردی کے زمرے میں چھوٹے چھوٹے جرائم کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ کوئی بھی ایسی سرگرمی اب دہشت گردی کہلائے گی جس سے انسانی جان کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ کوئی شخص کسی جلوس پر پتھر پھینکے تو اب وہ بھی دہشت گردی میں ملوث سمجھا جائے گا۔ اس سے بھی خفیہ اداروں اور پولیس اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کا موقع ملے گا۔

اس ایکٹ کا تیسرا حصہ ہے۔ خفیہ نگرانی ..... پہلے امریکہ میں کسی بھی شخص کی خفیہ نگرانی ممنوع تھی۔ اب یہ عین قانون بن گئی ہے۔ غیر ملکی عناصر کی نگرانی پہلے خفیہ ہوتی تھی۔ لیکن اسے قانونی تحفظ حاصل نہیں تھا۔ اب یہ جوابی خفیہ کاروائی کے لیے استعمال ہوسکتی ہے۔ اسے قانون

کے ذریعے جائز قرار دے دیا گیا ہے۔ اب خفیہ طور پر ریکارڈ شدہ گفتگو کسی کے خلاف استعمال ہوسکتی ہے۔ FISA کے تحت اب کسی کو پتہ ہی نہیں کہ حکم جاری ہوچکا ہے۔ اس لیے وہ اسے عدالت میں چیلنج بھی نہیں کرسکتا۔ آپ کے دفتر کی کسی بھی دستاویز کو حکومت حاصل کرسکتی ہے اور کہہ سکتی ہے کہ دہشت گردی کے خاتمے کے سلسلے میں اسے دیکھنا بہت ضروری ہے۔ اب اس قانون کے تحت جو تفتیش ہورہی ہے۔ وہ امریکہ میں صدیوں سے ہونے والی تفتیش سے بالکل مختلف ہے۔ اب کسی بھی وکیل، اکاؤنٹنٹ، جائز صنعت کار کے دفتر سے کوئی بھی دستاویز طلب کرنا بالکل قانونی ہے۔ اور کوئی اس سے انکار نہیں کرسکتا نہ اسے عدالت میں چیلنج کیا جاسکتا ہے۔

یہ سن کر تو ہم سب چونک گئے ہیں کہ کسی بھی پبلک لائبریری سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ نظر رکھے کہ لوگ کیا پڑھ رہے ہیں۔ بعض مخصوص کتابیں پڑھنے پر بھی قانون حرکت میں آسکتا ہے چاہے آپ کو پہلے سے علم بھی نہ ہو کہ یہ کتاب پڑھنا جرم ہے۔

وہ کہہ رہے ہیں کہ یہ سب کچھ امریکی معاشرے کے لیے ایک خطرناک چیلنج ہے۔ اس سے ایک دوسرے پر، اداروں پر عدم اعتماد بڑھ گیا ہے۔ عدالتیں کمزور پڑرہی ہیں۔ محکمۂ انصاف اگرچہ کہہ رہا ہے کہ ان اختیارات کا استعمال بہت کم ہورہا ہے۔ لیکن یہ قانون تو موجود ہے۔ انتظامیہ کے ہاتھ میں ہماری آزادیوں کو کچلنے کے لیے ہتھیار تو ہے۔ لوگ اب یہاں کھلے عام کہہ رہے ہیں کہ کیا امریکہ پولیس اسٹیٹ بن گیا ہے۔

اب پال روزنبرگ اپنے خیالات کا اظہار کررہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم محکمۂ انصاف سے یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ قانون کہاں کتنی بار استعمال ہورہا ہے۔ تو وہ ہمیں صحیح تعداد نہیں بتاتے۔ یہ سب کچھ پراسرار انداز سے ہورہا ہے..... کسی فرد یا ادارے کو پتہ نہیں ہے کہ وہ دہشت گردی میں مشکوک ہوچکا ہے..... اصل تشویش یہ ہوگئی ہے کہ ایف بی آئی کے ایجنٹوں کو کسی بھی دفتر میں محکمے میں جانے کا اختیار مل گیا ہے۔ اب وہ مسجدوں میں بھی داخل ہوسکتے ہیں۔ پہلے نہیں جاسکتے تھے۔ اس وقت قانونی اور سماجی حلقوں میں یہ بحث ہورہی ہے کہ یہ تبدیلی اچھی ہے یا بری۔ اگرچہ ابھی تک یہی پتہ چلا ہے کہ ایف بی آئی کی طرف سے مسجد میں

جانے کی اتھارٹی صرف ایک بار استعمال کی گئی ہے۔ لیکن یہ ہنگامہ خیز ہو سکتی ہے ہم تو کہتے ہیں کہ یہ امر فکر انگیز ہے۔ حکومت کو سبق سیکھنا چاہیئے۔ اس قانون کے غلط استعمال کے خطرات موجود ہیں۔ سی آئی اے، ایف بی آئی کو بہت زیادہ اختیارات مل چکے ہیں۔ ماضی کے واقعات شاہد ہیں۔ اب تو کتابیں بھی آ چکی ہیں۔ جب انہی اداروں کے افراد نے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے دوسرے ملکوں کے سیاسی لیڈروں تک کو قتل کر دیا۔

وہ انتہائی افسردہ لہجے میں گویا ہیں کہ ہم اس وقت مختلف اور مشکل حالات میں ہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد امریکی معاشرہ خفیہ اداروں کے غلبے میں آ گیا ہے۔ تفتیش خفیہ ہو رہی ہے۔ جج خفیہ بیٹھتا ہے۔ دستاویزات خفیہ رکھی جاتی ہیں۔ وکیل تک انہیں دیکھ نہیں سکتے تو وہ کیا چیلنج کریں گے کیا جرح کریں گے۔ پہلے کئی بار عدالتوں میں خفیہ نگرانی کے اقدامات چیلنج کیے گئے تو عدالت کے حکم پر خفیہ نگرانی روک دی جاتی تھی۔ اب ایسا نہیں ہے۔ کوئی بھی ادارہ اب یہ دیکھنے والا نہیں ہے کہ اگر کسی خفیہ ایجنٹ نے غلط نشاندہی کی ہے۔ اور کسی فرد کے خلاف غلط الزام عاید کر دیا ہے تو اس کو اس سے روکا جا سکے۔ یا اس حکم واپس لیا جا سکے۔ ایف بی آئی، فارن انٹلی جنس سروس سے ایسی غلطیاں ہو رہی ہیں۔ 1960ء اور 1970ء کے عشرے میں ایسے معاملات پر پریس سخت تنقید کرتا تھا۔ آزادی تھی۔ اور ان پر انصاف ہوتا تھا۔ اس کے بعد ایسا ہوتا ہی نہیں تھا۔ اس لیے یہ تنقید بھی کم ہوتی گئی ہماری نسل کو ایسے تجربات نہیں تھے۔ سرد جنگ کے بعد یہ کشمکش ختم ہو گئی تھی۔ خفیہ نگرانی اتنی عام نہیں رہی تھی۔ لیکن گیارہ ستمبر کے بعد رویے بدل گئے ہیں۔ شہری آزادیاں قریباً ختم ہو گئی ہیں۔ یہ قانون بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والا ہتھیار بن گیا ہے۔ یہ ایسا قانون ہے جسے ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ اس میں بے شمار خامیاں ہیں۔ جن کا فائدہ خفیہ اداروں کو ہوگا امریکی شہریوں کو نہیں۔

وہ بتا رہے ہیں کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپان اور جرمنی کے شہریوں کو کیمپوں میں رکھا گیا۔ اس کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں۔ حبس بے جا کے حق میں قوانین واپس لیے گئے ان سے پوچھا جا رہا ہے۔ کہ کیا یہ قانون اور اس پر اعتراضات آئندہ انتخابات پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ایک فضا تو بن رہی ہے۔ لیکن ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے کہ انتخابی

حیثیت اس سے متاثر ہوگی۔ لیکن یہ خطرہ ہے کہ اگر موجودہ پارٹی ہی جیتی تو یہ خطرہ ہے کہ اقتصادی کریک ڈاؤن بھی ہو سکتا ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ سٹی حکومتوں کے ملازمین ان نئے قوانین میں تعاون نہیں کر رہے ہیں وہ حتی الوسع کوشش کر رہے ہیں کہ معاشرہ ان اختیارات کے غلط استعمال کا شکار نہ ہو۔ اور دوسرے حلقوں میں بھی حکومت کی طرف سے اختیارات کے یکطرفہ استعمال پر سخت تشویش ہے۔ اس سے عام امریکیوں کے ذہن بھی متاثر ہو رہے ہیں۔

ہم پوچھ رہے ہیں کہ ہمارے ہاں اس قسم کے قوانین بنتے رہے ہیں۔ لیکن ہماری سیاسی پارٹیوں اور بالخصوص بار ایسوسی ایشنوں نے ان کی سخت مزاحمت بھی کی ہے۔ ملک گیر جلوس بھی نکالے ہیں، بیانات بھی دیئے ہیں۔ امریکہ میں ایسا نظر نہیں آ رہا ہے۔ وہ بتا رہے ہیں کہ نہیں ایسی خاموشی بھی نہیں ہے۔ امریکن بار ایسوسی ایشن نے اس سلسلے میں میٹنگ کی ہے۔ اور ایک قرارداد بھی منظور کی ہے۔ جس میں دہشت گردی کے خلاف فوجی عدالتوں کے صدارتی حکم کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کوششیں ہو رہی ہیں۔

کیا اس سلسلے میں جلوس نکالے گئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نہیں۔ جلوس نہ نکلے ہیں۔ نہ نکالے جائیں گے البتہ ہماری وکلاء تنظیمیں ..... مختلف دوسرے قانونی ادارے رضا کارانہ طور پر ان کوششوں میں ہیں کہ جن بے گناہ افراد کے خلاف یہ ایکٹ استعمال کیا جائے ان کو ہم جس حد تک قانونی امداد فراہم کر سکیں وہ کریں..... اور ساتھ ساتھ اس ایکٹ کے خلاف ایک فضا بھی قائم کی جائے۔

دونوں قانون دان صاحبان نے اپنی طرف سے ہمیں آگاہ اور باخبر کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ ہم اپنے طور پر مایوس بھی ہیں۔ کہ یہ سرزمین جو انصاف، قانون کی حکمرانی، شہری اور جمہوری آزادیوں کا مرکز سمجھی جاتی تھی۔ کس دور سے گزر رہی ہے۔ کیا امریکی انتظامیہ واقعی دہشت گردی کے خطرات کو ختم کرنے کے لیے یہ پابندیاں ضروری اور کارگر سمجھتی ہے۔ یا وہ ہمارے معاشروں کی طرح اس دہشت گردی کو بہانہ بنا کر اپنی گرفت مضبوط کرنا چاہتی ہے۔ دہشت گردی کے واقعات جس انداز میں اور جس وسیع پیمانے پر ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے

کے لیے یقیناً قانونی اقدامات ناگزیر ہیں۔ امریکی شہری واقعی دہشت گردی سے خوفزدہ ہیں۔ لیکن وہ دوسری طرف ان اقدامات سے بھی سہم گئے ہیں۔ کیونکہ ایک طرف یہ خطرہ کہ دہشت گرد کسی وقت کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اور ادھر یہ کہ خفیہ ادارے بھی کسی وقت کچھ کر سکتے ہیں۔ سیکورٹی کے سخت طریقوں کے ساتھ ساتھ ان اسباب اور وجوہ کے خاتمے کی طرف بھی توجہ ناگزیر ہے۔ جو لوگوں کو دہشت گرد بنا رہے ہیں۔ ان سیاسی ناانصافیوں اقتصادی محرومیوں اور سماجی ناہمواریوں کو دور کرنے کے لیے بھی پالیسیاں بنانی چاہئیں۔ جو خود امریکہ میں بعض افراد کو مایوس کر دیتی ہیں..... اور ان ملکوں میں جہاں انسان اپنے آپ کو بے بس سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ امریکہ اور یورپ کے معاشروں میں انسانوں کو بالخصوص نوجوانوں کو کتنی مراعات، کتنے مواقع، کتنا سازگار ماحول، کتنی آزادیاں میسر ہیں..... دوسری طرف فلسطین، مصر، اردن، سعودی عرب، عراق اور دوسرے مسلم ملکوں۔ ایشیائی ملکوں میں غلط پالیسیوں کے تحت جینا بھی دشوار ہے۔ فلسطین میں اسرائیل جس طرح ظلم توڑ رہا ہے۔ اور امریکہ اس کو کھلی چھوٹ دے رہا ہے۔ اس سے نوجوان فلسطینی نسل مایوس اور مجبور ہو کر دہشت گردی پر نہیں اترے گی تو اور کیا کرے گی..... عالم اسلام میں دوسرے مقامات پر کشمیر، فلپائن، میں جو ظلم ہو رہے ہیں، ان کو بھی مغرب کی سرپرستی حاصل ہے۔ اس لیے وہاں کے نوجوان جب معاشرے میں سازگار ماحول نہیں پاتے تو بے بسی ان کے ذہنوں پر غلبہ پا لیتی ہے۔ تو وہ خودکش بم دھماکوں اور دوسری کارروائیوں کو ایک انتقام کی صورت دے دیتے ہیں۔ دہشت گرد تنظیمیں ان کے لیے مواقع بھی فراہم کر دیتی ہیں۔

امریکہ اور مغربی ممالک کو مسلم ملکوں میں موجود سیاسی تنازعات شہری پابندیوں، ناانصافیوں اور اقتصادی محرومیوں کو دور کرنے کی طرف ترجیحی توجہ دینی ہوگی۔ ورنہ دہشت گردوں کی تعداد بڑھتی رہے گی۔ اور ان کے ردعمل میں امریکہ میں شہری آزادیوں کو اور زیادہ محدود کرتے رہنا پڑے گا۔

نرا پاگل پن

نرا پاگل پن یہ پیٹریاٹ ایکٹ پر اظہار خیال نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک ڈرامہ ہے۔ جو کینیڈی سینٹر میں چل رہا ہے۔ ہمارے بجٹ میں ایک ڈرامے کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ آج آخری دن ہے۔ اس لیے طے ہوا کہ امریکہ کے جوان مرگ صدر جان ایف کینیڈی کی یاد میں قائم سینٹر میں ڈرامہ بھی دیکھ لیا جائے۔ اور یہ یادگار مرکز بھی..... جو 1962ء میں امریکہ میں ہونے والی دہشت گردی کی شکار عظیم امریکی شخصیت کے نام پر قائم ہے۔ کتنا المناک سانحہ تھا۔ کیسی خوفناک واردات تھی۔ آج تک اس کے محرکات بھی معلوم نہیں ہو سکے۔ آج کل ایسا واقع ہوتا..... تو اس کا الزام چند گھنٹوں کے اندر اندر، اسامہ بن لادن اور القاعدہ پر دھر دیا جاتا..... اور پھر امریکی فوجیں کسی نہ کسی مسلم ملک پر چڑھ دوڑتیں۔

دی کینیڈی سینٹر کا پورا نام جان ایف کینیڈی سینٹر فار دی پرفارمنگ آرٹس ہے۔ یہاں مختلف ہال بھی ہیں۔ آڈیٹوریم بھی اور چھت پر ایک ریستوران بھی..... بورڈ آف ٹرسٹیز میں اعزازی مسند پر مسز لارا بش امریکی خاتون اوّل اور سابقہ خواتین اوّل فائز ہیں۔ جن میں سینٹر ہلیری کلنٹن، مسز جارج بش، مسز رونلڈ ریگن، مسز جمی کارٹر، مسز جیرالڈ آر فورڈ اور مسز لنڈن بی جانسن شامل ہیں۔ عہدیداروں میں بڑے بڑے لوگ ہیں۔ چیئرمین خازن صدر ہیں۔ امریکی صدر کے مقرر کردہ ارکان ہیں۔ کانگریس کے منظور کردہ ایکٹ کے تحت وزیر خارجہ، وزیر صحت،

وزیر تعلیم، چھ سینٹرز، چھ ارکان کانگریس بلحاظ عہدہ ارکان ہیں۔ اسی طرح کولمبیا کے میئر، سمتھ سونین انسٹی ٹیوشن لائبریرین آف کانگریس چیئرمین کمیشن آف فائن آرٹس، نیشنل پارک سروس سے بھی اسی حیثیت سے ارکان ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے ٹرسٹی ہیں۔ اور دلچسپ عہدے ملاحظہ کریں۔ نیشنل سمفنی آرکیسٹرا ایسوی ایشن بورڈ آف ڈائریکٹرز پریذیڈنٹ ایڈوائزری کمیٹی آف دی آرٹس، کینڈی سینٹر نیشنل کمیٹی برائے پرفارمنگ آرٹس، کینیڈی سینٹر انٹرنیشنل کمیٹی آف دی آرٹس جن میں متعلقہ شعبوں سے تعلق رکھنے والے کئی کئی ارکان شامل کیے گئے ہیں۔ کئی ہزار سے زیادہ تعداد میں وہ مخیّر حضرات اور ادارے ہیں جو اس مرکز کے لیے گرانقدر عطیات دیتے ہیں۔ پرفارمنگ آرٹس فنڈ الگ ہے۔ کارپوریٹ فنڈ الگ۔

زندہ قومیں اپنے ثقافتی مراکز کو اس اہتمام سے چلاتی ہے۔ اعلیٰ حکومتی شخصیات، سیاستدان، منتخب ارکان، تاجر صنعت کار، فنکار سب حصہ لیتے ہیں۔ ایک بڑی تعداد رضا کاروں کی ہے۔ جو مرکز میں مختلف شعبوں، ریستورانوں اور گفٹ شاپس پر ذمہ داریاں بغیر کسی تنخواہ کے انجام دے رہے ہیں۔

نرا پاگل پن Shear Madness اپنے نام کے عین مطابق پاگل پن ہی ہے۔ امریکیوں کا پاگل پن دیکھیں کہ یہ بوسٹن میں 22 سال سے چل رہا ہے۔ اور امریکہ کی تاریخ میں سب سے زیادہ دیر جاری رہنے والا ڈرامہ ہے۔ ساری مجنونانہ حرکتیں شیئر میڈنیس ہیئر اسٹائلنگ سیلون میں رونما ہورہی ہیں۔ اس کے اداکار بدلتے رہتے ہیں، اس کے اسکرپٹ میں بھی کچھ تازہ ترین واقعات کے حوالے سے اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے اس میں تازگی برقرار رہتی ہے۔ اس میں حصہ لینے والے فنکاروں کو بہت سے قومی اور علاقائی ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ بتایا جارہا ہے کہ بعض دوسرے ملکوں میں بھی اسی نام سے کمپنیاں قائم کی گئی ہیں۔ اور وہاں بھی ڈرامہ ہورہا ہے۔ جن میں روم، بڈاپسٹ، ڈیٹرائٹ، میکسیکو سٹی، فورٹ لاڈربیل، جوہانسبرگ، لزبن، بیونس آئرس اور میڈرڈ نمایاں ہیں۔ اس سے متعلقہ بوسٹن کی 22 سالہ اور شکاگو کی 16 سالہ کمپنیاں گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں جگہ پاچکی ہیں۔ بوسٹن کی متعلقہ گلی وارنٹن اسٹریٹ اب سرکاری طور پر "شیر میڈنیس ایلے" "نرا پاگل پن گلی" کہلاتی ہے۔ کینیڈی

سینٹر میں یہ پاگل پن 8 اکتوبر 1995ء سے شروع ہوا اور یہ اب تیسرا مرکز ہے جہاں یہ طویل ترین ڈرامہ چل رہا ہے۔

کہانی کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن دلچسپی آخر تک برقرار رکھتی ہے۔ شگوفے کھلتے رہتے ہیں۔ قہقہے لگتے رہتے ہیں۔ بات سے بات نکلتی ہے۔ اور سب کچھ ایک ہی جگہ پر ہوتا ہے۔ مختلف سیٹ نہیں لگانے پڑتے..... ادھر جنوبی ایشیا میں بھی بعض ایسے ڈرامے ہیں جو برسوں سے چل رہے ہیں۔ بمبئی میں ایک مقامی زبان میں چلنے والا ڈرامہ طویل بھی ہے..... اور صرف ایک ہی اداکار کے گرد گھومتا ہے..... اتنے برس دلچسپی برقرار رکھنا بڑا مشکل عمل ہے پاکستان میں شاید ایسا کوئی تھیٹر نہیں ہے۔ جہاں اس قسم کی کامیڈی برسوں سے چل رہی ہو۔ لاہور اور ملتان ڈراموں کے لیے مشہور ہیں۔ لیکن وہاں عریانی اور ذومعنی جملے زیادہ کام دکھاتے ہیں۔

البتہ سیاسی ڈرامے ہیں جو ایک جیسے ہیں۔ اور نصف صدی سے چل رہے ہیں۔ کردار بدلتے رہتے ہیں۔ کہانی بنیادی طور پر وہی رہتی ہے۔ بعض اوقات طریقے بدل جاتے ہیں اور بعض مرتبہ ہتھکنڈے، لیکن ملبوسات وہی، وردیاں وہی، اور مکالمے وہی ہوتے ہیں۔ قومی مفاد ہمیشہ پیش نظر رکھا جاتا ہے۔

کینیڈی سینٹر کے خوبصورت ماحول سے میں کہاں پہنچ گیا ہوں..... ہم جنوبی ایشیا کے ایڈیٹرز بلغارین امریکی جولیانہ کے ساتھ کینیڈی سینٹر سے ہنستے مسکراتے نکل رہے ہیں۔ کہ ہم نے "نرا پاگل پن" عملی طور پر دیکھ لیا۔ کئی دن سے امریکی پالیسیوں کو تو ہم یہی نام دے رہے ہیں۔ لیکن اس کا عملی مظاہرہ بھی دیکھ لیا۔ شاید اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے اس ڈرامے کو اسی لیے چنا ہو..... ورنہ شہر واشنگٹن میں تھیٹر بہت سے ہیں۔ وہاں بھی ڈرامے چل رہے ہیں۔ صرف یہی کیوں دکھایا گیا ہے۔

آخری دن کے تبدیل ہوتے پروگرام

آج انٹرنیشنل وزیٹرز پروگرام کا آخری دن ہے۔ لکھا ہوا تو یہ ہے کہ پینٹا گون میں صبح اعلیٰ افسروں کے ساتھ آن دی ریکارڈ میٹنگز کے لیے کوشش کی جائے گی۔ لیکن شاید یہ کوششیں نتیجہ خیز نہیں رہی ہیں۔ اس کا متبادل پروگرام یہ طے ہوا ہے کہ فارن پریس سینٹر میں امریکہ میں مقیم جنوبی ایشیا کے صحافیوں سے تبادلہ خیال ہوگا۔ موضوع ہے۔

''جنوبی ایشیا کے لیے امریکی پالیسیوں پر جنوبی ایشیا کے صحافیوں سے گول میز بحث''

یہاں بھی کوشش مکمل طور پر کامیاب نہیں رہی ہے۔ صرف پاکستان سے تعلق رکھنے والے دو سینئر صحافی ہی اس بحث میں شامل ہونے آئے ہیں۔ بھارت، سری لنکا، بنگلہ دیش والوں نے اسے ضروری نہیں سمجھا۔ خالد حسن ہیں۔ جو اپنی جگہ بہت اچھے ادیب، دانشور، سیاسی تجزیہ نگار ہیں۔ صدر ذوالفقار علی بھٹو کے پریس سیکرٹری کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ بعد میں مختلف عہدوں پر رہے۔ اب پاکستان کے مختلف روزناموں سے وقتاً فوقتاً نمائندہ خصوصی واشنگٹن کی حیثیت سے وابستہ رہتے ہیں۔ اس وقت روزنامہ ''خبریں'' میں کالم بھی لکھتے ہیں۔ خبریں بھی بھیجتے ہیں۔ ''ڈیلی ٹائمز'' لاہور سے بھی منسلک ہیں۔

دوسرے سینئر صحافی نیر زیدی ہیں۔ جو ایک طویل عرصے سے واشنگٹن میں پاکستان کے سب سے کثیر الاشاعت اخبار ''جنگ'' کی نمائندگی کررہے ہیں۔ امریکی سیاست پر ان کے

تجزیے معتبر ٹھہرتے ہیں۔

دونوں حضرات ویسے ممکن ہے کہ ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہوں۔ لیکن اس بات پر متفق ہیں کہ واشنگٹن میں کسی جنوبی ایشیائی کے لیے اعلیٰ حکام سے خبر حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ یہاں اصل خبریں چھپائی جاتی ہیں۔ اگر کوئی اطلاع دینی بھی ہو تو اپنے پسندیدہ مقامی رپورٹرز کو دی جاتی ہے۔ دوسرے جنوبی ایشیائی اخبارات یا چینل اپنے نمائندوں کو اتنے اچھے مشاہرے نہیں دیتے کہ وہ اپنی رہائش مرکزی علاقوں میں رکھ سکیں۔ کوئی خبر اگر رونما ہو رہی ہو۔ تو اس کا براہ راست علم نہیں ہوتا۔ امریکہ کے اعلیٰ سرکاری حلقوں میں اپنی کم مائیگی کے باعث ایشیا کے اخباری نمائندے کوئی مقام حاصل نہیں کرپاتے۔

جنوبی ایشیا کے لیے امریکی پالیسیاں کبھی یکساں نہیں رہی ہیں..... جب امریکہ کو اس خطے میں کوئی بڑا کام کرنا ہو، تو اعلیٰ سطحی رابطے ہوتے ہیں۔ اور جب یہ وقت گزر جائے تو امریکہ اس علاقے کو نظر انداز کردیتا ہے۔

ان دونوں تجزیہ کار اخبار نویسوں کی رائے سے ہم سب بھی متفق تھے اور ہمارے ساتھ آنے والی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی خاتون بھی اختلاف نہیں کررہی تھیں۔

امریکیوں کی آواز۔ وی او اے

خواہش ہماری بھی تھی کہ وائس آف امریکہ کے دفاتر دیکھ لیں۔ وہاں بہت سے اپنے احباب بھی ہیں اور ہمسایہ ملکوں کے لیے نشریات کا اہتمام بھی ملاحظہ کریں۔ آخری دن اس کا دورہ بھی شیڈول میں شامل کرلیا گیا ہے کہ میریڈیان میں اس آخری نشست سے پہلے ادھر ہولیں۔ جس میں ہمیں اپنے اس سفر اور مشاہدات کا تجزیہ کرکے یہ جاننا ہے کہ کیا سیکھا، کیا سمجھا۔

دی وائس آف امریکہ (وی او اے) یعنی صدائے امریکہ بین الاقوامی ملٹی میڈیا براڈ کاسٹنگ سروس ہے۔ جسے امریکی حکومت فنڈز فراہم کرتی ہے۔ وی او اے کا دعویٰ ہے کہ وہ دنیا بھر میں قریباً 10 کروڑ سامعین کے لیے، خبروں، اطلاعات، تعلیم، اور ثقافتی شعبوں میں ایک ہزار گھنٹوں کی نشریات پیش کرتی ہے۔ یہ پروگرام ریڈیو، سیٹلائٹ، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ سے 50 زبانوں میں سننے والوں تک پہنچائے جاتے ہیں۔

یہاں ہمارے میزبان جارج میکنزی ہیں۔ جو مصنف اور ایڈیٹر ہیں۔

عمارت ایسی ہی ہے۔ جو عام طور پر ریڈیو اسٹیشنوں کی ہوتی ہے۔ وسعتیں، شکوہ، اور کچھ کچھ قدامت کا احساس، پرانے اسٹوڈیوز، بڑے بڑے مائیک، برآمدوں سے گزرتے ہوئے شیشوں سے اندرونی ماحول دکھائی دے رہا ہے۔ وقت کم ہے۔ اس لیے اک نگاہ گزراں۔

بتایا جارہا ہے کہ صدائے امریکہ کا پہلا نشریہ 24 فروری 1942ء میں ہوا کے دوش پر ان الفاظ میں سنا گیا: یہ صدائے امریکہ ہے۔ آج امریکہ کو جنگ پر گئے 79 دن ہوگئے ہیں۔ اب ہم ہمیشہ اس وقت امریکہ اور جنگ کے بارے میں آپ سے باتیں کریں گے۔ خبریں اچھی ہوں یا بری۔ ہم آپ کو سچائی بتائیں گے اب وائس آف امریکہ 24 گھنٹے خبریں پیش کرتا ہے۔ دنیا بھر میں اسکے 40 نمائندے اور 100 فری لانس رپورٹرز واقعات کو رونما ہوتا دیکھتے ہیں۔ اور خبریں فائل کرتے ہیں۔ پہلے وی او اے نے مختلف ممالک کے 1100 ریڈیو اسٹیشنوں سے اپنے تیار کردہ پروگرام نشر کرنے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ 1994ء سے وی او اے ٹیلی ویژن کی دنیا میں بھی داخل ہوگیا۔ جب ''چائنہ فورم ٹی وی'' کا افتتاح کیا گیا۔ یہ پروگرام چینی زبان میں پیش کیا گیا۔

اب وائس آف امریکہ اکیسویں صدی کی جدید ترین ٹیکنالوجی سے مرصع ہوکر منتظمین کے مطابق دنیا کے متعدد ممالک میں آزادی اور امید کی آواز بن گیا ہے۔ جہاں کی حکومتیں اپنے عوام کو صرف وہی سننے دینا چاہتی ہیں۔ جو حکومت بتائے۔

پچاس سے زیادہ مختلف زبانوں میں نشریات باقاعدگی سے جاری رکھنا مشکل ذمہ داری بھی ہے اور مہنگی بھی۔ لیکن امریکہ جیسی سپر طاقت کے لیے اس کا اہتمام کیا مشکل ہے۔ عام لوگ تو کہتے ہیں کہ پراپیگنڈہ ہے۔ سامراجی طاقتیں پراپیگنڈے پر ہمیشہ سرمایہ لگاتی ہیں۔ جبکہ وی او اے کا کہنا ہے کہ وہ صرف سچ بتاتے ہیں۔ صرف حقائق پر مبنی خبریں دیتے ہیں۔ آزادی، جمہوریت، انسانی حقوق کی بات کرتے ہیں۔

مختلف نشریات میں سے ہمارے لیے دلچسپی کی زبانیں عربی، دری، فارسی، ہندی، پشتو، اردو ہوسکتی تھیں۔ عربی کے پروگرام پہلے 1942ء سے 1945ء تک نشر ہوئے 5 سال کے وقفے کے بعد 1950ء سے مسلسل جاری ہیں۔ دری، افغانستان میں بولی جانے والی زبانوں میں سے ایک ہے۔ یہاں پروگرام 1980ء سے اب تک جاری ہیں۔ فارسی میں سلسلہ 1942ء سے 1945ء تک رہا۔ پھر 1949ء سے 1960ء تک۔ پھر 1964ء سے 1966ء تک۔ اس کے بعد وقفوں کو ختم کرکے 1979ء سے یہ باقاعدگی سے اب تک جاری ہے۔ پشتو زبان میں

1982ء سے مسلسل خبریں اور پروگرام سنائے جارہے ہیں۔ اردو پروگرام پہلے 1951ء سے 1953ء تک جاری رہے۔ پھر کچھ وقفہ رہا۔ 1954ء سے باقاعدگی سے اب تک جاری ہیں۔ دوسری زبانوں کے حوالے سے یہ سال مختلف جنگوں کے مطابق ہیں۔ لیکن اردو میں 1954ء کا حوالہ پراسرار ہے۔ کیونکہ پاکستان میں 1954ء میں اس لیے یادرکھا جاتا ہے کہ اس سال سے سیاست میں فوج کا دخل شروع ہوا۔

ہماری نشست افغانستان پروگرام کو آرڈی نیٹر برائے ساؤتھ اینڈ سنٹرل ایشیا ڈویژن سپوز مائی۔ ڈبلیو میوندی کے دفتر میں رہی۔ وی او اے نے جنوبی، وسطی ایشیا اور افغانستان کو یکجا کردیا ہے۔ اور اسے ایک خاتون کے حوالے کردیا ہے۔ جو اردو بھی جانتی ہیں۔ بہت شستہ زبان میں دھیمے لہجے میں گفتگو کرتی ہیں۔ اردو سروس کے چیف ڈاکٹر برائن کیوسلور ہیں۔ امریکی ہیں۔ لیکن بڑی رواں اردو بولتے لکھتے ہیں۔ اردو ادب صحافت پر کافی حد تک عبور ہے۔ بنگلہ سروس کے چیف اقبال بہار چوہدری ہیں۔ ایمبیڈر ضمیر کے پرانے دوست۔ وہ دونوں آپس میں مصروف سخن ہوگئے ہیں۔ ہندی کے چیف جگدیش سرین ہیں۔

ان سب سے حال احوال ہوئے ہیں۔ ہمیں بھی جلدی ہے۔ ان کو بھی پہلے سے اطلاع نہیں تھی اس لیے کسی نشریے کا پروگرام نہیں ہے۔ ہمارے پاکستانی صحافی ساتھی قمر عباس جعفری، رضی الدین، بھی مل گئے ہیں..... پرانی صحبتیں یاد آرہی ہیں۔

اب ہمارے پروگرام کے آخری لمحات ہیں۔ اس لیے اب وطن واپسی کی بے تابی زیادہ ہے۔

کیا سیکھا۔ کیا سمجھا

پہلے تو لگتا تھا کہ یہ دو ہفتے کیسے گزریں گے۔ اجنبی سرزمین..... ناواقف لوگ..... شک و شبے سے دیکھتے سفید فام امریکی۔

آج آخری دن بھی گزرنے والا ہے۔

یہ میریڈیان انٹرنیشنل سینٹر کا وائٹ میئر ڈائننگ روم ہے۔ یہ ہے ایوبلیویشن سیشن۔ پروگرام کے تجزیے کی نشست، کیا اچھا رہا۔ کیا سیکھا، کیا رہ گیا، پروگرام معیاری تھے یا نہیں۔

اس پروگرام کا اہتمام کرنے والے بھی سب موجود ہیں۔ میڈم نان، گرانٹس آفیسر کوہن ڈیوڈ، جولیانہ، رانیا اصیلی، بزرگ میلکم۔

شرکاء کی متفقہ رائے یہ ہے کہ پروگرام دلچسپ تھا۔ معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ مزید بہتر بھی ہوسکتا تھا۔ لیکن اخبار نویس کے لیے بڑی شخصیتوں سے آن ریکارڈ گفتگو میں جو دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ پوری نہیں ہوئی ہے۔ وزیر خارجہ، مشیر برائے سلامتی، یا وزیر دفاع کسی سے ملاقات نہیں ہوسکی ہے۔ نیویارک میں سابق وزیر خارجہ ہنری کسنجر سے میٹنگ رکھی گئی۔ وہ بھی منسوخ کردی گئی۔

ہم غریب ملکوں کے ایڈیٹر تھے..... شاید اس لیے اہم شخصیتوں نے ملنا ضروری نہ سمجھا ہو۔ منتظمین اسطرح مرنجان مرنج..... اور معذرت خواہ..... جیسے ہمارے ہاں ہوتے ہیں.....

دراصل اگست بہت مشکل مہینہ ہوتا ہے۔ اکثر لوگ گرمیوں کی چھٹیوں پر ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ یہ مہینہ تو آپ نے ہی طے کیا آپ کسی اور دنوں میں بلا لیتے۔ ویسے مجموعی طور پر یہ پروگرام بہت مفید رہا ہے۔

سب سے نمایاں کمی یہ رہی کہ 11 ستمبر کے اصل ہدف ورلڈ ٹریڈ ٹاور کے شہر نہیں لے جایا گیا ہے۔ نیویارک میں جانا ضروری تھا۔ 11 ستمبر کا اصل احساس تو وہیں ہوتا۔

میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میں جب یہاں اپنے اخبار کی نمائندگی کر رہا ہوں۔ تو دراصل اس کے لاکھوں قارئین کی طرف سے اس ذمہ داری پر مامور ہوں کہ ان کو بتاؤں کہ میں نے کیا دیکھا۔ ان کے لیے کیا کیا جاننا ضروری ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی اور واحد طاقت امریکہ کی انتظامیہ کیا سوچ رہی ہے کیا اقدامات کر رہی ہے۔ اخبار کیا لکھ رہے ہیں۔ عام لوگ کیا ذہن رکھتے ہیں۔ اصل تجزیہ، تبصرہ اور تفصیلات تو میں وطن واپس پہنچ کر ان کی خدمت میں پیش کروں گا۔ ویسے میں بنیادی طور پر اس بات کا قائل ہوں کہ انسان ہر لمحے اور ہر قدم سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ سو میں نے بھی ان دو ہفتوں میں اپنے ہم سفروں، مقامی لوگوں، اداروں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ''بوسٹن گلوب'' کے دفتر کا دورہ، ان کی روزانہ ایڈیٹوریل میٹنگ میں شرکت میرے لیے بہت سودمند تھی۔

11 ستمبر 2001ء عالمی تاریخ کا ایک اہم سنگ میل ہے۔ جس کے بعد دنیا دیکھنے کے زاویے بدل گئے ہیں۔ امریکیوں نے اسے بہت زیادہ شدت سے محسوس کیا ہے کیونکہ وہ براہ راست ہدف تھے۔ لیکن دوسری قوموں نے بھی اس خوفناک واقعے کو اسی طرح انسانیت کے لیے ایک المیہ سمجھا ہے۔ فرق یہ ہوا ہے کہ دوسرے لوگ اس تاثر میں تھے کہ یہ انسانیت پر حملہ ہے۔ میں بھی ذاتی طور پر اسے بنی نوع انسان پر ایک ضرب کاری سمجھ رہا تھا۔ لیکن یہاں امریکہ میں آکر پتہ چلا کہ آپ لوگ اسے صرف امریکہ پر حملہ تصور کر رہے ہیں۔ آپ امریکیوں کو ایک برتر نسل خیال کر رہے ہیں۔ آپ کے سارے اقدامات کے پس منظر میں بھی یہی طرز عمل شامل ہے۔ جو ظاہر ہے کہ درست نہیں ہے۔

یہاں یہ اعتراف کرنا چاہوں گا کہ ہر میٹنگ میں کھل کر باتیں ہوئیں۔ امریکی سرکار کے

افسروں کی موجودگی کے باوجود امریکی شہری اپنے تاثرات آزادانہ بیان کرتے رہے ہیں۔ ان پر کوئی قدغن کوئی پابندی نہیں تھی۔ اسی طرح ہم سب ایڈیٹرز بھی امریکی پالیسیوں کی بھرپور تنقید کرتے رہے۔ سخت باتیں بھی کیں۔ لیکن کہیں روکا ٹوکا نہیں گیا ہے۔ نہ ہماری مہمانداری میں کوئی کمی کی گئی یہی امریکی معاشرے کی ترقی اور عظمت کا راز ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امریکہ میں جو کچھ دیکھا، جس طرح ذرائع ابلاغ کو اشارے دیئے جاتے ہیں۔ خبروں کا انکشاف کیا جاتا ہے۔ 11 ستمبر جیسے واقعات دوبارہ ہونے کا شوشہ کسی نہ کسی امریکی محکمے کی طرف سے چھوڑا جاتا ہے۔ اور امریکی عوام اس خوف میں مبتلا ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یا دوسرے ملکوں، دوسرے تہذیبوں کے بارے میں ریڈیو، ٹی وی، اخبارات میں ایسی کوئی لہر چھوڑ دی جاتی ہے۔ جس سے عوام کسی حد تک غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ امریکہ بھی دنیا کی بڑی جمہوریتوں میں سے ہے۔ اسی طرح بھارت بھی بڑی جمہوریت ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ وہاں بھی عوام کو حقائق سے بے خبر رکھنے کے لیے ان کے ذہن کو گمراہ کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ ڈس انفرمیشن چلائی جاتی ہے۔ جیسے دسمبر 2001ء میں بھارتی پارلیمنٹ پر حملے کا ڈرامہ رچایا گیا جس میں کوئی بھارتی سرکاری اہلکار ہلاک نہیں ہوا۔ صرف مبینہ حملہ آور ہی مارے گئے۔ ہمارے ساتھی ایڈیٹر بار بار اس واقعے کا تذکرہ کرتے رہے۔ دنیا کی ایک بڑی جمہوریت بھارتی حکومت نے اپنے عوام کو اس سلسلے میں اتنا گمراہ کیا ہے کہ وہ واقعات کا تجزیہ ہی نہیں کرتے۔ یہ ایک پہلو بھی قابل غور ہے۔

ہم یہاں سب اپنے اپنے طور پر آئے ہیں۔ اپنی حکومت کا بریف لے کر نہیں آئے۔ ہم آزاد اور غیر جانبدار حیثیت میں جائزہ لیتے رہے ہیں۔ مگر ہم میں سے بعض کا رویہ ایسا رہا ہے جیسے غلامی کے دنوں میں ہم لندن کے دربار میں جا کر ملکہ ہند کے سامنے التجائیں کرتے تھے۔ یہ غلط ہے۔ اب سب قومیں برابری کا درجہ رکھتی ہیں۔ کوئی اقتصادی طور پر فوجی اعتبار سے کمزور ہوسکتا ہے۔ لیکن جب وہ عالمی برادری میں بیٹھیں گے یا بات ہوگی۔ تو بالکل برابری کی سطح پر، مساوی حیثیت سے، ایک خودمختار اور مقتدر مملکت کے حوالے سے۔

بوسٹن میں بھی ہم نے بہت سیکھا ہے۔ نیمان فاؤنڈیشن کے عمر رسیدہ سربراہ باب جائلز

نے امریکی اخبارات کی بنیادی کمزوریاں بتائیں۔ پھر پلولرزم کے شعبے سے ہمیں بہت کچھ سننے اور سیکھنے کا موقع ملا۔ آخری روز دو سینئر وکلاء نے ''دی پٹریاٹ ایکٹ'' پر جس طرح آزادانہ تبادلہ خیال کیا۔ اس کے مضمرات اور اثرات بتائے۔ وہ بہت ہی چشم کشا تھا۔ میرے لیے تو یہ دورہ بہت Educative رہا۔ میری بڑی ذہنی تربیت ہوئی ہے۔ میں پہلے سے بہتر سوچ سکتا ہوں۔ اور بہتر تجزیہ کرسکتا ہوں۔ اس کے لیے میں امریکی محکمۂ خارجہ کا ہمیشہ شکرگزار رہوں گا۔ اور اپنے قارئین کو پورے اعتماد سے بتاسکوں گا کہ امریکہ کیا سوچ رہا ہے۔

اب جنوبی ایشیا سے آنے والے مدیران اپنے اپنے ملک کے روایتی تحائف امریکیوں کو پیش کررہے ہیں۔ لکڑی کی مصنوعات، چمڑے کی اشیا، اجرکیں، چنگیریں۔

شام ڈھل رہی ہے۔ کل سے سب اپنے اپنے سفر پر روانہ ہوجائیں گے۔

ہماری بیگم اور بڑے صاحبزادے قاسم محمود کینیڈا سے پہنچ گئے ہیں۔ ایک دو روز واشنگٹن کے گلی کوچے اور وہ عمارتیں دیکھیں گے۔ جہاں قوموں کی قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں۔ تاریخ بنتی ہے۔ بگڑتی ہے۔ امریکہ سے نفرت اور بڑھتی ہے۔ بے چارہ امریکہ دنیا کو سب سے زیادہ مالی اور فوجی مدد بھی دیتا ہے۔ سب سے زیادہ ناپسندیدہ بھی ہے۔

امریکیو! کبھی اس پر غور تو کرو۔

اضافی موضوعات

مصنف نے ضروری سمجھا کہ تھنک ٹینکوں اور امریکہ میں مسلمانوں پر الگ سے تحقیق اور مطالعے کے بعد کچھ تفصیلات دی جاسکیں۔

تھنک ٹینک۔ کتنے موثر ہیں؟

پاکستان میں گزشتہ کئی سال سے امریکی تھنک ٹینکوں کے بارے میں پڑھتے.....سنتے آرہے ہیں۔ پہلے پہلے تو یہ اصطلاح یا ترکیب ہی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ پھر معلوم ہوا کہ یہ مشاورتی ادارے ہیں۔ لیکن ان کی ہیئت .....طریق کار.....اور نوعیت کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھی۔ اب ان دو ہفتوں کے پروگراموں میں ہمیں تھنک ٹینکوں کے جواں سال.....اور معمر محققین سے ملنے کا اتفاق بھی ہوا۔ تو ان کی ہمہ دانی.....اور علمی گہرائی سے براہِ راست آگاہی ہوئی۔ اور یہ امریکی انتظامیہ اور رائے عامہ پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں بھی کسی حد تک جاننے کا موقع ملا۔ گزشتہ صفحات میں آپ رینڈ کارپوریشن..... ہیریٹیج فاؤنڈیشن کے اسکالرز سے ملاقاتوں کی روداد سن چکے ہیں۔ پھر بھی میں نے ضروری سمجھا کہ تھنک ٹینکوں سے متعلق کتابیں حاصل کی جائیں۔ اور ان سے مزید اطلاعات تلاش کر کے آپ تک پہنچائی جائیں۔ تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ تھنک ٹینک کیا ہیں۔ ان کا تاریخی پس منظر کیا ہے۔ یہ کیا کرتے ہیں۔ کیا نہیں کرتے۔ امریکی حکومتی پالیسیوں کی تشکیل میں کس طرح دخل اندازی کرتے ہیں۔ امریکی پبلک کے ذہن کو کس طرح تبدیل کرتے ہیں۔

تھنک ٹینک کے بارے میں مختلف تجزیہ نگار..... محققین اور صحافیوں کے درمیان یہ اتفاق

رائے تو ہے کہ یہ پبلک پالیسی انسٹی ٹیوٹ کا درجہ رکھتے ہیں۔ آج کے سیاسی دور میں ان کا اثر اور حوالہ یقیناً ایک حقیقت ہے۔ لیکن ان کی تحقیق.....رائے اور مشاورت کو امریکی انتظامیہ کس حد تک وقعت دیتی ہے۔ کتنا عمل کرتی ہے۔ اور ان کی پالیسیوں کے کیا واقعی مثبت اور انقلابی نتائج نکلے ہیں۔ اس سلسلے میں آراء مختلف پائی جاتی ہیں۔ کیونکہ بعض تھنک ٹینک اپنے بارے میں پراپیگنڈہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ اکثر سیاسی تبدیلیوں یا کامیاب پالیسیوں کو اپنی تحقیق کا نتیجہ قرار دیتے رہتے ہیں۔

یہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ ہر کامیاب پالیسی کے تو بہت سے دعویدار ہوتے ہیں۔ یعنی ہر نتیجہ خیز خیال کے تو سینکڑوں ماں باپ ہوتے ہیں۔ لیکن ہر بری پالیسی بے چاری یتیم ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی کوئی فارمولا چل جائے تو شہر میں بیسیوں افراد دعویٰ کرتے نظر آئیں گے کہ مرکزی خیال میرا تھا۔ میں نے صدر مملکت سے ملاقات میں اس کے لیے کہا تھا۔

امریکہ میں دوسری جنگ عظیم تک ایسے اداروں کی تعداد دو درجن سے بھی کم تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد ان میں رفتہ رفتہ اضافہ ہونے لگا۔ اس کی وجہ سرد جنگ کا بتدریج پھیلاؤ بھی تھا۔ مختلف کتابوں کے مطابق 1980ء تک یونیورسٹیوں وغیرہ میں یہ 1200 سے زیادہ ہوگئے۔ ان میں سے زیادہ تر کے دفاتر واشنگٹن میں ہیں۔ بیسویں صدی کے آخر میں یہ تعداد 1600 تک ہو چکی ہے۔

آپ یقیناً جاننا چاہتے ہوں گے کہ ایک تھنک ٹینک کی ہیئت یا ڈھانچہ کیا ہوتا ہے۔ اصل میں تو ایک یا دو صاحب فکر اس میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک دو لوگ دفتری کارکن اور ایک یا دو ریسرچر..... یہ ایک اوسط درجے کے تھنک ٹینک کی صورت ہے۔ اس کے سالانہ اخراجات اڑھائی لاکھ ڈالر سے 5 لاکھ تک ہوتے ہیں..... ان میں اسٹاف زیادہ نہیں ہوتا۔ یہ باہر سے بھی رپورٹیں وغیرہ تیار کروا لیتے ہیں۔ بڑے تھنک ٹینکوں کا بجٹ 18 سے 20 ملین ڈالر تک ہوسکتا ہے۔ اس وقت رینڈ کارپوریشن کو بجٹ اور اسٹاف کے حوالے سے سب سے بڑا تھنک ٹینک کہا جاسکتا ہے..... جس کا سالانہ بجٹ 100 ملین ڈالر تک ہے۔ اسٹاف کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے۔ اور اس کی اپنی بلڈنگ ہے۔ ایک تھنک ٹینک کو پالیسی انسٹی

ٹیوٹ..... پالیسی ریسرچ کمیونٹی بھی کہا جاسکتا ہے۔

امریکہ میں تھنک ٹینک اس لیے زیادہ کامیاب اور موثر ہوگئے ہیں کہ یہاں سیاسی جماعتی نظام کمزور ہے۔ غیر سرِگرم ہے۔دونوں بڑی سیاسی پارٹیاں ڈیموکریٹس اور ری پبلکن صرف صدارتی انتخابات کے سال کے دوران زیادہ فعال اور متحرک ہوتی ہیں۔ باقی تین سال قریباً ایک سیاسی خلاء رہتا ہے۔ جسے تھنک ٹینک.....اپنی ریسرچ.....اور سفارشات کے ذریعے پر کرتے ہیں۔ صدارتی انتخابی سال کے دوران بھی تھنک ٹینک بہت سرگرم ہوتے ہیں.....کیونکہ دونوں سیاسی پارٹیاں الیکشن کے لیے فعال تو ہوتی ہیں لیکن ان کے پاس مختلف بین الاقوامی امور قومی مسائل پر پالیسیاں مرتب کرنے کے لیے وقت اور افراد نہیں ہوتے۔ اس لیے وہ تھنک ٹینکوں پر ہی انحصار کرتے ہیں۔ جہاں جہاں پارلیمانی نظام کامیاب اور مستحکم ہے۔ وہاں تھنک ٹینکوں کے لیے اتنی گنجائش نہیں نکل سکی ہے۔ امریکہ کے پڑوس کینیڈا اور ادھر یورپ میں تھنک ٹینک زیادہ موثریت اور مقبولیت حاصل نہیں کر سکے۔ اس پر مزید باتیں آئندہ بھی ہوں گی۔

ایک تھنک ٹینک کس طرح وجود میں آتا ہے۔ اس کے خدوخال کیا ہوسکتے ہیں۔ اس پر کوئی ایک رائے نہیں ہے مختلف اوقات میں مختلف تجزیہ نگاروں نے الگ الگ تعریفیں اور توجیہات متعین کی ہیں۔ اور مختلف ادوار میں مختلف نسلوں کے لیے الگ الگ محرکات بیان کیے ہیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ تھینک ٹینک میں پالیسی ساز برادری کو جگہ دی جاتی ہے۔ اور یہ تین قسم کے ہوسکتے ہیں۔

1۔ ایسی یونیورسٹیاں..... جہاں طلبہ نہیں ہیں۔

2۔ جو حکومت سے معاہدے کر کے اس کے لیے کام کرتے ہیں۔

3۔ جو مختلف پالیسیوں کی وکالت کرتے ہیں۔

ایک اور صاحب نے کہا کہ تھنک ٹینکوں کی کم از کم سات اقسام ہوسکتی ہیں۔

1۔ تدریسی لحاظ سے متنوع۔

2۔ تدریسی لحاظ سے مخصوص۔

3۔ معاہدے پر مشاورت۔

4۔ وکالت۔

5۔ پالیسی ساز

6۔ ادبی نمائندگی۔ پبلشنگ ہاؤس

7۔ حکومتی ادارہ

دوسرے کئی مبصرین اور محققین نے اور بھی اقسام بیان کی ہیں لیکن بنیادی شعبے یہی ہیں۔

انہیں بغیر طلبہ کے یونیورسٹیاں واقعتاً کہا جاسکتا ہے۔ کہ ان سے اکثر ماہرین تعلیم، اساتذہ وابستہ ہیں۔ وہ تعلیمی موضوعات پر تفصیلی تحقیق بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کے فرائض میں معاشرے کو درپیش متعدد اہم سیاسی.....اقتصادی.....سماجی مسائل پر وسیع تر مفاہمت کا فروغ شامل ہے۔ جو یقیناً یونیورسٹیوں کا بھی فریضہ ہے۔ لیکن یہ یہاں نہ کلاسز لے رہے ہوتے ہیں۔ نہ باقاعدہ تدریس میں مصروف ہوتے ہیں۔ رپورٹیں بھی تیار کرتے ہیں کتابیں بھی مرتب کرتے ہیں۔

حکومت سے معاہدے کر کے اکثر تھنک ٹینکوں نے بڑی بڑی پالیسی ساز رپورٹیں تیار کی ہیں۔ جن پر مختلف سرکاری محکموں نے عملدرآمد کر کے کامیابی سے مسائل پر قابو پایا ہے۔

اپنے موقف کی وکالت کرنے والے تھینک ٹینکوں نے 1970ء کے بعد زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ ایسے ادارے مضبوط پالیسی کے نکات۔ کو نظریاتی یا جماعتی وابستگی سے ملحق کر کے اس کو جارحانہ انداز میں پیش کرتے ہیں اس طرح پالیسی مباحثوں میں کسی ایک فریق پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

بیسویں صدی کے ابتدائی عشرے امریکہ میں تھنک ٹینکوں کی تشکیل کے لیے انتہائی اہمیت رکھتے ہیں اس وقت اگرچہ ہارورڈ.....جان ہاپکنز.....شکاگو جیسی متعدد ممتاز یونیورسٹیاں موجود تھیں۔ لیکن بعض مخیّر حضرات اور پالیسی سازوں کا خیال تھا کہ ایسے اداروں کی ضرورت ہے جن کا ابتدائی مقصد تدریس نہیں بلکہ تحقیق اور تجزیہ ہو..... اس طرح ان دنوں میں رابرٹ بروکنگز.....اینڈریو کارنیگی..... ہربرٹ ہووا..... جان ڈی راکفیلر..... مارگریٹ اولیویا سیج جیسی

شخصیتوں کی طرف سے فراخ دلانہ عطیات کے نتیجے میں کئی انسٹی ٹیوٹ قائم ہوئیں۔ جن میں رسل سیج فاؤنڈیشن (1907) ۔ کارینگی اینڈاؤمنٹ برائے انٹرنیشنل پیس (1910)۔ کانفرنس بورڈ (1916) دی انسٹی ٹیوٹ آف گورنمنٹ ریسرچ (1916) یہ 1927ء میں بروکنگز انسٹی ٹیوشن قائم کرنے کے لیے انسٹی ٹیوٹ آف اکنامکس..... اور رابرٹ بروکنگز گریجویٹ اسکول آف اکنامکس کے ساتھ مدغم کردی گئی۔ دی ہوورانسٹی ٹیوشن آن وار..... ریولیوشن اینڈ پیس(1919) دی نیشنل بیوروآف اکنامکس ریسرچ (1920) کونسل آف ریلیشنز (1921) قابل ذکر ہیں۔ ان اداروں نے سماجی علوم (سوشل سائنسز) کے اسکالرز کومعقول مشاہروں پر پیشکشیں کیں۔ ان سے رپورٹیں مرتب کروائیں۔

یونیورسٹیوں میں بھی ان موضوعات پر کام ہوتا تھا۔ لیکن وہ تھنک ٹینکوں کی طرح جارحانہ انداز میں اپنی تحقیق کی تشہیر نہیں کرسکتی تھیں۔ اس لیے تھنک ٹینکوں کی تحقیق کو زیادہ شہرت ملی بعض تھنک ٹینک کتابیں بھی شائع کرتے ہیں۔ بعض اپنے ماہانہ یا سہ ماہی جرائد میں ہر تحقیق پیش کرتے ہیں۔ مختلف سرکاری محکمے معاہدے کے تحت تھنک ٹینکوں سے جو دستاویزات تیار کرواتے ہیں۔ ان میں سے بعض کو باقاعدہ منظر عام پر بھی لایا جاتا ہے۔

1946ء سے 1970ء کے درمیان امریکہ میں تھنک ٹینکوں کے حوالے سے ایک نئی لہر دوڑنا شروع ہوئی۔ جس کی وجہ دنیا بھر میں بالخصوص یورپ اور ایشیا میں امریکی پالیسیوں پر سخت تنقید ہونے لگی تھی۔ اس کا جواب ضروری تھا۔ اس وقت کی انتظامیہ کا یہ خیال تھا کہ ڈیلوپمنٹ مراکز کو فنڈز فراہم کرکے یہ مقصد حاصل کیا جائے۔ رینڈ کارپوریشن اور ہڈسن انسٹی ٹیوٹ اسی دور میں وجود میں آئیں۔ 1960ء کے عشرے میں دنیا نے امریکہ میں شہروں میں بالخصوص اقتصادی، سماجی، علمی، اور سیاسی حوالے سے بہت بے چینی دیکھی۔ صدر جانسن نے اربن انسٹی ٹیوٹ سے اسی حوالے سے معاونت حاصل کی۔ پھر اسی عشرے میں آزاد دنیا، کمیونسٹ دنیا اور تیسری دنیا میں سرد جنگ کا آغاز ہوا۔ اس ضمن میں تو تھنک ٹینکوں کو بہت زیادہ مواقع حاصل ہوئے۔ سنٹر فار اسٹریٹجک اینڈ انٹرنیشنل اسٹڈیز۔ (سی ایس آئی ایس) انسٹی ٹیوٹ فار پالیسی اسٹڈیز (آئی پی ایس) کی اسی دور میں بنا رکھی گئی۔ جن سے بعد میں بگنیو برزنسکی، جیمز

شلینگر جیسی شخصیات قریبی طور پر منسلک رہیں۔ جو پہلے امریکی انتظامیہ میں مشیر برائے قومی سلامتی..... اور وزیر دفاع کی حیثیت سے نمایاں مقام حاصل کر چکے تھے۔

محققین کے مطابق 1971ء سے 1989ء کے عشروں میں تھنک ٹینکوں کی تیسری لہر نے امریکہ اور آس پاس کے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لیا۔ اس دور کی خصوصیت یہ تھی کہ اب تھنک ٹینکوں کے مفکرین اپنی پالیسیوں کو حکومت یا معاشرے میں مقبول کروانے کی بجائے امریکی انتظامیہ کی پالیسیوں اور فیصلوں کی وکالت کررہے تھے۔ اب بنیادی طریق کار یہ تھا کہ نظریات اور خیالات کو مارکیٹ میں پیش کرنے پر ترجیح دی جارہی تھی۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا دونوں ترقی کر چکے تھے اس لیے خیالات کو زیادہ وسیع اور موثر انداز میں پیش کرنے میں آسانی حاصل ہورہی تھی۔ اس عرصے میں قائم ہونے والے اداروں میں ہیریٹیج فاؤنڈیشن (1973) راک فورڈ انسٹی ٹیوٹ (1976) لبریشن کاٹوانسٹی ٹیوٹ (1977) اکنامک پالیسی انسٹی ٹیوٹ (1986) قابل ذکر ہیں۔

چوتھی لہر 1990ء سے شروع ہوئی جو قریباً اب تک جاری ہے۔ یہ نظریاتی طور پر کوئی نئے تھنک ٹینک نہیں کہلا سکتے۔ لیکن یہ نئے انداز ضرور رکھتے ہیں۔ ان میں قدر مشترک یہ ہے کہ بعض اپنی میراث کے تحفظ اور اس کے حوالے سے خیالات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ بعض اپنے بانی کی طرز فکر کی ترویج، تاویل اور تعبیر میں مصروف ہیں۔ جیسے کارٹر سینٹر، نکسن سینٹر برائے امن و آزادی (1994) نے اپنے بانیوں کی پالیسیوں اور نظریات پر تحقیق کے متعدد پروگرام شروع کردیئے ہیں۔ بیٹر امریکہ ..... پراگریس اینڈ فریڈم فاؤنڈیشن (1993) میں قائم ہوئی۔ جس کے بانیوں میں امریکی کانگریس کے اسپیکر نیوٹ گنگریچ کا نام بھی شامل ہے۔ یونائیٹیڈ وی اسٹینڈ(1993) صدارتی امیدوار راس پیروٹ نے قائم کی۔ ایمپاورامریکہ 1993ء میں وجود میں آئی۔ اس کی بنیاد رکھنے والوں میں نئے قدامت پسندوں کا ایک موثر گروپ شامل تھا۔ جن میں ژاں کرک پٹرک..... ولیم بینٹ..... اور جیک کیمپ نمایاں تھے۔ اب تک قائم ہونے والے امریکی تھنک ٹینکوں میں سے جو زیادہ ممتاز اور کامیاب رہے ہیں ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہوسکتی ہے۔

نمبر شمار	ادارہ	مقام	سن آغاز	عملہ	بجٹ (موجودہ)
1	رسل سیج فاؤنڈیشن	نیویارک	1907ء	31 معاونین	20 سے 50 لاکھ ڈالر
2	کارنیگی اینڈومنٹ برائے بین الاقوامی امن	واشنگٹن	1910ء	39۔ہمہ وقتی محقق 43۔معاونین	ایک کروڑ ڈالر
3	بروکنگز انسٹی ٹیوشن	واشنگٹن	1916ء	79 ہمہ وقتی محقق 161 معاونین	دو کروڑ ڈالر سے زیادہ
4	ہوور انسٹی ٹیوشن آن وار۔ریولیوشن اینڈ پیس	اسٹینفورڈ	1919ء	80 ہمہ وقتی 20 جزوقتی 130 معاونین	دو کروڑ ڈالر سے زیادہ
5	دی ٹوئنٹیتھ سنچری فنڈ	نیویارک	1919ء	33 ہمہ وقتی 1 جزوقتی 2 معاونین	20 سے 50 لاکھ ڈالر
6	نیشنل بیورو آف اکنامک ریسرچ	کیمبرج	1920ء	500 جزوقتی 45 معاونین	20 سے 50 لاکھ ڈالر
7	کونسل آف فارن ریلیشنز	نیویارک	1921ء	100 ہمہ وقتی جزوقتی 100 معاونین	دو کروڑ ڈالر
8	امریکن انٹرپرائز انسٹی ٹیوٹ فار پبلک پالیسی ریسرچ	واشنگٹن	1943ء	100 ہمہ وقتی 65 معاونین	ایک کروڑ ڈالر
9	رینڈ	سانتا مونیکا	1946ء	543 ہمہ وقتی 80 جزوقتی 453 معاونین	دس کروڑ ڈالر
10	فارن پالیسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ	فلاڈلفیا	1955ء	7 ہمہ وقتی 13 جزوقتی 5 معاونین	دس لاکھ سے بیس لاکھ ڈالر
11	ہڈسن انسٹی ٹیوٹ	انڈیاناپولس	1961ء	54 ہمہ وقتی 10 جزوقتی 13 معاونین	ایک کروڑ ڈالر
12	انسٹی ٹیوٹ فار پالیسی اسٹڈیز	واشنگٹن	1963ء	16 ہمہ وقتی 3 جزوقتی 4 معاونین	10 لاکھ سے 20 لاکھ ڈالر
13	اربن انسٹی ٹیوٹ	واشنگٹن	1968ء	212 ہمہ وقتی 33 جزوقتی 134 معاونین	ایک کروڑ ڈالر
14	سنٹر فار ڈیفنس انفرمیشن	واشنگٹن	1972ء	15 ہمہ وقتی 4 معاونین	دس لاکھ سے 20 لاکھ ڈالر
15	انسٹی ٹیوٹ فار کونٹیمپریری اسٹڈیز	سان فرانسسکو	1972ء	8 ہمہ وقتی اور معاونین	دس لاکھ ڈالر سے کم
16	ہیریٹیج فاؤنڈیشن	واشنگٹن	1973ء	134 ہمہ وقتی 46 معاونین	3 کروڑ ڈالر سے زیادہ
17	ورلڈ انسٹی ٹیوٹ واچ	واشنگٹن	1974ء	14 ہمہ وقتی 16 معاونین	بیس سے پچاس لاکھ ڈالر
18	اتھکس اینڈ پبلک پالیسی سنٹر	واشنگٹن	1976ء	5 ہمہ وقتی 10 جزوقتی 5 معاونین	10 سے 20 لاکھ ڈالر

19	راکفورڈ انسٹی ٹیوٹ	راکفورڈ	1976ء	4 ہمہ وقتی 3 معاونین	10 سے 20 لاکھ ڈالر
20	کاٹو انسٹی ٹیوٹ	واشنگٹن	1977ء	42 ہمہ وقتی جز وقتی 20 معاونین	ایک کروڑ سے دو کروڑ ڈالر
21	نارتھ ایسٹ مڈویسٹ انسٹی ٹیوٹ	واشنگٹن	1977ء	11 ہمہ وقتی 2 جز وقتی 5 معاونین	20 سے 30 لاکھ ڈالر
22	مین ہٹن انسٹی ٹیوٹ فار پالیسی ریسرچ	نیویارک	1978ء	25 ہمہ وقتی 15 معاونین	پچاس لاکھ ڈالر سے زیادہ
23	دی کارٹر سینٹر	اٹلانٹا	1982ء	35 ہمہ وقتی 150 معاونین	ایک کروڑ ڈالر سے زیادہ
24	سٹیزنز فار اے ساونڈ اکنامی فاؤنڈیشن	واشنگٹن	1984ء	98 ہمہ وقتی 2 جز وقتی 10 معاونین	دو کروڑ ڈالر سے زیادہ
25	یونائیٹڈ اسٹیٹس انسٹی ٹیوٹ آف پیس	واشنگٹن	1984ء	50 ہمہ وقتی جز وقتی۔معاونین	ایک کروڑ ڈالر سے زیادہ
26	اکنامکس پالیسی انسٹی ٹیوٹ	واشنگٹن	1986ء	18 ہمہ وقتی 20 معاونین	بیس سے 50 لاکھ ڈالر
27	پروگریسو پالیسی انسٹی ٹیوٹ	واشنگٹن	1993ء	17 ہمہ وقتی 3 معاونین	10 لاکھ سے 20 لاکھ ڈالر
28	ایمپاور امریکہ	واشنگٹن	1993ء	10 ہمہ وقتی 5 جز وقتی	پچاس لاکھ سے ایک کروڑ ڈالر

29	دی پراگریس اینڈ فریڈم فاؤنڈیشن	واشنگٹن	1993ء	4 ہمہ وقتی 5 جز وقتی	20 سے 50 لاکھ ڈالر
30	نکسن سنٹر فار پیس اینڈ فریڈم	واشنگٹن	1994ء	7 ہمہ وقتی 3 معاونین	(دستیاب نہیں)

یہ تو تھے امریکہ کے اہم اور قابل ذکر تھنک ٹینکوں کے کوائف۔ اب ہم ان میں سے چند بڑے تھنک ٹینکوں کے بارے میں بات کرتے ہیں۔

بروکنگز انسٹی ٹیوشن

بروکنگز امریکہ میں سب سے پرانے اور نمایاں تھنک ٹینکوں میں سے ہے۔ واشنگٹن کے ساچوسٹس ایونیو میں اس کا دفتر ہے جو واشنگٹن میں قائم تھنک ٹینکوں کے لیے ایک مقبول مقام ہے۔ سینٹ لوئیس کے بزنس مین.....مخیر، سماجی فلسفی اس بات کے قائل تھے کہ ایک غیر جانبدار .....اور اندرونی طور پر منضبط تحقیقی انسٹی ٹیوٹ پالیسی میکرز اور عوام دونوں کے مفادات پورے کرسکتی ہے۔ ادارے کے اغراض و مقاصد میں بھی اسی منزل کا تعین کیا گیا۔ سائنسی تحقیق..... تعلیم، تربیت، اکنامکس، حکومتی انتظامیہ، سیاسی اور سماجی علوم میں مطبوعات کو محور بنایا گیا۔ اس کی بیشتر آمدنی مخیر وقف اداروں.....نجی عطیات اور اس کے اپنے 200 ملین ڈالر کے اثاثوں سے حاصل ہوتی ہے۔ صرف 4% حکومتی وسائل سے ملتا ہے۔ اکثر یونیورسٹیوں کی طرح اس کے الگ الگ شعبے ہیں۔ مرکزی شعبوں میں اکنامکس اسٹڈیز، خارجہ پالیسی اسٹیڈیز، حکومتی اسٹیڈیز شامل ہیں۔ ہر شعبے کا سربراہ ایک ڈائریکٹر ہے جس کی ذمہ داری تحقیقی کام کی نگرانی کے ساتھ ساتھ اپنے شعبے کے اخراجات پورے کرنے کے لیے فنڈ زجمع کرنا بھی ہے۔

مختلف مقامات پر بروکنگز کے آٹھ مراکز ہیں جو مختلف موضوعات کی پالیسیوں پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔ ان میں سنٹر برائے اربن اور میٹروپولیٹن پالیسی، سنٹر برائے نارتھ ایسٹ ایشین پالیسی اسٹیڈیز.....سنٹر آن دی یو ایس اینڈ فرانس نمایاں ہیں۔ بروکنگز سال میں کم از کم 24 سے 25 کتابیں رسائل بھی شائع کرتی ہے۔

رینڈ

بروکنگز کی طرح رینڈ اپنے وجود کے لیے کسی ایسے مخیّر کی مرہونِ منت نہیں ہے۔ جو خیال کی طاقت کا قائل تھا۔ بلکہ یہ ایسے انجینئروں اور فوجی لیڈرز کی وجہ سے قائم ہوئی، جن کو یقین تھا کہ بین البراعظمی میزائیلوں کی تیاری امریکہ کی سلامتی کے لیے خطرہ بھی ہے اور اس کے تحفظ کی ضمانت بھی۔ 1945ء میں جنرل ایچ ایچ آرنلڈ کمانڈنگ جنرل آف آرمی ایئرفورسز (امریکی فضائیہ کا محکمہ ستمبر 1947ء میں قائم ہوا) نے ڈگلس ایئرکرافٹ کمپنی کے دو انجینئروں آرتھر ریمنڈ اور فرینک کولبوہم کے کہنے پر ڈگلس کمپنی کو رینڈ پروجیکٹ کی تشکیل کے لیے 10 ملین ڈالر کے معاہدے کی پیشکش کی۔ جس کا مقصد تھا وی -I ۔ وی II راکٹ۔ اور مستقبل کے لیے دوسرے بین البراعظمی فضائی ٹیکنیک پر تحقیق کی جائے۔ دو سال تک گفتگو جاری رہی۔ حکومت کو بھی دلچسپی تھی۔ لیکن یہ پروجیکٹ ڈگلس کمپنی کے ساتھ شروع نہ ہو سکا۔ ایئرفورس نے اس پروجیکٹ کو ایئرکرافٹ کمپنی سے الگ کر کے ایک غیر منافع بخش ادارے کے طور پر قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ مئی 1948ء میں تاہم رینڈ کارپوریشن قائم کردی گئی جس کا مقصد تھا ''امریکہ کی سلامتی اور عوامی بہبود کے لیے خیراتی مقاصد، تعلیم اور سائنس کے فروغ کی کوششیں۔'' انجینئر کولبوہم نے ڈگلس کمپنی چھوڑ کر رینڈ کی صدارت سنبھال لی۔ رینڈ کو اب امریکی فضائیہ آرمی..... وزارتِ دفاع کے دفاتر سے 113.5 ملین ڈالر کا سالانہ بجٹ ملتا ہے۔ لیکن اب اس کے تحقیقی موضوعات صرف دفاع اور قومی سلامتی کے معاملات تک محدود نہیں رہے ہیں۔ اب اس کے کئی سو محققین صحت.....دیوانی، فوجداری، انصاف ، سائنس، ٹیکنالوجی، ماحولیات اور انفراسٹرکچر سمیت مختلف موضوعات پر تحقیق کر رہے ہیں۔ رینڈ کئی اہم کتابیں، رپورٹیں، تدریسی جراید شائع کر چکی ہے۔ اپنا ایک گریجویٹ اسکول بھی قائم کیا ہے۔ جہاں طلبہ کو پالیسی امور کی پیچیدگیوں میں جھانکنے کی کثیر الجہتی تربیت دی جاتی ہے۔

دی ہیریٹیج فاؤنڈیشن

رینڈ نے حکومت کے ایک ٹھیکیدار کی نوعیت سے خدمت کی تو ہیریٹیج فاؤنڈیشن نے اس

پالیسی انسٹی ٹیوٹ کی طرز اختیار کی جس کی خواہش حکومتی پالیسیوں کی وکالت کرنے والے تھنک ٹینک کرنا چاہتے تھے۔ ہیریٹیج کی بنیاد 1973ء میں کانگریس کے دو معاونین پال ویریچ اور ایڈون فیولنر نے اڑھائی لاکھ ڈالر سے رکھی تھی۔ جو کولوریڈو کے ایک بزنس مین جوزف کورز نے ادا کیے۔ پالیسی سازوں کو پالیسی سے متعلق اور بروقت اطلاعات فراہم کرنے والے تھنک ٹینک کا خیال دونوں کو اس وقت آیا۔ جب وہ ایک روز سینٹ آفس بلڈنگ میں دوپہر کے کھانے کے لیے بیٹھے۔ فیولنر کو یاد ہے کہ ہم دونوں لنچ کر رہے تھے تو اس نے مجھے ایک رپورٹ دکھائی جس میں سپرسانک ٹرانسپورٹ کے اسرار و رموز بتائے گئے تھے۔ یہ ایک اچھا تجزیہ تھا، لیکن یہ اس روز ملا۔ جب اس پر ووٹنگ ہو چکی تھی۔ اس وقت ہمیں خیال آیا کہ کیوں نہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو اس قسم کی رپورٹ قبل از وقت تیار کرے اور جسے پالیسی ساز استعمال کرسکیں۔ فیولنر نے صدر سے ملاقات کی۔ اور اس سلسلے میں بات کی۔ وہیں سے ہیریٹج کے خیال نے جنم لیا۔

ایک کریانہ اسٹور کے اوپر ایک مختصر سے دفتر سے اس کا عمل شروع ہوا۔ 1970ء کے عشرے کی ابتدا میں ہی اسے مقبولیت حاصل ہونے لگی۔ ریگن کے دور میں یہ سب سے نمایاں تھنک ٹینک بن گیا اب یہ کیپٹل بلڈنگ سے چند بلاک دور ایک اہم مقام پر ایک پرشکوہ دفتر میں موجود ہے۔ ہیریٹیج کا بنیادی مقصد پالیسی سازوں، شہریوں اور میڈیا پر یہ زور دینا ہے کہ وہ آزاد تجارتی اداروں، محدود حکومت، شخصی آزادی، روایتی امریکی اقدار، اور ایک مضبوط قومی دفاع کے اصولوں کو اپنا نصب العین بنائیں۔

دوسرے وکالتی تھنک ٹینکوں کی طرح ہیریٹیج اپنے مشن کو خفیہ نہیں رکھتا ہے۔ اس کے صدر ایڈون فیولنر کا کہنا ہے: '' ہمارا کام واشنگٹن پبلک پالیسی کمیونٹی .....خاص طور پر کانگریس اور سینٹ پھر ایگزیکٹو برانچ اور تیسرے قومی ذرائع ابلاغ کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے رہنا ہے۔اس کی پالیسیوں کو پذیرائی نصیب ہوئی ہے۔ اس کا بجٹ بھی دوگنا ہوگیا ہے۔ کم از کم دو لاکھ چالیس ہزار افراد اسے سالانہ چندہ دیتے ہیں۔ دوسرے کئی اداروں سے بھی عطیات ملے تھا۔ ان سب کا مقصد اپنے قدامت پسند نظریات کا فروغ ہے۔ صرف ایک مخیّر صاحب رچرڈ

میلن سکیف اب تک انہیں دو کروڑ ڈالر سے زیادہ عطیات دے چکے ہیں۔

ایمپاور امریکہ

ایمپاور امریکہ کو بھی ہیریٹیج کی طرح امریکہ کے قدامت پسندوں کی نمایاں حمایت حاصل ہے۔1993ء میں اسے چار ممتاز قدامت پسندوں ولیم جے بینٹ، جین کرک پٹرک، جیک کیمپ، ون ویبر نے قائم کیا۔ یہ سب صدر ریگن اور صدر بش کے دور میں وزارتی سطح کے عہدوں پر خدمات انجام دے چکے تھے۔اس کا بنیادی مقصد پبلک پالیسی مسائل کے ایسے حل پیش کرنا ہے۔ جن سے زیادہ سے زیادہ آزاد مارکیٹوں اور انفرادی ذمہ داریوں کی حوصلہ افزائی ہو۔ دوسرے تھنک ٹینکوں کی نسبت ایمپاور امریکہ ایک قدم آگے ہے۔ صرف رپورٹیں ہی تیار نہ کی جائیں بلکہ ان رپورٹوں پر عملدرآمد کروانے میں بھی اپنا کردار ادا کیا جائے۔ اس کے لیے یہ پہلے پالیسیوں کے لیے مباحثے کرواتا ہے۔ جس میں اخبار نویسوں اور سیاسی رہنماؤں کو شامل کر کے ایک اتفاق رائے حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ نچلی سطح سے شروع ہونے والی تحریکوں پر بھی زور دیتا ہے کہ ان کے ذریعے مسائل کی تشہیر بہتر انداز میں ہوتی ہے۔ اب اس کا بجٹ پچاس لاکھ سے ایک کروڑ ڈالر ہو گیا ہے۔ جو مختلف افراد اور اداروں کے عطیات اور مخیّر فاؤنڈیشنوں کی گرانٹس سے پورا ہوتا ہے۔ اس نے پانچ مرکزی پالیسی امور پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔

.....انٹرنیٹ اور ٹیکنالوجی پالیسی۔

..... تعلیمی اصلاحات۔

.....ٹیکس اصلاحات۔

.....سوشل سیکورٹی اصلاحات۔

.....نیشنل سیکورٹی۔

تحقیق کے نتائج باقاعدہ شائع کیے جاتے ہیں۔ ان مطبوعات کی تقسیم کے علاوہ ایمپاور امریکہ کا اسٹاف کانگریس کی کمیٹیوں کے سامنے پیش بھی ہوتا ہے اور مختلف نیوز نیٹ ورکس پر حالاتِ حاضرہ کے پروگراموں میں خصوصی ماہرین کے طور پر حصہ بھی لیتا ہے۔

امریکہ میں اسلام اور مسلمان

امریکہ میں اسلام گزشتہ دو تین دہائیوں میں تیزی سے پھیلا ہے۔ امریکی انتظامیہ بھی یہ کہتی رہی ہے کہ امریکی بڑی تعداد میں اسلام قبول کر رہے ہیں اور یہ سب سے زیادہ اپنایا جانے والا مذہب ہے۔ گیارہ ستمبر 2001ء کے واقعات نے اگرچہ اسلام کے بارے میں ایک منفی تاثر پیدا کیا۔ لیکن اس کے بعد اسلام کو سمجھنے۔ اسلامی تعلیمات کے بارے میں جاننے اور پڑھنے کے رجحانات بھی بہت تیز ہوئے ہیں۔ قرآن پاک بمعہ انگریزی ترجمے کے نسخے لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوئے ہیں۔ مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں کئی پرانی کتابوں کے تازہ ایڈیشن بھی شائع ہوئے ہیں۔

نئی امریکن نسل میں اسلام کے بارے میں خاص طور پر بہت گہرا تجسس پایا جاتا ہے۔ اس لیے پبلشرز، ٹی وی چینل مجبور ہیں کہ وہ ایسی کتابیں شائع کریں۔ ایسے پروگرام پیش کریں۔ جن کے ذریعے نوجوان امریکیوں کے ذہنوں میں ابھرتے سوالات کا جواب مل سکے۔

امریکہ میں باقاعدہ کوئی مسلم شماری تو نہیں ہوئی ہے۔ لیکن مختلف مضامین، کتابوں، جرائد اور رپورٹوں کے مطابق مسلمان امریکہ کی کل 28 کروڑ کی آبادی میں 60 لاکھ کے قریب ہیں۔ جن میں مقامی افریقی، امریکی مسلمانوں کے علاوہ جنوبی ایشیاء بالخصوص بھارت، پاکستان، مشرقِ بعید اور مشرقِ وسطیٰ سے آنے والے تارکین وطن بھی شامل ہیں۔ مسلمانوں نے اپنی الگ

الگ تنظیمیں بھی قائم کی ہوئی ہیں۔ جو بہت موثر انداز سے اپنا موقف عام امریکیوں اور انتظامیہ تک پہنچاتی ہے۔

2000ء میں مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن نے سٹینفورڈ یونیورسٹی میں ہفتہ اسلامی بیداری منایا۔ جس کا نصب العین تھا ''میں سوچتا ہوں اس لیے اسلام ....'' اس کے بعد مختلف یونیورسٹیوں میں بھی اسی طرح کی تقریبات ہوئیں۔ اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ (اسنا) کا ہیڈ کوارٹر پلین فیلڈ ریاست انڈیانا میں ہے۔ جہاں جدید اینٹوں سے تعمیر مسجد اور دفاتر میں ہر وقت سرگرمی جاری رہتی ہے۔ ایک رسالہ اسلامک ہورائزن بھی شائع ہوتا ہے۔ اسنا نے مسلم اسٹوڈینٹس ایسوسی ایشن سے ہی جنم لیا تھا۔ اسنا نے پہلے سے مقیم مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والے اور نئے تارکین وطن مسلمانوں کو یکجا کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ اس سلسلے میں مختلف ریاستوں میں مسلم کنونشن بھی منعقد کیے ہیں۔ اسکول قائم کرنے پر توجہ دی ہے۔ اسلامی مراکز بھی تشکیل دیئے ہیں۔

''ایک نیا مذہبی امریکہ'' کی مصنف ڈیانا ایل کی نے دوسرے مذاہب، بدھ مت، ہندومت، بہائی، جین وغیرہ کے ساتھ ساتھ امریکہ میں اسلام کے حوالے سے بھی بہت تحقیق کی ہے۔ مختلف ریاستوں میں مقیم مسلمانوں کے کنونشنوں..... مذہبی رسوم میں شرکت کی۔ مساجد..... اسلامی اسکولوں..... اور اسلامی مراکز میں خود گئیں۔ منتظمین سے ملاقاتیں کیں۔ یہ تفصیلات ان کی اہم تصنیف میں پڑھے جانے کے قابل ہیں۔ وہ اسلام کے پھیلاؤ سے خوفزدہ نہیں ہیں بلکہ روشن پہلو دیکھتے ہوئے کہتی ہیں کہ مساجد کے میناروں اور گنبدوں نے امریکہ کے افق کو حسین تر کردیا ہے۔ ان کے مطابق پورے امریکہ میں 1400 کے قریب بڑی اور مرکزی مساجد ہیں۔ ہاؤسٹن میں دو درجن سے زیادہ اسلامی مراکز ہیں۔ جن میں سے دس اسلامک سوسائٹی آف گریٹر ہاؤسٹن کے رکن ہیں۔ جو 1968ء میں قائم کی گئی تھی۔

مسلمانوں کی ترجمانی کرنے والی دوسری تنظیموں میں امریکن مسلم کونسل..... مسلم پبلک افیئرز کونسل، امریکن مسلم الائنس ..... ہارورڈ اسلامک سوسائٹی، اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ بھی قابل ذکر ہیں۔ کئی ریاستوں اور شہروں میں متعدد تنظیمیں مقامی طور پر بھی سرگرم عمل ہیں۔

واشنگٹن سے کچھ دور فالز چرچ..... لٹل مکہ..... مکۃ الصغیر کہلاتا ہے۔ جو عرب مسلمانوں کا گڑھ ہے۔ گلیوں میں دور دور تک عرب مسلمانوں کی دکانیں..... کافی ہاؤس..... ریستوران، کریانہ اسٹورز ہیں۔ یہاں کے ہائی اسکول میں مسلمان طلبہ کل تعداد کا 12% ہیں۔

امریکہ میں پہلا مسلمان کب اور کیسے پہنچا۔ ڈیانا ایل ایک نے اس پر بھی گہری تحقیق کی ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں افریقہ سے جبری طور پر لائے جانے والے ایک کروڑ انسانوں کو غلام بنایا گیا ان میں سے کم از کم دس فی صد مسلمان تھے۔ اور ان میں اکثر پڑھے لکھے تھے۔ ان کے سفید فام آقاؤں نے بھی ان کی دیانتداری..... فرض شناسی کی تعریف کی۔ ان مجبور و مظلوم افریقیوں سے ہی امریکہ میں مسلمانوں کی پہلی نسل کا آغاز ہوا۔ ان کے بارے میں کئی کتابیں اور دستاویزات دستیاب ہیں۔ جبری غلامی کے بعد یہ مسلمان باقاعدہ امریکی شہری بنتے رہے۔ اور یہاں مستقل آباد ہوتے رہے۔ شروع میں انہیں اپنی جائیداد بنانے اور خریدنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

یہودیوں اور عیسائیوں میں اس وقت بھی اسلام کا خوف غالب تھا۔ اسلام فوبیا کی اصطلاح عام تھی۔ 1893ء میں شکاگو میں World's Parliament of Religions - مذاہب کی عالمی پارلیمنٹ منعقد کی گئی۔ اس وقت خلافت عثمانیہ موجود تھی۔ وہاں سے کوئی مسلم مندوب نہیں لیا گیا۔ یہاں مسلمانوں کی نمائندگی محمد رسل الیگزینڈر ویب نے کی۔ جو نیویارک کے ایک اخباری پبلشر کے صاحبزادے تھے۔ امریکہ کے ہائی اسکول، کالج سے تعلیم یافتہ ویب پہلے رپورٹر کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے پھر فلپائن میں امریکہ کے قونصل جنرل مقرر ہوئے۔ وہاں انہیں اسلامی تعلیمات قریب سے جاننے کا موقع ملا۔ اور انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔

مذاہب کی عالمی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے بڑے اعتماد سے کہا"
''میں امریکیوں کا امریکی ہوں۔ میں بھی برسوں تک ہزاروں امریکیوں کی غلط فہمیوں کو ساتھ لے کر چلتا رہا۔ جو وہ اب بھی لے کر پھر رہے ہیں۔ یہ غلط فہمیاں تاریخ میں قدآور ہوگئی ہیں۔ جعلی تاریخ نے اسلام کے بارے میں آپ کے نظریے کو متاثر کیا ہے۔ دس سال پہلے میں

نے مشرقی مذاہب کا مطالعہ شروع کیا۔ غلط فہمیوں کے زیر اثر اس وقت بھی میں نے اسلام کو درخور اعتنا نہیں خیال کیا۔ کیونکہ اس کو ہم اتنا بدعنوان سمجھتے تھے کہ یہ توجہ کے قابل بھی نہیں تھا۔ لیکن جب میں گہرائی میں گیا۔ اور یہ جانا کہ اسلام حقیقتاً کیا ہے۔ اور رسول عربی کون تھے کیا تھے..... میں اپنے خیالات بدل لیے۔ اور اب میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک مسلمان ہوں۔''

اس وقت امریکہ میں بھی یہ تصور چھایا ہوا تھا کہ اسلام تلوار کے ذریعے پھیلا ہے۔

ویب نے اسی حوالے سے کہا: ''میں امریکہ اس لیے نہیں لوٹا ہوں کہ میں آپ سب کو مسلمان بناؤں۔ میں نہیں کہتا کہ آپ ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک میں قرآن لے کر چل پڑیں اور ہر اس شخص کو قتل کر ڈالیں۔'' جو لاالہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ '' نہ کہے۔ مجھے امریکی دانش، اور تدبّر پر اعتماد ہے۔ مجھے انصاف سے امریکی محبت پر یقین ہے۔ جو امریکی ذہن اسلام کو سمجھے گا۔ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ اسے پسند نہ کرے۔''

ایک صدی پہلے کی آواز اب بھی امریکہ میں گونجتی ہے۔ مسلمانوں کی تنظیمیں امریکیوں سے یہی کہتی ہیں کہ آپ خود اسلام کا مطالعہ کریں۔ ذرائع ابلاغ نے پروپیگنڈے کے ذریعے اس کی جو مسخ شدہ صورت پیش کی ہے۔ اس پر نہ جائیں۔ اسلامی تعلیمات کو خود پڑھیں پھر اپنی رائے قائم کریں۔

واشنگٹن میں سعودی عرب کے سفارت خانے کی طرف سے انتہائی خوبصورت لے آؤٹ کے ساتھ اور قیمتی کاغذ پر شائع شدہ ایک بروشر "Understanding Islam and the muslims" اسلام اور مسلمانوں کی تفہیم، کے زیرِ عنوان تقسیم ہوتا ہے۔ جس میں مختصراً یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کیا ہے، مسلمان کون ہیں۔ مسلمانوں کے عقائد کیا ہیں، مسلم کیسے بنتا ہے۔ اسلام کا مطلب کیا ہے۔ اسلام اکثر اجنبی کیوں لگتا ہے کیا عیسائیت اور اسلام کی بنیادیں الگ ہیں۔ خانہ کعبہ کی کیا اہمیت ہے۔ حضور اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں۔ وہ پیغمبر خدا کیسے بنے۔ اسلام نے دنیا کو کیسے متاثر کیا۔ قرآن پاک کیا ہے۔ اس کی تعلیمات کیا ہیں۔ دوسری مقدس تعلیمات کیا ہیں۔ احادیث رسول کی اہمیت کیا ہے۔ کیا اسلام دوسرے عقائد کو برداشت

کرتا ہے۔ مسلمان حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں۔ مسلمانوں میں خاندان کی اہمیت کیوں ہے۔ مسلمان خواتین کے حقوق کیا ہیں۔ کیا ایک مسلمان ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکتا ہے۔ اسلامی شادی اور مسیحی شادی میں فرق، مسلمان اپنے بزرگوں سے کیا سلوک کرتے ہیں۔ موت کے بارے میں مسلمانوں کے تصورات، جنگ کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے۔ خوراک پر اسلام کی تعلیمات، مساجد کی تعمیر میں مختلف طرز ہائے تعمیر اور ثقافت، امریکہ میں اسلام، اسلام حقوق انسانی کی ضمانت کیسے دیتا ہے۔

امریکی ذہن جیسے سوچتا ہے۔ امریکہ میں طرز زندگی جیسی ہے۔ آپ کو انہی اصطلاحات اور اسی حوالے سے اسلام کے بارے میں سمجھانا پڑتا ہے۔ تب وہ اسلام کی تعلیمات کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ ہم اپنے اندازِ فکر سے انہیں سمجھائیں گے۔ تو وہ کچھ نہیں سمجھ پائیں گے۔

11 ستمبر سے پہلے بھی امریکن معاشرے کے بعض حصوں میں مسلمانوں کو مشکلات کا سامنا تھا۔ بعض متعصب یہودی اور عیسائی تنظیمیں مسلمانوں پر تنقید کرتی رہتی تھیں۔ اور ان پر انتہا پسندی کا الزام عائد کرتی تھیں۔ نیویارک میں ورلڈ ٹاور، واشنگٹن میں پینٹا گون پر حملوں کے بعد تو ان تنظیموں اور ان کے ساتھ ساتھ دوسرے اداروں کو بھی موقع مل گیا۔ اور انہوں نے مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کی مہم شروع کردی۔ چونکہ ان بھیانک وارداتوں میں مشرقِ وسطیٰ کے نوجوان ملوث بتائے گئے تھے۔ اس لیے مساجد پر حملے ہوئے۔ مسلمانوں کی تجارت، بزنس، کمپنیاں، تباہ کردی گئیں۔ بعض مقامات پر جنوبی ایشیا سے تعلق رکھنے والے تاجروں، دکانداروں اور ملازمت پیشہ افراد کو نشانہ بنایا گیا۔ چاہے وہ مسلمان نہیں بھی تھے۔ حالانکہ یہ لوگ بڑی ذمہ داری سے اسی طرح اپنی زندگی گزار رہے تھے جس طرح دوسرے امریکی۔ ایک تنظیم نے اس سلسلے میں امریکہ کے مختلف حصوں میں مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں سے ملاقاتیں کیں۔ ان کے تاثرات معلوم کیے۔ ایک اسٹور کے منیجر یوسف طلعت نے کہا کہ وہ 26 سال سے امریکی شہری کی حیثیت سے قانون کی پابند زندگی گزار رہا تھا۔ اور یہ سمجھتا تھا کہ صدر بش نے مسلمان امریکیوں کا دفاع بہت کامیابی سے کیا ہے۔ لیکن اب جو کوائف جمع کیے جا رہے ہیں۔ اس سے اسے تشویش لاحق ہوگئی

ہے کہ امریکی انتظامیہ نسلی اور مذہبی امتیاز سے کام لے رہی ہے۔ میرے جیسے قانون کی پیروی کرنے والے باقاعدگی سے ٹیکس ادا کرنے والے امریکی کے ساتھ یہ قطعی نامناسب ہے۔ یہی سلوک میرے پڑوس میں رہنے والے یا ساتھ والے دکاندار سے کیوں نہیں کیا جاتا۔

یہیں مسلمانوں نے 11 ستمبر کے بعد ایک تنظیم سالیڈریٹی انٹرنیشنل یو ایس اے قائم کی ہے۔ جس کا مقصد موجودہ حالات میں مسلمانوں کو قانونی تحفظ فراہم کرنا ہے۔ الیف بی آئی وغیرہ کی تفتیش کی صورت میں وکیل کی مدد دینا ہے۔ عام طور پر مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ زیادہ نمایاں نہ ہوں۔

ڈاکٹر سونیا غیالا کا کہنا ہے کہ 11 ستمبر کے بعد ان کے پاس آنے والے مریضوں کی تعداد کم ہوگئی ہے۔ صدر بش کی اسلامی مرکز واشنگٹن میں آمد کو وہ دوسرے انداز سے دیکھتی ہیں ان کا کہنا ہے کہ اس سے مسلمانوں اور بالخصوص عربوں کے خلاف امتیاز کے رجحانات زیادہ شدید ہوئے ہیں۔ صدر اگر یہاں نہ جاتے تو مسلمان شاید اس طرح توجہ کا مرکز نہ بنتے۔ 19 سالہ سارہ ولی کو یہ تشویش ہے کہ اب نئی قانون سازی سے ان کی عبادت کا حق بھی زد میں آسکتا ہے۔ اس سے ان کے آئینی حقوق متاثر ہو رہے ہیں۔ سارہ کو اپنے مسلم اور مصری ہونے پر فخر ہے۔ اور وہ اسی اعتماد کے ساتھ امریکہ کے حق اور شہری آزادیوں کا لطف اٹھا رہی تھی۔ اب جو حالات رونما ہو رہے ہیں۔ اب وہ نہ خود پہلے سی رہی ہے۔ اور نہ ہی وہ امریکہ کی سہولتوں سے محظوظ ہوسکے گی۔ انہوں نے سب کچھ چھین لیا ہے۔

مسلمانوں میں ایک بڑی تعداد ایسی ہے۔ جنہوں نے انتہائی صدق دلی اور پرامن انداز سے ایک طرف عام امریکیوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ کہ اسلام دہشت گردی نہیں سکھاتا۔ تشدد کی تعلیم نہیں دیتا۔ دوسری طرف مسلمانوں کو بھی باور کروایا ہے کہ انہوں نے اپنے طور پر عام شہریوں سے تعلقات میں بہتر ساکھ کی کوششیں نہیں کی ہیں۔ ان میں اسلامک ایسوسی ایشن آف ریلے نارتھ کیرولینا کے منتظمین اور یہاں کی مسجد کے امام محمد بیعنونی بھی شامل ہیں جنہوں نے بھرپور استقامت سے یہ ثابت کیا کہ قرآن پاک بے گناہوں کی ہلاکت کی مذمت کرتا ہے۔

دوسری طرف امریکہ میں اکثر مسلمان اور بالخصوص عرب اس امر کے قائل ہیں کہ صدر بش اگر واقعتہً دہشت گردی کے خلاف جنگ کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور دہشت گردی کے اسباب کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنی خارجہ پالیسی میں تبدیلیاں لانا ہوں گی، مشرق وسطٰی میں اسرائیل کی حمایت میں ہٹ دھرمی کو ترک کرنا ہوگا۔ اسرائیل کی جب تک یہ ناجائز محبت ختم نہیں ہوگی۔ مشرق وسطٰی میں انتہاپسندی باقی رہے گی۔

ایک حلقے کا کہنا ہے کہ صدر بش آزاد فلسطین ریاست کے قیام کی حمایت کرتے ہیں۔ لیکن انہیں اس کے حقیقی قیام اور اس کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے سنجیدگی سے اقدامات کرنے ہوں گے۔

دوسری طرف اکثر مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ اب امریکہ میں مقیم تمام مسلمانوں کو اپنی زبان اور ملک کے امتیاز سے بالاتر ہوکر امریکی سیاسی عمل میں بھرپور انداز میں شامل ہونا چاہیئے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ عرب اور دوسرے مسلم امریکی اس نظام کا سرگرم حصہ بن جائیں جو پالیسی تشکیل دیتا ہے۔ وہ شہری بنیں۔ ووٹر بنیں اور عہدوں کے لیے الیکشن بھی لڑیں۔ اگر آپ امریکی ہیں تو صحیح معنوں میں امریکی بنیں۔ اور امریکی نظام میں اپنا کردار بھرپور انداز سے ادا کریں۔"

یہ ایسی مثبت سوچیں ہیں..... جو امریکہ میں مسلمانوں کو واقعتہً ان کا جائز اور باوقار مقام دلاسکتی ہیں۔ سان فرانسسکو میں مقیم ایک مسلمان انجینئر شاہد امان اللہ کا کہنا ہے۔ کہ امریکی اور اسلامی اقدار میں فاصلے نہیں ہیں۔ امریکی بھی اپنے خاندان..... ایمان..... محنت..... اور ایک بہترین فرد اور معاشرے کے لیے کام پر یقین رکھتے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات بھی یہیں ہیں۔ اگر دونوں ایک دوسرے کو سمجھنے کی سنجیدہ کوششیں کریں تو تضادات اور نفرتیں ختم ہوسکتی ہیں۔

حال ہی میں نیویارک کی ایک مسجد کے امام فیصل عبدالرؤف کی تصنیف..... "اسلام کے نزدیک کیا جائز ہے" شائع ہوئی ہے۔ یہ مسجد 11 ستمبر کو نشانہ بننے والے ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے 12 بلاک نزدیک واقع ہے۔ امام فیصل نے اپنی تحقیق اور مطالعے کے نتیجے میں یہ بتانے کی

کوشش کی ہے کہ یہ خطرناک ہوگا کہ امریکہ یا اسلام میں سے کسی کے نظریات کا دوسرے کے عمل سے تقابل کیا جائے۔ اس سے تضادات نظر آئیں گے۔ دونوں کے نظریات کا نظریات سے..... عمل کا عمل سے موازنہ کیا جائے۔ امام فیصل مختلف امور کا جائزہ لیتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ امریکہ درحقیقت ایک اسلامی ملک ہے۔ مطلب یہ کہ ایسا ملک جس کے نظام زیادہ تر ان بنیادی اصولوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ جن کا اسلامی قوانین ایک حکومت سے تقاضا کرتے ہیں۔

اس تاثر کا ایک مظہر وہ باعمل مسلمانوں کی ان قطاروں کو بتاتے ہیں جو مختلف مسلم ملکوں میں امریکہ کے سفارت خانوں اور قونصلیٹوں کے ویزا آفسوں کے سامنے لگی ہوئی ہیں۔ امام فیصل خود بھی مصر، ملائیشیا اور انگلینڈ میں قیام کے بعد امریکہ میں لڑکپن میں داخل ہوئے تھے۔ ان کی تصنیف کا عنوان ہے "اسلام کے نزدیک کیا جائز ہے" اس کا ذیلی نام یہ بھی ہوسکتا ہے۔ "اور امریکہ کے نزدیک کیا جائز ہے" امام فیصل کویت کی پیدائش ہیں۔ تعلیم امریکہ میں ہی حاصل کی۔ کولمبیا یونیورسٹی سے ڈگری لینے والے فیصل کو امریکہ کی تاریخ، اقدار، شہری اصولوں پر اتنا عبور حاصل ہے۔ جو امریکہ میں پیدا ہونے والے اسکالرز کو بھی نہیں ہوگا۔

دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ ایک طرف تو اعتدال پسند امریکی مسلمانوں کو کھل کر اظہار خیال کی دعوت دیتے ہیں۔ دوسری طرف وہ امریکی اقدار سے بھرپور محبت بھی ظاہر کرتے ہیں اور ان پر مکمل اعتماد بھی کرتے ہیں۔ مگر ساتھ ساتھ وہ یہ زور بھی دیتے ہیں کہ امریکی اپنی اقدار کو برقرار رکھیں جنہیں اس وقت شدید چیلنج درپیش ہیں ان کو یہ خدشہ ہے کہ موجودہ بحران میں کہیں امریکی ہی ان اقدار اور اصولوں سے دور نہ ہوجائیں جو اعلیٰ ترین ہیں۔ اور اسلامی اقدار کے نزدیک ہیں۔ ان کا تجزیہ ہے کہ موجودہ تنازع خالصتاً مذہبی نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے عام تنازعات کی طرح یہ اختیارات اور اقتصادی مفادات کا تصادم ہے۔ ایک انتہائی فکر انگیز تحقیق ملاحظہ کریں:

"دنیا بھر میں مسلمان ان اصولوں پر اعتماد کرتے ہیں جو امریکی حکمرانی کی بنیاد ہیں اور اسے اپنے لیے پسند بھی کرتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ امریکہ نے تاریخی تناظر میں جو اقدامات کیے ہیں۔ اس سے یہ طاقت ورتا' ابھرتا رہا ہے کہ امریکہ مسلمانوں کو ان کے ناقابل تغیر حقوق سے محروم کرنے میں کوشاں ہیں۔"

ان کی ایک دلیل یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں قرآن کے مطابق زور اس بات پر ہے کہ ایک منصفانہ اور نیک معاشرہ قائم کیا جائے۔ قرآنی احکام اس امر کو اسی طرح دینی ذمہ داری قرار دیتے ہیں۔ جیسے نماز کے قیام کو..... جبکہ منصفانہ معاشرے کا قیام امریکیوں کے نزدیک ایک سیکولر ذمہ داری ہے۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک مذہب اور مملکت کو الگ الگ رکھنے کا نقطۂ نظر کیا ہے۔

نیک معاشرے کا قیام امریکہ اور مسلمانوں دونوں کا نامکمل ایجنڈا ہے۔ الگ الگ طریقے دراصل ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ امریکہ کا نامکمل ایجنڈا۔ اور منزل تک پہنچنے کا راستہ مذہب ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ سوال یہ ہے کہ اپنے مذہبی تعین کو آئین کی حدود میں رہتے ہوئے کیسے ظاہر کرنا ہے۔ جبکہ مسلمانوں کا نامکمل ایجنڈا یہ ہے کہ مسلم قوانین کے طے کردہ رہنما خطوط میں رہتے ہوئے۔ جمہوری معیشت کو آئینی طور پر کیسے حاصل کرنا ہے۔

امام فیصل پھر یہ لکھتے ہیں کہ حالیہ صدیوں میں مغربی معاشروں نے بہت زیادہ خوشحالی اگر حاصل کی ہے۔ تو اس لیے کہ انہوں نے دو شعبوں میں تبدیلیاں کی ہیں جو ابراہمی مذاہب میں پہلے گناہ تصور کیے جاتے تھے۔ انہوں نے قرضوں پر سود وصول کیا ہے۔ اور قرضوں کی مکمل ادائیگی کی ذمہ داری کا خاتمہ کیا ہے۔

مسلمان معاشرے اقتصادی طور پر پسماندہ رہ گئے ہیں کیونکہ قرآن نے سود کو ربا قرار دے کر اس سے منع کیا ہے۔ جس سے یہاں بینکوں، سرمایے کی مارکیٹوں اور اسٹاک ایکسچینجوں کو فروغ نہیں ملا..... مسلمانوں کے لیے اقتصادی شعبے میں نمایاں ترقی ممکن ہے کہ جمہوریت کے مکمل اطلاق سے زیادہ ضروری ہو۔

اس کتاب کی اشاعت سے امریکی مسلمانوں میں نئے مباحث کا آغاز ہوا ہے، اس طرح کی کوششیں بھی امریکہ میں ہورہی ہیں۔ امریکی یونیورسٹیوں اور انتظامیہ کی طرف سے بھی مسلمانوں کی اقدار اور اسلامی شعائر کو سمجھنے اور اعتدال قائم کرنے کے لیے اقدامات کیے گئے ہیں۔ یہ دراصل مسلمانوں اور امریکہ کے درمیان مفاہمت کا پل تعمیر کرنے کی حقیقت پسندانہ کوششیں ہیں۔ دونوں کے درمیان دوریوں کو بڑھانے کے لیے اشتعال پھیلانے کے لیے تو

بہت کچھ ہوتا ہے۔ اصل ضرورت اس قسم کی کوششوں کی ہے۔

ممتاز مصری اسکالر جمال بداوی کی اس حوالے سے خدمات قابل ذکر ہیں۔ اپنی تصنیفات اور لیکچرز میں انہوں نے بار بار یہ واضح کیا ہے'' جہاد اور بے معنی، بے نتیجہ دہشت گردی کو خلط ملط نہ کیا جائے۔ جہاد ایک مقدس عمل ہے۔ قرآن پاک کی تعلیمات میں جہاد بہتری، عمدگی اور اعلیٰ اقدار کے حصول کی کوشش کا نام ہے۔ مسلمان جہاد قرآن پاک کے ساتھ کرتا ہے۔ تلوار کے ساتھ نہیں۔ حقیقی مسلح جہاد دو صورتوں میں ہوتا ہے۔ ایک اپنے دفاع کے لیے.....دوسرا ظلم و بربریت کے خلاف لڑائی کی خاطر۔

امریکہ میں مسلمانوں کا مستقبل محفوظ اور روشن ہوسکتا ہے۔ اور وہ امریکی معاشرے میں صف اول میں مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے کیا کرنا چاہیئے۔ کیا لائحہ عمل ہونا چاہیئے۔ امریکہ میں مختلف مسلم انجمنیں اس مقصد کے حصول کے لیے ٹھوس اقدامات کررہی ہیں۔ ان اجتماعی ساعی سے یقیناً مسلمان امریکی معاشرے میں نمایاں حیثیت حاصل کرلیں گے۔ ان کے بارے میں جو غلط تاثر پیدا کیا گیا ہے۔ نہ صرف وہ دور ہوگا بلکہ مسلمانوں کو امریکی پالیسیاں مرتب کرنے والے اداروں میں بھی کلیدی رتبہ مل سکے گا۔

اپنی آئندہ نسل میں اسلامی اقدار کے تسلسل کو یقینی بنانے کے لیے بھی مسلم انجمنیں اجتماعی طور پر منصوبہ بندی کررہی ہیں۔ جمال بداوی نے کہا تھا'' اگر آپ نے اپنی اولاد کھودی۔ تو مسجدوں کی زیادہ تعداد کوئی مدد نہیں کر سکے گی۔'' اس لیے اسلامی تعلیمات کی تدریس کے لیے مساجد کے ساتھ اسلامی اسکولوں کا قیام بھی بنیادی ضرورت خیال کیا جارہا ہے۔ جہاں امریکہ میں پیدا ہونے والے بچوں کو قرآن پاک، حدیث، اسلام کے بنیادی ارکان کی تعلیم دی جاسکے۔ کہیں ہمہ وقتی اسکول ہیں کہیں جز وقتی، کہ مسلمانوں کے بچے امریکہ کی اپنی مروجہ تعلیم بھی حاصل کریں۔ اور روزانہ کچھ وقت اپنی مذہبی تعلیمات کے لیے بھی وقف کریں۔

اس سلسلے میں مسلمانوں کی پیشہ ورانہ تنظیمیں موثر کردار ادا کررہی ہیں۔ جن میں ایسوی ایشن آف مسلم سائنسٹس اینڈ انجینئرز .....ایسوی ایشن آف مسلم سوشل سائنسٹس، اسلامک میڈیکل ایسوی ایشن آف نارتھ امریکہ (ایمانا) پیش پیش ہیں۔ یہ باقاعدگی سے سیمینار بھی

منعقد کرتی ہیں۔ ان کی اپنی مطبوعات بھی ہیں۔

ڈیانا ایل ایک اسی لیے یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوئی ہیں کہ اسلام امریکہ میں قائم رہے گا۔ اور ہماری زندگیوں میں ایک واضح اور نمایاں حصہ بنے گا۔ مسلمانوں کی دوسری نسل، امریکہ میں پیدا ہونے والے مسلمان اس کے مظہر ہیں جو اپنی اسلامی اور امریکی شناخت دونوں کو سنجیدگی سے اہمیت دیتے ہیں۔ اور انہوں نے اپنی نئی تنظیمیں بھی قائم کی ہیں۔ جن میں '' عاملہ'' سرفہرست ہے۔ جس کا عربی میں مطلب '' کام'' ہے۔ اور یہ مخفف ہے "American Muslim intentonon learning and Activism" (حصول علم اور سرگرمی سے امریکی مسلمانوں کی رغبت) کا۔

امریکہ میں مسلمانوں کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ لیکن گزشتہ تین دہائیوں میں امریکہ کے نئے مذہبی منظر نامے میں یہ سب سے متحرک اور سرگرم برادری بن گئی ہے۔ ماضی میں امریکی معاشرہ مسلمانوں کی شناخت کو اپنی لاعلمی، امتیاز، خوف، خدشات کے روایتی نقطۂ نظر سے پیچیدہ بناتا رہا ہے۔ لیکن تاریخ کا پہیہ پیچھے کی طرف نہیں دھکیلا جاسکتا۔ امریکہ کی نئی پرجوش مسلم برادری کو یہاں رہنا ہے۔ اور امریکیوں کو بھی قرآن کی اس ہدایت کے چیلنج کو قبول کرنا ہوگا۔

'' ہمارے اختلافات کا ہی تقاضا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانیں اور سمجھیں۔''

امریکی حکومتی نظام کیسے چلتا ہے

امریکی انتظامیہ کے معاملات کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ امریکی صدر..... کانگریس اور سینٹ کے طریق انتخاب اور ان کے اختیارات کو اچھی طرح سمجھا جائے۔

ذیل میں شعبۂ تعلقات عامہ..... سفارت خانہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ، اسلام آباد کی طرف سے شائع کردہ ''امریکی حکومت..... ایک خاکہ'' سے اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔ (مصنف)

صدر امریکہ کا انتخاب اور اختیارات

ایک ایسے زمانے میں جب یورپ کے تمام بڑے ملکوں کے سربراہ موروثی بادشاہ ہوتے تھے، ایک ایسے صدر کا تصور بجائے خود ایک انقلابی تصور تھا جس کے عہدے کی مدت مقرر ہو۔ دستور صدر کو انتظامی اختیار دیتا ہے۔ دستور کے تحت ایک نائب صدر کا انتخاب بھی ہوتا ہے جو صدر کے انتقال، استعفیٰ یا مفلوج ہوجانے کی صورت میں صدر کا عہدہ سنبھالتا ہے۔ دستور میں صدر کے اختیارات اور فرائض کی کچھ تفصیلات تو وضاحت کے ساتھ دی گئی ہیں لیکن نائب صدر یا صدر کی کابینہ کے ارکان یا دوسرے وفاقی عہدیداروں کے لیے کسی انتظامی اختیار کا ذکر نہیں کیا گیا۔ دستوری کنونشن میں اس وجہ سے خاصے اختلافات پیدا ہوئے کہ پریذیڈنسی کو انتظامی اختیارات کا واحد اور انتہائی طاقتور مرکز بنایا جا رہا تھا۔

کئی ریاستوں میں ایک سے زیادہ ارکان پر مشتمل انتظامی کونسلوں کا تجربہ کیا جا چکا تھا۔ اسی طرح کا نظام کئی برسوں سے سوئٹزرلینڈ میں خاصی کامیابی سے چل رہا تھا بینجمن فرینکلن اس بات پر زور دے رہے تھے کہ یہی نظام ریاست ہائے متحدہ میں بھی اختیار کیا جائے۔ اس کے علاوہ کئی وفود ایسے تھے جنہیں شاہ برطانیہ کو حاصل اختیارات کے ظالمانہ استعمال کا تلخ تجربہ ابھی فراموش نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک طاقتور پریذیڈنسی سے خائف تھے۔ لیکن بالآخر فتح ان لوگوں کی ہوئی جو سخت چیک اور بیلنس میں رہتے ہوئے ایک بااختیار صدر کے واحد عہدہ کی وکالت کر رہے

تھے۔

صدر کی جانشینی کا حق دینے کے علاوہ نائب صدر کو سینیٹ کا صدارتی عہدہ بھی دیا گیا۔ 1967ء میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعہ صدر کے عہدے پر جانشینی کے معاملے کو وسعت دی گئی۔ اس ترمیم کے ذریعہ ان خاص حالات کی وضاحت کی گئی ہے جن میں نائب صدر، صدارتی عہدے کے اختیارات سنبھال سکتا ہے اگر صدر معذور ہو چکا ہو ساتھ ہی اس ترمیم میں یہ گنجائش بھی رکھی گئی ہے کہ اگر صدر کی معذوری دور ہوجائے تو صدر دوبارہ اپنے عہدے پر واپس آ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ترمیم صدر کو کانگریس کی منظوری سے اس وقت ایک نائب صدر کی نامزدگی کا اختیار بھی دیتی ہے جبکہ نائب صدر کا عہدہ خالی ہوجائے۔ دستور میں اس پچیسویں ترمیم کو 1974ء میں دوبارہ استعمال کیا گیا۔ اس وقت جب نائب صدر اسپائرو ٹی، اگنیو نے استعفیٰ دیدیا اور ان کی جگہ جیرالڈ آر، فورڈ نے سنبھالی۔ اور دوسری بار اس وقت جب صدر نکسن نے استعفیٰ دیدیا۔ صدر فورڈ نے نیویارک کے سابق گورنر نیلسن اے راک فیلر کو نائب صدر نامزد کیا اور کانگریس نے اس کی توثیق کی۔ دستور میں کانگریس کو اختیار دیا گیا ہے کہ نائب صدر کے بعد دوسرے عہدیدار کس ترتیب سے جانشینی کریں گے۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ اگر صدر اور نائب صدر دونوں اپنا عہدہ چھوڑ دیں تو ایوان نمائندگان کا اسپیکر صدر کا عہدہ سنبھالے گا۔ اس کے بعد سینیٹ کا کل وقتی صدر آتا ہے جسے سینیٹ اپنے ارکان میں سے منتخب کرتی ہے اور وہ نائب صدر کی غیر موجودگی میں اس ادارہ کی صدارت کرتا ہے۔ اس کے بعد مقررہ ترتیب سے ارکان کابینہ کا نمبر آتا ہے۔

دارالحکومت 1800ء میں واشنگٹن ڈی سی (ڈسٹرکٹ کولمبیا) منتقل کر دیا گیا تھا جو مشرقی ساحل پر ایک وفاقی علاقہ ہے جس کی حدود متعین ہیں۔ صدر کی رہائش اور دفتر کی عمارت وائٹ ہاؤس اسی علاقہ میں واقع ہے۔ وفاقی دارالحکومت کے لیے اگرچہ میری لینڈ اور ورجینیا دونوں ریاستوں نے علاقہ مختص کر دیا تھا لیکن موجودہ ڈسٹرکٹ کولمبیا صرف اس علاقے پر مشتمل ہے جو میری لینڈ نے وفاق کو دیا تھا۔ ریاست ورجینیا کا دیا ہوا حصہ تقریباً نصف صدی تک بغیر استعمال کے پڑا رہا اور 1846ء میں یہ علاقہ ورجینیا کو واپس کر دیا گیا۔

دستور کے مطابق ہر وہ امریکی شہری جس کی جائے پیدائش مقامی ہو اور جس کی عمر کم از کم 35 سال ہو وہ امریکہ کا صدر بن سکتا ہے۔ صدارتی انتخابات کے لیے سیاسی جماعتیں اپنے اپنے امیدواروں کا اعلان کئی ماہ پہلے کر دیتی ہیں۔

صدارتی انتخاب کا دن بھی مقرر ہے یعنی ہر چار سال بعد نومبر کے مہینے میں پہلے پیر کے بعد آنے والے منگل کو امریکی صدر کا انتخاب ہوتا ہے۔

صدر کے انتخاب کا طریقہ امریکی نظام کے سوا کہیں اور رائج نہیں ہے۔ اگرچہ بیلٹ پیپر پر صدارتی امیدواروں کے نام لکھے ہوتے ہیں لیکن تکنیکی طور پر ریاست کے شہری صدر (اور نائب صدر) کو براہ راست ووٹ نہیں دیتے۔ اس کی بجائے وہ صدارتی انتخاب کنندگان کو اجتماعی طور پر چنتے ہیں۔ ہر ریاست میں صدارتی انتخاب کنندگان (یا صدارتی انتخابی ووٹرز) کی تعداد اس ریاست کو کانگریس میں حاصل نمائندگان اور سینیٹرز کی تعداد کے مساوی ہوتی ہے۔ جس صدارتی امیدوار کو ریاست میں سب سے زیادہ انتخابی ووٹ ملتے ہیں وہ اس ریاست کے تمام انتخابی ووٹوں کا حق دار ہوتا ہے۔

تمام پچاس ریاستوں اور ڈسٹرکٹ کولمبیا کے انتخاب کنندگان جن کی کل تعداد 538 بنتی ہے مل کر انتخابی ادارہ کہلاتے ہیں۔ دستور کے مندرجات کے تحت اس انتخابی ادارے کا کبھی کوئی اجلاس نہیں ہوتا۔ اس کی بجائے انتخاب کنندگان، انتخابات کے کچھ ہی دن بعد ریاست کے دارالحکومت میں جمع ہوتے ہیں اور اپنی ریاست سے اکثریت حاصل کرنے والے امیدوار کے حق میں ووٹ ڈالتے ہیں۔ صدر منتخب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ امیدوار کو 270 ووٹ حاصل ہوں۔ دستور میں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی بھی امیدوار اکثریت حاصل نہ کر سکے تو پھر فیصلہ ایوان نمائندگان کرے گا جس کے تمام اراکین بطور ایک یونٹ کے ووٹ دیں گے۔ ایسا موقع جب بھی آئے گا تو ہر ریاست کو اور ڈسٹرکٹ کولمبیا کو ایک، ایک ووٹ دینے کا اختیار ہوگا۔

صدارتی عہدے کی مدت کا آغاز نومبر کے انتخابات کے بعد آنے والے جنوری کے مہینے کی 20 تاریخ سے ہوگا۔ پہلے یہ تاریخ مارچ کے مہینے کی تھی بعد میں بیسویں ترمیم کے ذریعہ اسے تبدیل کر دیا گیا۔ اس ترمیم کی توثیق 1993ء میں ہوئی تھی۔ صدر اپنے منصبی فرائض افتتاحی

تقریب سے شروع کرتا رکرتی ہے۔ یہ تقریب روایتاً امریکی کیپیٹل کی عمارت کی سیڑھیوں پر ہوتی ہے۔ اسی عمارت میں کانگریس کے اجلاس ہوتے ہیں۔ صدر اپنے عہدے کا حلف سرِعام اٹھاتا ہے۔ روایتاً امریکہ کا چیف جسٹس صدر سے حلف لیتا ہے۔ حلف کے الفاظ جو دستور کے آرٹیکل II میں دیئے گئے ہیں، درج ذیل ہیں:

"میں عہد کرتا ہوں کہ میں ریاست ہائے متحدہ کے صدر کے عہدے کے تمام فرائض دیانتداری سے انجام دوں گا اور ریاست ہائے متحدہ کے دستور کے تحفظ، بقا اور دفاع کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لاؤں گا۔"

حلف اٹھانے کے فوراً بعد صدر افتتاحی خطاب کرتا ہے جس میں وہ اپنی حکومت کے منصوبوں اور پالیسیوں کا اعلان کرتا رکرتی ہے۔

صدارتی اختیارات

ریاست ہائے متحدہ کے صدر کا عہدہ دنیا کے سب سے زیادہ بااختیار عہدوں میں سے ہے۔ دستور کہتا ہے کہ صدر کو اس بات کا "خیال رکھنا چاہیئے کہ قوانین پر دیانتداری سے عمل ہو۔" یہ ذمے داری پوری کرنے کے لیے صدر وفاقی حکومت کی انتظامی شاخ کی صدارت کرتا رکرتی ہے۔ وفاقی حکومت لاکھوں افراد پر مشتمل ایک نہایت وسیع تنظیم ہے۔ اس کے علاوہ صدر کو اہم قانون سازی اور عدالتی اختیارات بھی حاصل ہوتے ہیں۔

قانون سازی کے اختیارات:

اس دستوری شق کے باوجود کہ "قانون سازی کے تمام اختیارات" کانگریس کو حاصل ہوں گے قانون سازی میں صدر کا بھی ایک نمایاں کردار ہے کیونکہ سرکاری پالیسیاں صدر کی سربراہی میں ہی بنتی ہے۔ صدر کانگریس کے منظور کردہ کسی بھی بل کو ویٹو کرسکتا ہے اور جب تک دونوں ایوان اپنے اپنے اجلاسوں میں دوتہائی اکثریت کے ساتھ صدر کے ویٹو کو نظرانداز کرنے کی قرارداد منظور نہ کرلیں اس وقت صدر کا مسترد کردہ بل قانون نہیں بن سکتا۔ کانگریس میں قانون سازی کا جتنا بھی کام ہوتا ہے اس میں سے بیشتر کا مسودہ حکومت کے انتظامی شعبے کی ایما

پر تیار کیا جاتا ہے۔ کانگریس کے نام اپنے سالانہ پیغام کے ذریعہ اور خصوصی پیغامات کے ذریعہ صدر ایسی قانون سازی کی تجویز دے سکتا رسکتی ہے جو اس کی نظر میں ضروری ہو۔ اگر کانگریس کا اجلاس قانون سازی کے لیے صدر کی تجویز پر کوئی کارروائی کئے بغیر ملتوی ہوجائے تو صدر کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی تجویز پر کارروائی کے لیے کانگریس کا خصوصی اجلاس طلب کرے۔ لیکن ان اختیارات کے علاوہ بھی صدر کانگریس میں قانون سازی کے عمل پر اثر انداز ہوسکتا ہے کیونکہ وہ ایک سیاسی پارٹی کا سربراہ ہوتا ہے اور امریکی حکومت کا سب سے بڑا عہدہ ہوتا ہے اور ان دونوں حیثیتوں میں رائے عامہ پر اثر انداز ہوسکتا ہے۔ حالیہ برسوں میں ایک اضافہ یہ ہوا ہے کہ کانگریس سے تعلقات کار بہتر سطح پر رکھنے کے لیے صدر نے وہائٹ ہاؤس میں کانگریس سے رابطے کا ایک باقاعدہ دفتر قائم کرلیا ہے۔ صدر کے نائبین قانون سازی سے متعلق تمام اہم اقدامات سے آگاہی حاصل کرتے رہتے ہیں اور ایوان نمائندگان اور سینیٹ کے اراکین کو انتظامیہ کی پالیسیوں کی حمایت پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عدالتی اختیارات:

صدر کو حاصل آئینی اختیارات میں اہم سرکاری عہدوں پر تقرر کا اختیار بھی شامل ہے۔ سپریم کورٹ کے اراکین سمیت وفاقی ججوں کی صدر کی طرف سے نامزدگی کی سینیٹ کی طرف سے توثیق ضروری ہوتی ہے۔ ایک اور اہم اختیار وفاقی قانون کی خلاف ورزی کے مرتکب فرد کو مکمل یا مشروط معافی دینے کا اختیار ہے۔ البتہ کانگریس کی طرف سے مواخذہ کے معاملے میں صدر کو معافی دینے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ معافی دینے کا اختیار قید کی سزا اور جرمانے کی سزا دونوں میں تخفیف کا احاطہ کرتا ہے۔

انتظامی اختیارات:

خود حکومت کے انتظامی شعبے میں صدر کو وسیع اختیارات حاصل ہیں تاکہ وہ وفاقی حکومت چلاسکے اور قومی امور انجام دے سکے۔ صدر قواعد وضوابط اور ہدایت جاری کرسکتا ہے جنہیں انتظامی احکام کہا جاتا ہے۔ وفاقی حکومت کے تمام ادارے قانون طور پر پابند ہیں کہ انتظامی

احکام پر عمل کریں۔ ریاست ہائے متحدہ کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے صدر کو اختیار ہے کہ جنگ یا ایمرجنسی کی صورت میں ریاستوں سے نیشنل گارڈ دستوں کو وفاقی خدمات کے لیے طلب کرے۔ جنگ یا ایمرجنسی کی صورت میں کانگریس قومی معیشت کا انتظام چلانے اور ریاست ہائے متحدہ کی سلامتی کا تحفظ کرنے کے لیے اس سے بھی زیادہ وسیع اختیارات صدر کو تفویض کر سکتی ہے۔

سینکڑوں دوسرے اعلیٰ وفاقی عہدیداروں کے ساتھ ساتھ تمام انتظامی محکموں اور ایجنسیوں کے سربراہوں کا انتخاب بھی صدر کرتا ہے۔ البتہ وفاقی ملازمین کی بہت بڑی تعداد کا انتخاب سول سروس کے نظام کے ذریعہ ہوتا ہے اور تقرر اور ترقی کا دارومدار اہلیت اور تجربہ پر ہوتا ہے۔

امور خارجہ کے اختیارات:

دستور کے تحت بیرونی اقوام سے ریاست ہائے متحدہ کے تعلقات کی بنیادی ذمے داری ایک وفاقی عہدیدار کی حیثیت سے صدر پر عائد ہوتی ہے۔ صدر سفیروں، قونصلروں اور دوسرے سفارتی افسروں کا تقرر کرتا ہے۔ تقرر کی توثیق سینیٹ کرتی ہے۔ دوسرے ممالک کے سفیروں اور دوسرے سرکاری افسروں سے اسناد بھی صدر وصول کرتا ہے۔ سیکرٹری آف سینیٹ کی مدد سے صدر ہی بیرونی حکومتوں کے ساتھ تمام روابط قائم کرتا اور متعلقہ امور انجام دیتا ہے۔ جب کبھی سربراہوں کی سطح پر براہ راست صلاح مشورے کے لیے کانفرنس ہو تو صدر سربراہی کانفرنس میں بذات خود شرکت کر سکتا ہے۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر ہونے والی پیرس کانفرنس میں صدر رووڈ روولسن نے امریکی وفد کی قیادت کی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران صدر فرینکلن ڈی روز ویلٹ نے اتحادی لیڈروں سے ایشیاء اور افریقہ کی بحری حدود میں صلاح مشورہ کیا۔ صدر روز ویلٹ کے بعد سے ہر امریکی صدر معاشی اور سیاسی امور پر بات چیت کے لیے اور دو طرفہ اور کثیر الملکی معاہدوں پر گفتگو کے لیے غیر ملکی مدبرین سے ملاقات کرتا رہا ہے۔

دفتر خارجہ کے توسط سے بیرون ملک امریکیوں اور ریاست ہائے متحدہ میں موجود غیر ملکیوں کے تحفظ کا ذمہ دار بھی صدر ہوتا ہے۔ کسی نئی مملکت کو اور کسی نئی حکومت کو تسلیم کرنے کا

فیصلہ صدر کرتا ہے۔ دوسرے ملکوں کے ساتھ ان معاہدوں کی بات چیت کا فیصلہ صدر کرتا ہے جن کی پابندی ریاست ہائے متحدہ پر لازم ہو۔ ان معاہدوں کی توثیق سینیٹ دو تہائی اکثریت سے کرتی ہے۔ صدر دوسرے ممالک سے ''ایگزیکٹو'' معاہدے بھی کر سکتا ہے۔ ان معاہدوں کی توثیق سینیٹ سے کروانا ضروری نہیں۔

چونکہ صدر کے کردار اور ذمہ داریوں کا سلسلہ انتہائی طویل وعریض ہے اور صدر قومی اور بین الاقوامی سطح پر بھی نمایاں طور پر مصروف رہتا ہے اس لیے مبصرین صدر کے اختیارات پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ فرینکلن ڈی روز ویلٹ نے اپنے دور صدارت میں صدر کے کردار کو جتنا وسیع کر دیا تھا اس کے پیش نظر بہت سے مبصرین نے تو اس عہدہ کو ''شاہی صدارت'' کا نام بھی دیا ہے۔

ایک نئے صدر کو عہدہ سنبھالتے ہی جن نئے حقائق کا ادراک ہوتا ہے ان میں سے ایک کا تعلق بیوروکریسی کے اس ڈھانچے سے ہے جو اسے ورثے میں ملتا ہے۔ بیوروکریسی کو چلانا انتہائی مشکل اور اسی کی سمت میں تبدیلی کا عمل انتہائی سست رفتار ہوتا ہے۔ صدر سویلین حکومت کے تیس لاکھ سے زیادہ ملازمین میں سے زیادہ سے زیادہ تین ہزار عہدوں پر تقرر کر سکتا ہے۔ پھر سرکاری ملازمین کی غالب اکثریت سول سروس کے ضابطوں کے تحت کام کرتی ہے اور انہیں قانونی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔

صدر کو آہستہ آہستہ احساس ہوتا ہے کہ حکومتی مشینری زیادہ تر صدر کی مداخلت کے بغیر آزادانہ طور پر کام کرتی ہے اور یہ کہ سابقہ صدور کے تحت بھی بیوروکریسی اسی طرح عمل کرتی رہی ہے اور آئندہ بھی کرتی رہے گی۔ نئے صدر کو عہدہ سنبھالتے ہی فیصلے طلب معاملات کے ایک انبار سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ وہ معاملات ہیں جو جانے والا صدر بغیر کسی فیصلہ کے چھوڑ جاتا ہے۔ یہ معاملات پیچیدہ بھی ہوتے ہیں اور نئے صدر کے لیے غیر مانوس بھی۔ نئے صدر کو ایک ایسے بجٹ سے واسطہ پڑتا ہے جو اس کے عہدہ سنبھالنے سے بہت پہلے تشکیل دیا گیا تھا اور جواب قانون کی شکل میں موجود ہے۔ اس بجٹ میں مختلف شعبوں پر اخراجات کے بڑے بڑے پروگرام بھی شامل ہوتے ہیں جنہیں پورا کرنا قانونی ذمہ داری ہے اور جنہیں تبدیل نہیں کیا

احکام پر عمل کریں۔ ریاست ہائے متحدہ کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے صدر کو اختیار ہے کہ جنگ یا ایمرجنسی کی صورت میں ریاستوں سے نیشنل گارڈ دستوں کو وفاقی خدمات کے لیے طلب کرے۔ جنگ یا ایمرجنسی کی صورت میں کانگریس قومی معیشت کا انتظام چلانے اور ریاست ہائے متحدہ کی سلامتی کا تحفظ کرنے کے لیے اس سے بھی زیادہ وسیع اختیارات صدر کو تفویض کر سکتی ہے۔

سینکڑوں دوسرے اعلیٰ وفاقی عہدیداروں کے ساتھ ساتھ تمام انتظامی محکموں اور ایجنسیوں کے سربراہوں کا انتخاب بھی صدر کرتا ہے۔ البتہ وفاقی ملازمین کی بہت بڑی تعداد کا انتخاب سول سروس کے نظام کے ذریعہ ہوتا ہے اور تقرر اور ترقی کا دارومدار اہلیت اور تجربہ پر ہوتا ہے۔

امور خارجہ کے اختیارات:

دستور کے تحت بیرونی اقوام سے ریاست ہائے متحدہ کے تعلقات کی بنیادی ذمے داری ایک وفاقی عہدیدار کی حیثیت سے صدر پر عائد ہوتی ہے۔ صدر سفیروں، قونصلروں اور دوسرے سفارتی افسروں کا تقرر کرتا ہے۔ تقرر کی توثیق سینیٹ کرتی ہے۔ دوسرے ممالک کے سفیروں اور دوسرے سرکاری افسروں سے اسناد بھی صدر وصول کرتا ہے۔ سیکرٹری آف سینیٹ کی مدد سے صدر ہی بیرونی حکومتوں کے ساتھ تمام روابط قائم کرتا اور متعلقہ امور انجام دیتا ہے۔ جب کبھی سربراہوں کی سطح پر براہ راست صلاح مشورے کے لیے کانفرنس ہو تو صدر سربراہی کانفرنس میں بذات خود شرکت کر سکتا ہے۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر ہونے والی پیرس کانفرنس میں صدر رووڈ رووِلسن نے امریکی وفد کی قیادت کی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران صدر فرینکلن ڈی روز ویلٹ نے اتحادی لیڈروں سے ایشیاء اور افریقہ کی بحری حدود میں صلاح مشورہ کیا۔ صدر روز ویلٹ کے بعد سے ہر امریکی صدر معاشی اور سیاسی امور پر بات چیت کے لیے اور دو طرفہ اور کثیر الملکی معاہدوں پر گفتگو کے لیے غیر ملکی مدبرین سے ملاقات کرتا رہا ہے۔

دفتر خارجہ کے توسط سے بیرون ملک امریکیوں اور ریاست ہائے متحدہ میں موجود غیر ملکیوں کے تحفظ کا ذمہ دار بھی صدر ہوتا ہے۔ کسی نئی مملکت کو اور کسی نئی حکومت کو تسلیم کرنے کا

فیصلہ صدر کرتا ہے۔ دوسرے ملکوں کے ساتھ ان معاہدوں کی بات چیت کا فیصلہ صدر کرتا ہے جن کی پابندی ریاست ہائے متحدہ پر لازم ہو۔ ان معاہدوں کی توثیق سینیٹ دو تہائی اکثریت سے کرتی ہے۔ صدر دوسرے ممالک سے ''ایگزیکٹو'' معاہدے بھی کر سکتا ہے۔ ان معاہدوں کی توثیق سینیٹ سے کروانا ضروری نہیں۔

چونکہ صدر کے کردار اور ذمہ داریوں کا سلسلہ انتہائی طویل وعریض ہے اور صدر قومی اور بین الاقوامی سطح پر بھی نمایاں طور پر مصروف رہتا ہے اس لیے مبصرین صدر کے اختیارات پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ فرینکلن ڈی روز ویلٹ، نے اپنے دور صدارت میں صدر کے کردار کو جتنا وسیع کر دیا تھا اس کے پیش نظر بہت سے مبصرین نے تو اس عہدہ کو ''شاہی صدارت'' کا نام بھی دیا ہے۔

ایک نئے صدر کو عہدہ سنبھالتے ہی جن نئے حقائق کا ادراک ہوتا ہے ان میں سے ایک کا تعلق بیوروکریسی کے اس ڈھانچے سے ہے جو اسے ورثے میں ملتا ہے۔ بیوروکریسی کو چلانا انتہائی مشکل اور اس کی سمت میں تبدیلی کا عمل انتہائی سست رفتار ہوتا ہے۔ صدر سویلین حکومت کے تیس لاکھ سے زیادہ ملازمین میں سے زیادہ سے زیادہ تین ہزار عہدوں پر تقرر کر سکتا ہے۔ پھر سرکاری ملازمین کی غالب اکثریت سول سروس کے ضابطوں کے تحت کام کرتی ہے اور انہیں قانونی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔

صدر کو آہستہ آہستہ احساس ہوتا ہے کہ حکومتی مشینری زیادہ تر صدر کی مداخلت کے بغیر آزادانہ طور پر کام کرتی ہے اور یہ کہ سابقہ صدور کے تحت بھی بیوروکریسی اسی طرح عمل کرتی رہی ہے اور آئندہ بھی کرتی رہے گی۔ نئے صدر کو عہدہ سنبھالتے ہی فیصلے طلب معاملات کے ایک انبار سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ وہ معاملات ہیں جو جانے والا صدر بغیر کسی فیصلہ کے چھوڑ جاتا ہے۔ یہ معاملات پیچیدہ بھی ہوتے ہیں اور نئے صدر کے لیے غیر مانوس بھی۔ نئے صدر کو ایک ایسے بجٹ سے واسطہ پڑتا ہے جو اس کے عہدہ سنبھالنے سے بہت پہلے تشکیل دیا گیا تھا اور جو اب قانون کی شکل میں موجود ہے۔ اس بجٹ میں مختلف شعبوں پر اخراجات کے بڑے بڑے پروگرام بھی شامل ہوتے ہیں جنہیں پورا کرنا قانونی ذمہ داری ہے اور جنہیں تبدیل نہیں کیا

جا سکتا۔ مثلاً سابق فوجیوں کی فلاح کا پروگرام، سوشل سیکورٹی اور ضعیفوں کے لیے طبی امداد کے پروگرام۔ خارجہ امور میں نئے صدر کو ان معاہدوں اور غیر رسمی سمجھوتوں کی پابندی کرنی ہوتی ہے جو اس کے پیش رو صدور نے دوسرے ملکوں سے کر رکھے ہیں۔

الیکشن جیتنے کی خوشی بہت جلد کافور ہو جاتی ہے جب نئے صدر کو یہ پتا چلتا ہے کہ کانگریس کا تعاون بہت کم ہے اور میڈیا کا رویہ زیادہ تر ناقدانہ ہے۔ مجبوراً صدر کو کم از عارضی طور پر متضاد بلکہ اکثر متصادم اقتصادی، جغرافیائی، نسلی اور نظریاتی مفادات سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ قانون منظور کروانے کے لیے کانگریس کے ساتھ مفاہمت کرنا لازمی ہوتا ہے۔ صدر جان ایف کینیڈی کو شکوہ تھا کہ ”کانگریس میں کسی بل کی نامنظوری جتنی آسان ہے اس سے زیادہ مشکل کسی قانون کے منظور کروانے میں پیش آتی ہے۔“

اتنی حدود و قیود کے باوجود شاید ہی کوئی صدر ہوگا جس نے دوسری مدت کے لیے انتخاب لڑنے کا موقع ہاتھ سے جانے دیا ہو۔ ہر صدر قانون سازی کے بارے میں اپنے کچھ نہ کچھ مقاصد پورے کرنے میں کامیاب رہتا ہے اور کچھ ایسے قوانین کو ویٹو کر دیتا ہے جو اس کی نظر میں قوم کے بہترین مفاد میں نہ ہوں۔ جنگ اور امن کے معاملات چلانے اور معاہدے کرنے کے لیے صدر کو اچھے خاصے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ صدر اپنی منفرد پوزیشن استعمال کر کے اپنے خیالات، نظریات اور پالیسیوں کی حمایت میں رائے عامہ ہموار کر سکتا ہے اور اپنے سیاسی حریفوں کے مقابلہ میں عام لوگوں کی رائے کو بہتر طور سے متاثر کر سکتا ہے۔ جب صدر کوئی معاملہ اٹھاتا ہے تو یہ لامحالہ عام بحث و مباحثہ کا موضوع بن جاتا ہے۔ تمام تر حدود و قیود کے باوجود امریکی صدر کو جو اختیارات حاصل ہیں اور اس کا جو اثر و رسوخ ہوتا ہے وہ کسی اور امریکی کو میسر نہیں ہو سکتا۔

انتظامی محکمے:

وفاقی قوانین کے نفاذ اور انتظام کا روزمرہ کا کام مختلف انتظامی محکموں کے ذمہ ہوتا ہے۔ یہ محکمے کانگریس اس غرض سے تشکیل دیتی ہے کہ وہ اپنے اپنے دائرہ کار میں قومی اور بین الاقوامی امور نمٹائیں ان محکموں کے سربراہوں کا انتخاب صدر کرتا ہے اور سینٹ ان کی منظوری دیتی ہے۔

کانگریس اور سینٹ

دستور کا آرٹیکل نمبر 1 وفاقی حکومت کے قانون سازی کے تمام اختیارات کانگریس کو دیتا ہے جس کے دو الگ الگ ایوان ہیں۔ ایک سینٹ اور دوسرا ایوان نمائندگان۔ سینٹ جس کے ممبران کی تعداد کم ہے اس میں دستور کے مطابق ہر ریاست کے دو اراکین ہوتے ہیں۔ ایوان نمائندگان میں اراکین کی تعداد آبادی کے مطابق ہوتی ہے چنانچہ دستور میں اس ایوان کے اراکین کی تعداد نہیں دی گئی۔

دستور کی منظوری کے بعد سو سال سے زیادہ عرصہ تک سینٹ کے اراکین عوام کے براہ راست ووٹ سے منتخب نہیں ہوتے تھے بلکہ انہیں ریاستی اسمبلی منتخب کرتی تھی۔ سینٹرز کو اپنی اپنی ریاست کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ ان کا فرض یہ تھا کہ وہ ہر طرح کی قانون سازی میں اپنی ریاست کے ساتھ مساویانہ سلوک کو یقینی بنائیں۔ 1913ء میں سترہویں ترمیم منظور کی گئی جس میں سینٹ کے براہ راست انتخاب کا طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ دستوری کنونشن میں شریک نمائندوں کا خیال تھا کہ اگر ہر مجوزہ قانون کی منظوری دو الگ الگ گروپوں کے ذریعہ کروانا لازمی قرار دیا جائے تو اس بات کا خطرہ نہیں رہے گا کہ کانگریس قانون سازی میں جلد بازی یا لاپرواہی سے کام لینے لگ جائے گی۔ ریاست اور عوام کی نمائندگی کرنے والے دونوں گروپوں میں سے ہر گروپ ایک دوسرے کے لیے اسی طرح چیک کا کام کرے گا جس طرح کے

برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوان کرتے ہیں۔ سترہویں ترمیم کی منظوری سے دونوں ایوانوں میں طاقت کے توازن پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ اگرچہ کونشن میں کانگریس کی بناوٹ اور اختیارات کے بارے میں خاصا بحث ومباحثہ ہوا لیکن بہت سے نمائندوں کا خیال تھا کہ مقننہ کی اہمیت حکومت کے دوسرے شعبوں کے مقابلہ میں کم ہوگی۔ چند ایسے تھے جو سمجھتے تھے کہ کانگریس زیادہ تر خارجہ امور میں مصروف رہے گی اور ملکی معاملات ریاستوں اور مقامی حکومتوں کے پاس رہیں گے۔

ظاہر ہے کہ یہ دونوں نقطہ نظر حقیقت سے بہت دور تھے۔ قومی نوعیت کے تمام معاملات میں کانگریس وسیع اختیارات اور اقتدار کی مالک ہے۔ اس نے اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کرتے رہنے کی صلاحیت منوائی ہے۔ اگرچہ امریکی تاریخ کے مختلف ادوار میں انتظامیہ کے مقابلے میں کانگریس کی قوت کم وبیش ہوتی رہی ہے لیکن صدارتی فیصلوں کی توثیق کرنے یا اپنے اختیارات کے استعمال میں کانگریس کبھی بے بس نہیں رہی۔

"کانگریس کی رکنیت کی شرائط"

دستور کے تحت لازمی ہے کہ امریکی سینٹ کے رکن کی عمر کم سے کم 30 سال ہو وہ کم از کم نو سال سے امریکہ کا شہری ہو اور اس ریاست میں رہائش رکھتا ہو جس سے وہ منتخب ہوا ہے۔ ایوان نمائندگان کی رکنیت کے لیے کم از کم عمر کی حد 25 سال ہے اور شہریت کی کم از کم مدت سات سال ہے۔ ایوان نمائندگان کے رکن کو اس ریاست کا رہائشی ہونا چاہیئے جس نے اسے اپنا نمائندہ منتخب کیا ہے۔ ریاستیں کانگریس کی رکنیت کے لیے کچھ اور شرائط بھی لگا سکتی ہیں لیکن دستور میں ہر ایوان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی رکنیت کے لیے شرائط مقرر کرے۔

ہر ریاست سینٹ کے دو ارکان منتخب کرتی ہے اس طرح امریکہ کی سب سے چھوٹی ریاست روڈ آئی لینڈ جس کا کل رقبہ تقریباً 3156 مربع کلومیٹر ہے اس سے بھی دو سینٹر منتخب ہوتے ہیں اور الاسکا بھی دو سینٹر منتخب کرسکتی ہے۔ حالانکہ 1524640 مربع کلومیٹر رقبہ کے ساتھ الاسکا امریکہ کی سب سے بڑی ریاست ہے۔

وائی یومنگ (Wyoming) کی آبادی 1987ء میں 490000 افراد پر مشتمل تھی اور

اس کی نمائندگی کیلی فورنیا کے برابر تھی جس کی آبادی 1987ء میں 27,663,000 افراد پر مشتمل تھی۔

ایوان نمائندگان کے اراکین کی کل تعداد کانگریس نے متعین کردی ہے۔ اس تعداد کو ریاستوں کے درمیان ان کی آبادی کے لحاظ سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ آبادی کا لحاظ کئے بغیر اس بات کی ضمانت دستور میں دی گئی ہے کہ ایوان نمائندگان میں ہر ریاست کا کم سے کم ایک نمائندہ ضرور ہوگا۔ ایسی چھ ریاستیں ہیں جن کا صرف ایک نمائندہ ہوتا ہے جن کے نام یہ ہیں الاسکا، ڈلاویئر، نارتھ ڈکوٹا، ساؤتھ ڈکوٹا، ورماؤنٹ اور وائی یومنگ دوسری طرف چھ ریاستیں ایسی بھی ہیں جن کے نمائندوں کی تعداد بیس سے زیادہ ہے۔ صرف کیلی فورنیا کے نمائندگان کی تعداد 45 ہے۔

دستور کے تحت امریکہ میں ہر 10 سال بعد قومی مردم شماری ہوتی ہے۔ اور ایوان نمائندگان میں نشستوں کی نئے سرے سے تقسیم آبادی میں تبدیلیوں کے لحاظ سے کی جاتی ہے۔ دستور میں شروع میں نمائندگان کی جو تعداد مقرر کی گئی تھی وہ ہر تیس ہزار شہریوں پر ایک نمائندے کے تناسب سے تھی پہلے ایوان نمائندگان میں کل 65 اراکین تھے پہلی مردم شماری کے بعد یہ تعداد بڑھ کر 106 ہوگئی ہے اگر ایک اور 30 ہزار کے تناسب کا فارمولا مستقل طور پر اختیار کیا گیا ہوتا تو امریکہ میں آبادی کے اضافہ کی وجہ سے آج ایوان نمائندگان کے اراکین کی کل تعداد 7000 سے بڑھ چکی ہوتی۔ لیکن بعد میں چونکہ یہ فارمولا بدل دیا گیا اور آج ایوان نمائندگان 435 ارکان پر مشتمل ہوتا ہے یعنی امریکہ کے 530,000 شہریوں پر ایک نمائندہ۔

ریاستی قانون ساز اسمبلیاں اپنی ریاست کو کانگریسی حلقوں میں اس طرح تقسیم کرتی ہیں کہ ہر حلقہ بڑی حد تک دوسرے حلقے کے مساوی ہو۔ ہر حلقے کے لوگ ہر دو سال بعد کانگریس کے لیے ایک نمائندہ منتخب کرتے ہیں۔

سینٹ کے انتخابات پوری ریاست میں ایک ساتھ ہوتے ہیں۔ انتخاب کے سال کے لیے ضروری ہے کہ اس کا عدد دو سے تقسیم پذیر ہو سینٹ کی رکنیت کی مدت چھ سال ہے اور ہر دو سال بعد ایک تہائی سینٹ کے انتخابات ہوتے ہیں اس طرح کم از کم دو تہائی سینٹر ہمیشہ ایسے

ہوتے ہیں جنہیں قومی سطح پر قانون سازی کا کچھ نہ کچھ تجربہ ہو۔

نظریاتی طور پر تو یہ ممکن ہے کہ ایوان نمائندگان کے سارے ہی ارکان قانون سازی کے معاملہ میں بالکل ہی ناتجربہ کار ہوں۔ لیکن عملاً ایسا ہوتا نہیں اور زیادہ تر اراکین بار بار منتخب ہوتے ہیں اور سینٹ کی طرح ایوان نمائندگان میں بھی تجربہ کار قانون سازوں کا ایک گروپ ہمیشہ موجود رہتا ہے جس کے تجربے سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

کیونکہ ایوان نمائندگان کے اراکین کی مدت دو سال ہوتی ہے اس لیے کانگریس کی مدت بھی دو سال سمجھی جاتی ہے بیسویں ترمیم کے ذریعہ قرار دیا گیا ہے کہ اگر کانگریس نے کوئی اور تاریخ مقرر نہ کی ہوتو کانگریس کا باقاعدہ اجلاس ہر جنوری کے مہینہ کی 3 تاریخ کو ہوا کرے گا۔ کانگریس کا اجلاس اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک اراکین اجلاس ملتوی کرنے کی قرار داد منظور نہ کرلیں۔ یہ قرار داد عموماً سال کے اواخر میں منظور کی جاتی ہے۔ صدر جب ضروری سمجھے تو کانگریس کا خصوصی اجلاس بلاسکتا رسکتی ہے۔ کانگریس کے اجلاس، واشنگٹن ڈی سی کی عمارت کیپٹل میں ہوتے ہیں۔

"ایوان نمائندگان اور سینٹ کے اختیارات"

کانگریس کے ہر ایوان کو اختیار ہے کہ وہ مالیاتی بل کے علاوہ کسی بھی موضوع پر قانون سازی کا آغاز کرے۔ مالیاتی بل کے لیے لازمی ہے کہ اسے پہلے ایوان نمائندگان میں پیش کیا جائے۔ اس طرح یہ سوچا جاسکتا ہے کہ سرکاری خزانے پر بڑی ریاستوں کو چھوٹی ریاستوں کے مقابلہ میں زیادہ اثر ورسوخ حاصل ہے۔ لیکن عملاً دونوں میں سے کوئی بھی ایوان دوسرے ایوان کے منظور کردہ کسی بھی قانون کو مسترد کرسکتا ہے چنانچہ ایوان نمائندگان کے منظور کردہ بل کو یا کسی اور بل کو بھی سینٹ نامنظور کرسکتی ہے یا اس میں ایسی ترامیم کا اضافہ کرسکتی ہے جس سے اس بل کی نوعیت ہی تبدیل ہوجائے ایسی صورت میں دونوں ایوانوں کے اراکین پر مشتمل ایک کانفرنس کمیٹی بنانی پڑتی ہے تاکہ وہ دونوں ایوانوں کے لیے قابل قبول سمجھوتہ تیار کرسکے اس کے بغیر کوئی بل قانون نہیں بن سکتا۔

سینٹ کو کچھ ایسے اختیارات حاصل ہیں جو صرف اسی ادارے کے لیے مخصوص ہیں مثلاً

صدر کی طرف سے وفاقی حکومت کے اعلیٰ افسروں اور سفیروں کے تقرر کی توثیق کا اختیار۔ اس کے علاوہ سینٹ کو یہ خاص اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ دو تہائی اکثریت سے تمام معاہدوں کی توثیق کرے۔ اگر ان میں سے کسی بھی معاملے پر سینٹ کو اعتراض یا اختلاف ہوتو انتظامیہ کا اقدام بے اثر ہوجاتا ہے۔

وفاقی حکومت کے عہدہ داروں کے مواخذے کے معاملے میں صرف ایوان نمائندگان کو یہ اختیار ہے کہ وہ متعلقہ عہدیدار کے خلاف ایسے الزامات عائد کرے جن کے نتیجہ میں مواخذہ کا مقدمہ چل سکتا ہے یہ اختیار صرف سینٹ کو حاصل ہے کہ وہ مواخذے کے الزامات میں مقدمہ چلائے اور اداروں کو بری کردے یا مجرم قرار دیدے۔ مجرم قرار دینے کی صورت میں وفاقی عہدیدار سرکاری عہدہ سے علیحدہ کردیا جاتا ہے۔

پوری کانگریس کے وسیع اختیارات دستور کے پہلے آرٹیکل کے سیکشن آٹھ میں وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں۔

— ٹیکس لگانا اور جمع کرنا۔

— سرکاری خزانے کے لیے رقم قرض لینا۔

— ریاستوں کے درمیان اور بیرونی ممالک سے تجارت کو باضابطہ بنانے کے لیے قواعد وضوابط مرتب کرنا۔

— غیر ملکیوں کو شہریت دینے کے مساویانہ قواعد مرتب کرنا۔

— کرنسی وضع کرنا ان کی مالیت مقرر کرنا اور جعلی کرنسی بنانے والوں کے لیے سزا مقرر کرنا۔

— اوزان اور پیمائش کے معیار مقرر کرنا۔ پورے ملک کے لیے دیوالیہ پن کے قوانین مقرر کرنا۔

— ڈاک کے دفاتر قائم کرنا اور راستے متعین کرنا۔

— پٹنیٹ اور کاپی رائٹ جاری کرنا۔

— وفاقی عدالتوں کا ایک نظام قائم کرنا۔

— لٹیروں کو سزا دینا۔

— جنگ کا اعلان کرنا۔

— افواج تشکیل دینا اور ان کی نگہداشت کرنا۔

— نیوی کا انتظام کرنا۔

— بیرونی حملوں کا مقابلہ کرنے ، لاقانونیت کو روکنے اور وفاقی قوانین نافذ کرنے کے لیے ملیشیا دستے طلب کرنا۔

— ڈسٹرکٹ آف کولمبیا کے لیے قوانین بنانا اور

— دستور نافذ کرنے کے لیے تمام ضروری قوانین مرتب کرنا۔

مندرجہ بالا اختیارات میں سے چند کی تو اب ضرورت نہیں رہی (مثال کے طور پر ڈسٹرکٹ آف کولمبیا اب کم وبیش خود مختار ہے) لیکن یہ بدستور نافذ ہیں۔ دسویں ترمیم میں یہ کہہ کر کانگریس کے اختیارات کی واضح حدود قائم کی گئی ہیں کہ جو اختیارات قومی حکومت کو تفویض نہیں کیے گئے وہ یا تو ریاستوں کے پاس رہیں گے یا عوام کے پاس۔ اس کے علاوہ دستور میں کانگریس کو کچھ باتوں کی ممانعت بھی کی گئی ہے۔ کانگریس کو اختیار نہیں ہے کہ وہ

— بغاوت یا بیرونی حملے کی وجہ سے لازمی نہ ہو تو حبس بے جا سے متعلق اختیارات معطل کرے۔

— لوگوں کو مقدمہ چلائے بغیر جرائم کا یا خلاف قانون سرگرمیوں کا مرتکب قرار دینے کے لیے قوانین بنائے۔

— کوئی ایسا قانون بنائے جس میں کسی خاص فعل کو موثر بہ ماضی جرم قرار دیا گیا ہو۔

— پہلے سے مکمل شدہ مردم شماری کے علاوہ کسی اور بنیاد پر شہریوں پر براہ راست ٹیکس لگائے۔

— کسی ریاست کی بندرگاہوں پر یا ان بندرگاہوں کو استعمال کرنے والے جہازوں پر کوئی امتیازی ٹیکس لگائے یا ان کو کسی طرح کی خاص مراعات دے اور

— کسی کو نوابانہ خطابات استعمال کرنے کا حق دے۔

کانگریس کے افسران

دستور میں کہا گیا ہے کہ نائب صدر سینٹ کا صدر ہوگا وہ اپنے ووٹ کا حق صرف اس صورت میں استعمال کرسکتا/کرسکتی ہے جبکہ دونوں طرف کے ووٹ برابر ہوں۔ اگر نائب صدر موجود نہ ہو تو سینٹ اجلاس کی صدارت کے لیے ایک عارضی صدر منتخب کرے گی۔ ایوان نمائندگان اپنے صدارتی افسر کا خود انتخاب کرتا ہے جسے اسپیکر کہا جاتا ہے اسپیکر اور عارضی صدر کے لیے لازمی ہے کہ وہ متعلقہ ایوان میں اکثریتی پارٹی کا رکن ہو۔

ہر نئی کانگریس کے آغاز کے وقت سیاسی پارٹیاں اپنے اپنے فلور لیڈر اور دوسرے افسروں کا انتخاب کرتی ہیں۔ یہ لیڈر اور افسر مجوزہ قانون سازی کے سلسلے کو باقاعدہ رکھنے کا انتظام کرتے ہیں۔ صدارتی افسروں اور کمیٹیوں کے سربراہوں کے ساتھ ساتھ یہ افسر بھی قوانین کی تشکیل میں بڑے اثر ورسوخ کے حامل ہوتے ہیں۔

قانون سازی کا عمل

کانگریس کی بڑی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ کمیٹیاں کانگریس کی کارروائی میں ایک نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔ کمیٹیوں کو آج جتنی اہمیت حاصل ہے وہ دستور کی وجہ سے نہیں بلکہ ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے کیونکہ دستور میں تو کمیٹیوں کے قیام کے لیے کوئی شق رکھی ہی نہیں گئی۔

اس وقت سینٹ کی 16 مستقل کمیٹیاں ہیں اور ایوان نمائندگان کی 22 کمیٹیاں ہیں۔ ہر کمیٹی قانون سازی کے کسی خاص شعبہ میں مہارت رکھتی ہے۔ مثلاً خارجہ امور، دفاع، بینکنگ، زراعت، تجارت، اخراجات اور اسی طرح دوسرے شعبے۔ جب کوئی بل کسی ایوان میں پیش کیا جاتا ہے تو جائزے اور سفارشات کے لیے اسے متعلقہ کمیٹی کو بھیج دیا جاتا ہے۔ کمیٹی موصول شدہ بل کو منظور کرسکتی ہے۔ بدل سکتی ہے ختم کرسکتی ہے یا نظر انداز کرسکتی ہے۔ یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ کوئی بل متعلقہ کمیٹی کی منظوری کے بغیر سینٹ یا ایوان نمائندگان میں زیر غور آسکے۔ ایوان نمائندگان میں کسی بل کو کمیٹی کی منظوری کے بغیر براہ راست بحث کرنے کے لیے کم سے کم 218 ممبران کے دستخطوں کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ سینٹ میں اسی مقصد کے لیے کل اراکین کی

اکثریت درکار ہوتی ہے۔ عملاً صورتحال یہ ہے کہ کمیٹی کی منظوری کے بغیر کسی معاملے کو براہ راست زیر غور لانے کی قرارداد کو ضروری اکثریت شاذونادر ہی مل پاتی ہے۔

ہر ایوان میں اس کی اکثریتی پارٹی کمیٹیوں کی کارروائی کو کنٹرول کرتی ہے۔ کمیٹیوں کے چیئر مین پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں منتخب کیے جاتے ہیں یا اس مقصد کے لیے تشکیل دیا گیا ممبران کا ایک خاص گروپ ان کا انتخاب کرتا ہے۔ اقلیتی پارٹیوں کو متعلقہ ایوان میں اپنے اراکین کی تعداد کے تناسب سے نمائندگی ملتی ہے۔

ایوان میں بل متعارف کرانے کے کئی طریقے ہیں کچھ بل مجالس قائمہ تیار کرتی ہیں کچھ بل قانون سازی کے کسی خاص مسئلہ پر بنائی جانے والی خصوصی کمیٹیاں بناتی ہیں اور کچھ بل صدر یا دوسرے حکومتی افسروں کی طرف سے تجویز کیے جاتے ہیں۔ کانگریس کے باہر کی تنظیمیں اور شہری بھی کسی قانون سازی کی تجویز پیش کرسکتے ہیں اور کسی ایوان کا کوئی رکن انفرادی طور پر بھی کوئی بل پیش کرسکتا ہے جب کوئی بل پیش ہوجائے تو اُسے مقررہ کمیٹی کو بھیج دیا جاتا ہے اور اکثر معاملات میں کمیٹی عام سماعت کا شیڈول بناتی ہے تاکہ مجوزہ قانون کے حامیوں اور مخالفوں کو اپنا اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کا موقع مل سکے۔ عام سماعت سے جو اکثر ہفتوں بلکہ مہینوں بھی جاری رہ سکتی ہے قانون سازی کے عمل میں عام لوگوں کو شرکت کا موقع فراہم ہوتا ہے۔

کمیٹی سسٹم کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس سے کانگریس کے ممبران اور ان کے اسٹاف کو قانون سازی کے مختلف شعبوں میں کافی زیادہ مہارت حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ابتدائی دنوں میں جب ملک کی آبادی کم تھی اور وفاقی حکومت کے فرائض میں اتنی وسعت نہیں آئی تھی اس طرح کی مہارت اتنی زیادہ اہم نہیں تھی۔ کانگریس کا ہر رکن ہر معاملہ سے واقف ہوتا تھا اور خصوصی علم اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ منتخب نمائندے اکثر پبلک پالیسی کے ایک دو شعبوں میں مہارت حاصل کرسکتے ہیں۔

جب کوئی کمیٹی کسی بل کی حمایت کرتی ہے تو مجوزہ قانون عام بحث کے لیے ایوان کو بھیج دیا جاتا ہے۔ سینٹ میں قواعد ایسے ہیں کہ بحث لامحدود عرصہ تک جاری رہ سکتی ہے۔ ایوان نمائندگان میں چونکہ اراکین کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لیے ایوان کی قواعد وضوابط کی کمیٹی اکثر

ایک مدت مقرر کردیتی ہے جب بحث ختم ہوجاتی ہے تو ممبران ووٹ دے کر بل کو منظور کرلیتے ہیں یا مسترد کردیتے ہیں یا ملتوی کردیتے ہیں یا کمیٹی کو واپس بھیج دیتے ہیں۔ جب کوئی بل ایک ایوان میں منظور ہوجاتا ہے تو اسے دوسرے ایوان میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اگر دوسرا ایوان اس بل میں کوئی ترمیم کرے تو یہ بل ایک کانفرنس کمیٹی کے سپرد کردیا جاتا ہے جو دونوں ایوانوں کے اراکین پر مشتمل ہوتی ہے اور اختلافات دور کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

دونوں ایوانوں کی منظوری کے بعد بل صدر کو بھیج دیا جاتا ہے کیونکہ دستور کے مطابق کوئی بل صدارتی کارروائی کے بعد ہی قانون بنتا ہے۔ صدر کو اختیار ہے کہ وہ بل پر دستخط کردے (اس کے بعد وہ قانون بن جاتا ہے) یا اسے ویٹو کردے۔ اگر صدر نے کسی بل کو ویٹو کردیا ہو تو اسے قانون بنانے کے لیے دونوں ایوانوں کی دو تہائی اکثریت سے دوبارہ منظوری لازمی ہوتی ہے۔

صدر کو یہ اختیار بھی ہے کہ وہ کسی بل پر دستخط کرنے یا اسے ویٹو کرنے سے انکار کردے۔ ایسی صورت میں یہ بل صدر کو موصول ہونے کے بعد دس دن (اتوار شامل نہیں ہے) گزرنے پر صدر کے دستخطوں کے بغیر ہی قانون بن جاتا ہے۔ اس ضابطے سے استثناء کی واحد صورت یہ ہے کہ کانگریس صدر کو بل بھیجنے کے بعد اور دس دن کی مقررہ مدت ختم ہونے سے پہلے اپنا اجلاس ملتوی کردے۔ ایسی صورت میں صدر کی طرف سے کارروائی نہ کرنا بل کی نفی شمار ہوتا ہے جسے "پاکٹ ویٹو" کہا جاتا ہے۔

تحقیقات کرنے کا کانگریسی اختیار

کانگریس کو قانون سازی کے علاوہ جو امور انجام دینے ہوتے ہیں ان میں سب سے اہم امور میں تحقیقات کا اختیار شامل ہے۔ یہ اختیار زیادہ تر کمیٹیوں کو تفویض کردیا جاتا ہے۔ ان کمیٹیوں میں مجالس قائمہ کے علاوہ کسی خاص مقصد سے قائم کی جانے والی خصوصیت کمیٹیاں یا دونوں ایوانوں کے اراکین پر مشتمل مشترکہ کمیٹیاں شامل ہیں یہ کمیٹیاں جو تحقیقات کرتی ہیں ان کے مقاصد یہ ہوسکتے ہیں: آئندہ قانون سازی کی ضرورت کے بارے میں معلومات جمع کرنا۔ منظور شدہ قوانین کے مؤثر ہونے کا جائزہ لینا۔ حکومت کی دوسری شاخوں کے اراکین اور

افسروں کی اہلیت اور کارکردگی کے بارے میں تحقیقات اور معاملات کے بارے میں تفصیلی
جائزے میں مدد لینے کے لیے ایوان کے باہر سے ماہرین کو اکثر طلب کرتی ہیں۔

تحقیقاتی اختیار کے بہت سے اہم ضمنی اختیارات بھی ہیں۔ ان میں سے ایک اختیار یہ
ہے کہ تحقیقات کی اور ان کے نتائج کی تشہیر کی جائے۔ تحقیقاتی کمیٹیوں کی کارروائی عام پبلک
کے لیے کھلی ہوتی ہیں اور ذرائع ابلاغ وسیع پیمانے پر اس کی رپورٹنگ کرتے ہیں۔ شہریوں کی
آگاہی اور قومی معاملات میں ان کی دلچسپی بڑھانے کے لیے قانون سازوں کو جو وسائل حاصل
ہیں ان میں ایک اہم وسیلہ تحقیقاتی کمیٹیوں کی کارروائی ہے۔ کانگریس کی کمیٹیوں کو یہ اختیار بھی
ہے کہ وہ گواہی کے لیے ان لوگوں کو بھی مجبور کرسکتی ہے جو پیش ہونے پر تیار نہ ہوں۔ جو گواہ کسی
کمیٹی کے سامنے گواہی کے لیے پیش ہونے سے انکار کریں کمیٹی انہیں کانگریس کی توہین کا مجرم
قرار دے سکتی ہے اور جو گواہ جھوٹی شہادت دیں ان کے خلاف سزا کا مقدمہ قائم کرسکتی ہے۔

کانگریس کی غیر رسمی کارروائیاں:

یورپ کے پارلیمانی نظاموں کے برعکس امریکی قانون سازوں کا چناؤ اور کردار پارٹی
کے مرکزی ڈسپلن کا پابند نہیں ہوتا۔ امریکہ کی ہر بڑی سیاسی پارٹی بنیادی طور پر ان مقامی اور
ریاستی تنظیموں کا اتحاد ہوتی ہے جو ہر چار سال کے وقفے سے ہونے والے صدارتی انتخابات میں
ایک قومی پارٹی کے طور پر کام کرنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کرنا چاہتی ہوں
مثال کے طور پر ریپبلکن اور ڈیموکریٹک پارٹیاں۔ چنانچہ کانگریس کے ممبران اپنی پوزیشن کے
لیے نہ تو پارٹی کی قومی لیڈرشپ کے احسان مند ہوتے ہیں اور نہ کانگریس میں اپنے رفقاء کے
انہیں یہ مقام ان کے مقامی یا ریاستی رائے دہندگان کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ
ایوانِ نمائندگان کے یا سینٹ کے اراکین کا قانون سازی میں کردار انفرادی نوعیت کا ہوتا ہے
اور رائے دہندگان میں موجودہ تنوع کے ساتھ ساتھ اس آزادی کی عکاسی بھی کرتا ہے جو اپنے
حلقہ انتخاب میں اپنی شخصی مقبولیت برقرار رکھنے سے میسر آتی ہے۔

یوں کانگریس طبقاتی کی بجائے ایک رفاقتی تنظیم ہوتی ہے اس میں اختیارات کسی
کارپوریشن کی طرح اوپر سے نیچے کی طرف نہیں آتے بلکہ ہر طرف جاتے ہیں۔ کانگریس میں

اختیارات کی مرکزیت بہت ہی کم ہے کیونکہ اس کے پاس سزا اور جزا کے اختیارات ہی بہت کم
ہیں۔ کانگریس میں پالیسی سازی ان بدلتے ہوئے اتحادوں کے ذریعہ ہوتی ہے جن میں ہر زیر
غور معاملہ کے لحاظ سے تبدیلی آسکتی ہے۔ بعض اوقات جب متصادم دباؤ موجود ہوں (مثلاً
وہائٹ ہاؤس کی طرف سے یا اہم اقتصادی یا نسلی گروپوں کی طرف سے) تو قانون ساز فیصلہ
میں تاخیر کے لیے قواعد وضوابط کو بطور حربہ استعمال کرتے ہیں تاکہ کسی اہم اور بااثر حلقے کی
ناراضگی سے بچا جاسکے۔ کسی معاملے کو اس بنا پر موخر کیا جاسکتا ہے کہ متعلقہ کمیٹی نے جو کارروائی
کی وہ ناکافی تھی یا کانگریس ہدایت کرسکتی ہے کہ معاملے پر غور سے پہلے مقررہ ایجنسی ایک تفصیلی
رپورٹ تیار کرے۔ یا دونوں میں سے کوئی ایوان کسی مسئلہ کو التوا میں ڈال سکتا ہے اور معاملہ پر
کوئی فیصلہ کیے بغیر عملاً اسے ناکام بنایا جاسکتا ہے۔

کچھ ایسے غیر رسمی یا ان لکھے معیارات بھی ہیں جو اکثر کسی ممبر کے کام اور اثر ورسوخ کا
تعین کرتے ہیں۔ جو نمائندگان اور سینیٹرز قانون سازی سے متعلق اپنی ذمہ داریوں پر توجہ دیتے
ہیں اور ''ان سائڈر'' کہلاتے ہیں کانگریس کے ایوانوں میں ان کا اثر ورسوخ زیادہ ہوتا ہے بہ
نسبت ''آؤٹ سائڈرز'' کے جو قومی معاملات پر تقریریں کرنے کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔
ممبران سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اخلاق کا مظاہرہ کریں اور ذاتی حملوں
سے گریز کریں خواہ ان کے مخالفوں کی پالیسیاں کتنی ہی ناگوار یا انتہا پسندانہ کیوں نہ ہوں۔
ممبران سے یہ توقع بھی کی جاتی ہے کہ وہ قانون سازی کے سارے معاملات میں مہارت کا
دعویٰ کرنے کے بجائے دو، تین شعبوں میں مہارت حاصل کرنے پر توجہ دیں گے۔ جو ممبر اس
طرح کے غیر رسمی قاعدوں پر چلتے ہیں انہیں بڑی بڑی کمیٹیوں یا کم از کم ایسی کمیٹیوں کی رکنیت
ملنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں جن کا تعلق ان کے ووٹروں کی ایک بڑی تعداد کے مفادات
سے ہو۔

وفاق.....ریاست......اور بلدیات

وفاقیت روبہ عمل

امریکی نظام کی سب سے بڑی خصوصیت دستور کے تحت قائم شدہ وفاقی اکائی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ نظام بجائے خود ایک رنگارنگ مجموعہ ہے جو ہزاروں چھوٹی وحدتوں سے مل کر بنا ہے۔ یہی وہ اجزائے ترکیبی ہیں جو باہم مل کر ایک کل بناتے ہیں۔ پچاس حکومتیں اور ایک حکومت ڈسٹرکٹ آف کولمبیا کی۔ اس سے آگے چلیں تو مزید چھوٹی اکائیاں ہیں جو کاؤنٹی، شہر، قصبہ اور گاؤں کی سطح پر نظام حکومت چلاتی ہیں۔

حکومتی اکائیوں کی کثرت کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ خود ریاست ہائے متحدہ کے ارتقاء کا عمل ہے۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ وفاقی نظام ارتقائی عمل کا آخری مرحلہ تھا۔ دستور سے پہلے مختلف نو آبادیات کی الگ الگ حکومتیں تھیں جو بعد میں ریاستی حکومتیں کہلائیں۔ ریاستی حکومتوں سے پہلے کاؤنٹی حکومتیں اور دوسری چھوٹی اکائیاں تھیں۔ ابتدائی زمانہ کے انگریز آبادکاروں نے جو کام سب سے پہلے کئے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ انہوں نے بحیرہ اوقیانوس کے ساحل کے ساتھ ساتھ جو چھوٹی چھوٹی بستیاں قائم کیں ان کے لیے حکومتی اکائیاں بنائیں۔ 1620ء میں نئی دنیا کی تلاش میں طویل بحری سفر پر نکلنے والے اپنے جہاز سے نئی سرزمین پر اترنے سے پہلے

ہی ایک تصور تشکیل دے چکے تھے جس کو میفلاور کمپیکٹ (Mayflower Compact) کہا جاتا ہے یہ امریکہ کا پہلا تحریری دستور تھا اور جب اس نئی قوم نے مغرب کی طرف بڑھنا شروع کیا تو سرحد پر قائم ہونے والی ہر حفاظتی چوکی کی اپنی ایک حکومت ہوتی جو اپنے معاملات خود چلاتی امریکی دستور کی تدوین کرنے والوں نے اس کثیر المنزلہ حکومتی نظام کو جوں کا توں برقرار رکھا۔ انہوں نے ایک قومی ڈھانچہ تشکیل دیا جو کہ سپریم تھا۔ لیکن ساتھ ہی ان حکومتوں کے پورے سلسلے کو برقرار رکھنے کی ضرورت کا دانشمدانہ اعتراف بھی کیا جو براہ راست طریقے پر لوگوں سے رابطہ رکھتے ہیں اور ان کی ضرورتوں کا بھرپور ادراک کر سکتے تھے۔

چنانچہ دفاع، کرنسی اور خارجہ تعلقات جیسے فرائض انجام دینے کے لیے ایک مضبوط مرکزی حکومت کی ضرورت کو محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی اعتراف کیا گیا کہ صحت عامہ، تعلیم اور مقامی ٹرانسپورٹ جیسے دوسرے معاملات کا زیادہ تعلق مقامی حکومتوں سے ہے۔

ریاستی حکومت

آزادی سے پہلے نوآبادیات الگ الگ تاج برطانیہ کے زیرنگیں تھے۔ ریپبلک کے ابتدائی دنوں میں دستور کی منظوری سے پہلے ہر ریاست کی ایک خودمختار اکائی کے طور پر کام کرتی تھی۔ دستوری کنونشن میں شریک نمائندگان ایک مضبوط اور مستحکم وفاقی اکائی بنانے کے خواہشمند تھے لیکن انہوں نے اپنی اپنی ریاستوں کے حقوق تحفظ کا عزم بھی کر رکھا تھا۔

”وہ تمام معاملات جو مکمل طور سے ریاستی سرحدوں کے اندر آتے ہوں ان سب کی ذمہ دار ریاستی حکومتیں ہیں ان میں یہ ذمہ داریاں شامل ہیں۔“

اندرونی آمدورفت کے ذرائع، جائیداد سے متعلق قواعد وضوابط، صنعت، تجارت اور رفاہ عامہ کی سہولتیں، ریاستی ضابطہ فوجداری اور ریاست کی حدود میں حالات کار۔

ان ذمہ داریوں کے بارے میں وفاقی حکومت یہ چاہتی ہے کہ ریاستی حکومتیں جمہوری طرز کی ہوں اور یہ کہ وہ کوئی ایسا قانون نہ بنائیں جو وفاقی دستور کی یا وفاقی قوانین کی اور ریاست ہائے متحدہ کے معاہدوں کی تردید یا خلاف ورزی کرتا ہو۔ ریاستی اور وفاقی عدالتوں کی

حدود کا کئی معاملات میں مشترک ہونا یقینی ہے۔ خصوصاً حالیہ برسوں میں وفاقی حکومت نے صحت، تعلیم، فلاح و بہبود، ٹرانسپورٹ، ہاؤسنگ اور شہری ترقیات جیسے معالات کی کافی ذمہ داریاں لے لی ہیں۔ لیکن جن ریاستوں میں وفاقی حکومت اس طرح کی ذمہ داریاں اٹھاتی ہے وہاں اوپر سے پروگرام مسلط کرنے کے بجائے عام طور سے دونوں سطح کی حکومتوں کے درمیان تعاون کی بنیاد پر کام ہوتا ہے۔

وفاقی حکومت کی طرح ریاستی حکومتوں کی بھی تین شاخیں: مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ اپنے وظائف اور دائرہ کار کے لحاظ سے وفاقی حکومت کے محکموں سے بہت حد تک مماثل ہیں۔ ریاست کا چیف ایگزیکٹو گورنر ہوتا ہے جو براہ راست عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوتا ہے۔ اور اس کے عہدے کی مدت چار سال ہوتی ہے (چند ریاستیں ایسی بھی ہیں جہاں یہ مدت دو سال ہوتی ہے) نبراسکا کو چھوڑ کر جہاں ایک ہی قانون ساز ادارہ ہے باقی تمام ریاستوں میں دو ایوانی مقننہ ہے ان میں سے ایوان بالا کو عموماً سینٹ اور ایوان زیریں کو ایوان نمائندگان، ایوان وفود یا جنرل اسمبلی کہا جاتا ہے زیادہ تر ریاستوں میں سینٹرز چار سال کے لیے منتخب کئے جاتے ہیں اور ایوان زیریں کے ممبر دو سال کی مدت تک کام کرتے ہیں۔

مختلف ریاستوں کے دستور ایک دوسرے سے بعض تفصیلات میں مختلف ہوتے ہیں لیکن یہ دستور عموماً انہیں خطوط پر بنائے گئے ہیں۔ جن پر وفاقی دستور تشکیل دیا گیا ہے جن میں لوگوں کے حقوق کا ذکر بھی ہے اور حکومت کی تشکیل کے لئے ایک خاکہ بھی۔ کاروبار، بینک، رفاہ عامہ کی سہولتیں اور خیراتی اداروں کو چلانے کے لیے ضروری قواعد وضوابط جیسے معاملات کے بارے میں وفاقی دستور کی بہ نسبت ریاستی دستور میں زیادہ تفصیلات ہوتی ہین اور پوری وضاحت سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات ہر ریاستی قانو میں درج ہوتی ہے کہ اعلیٰ ترین اختیار عوام کو حاصل ہے۔ ہر ریاستی دستور میں کچھ ایسے معیار اور اصول مقرر کئے جاتے ہیں جو حکومت کی بنیاد کا کام کرسکیں۔

بلدیاتی حکومت

ریاست ہائے متحدہ کسی زمانے میں زیادہ تر دیہی معاشرہ پر مشتمل تھی لیکن آج پورے

ملک میں شہری زندگی اپنی اعلیٰ ترین سطح پر موجود ہے اور اس کی تین چوتھائی سے زیادہ آبادی آج کل قصبوں اور بڑے شہروں یا ان کے مضافات میں رہتی ہے۔ ان اعداد وشمار کو دیکھا جائے تو امریکی حکومت کی مجموعی شکل میں بلدیاتی حکومت انتہائی اہم قرار پاتی ہے۔ بلدیاتی حکومت پولیس اور آگ سے بچاؤ کے طریقوں سے لے کر صفائی کے معیار صحت کے ضابطوں تعلیم، پبلک ٹرانسپورٹ اور ہاؤسنگ تک ہر شعبہ میں عوام کی ضروریات پورا کرنے کی جو خدمت براہ راست انجام دیتی ہے وہ وفاقی یا ریاستی سطح سے کہیں زیادہ ہے۔

امریکہ کے بڑے شہروں کا نظام چلانا ایک بہت پیچیدہ عمل ہے مثال کے طور پر امریکہ کی صرف سات ریاستوں کی آبادی نیویارک شہر سے زیادہ ہے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ امریکی صدر کے عہدے کے بعد ملک کا سب سے مشکل انتظامی عہدہ نیویارک میئر کا ہے۔

بلدیاتی حکومت کا چارٹر ریاستی حکومتیں جاری کرتی ہیں جن میں شہری حکومت کے مقاصد اور اختیارات کی تفصیل درج ہوتی ہے لیکن زیادہ تر معاملات میں شہری حکومتیں ریاستی حکومت سے آزاد رہتے ہوئے عمل کرتی ہیں۔ زیادہ بڑے شہروں میں مقامی حکومتوں کا ریاستی اور وفاقی دونوں حکومتوں سے تعاون کرنا لازمی ہوتا ہے تا کہ وہ اپنے شہریوں کی ضروریات پوری کرسکیں۔

بلدیاتی حکومت کا تنظیمی ڈھانچہ

کئی طرز کی شہری حکومتیں ہیں جو پورے ملک میں رائج ہیں لیکن ان تمام حکومتوں میں چند باتیں ایک جیسی ہیں مثلاً تقریباً تمام شہروں میں ایک مرکزی کونسل ہوتی ہے جو براہ راست ووٹوں سے منتخب ہوتی ہے ہر بلدیاتی حکومت کا ایک انتظامی سربراہ ہوتا ہے جو شہر کے معاملات چلانے کے لئے مختلف محکموں کے سربراہوں کی مدد سے اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ طرز حکومت کے لحاظ سے شہری حکومتوں کے تین عمومی ٹائپ ہیں: ''میئر کونسل''، ''کمیشن'' اور ''سٹی منیجر''۔ یہ تین طرز کی حکومتیں بنیادی نوعیت کی ہیں جبکہ کئی شہروں میں ان تینوں یا دونوں طرز کو ملا کر ایک نئی طرز کی شہری عکومت اختیار کی گئی ہے۔

میئر کونسل: ریاست ہائے متحدہ میں بلدیاتی حکومت کی یہ قدیم ترین شکل ہے اور بیسویں صدی کے آغاز تک امریکہ کے کم وبیش تمام شہروں میں اسی طرز کی حکومتیں رائج تھیں۔

اس کی ساخت ریاستی اور مرکزی حکومتوں کی ساخت سے ملتی جلتی ہے اس میں انتظامیہ کا سربراہ ایک میئر ہوتا ہے جس کا براہ راست انتخاب کیا جاتا ہے۔ اسی طرح قانون سازی کے لیے ایک منتخب کونسل ہوتی ہے جس میں شہر کے مختلف حصوں کے نمائندے شامل ہوتے ہیں شہری حکومت کے محکموں کے سربراہوں اور دوسرے افسروں کا تقرر میئر کرتا ہے اور بعض جگہ اس تقرر کی منظوری کونسل دیتی ہے۔ میئر کو شہری قوانین کو ویٹو کرنے کا اختیار ہوتا ہے اور شہر کا بجٹ بھی اکثر میئر ہی تیار کرتے ہیں۔ کونسل آرڈیننس منظور کرتی ہے۔ جو شہری قوانین ہوتے ہیں۔ کونسل ہی جائیداد پر شہری ٹیکس کا نرخ مقرر کرتی ہے اور مختلف شہری محکموں کو رقوم فراہم کرتی ہے۔

کمیشن : اس طرز کی شہری حکومت میں قانون سازی اور انتظامی دونوں طرح کے فرائض یکجا ہوتے ہیں جو تین یا اس سے زیادہ افسروں کا ایک گروپ انجام دیتا ہے۔ اس گروپ کا انتخاب پورے شہر کے ووٹر کرتے ہیں۔ گروپ کا ہر افسر جو کمشنر کہلاتا ہے شہری حکومت کے ایک سے زیادہ محکموں کے کاموں کا نگران ہوتا ہے۔ گروپ کے افسران میں سے کسی ایک کو چیئرمین بنادیا جاتا ہے۔ جو اکثر میئر کہلاتا ہے لیکن اس کے اختیارات اس کے دوسرے ساتھی کمشنروں کے مساوی ہوتے ہیں۔

سٹی منیجر: منیجر کے طرز کی حکومت دراصل شہری مسائل کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی سے نمٹنے کے لیے اختیار کی گئی ہے۔ جدید شہروں کے معاملات چلانے کے لیے جس انتظامی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے وہ اکثر منتخب افسروں میں موجود نہیں ہوتیں۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ نفاذ قانون اور سہولتوں کی فراہمی سمیت اکثر انتظامی اختیارات کسی انتہائی تربیت یافتہ اور پیشہ ورانہ تجربہ کے حامل سٹی منیجر کے سپرد کردیے جائیں۔

سٹی منیجر کا طریقہ اختیار کرنے والے شہروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اس نظام میں ایک چھوٹی سی منتخب کونسل شہری قوانین بناتی ہے اور پالیسیاں متعین کرتی ہے لیکن اپنے فیصلوں پر عمل درآمد کروانے کے لیے ایک تنخواہ دار ناظم کا تقرر کرتی ہے جو سٹی منیجر کہلاتا ہے سٹی منیجر شہر کا بجٹ بناتا ہے اور اکثر شہری محکموں کے کام کی نگرانی کرتا ہے۔ عام طور سے سٹی منیجر کے عہدے کی کوئی مدت مقرر نہیں ہے اور جب تک کونسل اس کے کام سے مطمئن ہے وہ سٹی منیجر

کے فرائض انجام دیتا رہتی ہے۔

کاؤنٹی گورنمنٹ

کاؤنٹی ریاست کا ایک ذیلی حلقہ ہوتا ہے جس میں اکثر دو یا زیادہ قصبے اور کئی دیہات شامل ہوتے ہیں۔ نیویارک شہر اتنا بڑا ہے کہ اسے پانچ الگ الگ بورڈز میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر بورڈ اپنی جگہ ایک کاؤنٹی ہوتا ہے۔ برانکس، مین ہٹن ، بروک لن، کوئنیز اور اسٹیٹن آئی لینڈ نیویارک شہر کے بورڈز ہیں۔ واشنگٹن ڈی سی کے مقابل دریائے پوٹومیک کے دوسری طرف ریاست ورجینیا میں واقع آرلنگٹن کاؤنٹی ایک شہری علاقہ بھی ہے اور مضافاتی بھی اور اس کا انتظام ایک وحدانی طرز کی کاؤنٹی انتظامیہ چلاتی ہے۔

اکثر کاؤنٹیز میں کسی قصبہ یا شہر کو کاؤنٹی اسٹیٹ قرار دیدیا جاتا ہے جہاں شہری حکومت کے تمام دفاتر واقع ہوتے ہیں اور کمشنروں کے بورڈ یا سپروائزوں کے اجلاس ہوتے ہیں چھوٹی کاؤنٹیز میں ممبران بورڈ کا انتخاب پوری کاؤنٹی کے لوگ مل کر کرتے ہیں بڑی کاؤنٹیز میں سپروائزر علیحدہ ڈسٹرکٹ یا قصبوں کی نمائندگی کرتے ہیں وہ ٹیکس لگاتا ہے، قرضے لیتا اور محکموں کو رقوم فراہم کرتا ہے، کاؤنٹی کے ملازمین کی تنخواہیں مقرر کرتا ہے۔ انتخابات کی نگرانی کرتا ہے۔ شاہراہیں اور پل تعمیر کرتا اور ان کی دیکھ بھال کرتا ہے اور کاؤنٹی ریاست اور مرکزی حکومت کے رفاہی پروگرام چلاتا ہے۔

ٹاؤن اینڈ ویلج گورنمنٹ

ہزاروں میونسپل حدود اتنی چھوٹی ہیں کہ وہ بلدیاتی حکومت کے لیے موزوں نہیں ہوسکتیں یہاں قصبے اور دیہات کی سطح کی حکومتیں قائم کی جاتی ہیں اور ان کا تعلق صرف ان امور سے ہوتا ہے: گلیوں اور راستوں کی صفائی اور روشنی، پانی کی فراہمی، پولیس اور آگ سے بچاؤ کی خدمات صحت کے مقامی قواعد وضوابط ، کوڑے، نکاسی آب اور دیگر فضلے کو ٹھکانے لگانے کا انتظام۔ مقامی حکومت کے کاموں کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مقامی ٹیکس لگانا اور ریاست اور کاؤنٹی کے تعاون سے مقامی اسکول سسٹم کو چلانا۔

حکومت چلانے کا کام عموماً ایک منتخب بورڈ یا کونسل کے سپرد کیا جاتا ہے جو مختلف ناموں سے موسوم ہوسکتا ہے: ٹاؤن یا ولیج کونسل، بورڈ یا سلیک ٹمین بورڈ آف سپروائزرز، بورڈ آف کمشنرز۔ بورڈ کا ایک چیئرمین یا صدر ہوسکتا ہے جو چیف ایگزیکٹو افسر کے طور پر کام کرتا ہے۔ یا ایک منتخب میئر ہوسکتا ہے۔ حکومتی ملازمین میں ایک کلرک، خزانچی، پولیس اور فائر افسر اور ہیلتھ اور ویلفیئر افسر شامل ہوسکتے ہیں۔

مقامی حکومت کا ایک انوکھا پہلو جو زیادہ تر ریاست ہائے متحدہ کے نیو انگلینڈ کے خطے میں ملتا ہے ''ٹاؤن میٹنگ'' ہے۔ کسی قصبے کے تمام رجسٹرڈ ووٹر سال میں ایک بار (اور اگر ضروری ہوتو اس سے زیادہ بار) کھلا اجلاس کرتے ہیں جس میں افسروں کا انتخاب کیا جاتا ہے، مقامی مسائل پر بحث ہوتی ہے اور حکومت چلانے کے لیے قوانین منظور کئے جاتے ہیں۔ ایک ادارے کے طور پر ووٹرز کے ان اجلاسوں میں سڑکوں کی تعمیر و مرمت، سرکاری عمارتوں اور سہولتوں کی تعمیر، ٹیکسوں کی شرح اور قصبے کے بجٹ کے بارے میں فیصلے کئے جاتے ہیں۔ ''ٹاؤن میٹنگ''، جس کا سلسلہ گزشتہ دوسوسال سے زیادہ عرصہ سے جاری ہے اکثر براہ راست جمہوریت کی ایک ایسی خالص ترین شکل کے طور پر پیش کی جاتی ہے جس میں حکومت کرنے کا اختیار کسی کو تفویض نہیں کیا جاتا بلکہ تمام لوگ مل کر براہ راست اور باقاعدگی کے ساتھ یہ اختیار خود استعمال کرتے ہیں۔

دیگر مقامی حکومتیں

یہاں وفاقی، ریاستی اور مقامی حکومتوں کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ امریکہ کا نظم ونسق چلانے والی حکومتوں کے پورے سلسلے کا احاطہ ہرگز نہیں کرتا۔ محکمہ تجارت کے تحت قائم امریکی بیورو برائے مردم شماری نے ریاست ہائے متحدہ میں مقامی حکومت کے 78218 یونٹوں کی نشاندہی کی ہے جن میں کاؤنٹی، میونسپل، قصباتی، اکائیاں، اسکول ڈسٹرکٹ اور خصوصی ڈسٹرکٹ شامل ہیں۔

امریکی عوام اب اپنے ان متعدد کاموں کے لیے مختلف سطح کی حکومتوں کے محتاج بن چکے ہیں۔ جو ابتدا میں وہ خود کیا کرتے تھے۔ نوآبادیاتی دور میں پولیس والے یا فائر مین بڑے

شہروں میں بھی کم کم ہی ہوتے تھے۔ حکومتیں گلیوں اور سڑکوں پر نہ تو روشنیاں لگاتی تھیں نہ صفائی کا انتظام کرتی تھیں۔ ہر فرد بڑی حد تک اپنی املاک کی خود حفاظت کرتا تھا اور اپنے خاندان کی ضروریات پوری کرتا تھا۔

اب یہ کام پوری کیمونٹی کی ذمہ داری سمجھے جاتے ہیں۔ کیمونٹی یہ ذمہ داریاں حکومت کے توسط سے پوری کرتی ہے۔ اب تو چھوٹے قصبوں میں بھی پولیس، فائر مین، رفاہ عامہ اور صحت کے محکمے حکومتیں چلاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حکومتی اختیارات استعمال کرنے والے اداروں کا اتنا حیران کن سلسلہ قائم ہے۔

چھوٹے چھوٹے قانون ساز ادارے

کانگریس کے ایک رکن نے کانگریس کا بڑا دلچسپ تجزیہ کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ کانگریس مختلف کمیٹیوں کا ایک مجموعہ ہے جو ایک مخصوص عرصے کے بعد ایک کمرے میں یکجا ہوتی ہیں۔ اور ایک دوسرے کے کیے ہوئے فیصلوں کی منظوری دیتی ہے۔ یہ بیان اس امر کی بڑی عمدہ اور درست نشاندہی کرتا ہے کہ امریکی کانگریس کی اسٹینڈ ینگ اور مستقل کمیٹیاں ہی اس کی اصل جان ہیں۔ مثال کے طور پر دو سال کے عرصے میں کانگریس کے منعقدہ مختلف اجلاسوں میں کل 11,602 بل ایوان نمائندگان میں پیش کئے گئے جبکہ 4080 بل سینٹ میں پیش ہوئے۔ یہ تمام بل ان کمیٹیوں کے سپرد کر دیے گئے جو ان سے متعلق تھے۔ انہوں نے ان کا مطالعہ کیا، ان کے حق اور مخالفت میں دلائل سنے اور دیئے۔ شہادتیں سنیں، ان میں تبدیلیوں کی تجاویز نوٹ کیں ان تمام مراحل سے گزارنے کے بعد ان بلوں کو ایوان یا سینٹ میں پیش کیا گیا اور تقریباً 15 ہزار میں سے صرف 664 بل منظور ہو کر قانون بنے۔ یعنی چھ فیصد سے بھی کم بطور قانون نافذ ہو سکے۔

آئین میں خصوصی طور پر کانگریس کی ان کمیٹیوں کے قیام کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ جوں جوں ملک ترقی کرتا گیا اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی کہ قانون سازی سے پیشتر خوب اچھی طرح سے چھان پھٹک اور اس کے مختلف عوامل و عواقب، کا تجزیہ کیا

جانا چاہیئے۔ چنانچہ کمیٹیوں کا نظام 1789ء میں اس طرح شروع ہوا کہ ایوان کے اراکین مجوزہ قوانین کے سلسلے میں لامتناہی اور بے نتیجہ و مباحثہ میں الجھ گئے۔ اور بحث نے اتنا طول کھینچا کہ اراکین عاجز آ گئے۔ ابتدائی کمیٹیوں نے جن مسائل کو نپٹایا ان میں انقلابی جنگ کے کلیمز، پوسٹ سڑکیں اور علاقے اور دوسرے ممالک کے ساتھ تجارت جیسے معاملات شامل تھے۔ اس کے بعد آنے والے دور میں سیاسی، سماجی اور اقتصادی تبدیلیوں کے پیش نظر یہ کمیٹیاں بنتی اور ٹوٹتی رہیں۔ مثال کے طور پر کچھ عرصے کے بعد انقلابی جنگ کے کلیمز کے لیے قائم کمیٹی کی ضرورت نہ رہی۔ چنانچہ اس جگہ کانگریس کے دونوں ایوانوں میں سابق فوجیوں کے امور کی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔

1980ء کے عشرے کے آخری سال میں ایوان نمائندگان کی بائیس اسٹینڈنگ کمیٹیاں تھیں۔ جبکہ سینٹ میں سولہ کمیٹیاں تھیں۔ ان کے علاوہ چار مشترکہ مستقل کمیٹیاں تھیں جن کے اراکین دونوں ایوانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر ایوان کو یہ اختیار بھی حاصل تھا کہ وہ کسی خاص مسئلہ یا معاملہ کے بارے میں خصوصی یا سلیکٹ کمیٹی تشکیل دے سکتا ہے۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے ان اسٹینڈنگ کمیٹیوں نے اپنی مدد کے لیے مزید 300 ذیلی کمیٹیاں تشکیل دیں۔ اور ان کے لیے تحقیق، معلومات کی فراہمی، تجزیے اور ماہرانہ رائے دینے کے لیے تقریباً پچاس ہزار لوگ کام کرتے تھے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے قانون ساز مل کر حقیقی معنوں میں ایک کارنامہ سرانجام دیتے ہیں، حقائق یکجا کیے جانے کے بعد ایک کمیٹی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اس بل کے حق میں رائے دے کر اس کو آگے پیش کر دیا جائے یا اس بل میں ترمیم کر کے اس کو منظور کرنے کی سفارش کی جائے۔ کبھی کبھی کسی بل کو معرض التوا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اور فی الوقت اس پر غور خوص بند کر دیا جاتا ہے۔ کمیٹی جب کسی بل کو مثبت سفارشات کے ساتھ ایوان میں بھیج دیتی ہے اور اس کو ایوان یا سینٹ سے منظوری مل جاتی ہے، تب بھی کام ختم نہیں ہوتا، کیونکہ اسی وقت ایک اور کمیٹی اپنا عمل شروع کر دیتی ہے۔ ایک ہی بل کے بارے میں ایوان اور سینٹ کے درمیان جو اختلاف ہوتا ہے، اس کی روشنی میں اس کا مزید تجزیہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ کانفرنس کمیٹی کہلاتی ہے اور اس میں دونوں ایوانوں کے اراکین شامل

ہوتے ہیں۔ یہ کمیٹی اس بل کو وہ شکل دیتی ہے جو دونوں ایوانوں کے لیے قابل قبول ہو۔ اور جس سے تمام اراکین مطمئن ہوں۔ اس طرح یہ بل ایک بار پھر قطعی اور حتمی منظوری کے لیے ایوان اور سینٹ میں پیش ہوتا ہے وہاں سے منظوری کے بعد یہ بل صدر کو پیش کیا جاتا ہے جو اس پر دستخط کرتے ہیں۔

کانگریس کی کمیٹیاں قانون سازی کے سلسلے میں انتہائی اہم اور کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ ہر پیش کردہ تجویز کا بہت تفصیل اور گہرائی سے مطالعہ کرتی ہیں۔ اس کا تجزیہ کرتی ہیں۔ اس کو ہر زاویے سے دیکھتی ہیں، اس کی نوک پلک درست کرتی ہیں اور اگر چاہیں یا سمجھیں تو اس تجویز کو مسترد کرکے ہمیشہ کے لیے ختم بھی کرسکتی ہیں۔ یہ کمیٹیاں متواتر اپنے اس کام میں مصروف رہتی ہیں کوئی بل قانون بننے سے پیشتر ان مراحل سے گزر کر کندن بن جاتا ہے۔ اور امریکہ میں قانون سازی کے اس طریقے نے اس ملک کو بڑی توانائی اور تقویت بخشی ہے۔

کانگریس کے ''نگرانی'' کے اختیارات

کانگریس انتظامیہ پر اپنی گرفت کو مضبوط رکھنے کے لیے اور ان کی سرگرمیوں کی نگرانی کے لیے کئی طرح اقدامات کرتی ہے۔ اور ان میں سے موثر ترین طریقہ اس کے نگرانی اور احتساب کے اختیارات ہیں، کانگریس اس اختیار کو بروئے کار لاتے ہوئے مختلف قسم کے امور پر نظر رکھتی ہے قومی ضیاع اور فراڈ کا انسداد شہری آزادیوں اور انفرادی حقوق کا تحفظ، اس بات کو یقینی بناتا کہ انتظامیہ قانون پر عملدرآمد کرے۔ قانون سازی کے لیے معلومات اور اطلاعات حاصل کرے، عوام کی تعلیم و تربیت اور انتظامی عہدہ داران کی کارکردگی کا جائزہ لے۔ اس کے دائرہ کار میں کابینہ کے محکموں، انتظامی اداروں ریگولیٹری کیشنز اور پریذیڈنسی شامل ہے۔

کانگریس کی نگرانی کے فرائض میں چند امور درج ذیل ہیں:

☆ کمیٹی کے استفسارات اور شہادتیں۔

☆ انتظامیہ کی رپورٹوں پر ان سے سرکاری طور پر مشاورت کرنا۔

☆ انتظامی عہدیداروں کی نامزدگی اور معاہدوں کے بارے میں سینٹ کا مشورہ اور منظوری۔

☆ ایوان کی مواخذے کی کارروائی اور بعد ازاں سینٹ ٹرائیلز۔

☆ 25ویں ترمیم کے تحت صدر کی معذوری یا نائب صدر کا عہدہ خالی ہونے کی صورت

میں ایوان اور سینٹ کی کارروائی کو جاری رکھنا۔

☆ قانون سازوں اور انتظامی عہدیداروں کے درمیان غیر رسمی ملاقات۔

☆ سرکاری کمیشنوں میں کانگریس کے اراکین کی شمولیت۔

☆ کانگریس کی کمیٹیوں اور دیگر اداروں مثلاً کانگریس کا بجٹ دفتر، جنرل اکاؤنٹنگ آفس وغیرہ کے مرتب کردہ مطالعات۔

غرض اس طرح کے تمام امور کی نگرانی کانگریس کرتی ہے۔

کانگریس نگرانی کے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے سرکاری حکام کو ان کے عہدہ سے فارغ کرسکتی ہے۔ پالیسیاں تبدیل کرسکتی ہے اور انتظامیہ کو آئینی طور پر کنٹرول کرسکتی ہے۔ مثال کے طور پر 1949ء میں سینٹ کی ایک خصوصی ذیلی تحقیقاتی کمیٹی نے ٹرومین انتظامیہ کے اعلیٰ حکام کی بدعنوانیوں کا پردہ فاش کیا۔ اور اس تحقیقات کے نتیجے میں کئی اداروں کی تنظیم نو کی گئی اور وہائٹ ہاؤس خصوصی کمیشن قائم ہوا جس کا مقصد سرکاری اداروں میں کرپشن کے بارے میں تحقیقات کرنا تھا۔ 1960ء کے عشرے کے آخری حصے میں سینٹ کی امور خارجہ کی کمیٹی کی شہادتوں کو ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا۔ جس نے ویت نام کی جنگ کے خلاف لوگوں کے جذبات کو مہمیز دی۔ 1973ء میں واٹرگیٹ تحقیقات نے وہائٹ ہاؤس کے ان حکام کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات کئے کہ جو غیر قانونی طور پر اپنے اختیارات کو استعمال کرکے سیاسی فوائد حاصل کررہے تھے۔ اور اس کے بعد ایوان کے عدالتی کمیشن نے صدر نکسن کے خلاف مواخذے کارروائی کی اور نتیجتاً نکسن کا دور صدارت اختتام پذیر ہوا۔ 76-1975ء میں سینٹ کی سلیکٹ کمیٹی نے نشاندہی کی بعض سراغرساں ادارے اپنی قانونی حدود سے تجاوز کرتے ہیں اور کئی ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح کے سراغرساں اداروں کی سرگرمیوں کو قانون کے دائرے میں لانے کے لیے نئی قانون سازی کی گئی۔

1983ء میں یو ایس کسٹم سروس اور یو ایس امیگریشن سروس نے سرحدی معائنہ کے بارے میں ایک نیا مربوط طریقہ کار تجویز کیا۔ چونکہ اس کے بارے میں کوئی قانون موجود نہیں تھا اس لیے کانگریس نے اس کے بارے میں انکوائری کی اور یہ اعتراض کیا انتظامیہ کے پاس یہ

اختیار نہیں کہ کسی نئے قانون کی منظوری کے بغیر یہ طریقہ اختیار کرے اسی طرح 1987ء میں کانگریس کی نگرانی کے عمل کی وجہ سے یہ انکشاف ہوا کہ انتظامیہ نے خفیہ طور پر ایران کے ہاتھ اسلحہ فروخت کرکے اور اس سے حاصل شدہ منافع نکاراگوا میں حکومت مخالف قوتوں کو فراہم کرکے آئین کی خلاف ورزی کی ہے۔

کانگریس کی حاصل کردہ انہیں اطلاعات کی روشنی میں نئی قانون سازی ہوئی تاکہ آئندہ اس طرح کا واقعہ رونما نہ ہو۔ نگرانی کے یہ اختیارات صدارتی اقدامات پر نظر رکھنے اور دیگر سرکاری پالیسیوں کو کنٹرول کرنے کے لیے بے حد ضروری اور اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ستمبر 2001ء کے خونیں واقعات کے فوراً بعد صدر جنرل پرویز مشرف کا اظہار خیال

.....(نائن الیون کے صرف 5 دن بعد 16 ستمبر 2001ء کو پاکستان کے بڑے مدیران اخبارات و جرائد چیف ایگزیکٹو ہاؤس)(جواب وزیراعظم ہاؤس ہے) میں جمع تھے وہاں صدر نے بے تکلفی سے اس سنگین کیفیت اور صورت حال پر بات چیت کی جس سے پاکستان گزر رہا تھا اس وقت ہر قسم کے خطرات لاحق تھے۔ کچھ بھی ہوسکتا تھا یہ گفتگو اعتماد میں لے کر کی گئی تھی۔ اخبارات میں اس وقت اشاعت کے لیے نہیں تھی اب تو اس میں سے بہت کچھ منظر عام پر آچکا ہے۔ اس لیے اسے اس کتاب کا حصہ بنایا جارہا ہے)

صدر: آج کا get together تاریخی ہے میں میڈیا کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں بھارت کے مقابلے میں آگرہ کے دنوں میں جو تعاون آپ نے دیا، قومی مفاد کے تحفظ اور قومی یکجہتی کا مظاہرہ کیا وہ قابل تحسین تھا، اب اس کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے پاکستان کی تاریخ میں ایسی نازک صورتحال پہلے کبھی نہیں آئی تھی اس سے زیادہ آ بھی نہیں سکتی اتنا وسیع منظر نامہ پیچیدگیوں اور حساسیت کا کبھی نہیں تھا۔

ایک طرف فائدے ہیں ایک طرف نقصانات ہیں، اب ہم پر منحصر ہے کہ gains کو

زیادہ سے زیادہ کس صرح کر سکتے ہیں مجھے پھر آپ سے آ گرے والی unity چاہئے بلکہ اس سے زیادہ میڈیا، تمام سیاسی جماعتیں، حکومت سب اگر unifocal نہ ہوئیں تو ہم losses کو زیادہ کردیں گے ہمیں قومی اتحاد دکھانا ہے ہر لفظ سوچ سمجھ کر استعمال کرنا ہے آپ یقین جانیں ہمیں گھبراہٹ بالکل نہیں ہے ہم اچھی طرح غور کررہے ہیں پلان کررہے ہیں لیکن حالات اتنی تیزی سے رونما ہورہے ہیں، تبدیلیاں اتنی تیزی سے ہورہی ہیں۔ پہلے میں سوچ رہا تھا کہ آپ سے پیر کو ملوں لیکن جس طرح لحہ بہ لحہ باتیں آگے بڑھ رہی ہیں میں نے کہا کہ دیر ہوجائے گی اس لیے آپ کو بلایا۔ امریکی سفیر سے بار بار رابطہ ہورہا ہے۔ میں کراچی میں تھا وہیں فون آرہے تھے میں ناظموں سے مل رہا تھا امریکی قونصل جنرل باہر آ کر بیٹھ گئے انہوں نے کہا کہ وہ فوراً ملنا چاہتے ہیں میں میٹنگ درمیان میں چھوڑ کر ان سے ملا۔ بات یہ ہے کہ دہشت گردی کے بعد امریکہ یہ محسوس کررہا تھا کہ اس کی توہین ہوئی ہے humiliat کیا گیا ہے اب وہ عالمی ہمدردی حاصل کرنا چاہتا تھا صحیح یا غلط، اکثر ملکوں نے ہمدردی کی ہوگی اندر سے وہ ساتھ تھے یا نہیں انہوں نے ہمدردی کی۔

صحیح یا غلط، امریکہ نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اسامہ بن لادن اور طالبان کو سزا دینی ہے۔ اس پر دنیا میں debates ہورہی ہیں ہمارے یہاں بھی debates ہورہی ہیں کہ شواہد کیا ہیں ثبوت کیا ہیں لیکن بہرحال امریکہ اس نتیجے پر پہنچ چکا ہے۔ میں نے امریکی سفیر سے کہا کہ طالبان کسی ایک فرد کا نام نہیں ہے، یہ لاکھوں لوگ ہیں۔ اسامہ بن لادن تو ایک فرد ہے طالبان حکومت کچھ لوگ ہیں لیکن افغانستان تو ایک بڑی آبادی ہے اس طرح مناسب نہیں ہوگا کہ ہم حملہ کردیں۔ ہم نے کہا کہ ہمیں بھی دکھ ہوا ہے۔ ادھر ہمیں افسوس ہے کہ طالبان کے لیے پاکستان نے ہمیشہ ساتھ دیا لیکن انہوں نے بیان دے دیا کہ ان کے خلاف جس نے U.S کا ساتھ دیا تو وہ اس کے خلاف حملہ کردیں گے۔ ہم نے پھر بھی امریکہ سے کہا کہ یہ مناسب نہیں ہوگا لیکن صورت حال یہ تھی کہ کوئی گورا ہو، پیلا کالا سب ان سے ہمدردی کررہے تھے۔ جب صدر کلنٹن یہاں آئے اس وقت بھی ہم نے ان سے کہا تھا کہ آپ نے کروز میزائل پھینک کر طالبان کو خلاف کرلیا ہم نے ان سے کہا تھا کہ آپ ان کے مسائل سمجھیں۔ ہم نے پرنس عبداللہ

سے کہا کہ آپ کابل میں سفارت خانہ کھولیں، پرنس عبداللہ نے کہا کہ طالبان جھوٹے ہیں جو کہتے ہیں پورا نہیں کرتے۔

ادھر بھارت چاہتا ہے کہ پاکستان کوئی ایسا step لے کہ وہ امریکہ کے ساتھ مل کر وہ کچھ حاصل کرلے جو وہ برسوں سے چاہتا ہے۔ انہوں نے پیشکش کی کہ ہم ہوائی اڈے دینے کو تیار ہیں۔ ادھر دوشنبہ میں بھی میٹنگ ہوئی ایسا ہی اعلان ہوا، شمالی اتحاد نے طالبان کے خلاف امریکہ کا ساتھ دینے کا اعلان کیا۔ بھارت اور روس نے یہی اعلانات کئے۔ بھارت اسرائیل گٹھ جوڑ ہوگیا۔ ہم نے جمعہ کو ایئر پورٹ بند کیا کیونکہ ہمیں ایسی اطلاع ملی تھی کہ ہماری ایٹمی تنصیبات پر حملہ ہونے والا ہے۔ شکر ہے کہ بعد میں یہ اطلاع غلط نکلی ہم الرٹ تھے ہم اب بھی الرٹ ہیں ہمیں ایک بار پھر موقع ملا ہے کہ ہم پھر فرنٹ اسٹیٹ بن رہے ہیں۔ میں آپ کو بتاؤں کہ امریکہ کیا چاہتا ہے۔ کیا وہ ہمیں بتا رہا ہے، کچھ مجھے بتایا گیا کچھ امریکی سفیر کے ذریعے مختلف بالواسطہ ذریعوں سے کہا گیا، پھر ہمارے آئی ایس آئی کے چیف سے کہا گیا یہ کم وبیش ایک ہی چیز ہے، وہ ہمیں صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم واضح طور پر بتائیں کہ

''آپ ہمارے ساتھ ہیں یا نہیں۔''

نائب وزیر خارجہ آرمیٹج نے جنرل محمود سے میز پر بار بار مکہ مارتے ہوئے کہا۔'' ماضی کو بھول جائیں، مستقبل آج سے شروع ہو رہا ہے۔''

آپ کا یہ کہنا ہوگا کہ سیاہ ہے، جسے ہم سیاہ کہتے ہیں اسے آپ سیاہ کہیں، جسے ہم سفید کہیں آپ اسے سفید کہیں درمیان میں کچھ نہیں ہے۔

آپ یا ہمارے دوست ہیں یا ہمارے دشمن۔

اب صرف کارروائی کا ایکشن کا لمحہ ہے، بات چیت کا نہیں۔ ایک سینیٹر نے جنرل محمود سے کہا کہ آپ کو دیکھنا ہے کہ آپ اکیسویں صدی میں رہنا چاہتے ہیں یا پتھر کے دور میں۔ ہمارے سامنے کیا ہے، اقتصادی بحالی ہے، ہر شعبے میں امداد کا اعلان ہے۔

عالمی طور پر صورت حال یہ ہے کہ تمام مسلم ممالک امریکہ کے ساتھ ہیں حتیٰ کہ عراق نے بھی خط لکھا ہے۔ پرنس عبداللہ نے ہمارے پاس ایلچی بھیجا ہے۔ انہوں نے بھی کہا ہے سب

کہہ رہے ہیں سوچ کر احتیاط سے فیصلہ کریں ہم پاکستان کے لیے پریشان ہیں۔ ان سے فون پر بات ہوئی تب بھی یہی کہا گیا پھر سلامتی کونسل سے قرارداد بھی منظور کردی ہے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ امریکہ کیا چاہتا ہے وہ اگرچہ براہ راست جواب گول کر رہے ہیں لیکن ہمارا تجزیہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں (1) ہم انہیں انٹیلی جنس، انفارمیشن میں مدد دیں۔ (2) فضائی حدود کا استعمال Logestic support3 زمینی حکمت عملی میں امداد یہ سب سے بڑی چیز ہے یہ افغانستان کے حوالے سے ہے۔

ہم نے اپنے دوستوں سے discuss کیا چینی سفیر کے ذریعے وزیراعظم چین کو پیغام بھیجا، ہم نے discuss کیا کہ ہم اپنے strategic assetts پر بالکل compromise نہیں کریں گے، logistic support کا فیصلہ اس وقت واضح ہوسکتا ہے جب ہمیں معلوم ہو کہ ان کا Plan کیا ہے ہمارا تجزیہ یہ ہے کہ (1) سمندر سے میزائل کا حملہ بے فائدہ ہے، پہلے بے نتیجہ رہا تھا۔ (2) Air mobile action ہیلی کاپٹروں کے ذریعے مخصوص مقامات پر اترنا یہ ممکن ہے۔ (3) گراؤنڈ ایکشن، زمینی کارروائی، ساز وسامان اتارنا، انہوں نے پلان بتایا نہیں ہے۔ ہیلی کاپٹرز کا امکان بھی ہے۔ اس میں بات بالکل واضح ہے کہ پاکستان کے سوا کوئی اور ملک اس امکان میں زیادہ سہولت نہیں پہنچا سکتا اسی طرح سمندر کی سہولت بھی پاکستان سے زیادہ کوئی نہیں دے سکتا۔ ایران کسی حد تک کرسکتا ہے لیکن امریکہ ایران کے ذریعے نہیں کرسکتا۔

ہمارا موقف کیا ہے

ہم نے کئی میٹنگیں کیں Brain Storming کی، پاکستان کا مفاد کیا ہے، ہماری نازک تشویش کیا ہے، ہمارے وجود کا مسئلہ ہے، سب سے پہلے ہماری سیکورٹی ہے، غیر ملکی جارحیت کے خطرات کہاں کہاں سے ہیں۔ سب سے خطرناک ناراض اور برہم بھارت ہے جو سپر پاور کی مدد حاصل کرکے پرانے حساب چکانا چاہتا ہے۔ افغانستان میں پاکستان دشمن حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ ایران کی طرف سے ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن وہ افغانستان میں اپنی مرضی کی حکومت ضرور قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ تو Externel Threats ہیں ہماری معیشت کا

مسئلہ ہے جو نیچے جارہی ہے۔ ہم نے کافی کام کیا۔ ہم اسے Sustain کرنے کی کوششیں کررہے تھے لیکن درمیان میں یہ معاملہ آ گیا۔ اب حقیقت یہ ہے کہ اس واقعے کے بعد عالمی بینک کی ٹیم مذاکرات کررہی تھی، چلی گئی، آئی ایم ایف کی ٹیم چلی گئی، جو بھی وزارت خزانہ کا گراؤنڈ ورک تھا، ہم نے اعتماد حاصل کیا تھا وہ سب چلا گیا۔ اگر آپ کو کہیں سے کچھ نہیں ملے گا تو جو میں 3 سے 5 سال کی Sustainability کے لیے کہتا رہا ہوں اس کا کیا ہوگا۔ طاقتور بھارت اگر عالمی حمایت حاصل کرلے تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ کشمیر میں کتنی تباہی مچ سکتی ہے۔ ہمارے اسٹریٹیجک اثاثے، تنصیبات ہیں..... ہم نے تمام انتظامات کر رکھے ہیں انسانی اور فوجی طور پر ان کو ہم نقصان نہیں پہنچنے دیں گے اب آپ دیکھ لیں۔

1۔ ہمارے وجود کا، بقا کا مسئلہ ہے۔

2۔ معیشت کا مسئلہ ہے۔

3۔ ایٹمی تنصیبات کا سوال ہے۔

4۔ کشمیر کا سوال ہے۔

معیشت میں ہمارے پاس یہ امکان ہے کہ ہم تمام قرضے معاف کروالیں، اشارے ہیں یقین دہانی نہیں، کام ہوسکتا ہے۔ ہم اقتصادی بحران سے نکل سکتے ہیں۔ سیاسی فائدہ بھی یہ ہے کہ ہم عالمی برادری میں نمایاں ہیں اور نمایاں کام کرسکتے ہیں۔ افغانستان کے حوالے سے سب سے اہم کردار ہم ادا کرسکتے ہیں اگر وہاں حکومت کی تبدیلی ہوگی مگر اس میں ہماری say ہوگی تو وہاں ہم پاکستان دشمن حکومت نہیں بننے دیں گے۔ بھارت چاہتا ہے کہ ہم side line میں چلے جائیں وہ lime light میں آجائے۔ یہ ساری کوشش ہے۔ جنرل محمود واپس آئے انہوں نے بھی بتایا، پرنس عبداللہ کے ایلچی نے بھی بتایا کہ امریکہ میں یہ سوچ ہے کہ افغانستان پر ایٹمی حملہ کیا جائے، محدود ایٹمی طاقت استعمال کی جائے۔ ان کی قیادت سے جنرل محمود ملے، کانگریس اپنے قوانین evoke کرکے ہمیں مدد دینے کو تیار ہے لیکن اگر ان کی ہم حمایت نہیں کریں گے تو وہ اتنی تباہی بتارہے ہیں کہ ہم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ ان کا کہنا ہے کہ پرل ہاربر کے واقعے کے بعد امریکی عوام کسی واقعے پر اتنے برہم نہیں ہوئے۔

یہ صورتحال ہے دس سال سے ہماری معیشت زبوں حال ہے، امریکہ سے ظاہر ہے کہ کوئی سرٹیفکیٹ تو نہیں مل سکتا ان پر کوئی اعتماد نہیں کرسکتا، کوئی گارنٹی نہیں دے سکتا اگر کوئی توقعات ہم نے کیں، ہم نے ہی کی ہیں انہوں نے کہیں یقین نہیں دلایا۔ 1971ء میں بھی ہم خود ہی سمجھ رہے تھے انہوں نے کوئی وعدہ نہیں کیا پھر ہم نے کہا کہ ہمیں led down کردیا گیا ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ صورتحال سے ہمیں خود ہی کچھ حاصل کرنا ہوتا ہے اس وقت بھی یہی choice ہیں۔

میں نے انہیں بتایا، یقین دہانی کی۔ ہم دوسری بار فرنٹ اسٹیٹ بن رہے ہیں۔ میں نے صدر بش سے کھل کر بات کی۔ انہوں نے تمام معاملات کے سلسلے میں یقین دلایا ہے۔ امریکی سفیر کے ذریعے وہ لکھ کر بھی دیں گے۔ افغانستان میں کوئی حکومت اگر بنتی ہے، استحکام اور اتحاد کی بات ہوتی ہے تو ہم اس عمل کا حصہ بنیں گے اور وہاں pro pak گورنمنٹ بھی قائم کرواسکتے ہیں۔ کشمیر میں ہم نے امریکہ سے فعال کردار کی درخواست کی۔ میں نے اقتصادی بحالی کی، قرضے معاف کروانے کی بات کی ہے۔ 32 بلین ڈالر کے قرضے معاف کرنے کی بات کی ہے۔ پابندیاں ختم کروانے کی بات کی ہے۔ تجارت کھلنی چاہئے۔ میں نے ہر چیز clear کی تھی۔ ایک پیکیج کی بات کی ہے اور ان کا جواب انتہائی طور پر مثبت تھا۔

سوال، صدر: دو سال سے طالبان سے میں نے ملا عمر کے علاوہ ذاتی طور پر ہر سطح پر بات کی ہے۔ DG-ISI نے ہر سطح پر بات کی ہے۔ ان سے کہا ہے کہ آپ دیکھئے دنیا آپ کے خلاف کیوں ہے۔ وزیر خارجہ بہت سی باتیں مان کر جاتے ہیں ملا عمر نہیں مانتے۔ میں یہ پیغام بھیج رہا ہوں۔ اسامہ بن لادن کے بارے میں کہا ہے کہ اصول کی بات یہ ہے کہ ورلڈ ٹریڈ پر حملہ اصولی بات نہیں ہے۔ اسامہ ایک آدمی ہے لیکن اس کی وجہ سے 25 ملین لوگوں کو تو نقصان نہیں پہنچایا جاسکتا۔ ایٹمی حملے کی بات ہورہی ہے اس سے کتنی تباہی ہوگی۔ ہمیں یہ بھی پتہ چلا ہے کہ نیوٹرون استعمال ہوسکتا ہے جو آکسیجن جذب کرلیتا ہے، عمارتوں کو کچھ نہیں ہوتا، انسان ختم ہوجاتے ہیں، کتنی لاشیں گریں گی، کیا ہم مقابلہ کرسکتے ہیں، کابل تباہ ہوجائے گا، سب کچھ ختم ہوجائے گا، ہمارا ایلچی گیا ہے، ان کے ایلچی آرہے ہیں DG-ISI کل پرسوں

مسئلہ ہے جو نیچے جارہی ہے۔ ہم نے کافی کام کیا۔ ہم اسے Sustain کرنے کی کوششیں
کررہے تھے لیکن درمیان میں یہ معاملہ آ گیا۔ اب حقیقت یہ ہے کہ اس واقعے کے بعد عالمی
بینک کی ٹیم مذاکرات کررہی تھی، چلی گئی، آئی ایم ایف کی ٹیم چلی گئی، جو بھی وزارت خزانہ کا
گراؤنڈ ورک تھا، ہم نے اعتماد حاصل کیا تھا وہ سب چلا گیا۔ اگر آپ کو کہیں سے کچھ نہیں ملے
گا تو جو میں 3 سے 5 سال کی Sustainability کے لیے کہتا رہا ہوں اس کا کیا ہوگا۔ طاقتور
بھارت اگر عالمی حمایت حاصل کرلے تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ کشمیر میں کتنی تباہی مچ سکتی ہے۔
ہمارے اسٹریٹیجک اثاثے، تنصیبات ہیں..... ہم نے تمام انتظامات کررکھے ہیں انسانی اور فوجی
طور پر ان کو ہم نقصان نہیں پہنچنے دیں گے اب آپ دیکھ لیں۔

1۔ ہمارے وجود کا، بقا کا مسئلہ ہے۔
2۔ معیشت کا مسئلہ ہے۔
3۔ ایٹمی تنصیبات کا سوال ہے۔
4۔ کشمیر کا سوال ہے۔

معیشت میں ہمارے پاس یہ امکان ہے کہ ہم تمام قرضے معاف کروالیں، اشارے ہیں
یقین دہانی نہیں، کام ہوسکتا ہے۔ ہم اقتصادی بحران سے نکل سکتے ہیں۔ سیاسی فائدہ بھی یہ ہے
کہ ہم عالمی برادری میں نمایاں ہیں اور نمایاں کام کرسکتے ہیں۔ افغانستان کے حوالے سے سب
سے اہم کردار ہم ادا کرسکتے ہیں اگر وہاں حکومت کی تبدیلی ہوگی مگر اس میں ہماری say ہوگی تو
وہاں ہم پاکستان دشمن حکومت نہیں بننے دیں گے۔ بھارت چاہتا ہے کہ ہم side line میں
چلے جائیں وہ lime light میں آجائے۔ یہ ساری کوشش ہے۔ جنرل محمود واپس آئے انہوں
نے بھی بتایا، پرنس عبداللہ کے ایلچی نے بھی بتایا کہ امریکہ میں یہ سوچ ہے کہ افغانستان پر ایٹمی
حملہ کیا جائے، محدود ایٹمی طاقت استعمال کی جائے۔ ان کی قیادت سے جنرل محمود ملے،
کانگریس اپنے قوانین evoke کرکے ہمیں مدد دینے کو تیار ہے لیکن اگر ان کی ہم حمایت نہیں
کریں گے تو وہ اتنی تباہی بتارہے ہیں کہ ہم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ ان کا کہنا ہے کہ پرل ہاربر
کے واقعے کے بعد امریکی عوام کسی واقعے پر اتنے برہم نہیں ہوئے۔

یہ صورتحال ہے دس سال سے ہماری معیشت زبوں حال ہے، امریکہ سے ظاہر ہے کہ
کوئی سرٹیفکیٹ تو نہیں مل سکتا ان پر کوئی اعتماد نہیں کرسکتا، کوئی گارنٹی نہیں دے سکتا اگر کوئی
توقعات ہم نے کیں، ہم نے ہی کی ہیں انہوں نے کہیں یقین نہیں دلایا۔ 1971ء میں بھی ہم
خود ہی سمجھ رہے تھے انہوں نے کوئی وعدہ نہیں کیا پھر ہم نے کہا کہ ہمیں led down کردیا گیا
ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ صورتحال سے ہمیں خود ہی کچھ حاصل کرنا ہوتا ہے اس وقت بھی یہی
choice ہیں۔

میں نے انہیں بتایا، یقین دہانی کی۔ ہم دوسری بار فرنٹ اسٹیٹ بن رہے ہیں۔ میں
نے صدر بش سے کھل کر بات کی۔ انہوں نے تمام معاملات کے سلسلے میں یقین دلایا ہے۔
امریکی سفیر کے ذریعے وہ لکھ کر بھی دیں گے۔ افغانستان میں کوئی حکومت اگر بنتی ہے، استحکام
اور اتحاد کی بات ہوتی ہے تو ہم اس عمل کا حصہ بنیں گے اور وہاں pro pak گورنمنٹ بھی قائم
کرواسکتے ہیں۔ کشمیر میں ہم نے امریکہ سے فعال کردار کی درخواست کی۔ میں نے اقتصادی
بحالی کی، قرضے معاف کروانے کی بات کی ہے۔ 32 بلین ڈالر کے قرضے معاف کرنے کی بات
کی ہے۔ پابندیاں ختم کروانے کی بات کی ہے۔ تجارت کھلنی چاہئے۔ میں نے ہر چیز clear کی
تھی۔ ایک پیکیج کی بات کی ہے اور ان کا جواب انتہائی طور پر مثبت تھا۔

سوال، صدر: دو سال سے طالبان سے میں نے ملا عمر کے علاوہ ذاتی طور پر ہر سطح پر
بات کی ہے۔ DG-ISI نے ہر سطح پر بات کی ہے۔ ان سے کہا ہے کہ آپ دیکھئے دنیا آپ
کے خلاف کیوں ہے۔ وزیر خارجہ بہت سی باتیں مان کر جاتے ہیں ملا عمر نہیں مانتے۔ میں یہ
پیغام بھیج رہا ہوں۔ اسامہ بن لادن کے بارے میں کہا ہے کہ اصول کی بات یہ ہے کہ ورلڈ ٹریڈ
پر حملہ اصولی بات نہیں ہے۔ اسامہ ایک آدمی ہے لیکن اس کی وجہ سے 25 ملین لوگوں کو تو
نقصان نہیں پہنچایا جاسکتا۔ ایٹمی حملے کی بات ہورہی ہے اس سے کتنی تباہی ہوگی۔ ہمیں یہ بھی پتہ
چلا ہے کہ نیوٹرون استعمال ہوسکتا ہے جو آکسیجن جذب کرلیتا ہے، عمارتوں کو کچھ نہیں ہوتا،
انسان ختم ہوجاتے ہیں، کتنی لاشیں گریں گی، کیا ہم مقابلہ کرسکتے ہیں، کابل تباہ ہوجائے گا،
سب کچھ ختم ہوجائے گا، ہمارا ایلچی گیا ہے، ان کے ایلچی آرہے ہیں DG-ISI کل پرسوں

جا رہے ہیں۔ اسامہ بن لادن خود سرینڈر کردے تو اگرچہ پورا مسئلہ حل نہیں ہوگا لیکن افغانستان کی بچت ہوسکتی ہے۔

نسیم زہرا: امریکہ میں فرد کوئی فیصلہ نہیں کرتا، ہمیں امریکہ سے زیادہ توقعات نہیں رکھنی چاہئیں۔ ہمیں عوام کو اعتماد میں لینا ہوگا۔

صدر: یہ نقصان کی بات نہیں ہے، ہم نے صدر بش سے کہا ہے کہ جو بھی پاکستان کے لیے دیکھنا ہے کہ ہم اس میں کیا کررہے ہیں، پاکستان کے لیے ہم نے کہا ہے کہ سیکورٹی کونسل کا دوبارہ اجلاس ہو امریکہ اسلامی وزرائے خارجہ کا اجلاس کروائے، قرار داد منظور کروائے۔ ہم نے کہا ہے کہ اسامہ بن لادن کے خلاف کوئی بھی فوجی ایکشن ہو تو اس میں مسلم ممالک کی شرکت ہونی چاہئے، ہم کو اس میں نہ رکھا جائے، پاکستانی فوجیں سرحد عبور نہیں کریں گی۔ ہمارے اسٹرٹیجک اثاثوں کو اسرائیل و انڈیا سے خطرہ ہے۔ امریکہ ضمانت دے کہ وہ اس سے باہر رہیں گے۔ افغانستان میں اگر تبدیلی ہو تو اس عمل میں پاکستان کی شرکت ہونی چاہئے۔

عبدالستار: صدر صاحب ابتدا سے ہی امریکہ سے کہہ رہے ہیں کہ اسلامی وزرائے خارجہ کی میٹنگ بلانے میں مدد کریں۔

صدر: دو طریقہ کار ہوتے ہیں پہلے deal کرلی جائے پھر کہا جائے کہ مانتے ہو یا نہیں۔ دوسرا یہ ہے کہ ہم کہیں ہم ساتھ ہیں۔ ہم کریں گے، یہ ہماری مشکلات ہیں۔ آرمیٹج نے جیسا کہ کہا کہ یا تو ریچھ کو مار دو یا زخمی نہ کرو۔ امریکہ اس وقت زخمی ہے اس کو ہم موقع نہیں دینا چاہتے کہ وہ پھر سے حملہ کرے۔

راشد قریشی: ہم نے افغانستان کے لیے بہت قربانیاں دی ہیں لیکن طالبان کا رویہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں فرقہ وارانہ قتل کرکے لوگ وہاں چلے جاتے ہیں۔ وہ ہمارے کہنے کے باوجود واپس نہیں کرتے۔

صدر: ریاض بسرا کے معاملے میں ہم نے کہا ہے وہ نہیں دیتے۔

مجید نظامی: کل تک طالبان کے ساتھ تھے، نصیر اللہ بابر نے کام شروع کیا۔ آپ یہ بتائیں کہ ہم اب طالبان کے خلاف کیوں ہو رہے ہیں، ہمیں طالبان کا ساتھ دینا چاہئے۔

صدر: کوئی چیز کوئی بات مستقل نہیں ہوتی صرف قومی مفاد مستقل ہے۔ میں آپ سے اتفاق نہیں کرتا۔ آپ متوازن view نہیں لے رہے ہیں۔ آپ کے view سے قوم کو نقصان ہوگا۔

مجید نظامی: ظاہر شاہ، ربانی کی بات ہو رہی ہے۔

صدر: اگر آپ کے views سے سب متفق ہوں تو میں بھی اپنا موقف بدلنے کو تیار ہوں۔ میں حقائق کے خلاف بات نہیں کررہا ہوں۔

نسیم زہرا: افغانستان میں مستقبل کی بات کے لیے ایران سے، USA سے بات ہونی چاہئے تھی۔

عبدالستار: صدر، ایران کے صدر سے چار بار مل چکے ہیں۔ وزیر خارجہ سے بات ہوئی ہے۔ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ایران کی خواہش یہ ہے کہ ان کی مرضی کی حکومت ہو لیکن ہم بنوائیں۔ ایران نے 3 بلین ڈالر ایسی حکومت کے قیام کے لیے خرچ کئے ہیں۔ ہمارے پاس تو پیسے نہیں ہیں۔

صدر: نصیر اللہ بابر نے بھی کریڈٹ لیا، ہم نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ یہ سب کچھ خود ہوا تھا۔

اکرام سہگل: ہمیں دہشت گردی اور militancy میں فرق کرنا ہے، کشمیر میں دہشت گردی نہیں militancy ہے۔ یہ فیصلہ پاکستان کے مفاد میں ہے لیکن ہم یہ کیوں کہہ رہے ہیں کہ ہم افغانستان کی سرحد پار نہیں کریں گے۔

صدر: نہیں ایسی بات نہیں اگر افغانستان نے حملہ کیا تو ہم ضرور کریں گے صرف ملٹی نیشنل فورس میں ہم شامل نہیں ہوں گے۔

مجیب شامی: آپ کا یہ فیصلہ صحیح ہے، پاکستان کے مفاد میں ہے۔ خلیج میں ہم نے دیر کی، بہت بڑے عذاب سے ہم بچ گئے۔ اس میں ہمیں فائدہ ہوگا۔

صدر: یہ اچھی بات ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے کہ احمد شاہ مسعود کا انتقال ہوگیا اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ بعد کے واقعات کو اپنے حق میں کیسے کریں۔

قادر حسن: عوام کو اعتماد میں لینا چاہئے۔

طلعت حسین: وسیع تر تناظر سے دیکھا جائے کہ یہ صرف اسامہ کا مسئلہ نہیں ہے القاعدہ اور اخوان المسلمین کا نہیں ہے یہ تو پوری جہادی انڈسٹری کو ختم کرنے کا مسئلہ ہے۔ اس کا اندرون ملک میں ردعمل ہوگا۔

صدر: ہمیں جہاد اور آزادی کی تحریکوں میں فرق کو سامنے رکھنا ہے، ہم نے امریکہ سے بارہا کہا ہے کہ کشمیر میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ دہشت گردی نہیں ہے۔ امریکہ سے کہا ہے افغانستان میں جو کچھ ہوگا وہ طویل نہ ہو اس کے فوراً بعد rehabliation ہوگی، معیشت کی تعمیر ہو، مہاجرین اس لیے پاکستان میں ہیں کہ وہاں پانی تک نہیں ملتا۔ افغانستان میں جو کچھ ہوگا اس کا فال آوٹ ضرور ہوگا۔ داخلی سلامتی کی بریفنگ میں بتایا گیا کہ کافی پیچیدگیاں ہوں گی۔ سرحد میں پشاور میں فوج اور گورنر سے کہا ہے کہ وہ الرٹ رہیں، کراچی میں بھی افغان ہیں وہاں بھی گورنر سے کہا گیا ہے۔

نسیم زہرا: بعد میں جو کچھ ہوگا امریکہ کیا share کرے گا۔

صدر: وسیع تر بنیادوں پر وہ share کرے گا، ہم سے وہ پوچھتے ہیں اسامہ کہاں ہے ہم اس میں share کریں گے لیکن پاکستان میں جو کچھ ہوگا وہ پاکستان کی حکومت کی ذمہ داری ہوگی۔ امریکا اس میں مداخلت نہیں کرے گا۔

ہمایوں گوہر: ایٹمی حملے کی صورت مین فال آؤٹ ہوگا اس کے لیے تیاری ہے اور آپ کے روڈ میپ کا کیا ہوگا۔

صدر: ایٹمی حملے والی بات ہوئی اس کے فال آوٹ پر بھی بات ہوئی ہے لیکن یہ Air borne ہوگا، لینڈ آپریشن بھی نہیں ہوگا صرف فضا سے بات ہوسکتی ہے وہ اپنے ہیلی کاپٹر لا رہے ہیں، وہ پلان بتائیں تو وقت اور وسعت کی بات ہوسکتی ہے، جمہوری روڈ میپ میں کوئی تبدیلی نہیں ہے، وقت بہت کم ہے، دباؤ بہت زیادہ ہے۔ ہم طالبان سے بات کررہے ہیں کہ وہ نظر ثانی کریں، اسامہ بن لادن کو تو دینا ہی ہوگا۔

فوری تاثرات

امریکہ سے واپسی کے فوراً بعد.....روزنامہ جنگ میں شائع ہونے والی تحریریں پیش خدمت ہیں جو ملک بھر میں اور بیرون ملک بھی بہت پسند کی گئیں۔ یہ ایک طرح سے ابتدائی تاثر تھا اور مختلف گفتگوؤں کا خلاصہ۔ کتاب کے متن اور ان اقساط میں کچھ تکرار اور ملتے جلتے نکات بھی ہوں گے۔ ان سے قطع نظر یہ تحریریں اپنی جگہ ایک اہمیت رکھتی ہیں۔

امریکہ کیا سوچ رہا ہے

Visit America before it visits you.

(امریکہ پہلے ہو آؤ۔ پیشتر اس کے کہ امریکہ آپ کے پاس آئے)۔

میں نے اپنے امریکی میزبانوں کے سامنے جب اپنا یہ نعرہ بلند کیا تو پہلے تو وہ ہنسے۔ مگر بعد میں وہ بہت روئے کہ یہ کیوں؟

ہم نے عرض کیا کہ آپ کی طرف سے پیغام ملا کہ دو ہفتے کے دورے پر آئیں۔ جس کا موضوع ہے۔

U.S.Engagmement in the post 9/11 world.

بعد از 9/11 دنیا میں امریکہ کی مصروفیات۔

ہم چلے آئے کہ دیر نہ ہو جائے۔ آپ کو کہیں پہلے زحمت نہ کرنی پڑ جائے۔ عراق میں آپ پہلے ہی پریشان ہیں۔ جہاں تک 9/11 کے بعد کی دنیا میں آپ کی مصروفیات کا تعلق ہے۔ وہ تو آپ ہی کو سب کچھ کرنا ہے۔ 9/11 سے پہلے بھی سب کچھ آپ ہی کرتے تھے۔

جو چاہتے ہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا۔

انٹرنیشنل وزیٹرز پروگرام۔ امریکی محکمۂ خارجہ گزشتہ 60 سال سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ جن میں دانشوروں، صحافیوں، سیاست دانوں، تاجروں، صنعت کاروں، علماء کو مدعو کیا جاتا

ہے۔ ان میں کچھ ایسے خوش نصیب بھی تھے۔ جنہیں بعد میں اپنے ملک کی سربراہی کا موقع بھی مل گیا۔ افغانستان کے عبوری صدر حامد کرزئی تازہ ترین مثال ہیں۔ تاریخ میں اور بھی ایسی شخصیتیں اس پروگرام میں شامل ہوتی رہی ہیں۔

اب جب میں اس پندرہ روز کی تفصیلات آپ تک پہنچانے حاضر ہوا ہوں، پھر 11 ستمبر آنے والی ہے۔ ہم مسلمانوں کی اور پھر پاکستانی کی تاریخ میں تو نہ جانے کتنی ایسی 9/11 آ چکی ہیں۔ غریب وسادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل۔ لیکن امریکیوں کے لیے 11 ستمبر 2001ء پہلی بار آئی تھی اور اب وہ چاہتے ہیں کہ دوبارہ 9/11 ان کے ہاں نہ آئے۔ دنیا میں بے شک اس سے زیادہ ہلاکتیں اور تباہیاں رونما ہوتی رہیں۔

امریکہ اس وقت واحد سپر طاقت ہے اور زیادہ تر امریکی اپنے آپ کو اشرف ترین قوم سمجھتے ہیں۔ اب تک وہ ساری جنگیں اپنی سرزمین سے بہت دور لڑتے رہے ہیں۔ ان سب کو یہ خیال ہی نہیں اعتماد تھا کہ وہ جن دو عظیم سمندروں بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل کے حصار میں ہیں۔ وہ ان کی حفاظت کریں گے۔ جتنے لوگوں سے بھی میٹنگیں رہیں۔ جن میں عام شہری، فوجی، اعلیٰ حکام، ماہرین شامل تھے۔ ان کی بنیادی تشویش یہی تھی کہ یہ دونوں سمندر ان کو تحفظ نہ دے سکے اور 11 ستمبر کو دشمن ان کے گھر میں ان کے تجارتی قلب پر حملہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اب امریکیوں کے تمام ادارے کانگریس، سینیٹ، اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ، پینٹاگون، تھنک ٹینکس، اخبارات، چینل، یونیورسٹیاں، ایک نامعلوم اور تصوراتی دشمن کے مقابلے کے لیے ہر قسم کی تیاریاں کررہے ہیں۔ امریکی قوم تحقیق اور دریافت پر یقین رکھتی ہے۔ اس لیے وہ اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں منہمک ہے۔

لوگ امریکہ سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟

یہ تو بنیادی سوال ہے۔ امریکیوں کو اس سلسلے میں تشویش اس لیے بھی ہے کہ ان کے بچے ان سے یہ بار بار پوچھ رہے ہیں۔ ورلڈ ٹریڈ ٹاور کے زمیں بوس ہونے کے روح فرسا مناظر سے امریکی معصوم بچوں نے یہ پوچھنا شروع کیا تھا۔ افغانستان میں امریکی فوجی ہلاک ہوئے تو بھی امریکی بچوں کے چہرے سوالیہ نشان بن رہے تھے اور اب جب عراق میں ہر روز کسی

امریکی ماں کا لختِ جگر لقمۂ اجل بنتا ہے تو امریکیوں کو بچوں سے یہی سوال سننا پڑتا ہے۔ بچوں کے منہ تو پیٹریاٹ ایکٹ کے نفاذ سے بند نہیں ہوسکتے، اس کلیدی سوال سمیت متعدد سوالات جو ہمارے ذہن میں بھی تھے اور ہمارے میزبانوں کے بھی، وہ کچھ یوں تھے اور میرے خیال میں یہ آپ کے ذہن میں بھی گردش کرتے ہیں۔

1- لوگ امریکہ سے نفرت کیوں کرتے ہیں۔

2- کیا امریکہ ایک سامراج (ایمپائر) بن رہا ہے۔

3- کیا امریکہ تمام مسلمانوں کو دہشت گرد کہتا ہے۔

4- کیا دہشت گردی کے خلاف امریکی مہم کبھی ختم بھی ہوسکے گی۔

5- کیا امریکہ پاکستانیوں کے لیے اب غیر محفوظ ہو رہا ہے۔

6- دہشت گردی کے خلاف مہم کے لیے جو نئے قوانین بن رہے ہیں کیا ان سے امریکہ میں شہری آزادیاں سلب نہیں ہو رہیں۔

7- کیا امریکہ اب بھی دوسرے ملکوں کے تارکین وطن کے لیے امکانات کی سرزمین کا درجہ رکھے گا۔

8- کیا صدر بش۔ اپنے اختیارات سے تجاوز کر رہے ہیں۔

9- کیا امریکہ اور دوسرے ممالک عالمی قوانین کے اعتبار سے اب برابری کی حیثیت میں نہیں رہے ہیں۔

10- امریکہ کو یہ حق کس طرح مل رہا ہے کہ وہ اقوام متحدہ کی اجازت کے بغیر کسی بھی ملک میں دہشت گردی کے خاتمے کے لیے اپنی فوجیں لے کر داخل ہو جائے۔

11- انتہاپسندی تو ہر مذہب میں ہوتی ہے لیکن صرف اسلامی انتہاپسندی کی اصطلاح کیوں استعمال ہوتی ہے۔ اخبارات، ٹی وی چینل اور مصنفین ہندو انتہاپسند، عیسائی انتہا پسند، یہودی انتہاپسند کی اصطلاحات کیوں استعمال نہیں کرتے۔

12- امریکہ نے دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اب تک جہاں جہاں فوجی مداخلت کی ہے اور وہاں کے شہریوں کو آمریت اور غیر نمائندہ حکومتوں سے نجات دلا کر جمہوری حقوق

دلانے کی کوشش کی ہے وہاں بہت کم کامیابی کیوں ہوئی ہے۔ ماضی کی ان ناکامیوں کی روشنی میں اب افغانستان، عراق میں کامیابی کی توقع کیسے رکھ سکتے ہیں۔

13- افغانستان میں اب تک جمہوری حکومت کیوں قائم نہیں ہوسکی اور شہریوں کے جان و مال کو تحفظ کیوں نہیں مل سکا ہے۔

14- امریکہ کسی ایک ملک میں اپنے مشن کی تکمیل سے پہلے دوسرے ملک میں کیوں مداخلت شروع کر دیتا ہے؟

15- افغانستان میں روس کا مقابلہ کرنے کے لیے امریکہ نے اسامہ بن لادن اور دوسرے ایسے عسکریت پسندوں کو مکمل عسکری اور مالی امداد دی۔ انہیں مجاہدین قرار دیا، ان کے اسلامی جذبات کو تحریک دی۔ اب وہ دہشت گرد کیسے قرار دیئے جا رہے ہیں۔

16- امریکہ نے صدام حسین کی بھی بہت حمایت کی۔

17- ان تاریخی مثالوں کی موجودگی میں اب کیسے یقین کیا جائے کہ اس وقت امریکہ جو پالیسیاں اختیار کر رہا ہے ان کے بھی ایسے منفی اثرات مرتب نہیں ہوں گے۔

18- امریکی حکومت دوسرے ملکوں کے خلاف جو کارروائی کرتی ہے۔ اس کے لیے کیا اسے امریکی عوام کی حمایت حاصل ہوتی ہے، اس کا تعین کیسے کیا جاتا ہے۔

19- مختلف اہم اور سنگین موضوعات پر امریکی رائے عامہ کے جو اندازے، سروے شائع کیے جاتے ہیں۔ کیا وہ قابل اعتبار ہوتے ہیں۔

20- امریکی ذرائع ابلاغ، اخبارات، ریڈیو، ٹی وی، کس حد تک واقعی آزاد ہیں۔

21- امریکی یونیورسٹیوں میں طلبہ و طالبات ان حساس موضوعات پر کیا ردِّعمل ظاہر کر رہے ہیں۔

22- امریکہ میں قائم تھنک ٹینکس کس حد تک صحیح تجزیہ کرتے ہیں اور ان کی رائے امریکی حکومت کس حد تک قبول کرتی ہے۔

23- امریکہ کو اگر دنیا میں جمہوریت کے قیام کی حقیقی فکر ہے تو وہ اب تک بعض متمول ممالک میں بادشاہتوں، شخصی حکومتوں اور فوجی آمریتوں کی مسلسل حمایت کیوں کرتا رہا ہے۔

24- دہشت گردی اور اس کے خلاف مہم سے امریکی معیشت پر کیا اثرات مرتب ہورہے ہیں اور اس کے نتیجے میں دنیا کی معیشتوں کا کیا حال ہے۔

اس وقت دنیا میں سیاسی اضطراب، عدم تحفظ کی جو کیفیت ہے۔ مسلمان ملکوں میں بالخصوص مسلم نوجوانوں میں جو احتجاج اور مایوسی ہے۔ اس کے پس منظر میں بھی یہی بنیادی معاملات ہیں۔ جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ ہمارے وفد میں پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور افغانستان کے مدیر اور کالم نویس تھے۔ اس لیے جنوبی ایشیا پر زیادہ توجہ مرکوز رہتی تھی۔ افغانستان میں تو امریکہ پہنچ چکا ہے، بنگلہ دیش کا موجودہ حساس معاملات سے کچھ زیادہ تعلق نہیں ہے۔ اس لیے پاکستان، بھارت کے معاملات زیادہ زیر بحث آتے تھے۔ بھارت امریکیوں کے نزدیک دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔ آبادی کے اعتبار سے یا جمہوری آداب اور جمہور کے مسائل حل کرنے کے حوالے سے۔ یہ ابھی طے ہونا ہے۔ پاکستان ہر حوالے سے زیر غور آتا تھا۔ طالبان کی دوستی، القاعدہ کے رہنماؤں کی روپوشی، دینی مدارس میں انتہا پسندی، جمہوریت کا عدم تسلسل، معاشرے میں عدم رواداری، متحدہ مجلس عمل کی سرحد حکومت، بھارت سے کشیدگی اور سرحد پار دہشت گردی کی سرپرستی۔

باتیں تلخ بھی ہوتی تھیں لیکن یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ امریکی سرکاری حکام کی موجودگی میں بھی امریکی پالیسیوں پر کھل کر تنقید ہوتی تھی، اور وہ اسے برداشت بھی کر لیتے تھے۔

اب ہم ان سوالات کے حوالے سے دیکھتے ہیں کہ امریکہ کیا سوچ رہا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے امریکی کیا کہتے ہیں۔

صدر مشرف کے اقدامات پر اعتماد

پاکستان امریکہ کا اتحادی ہے۔

بھارت امریکہ کا نیا محبوب ہے۔

اتحادی ہونا تاریخ میں زیادہ تر مجبوری رہی ہے۔ محبوب مرضی سے چنا اور بنا جاتا ہے۔ اس میں کسی قدر جذبات بھی شامل ہوجاتے ہیں۔

اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور پنٹاگون کے حکام اپنی آف دی ریکارڈ اور آن دی ریکارڈ گفتگو میں بار بار بھارت کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کے حوالے سے یاد کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت تو 56 برسوں سے تھی، اب گزشتہ دس بارہ برس سے یہ ایک بڑی معیشت بننے کی طرف بھی گامزن ہے۔ یوں 56 برس کے جمہوری تسلسل اور ووٹروں کی بڑی تعداد کی دھند نے بھارت میں انسانیت پر توڑے جانے والے مظالم، چھوٹی ذاتوں سے ہونے والی ناانصافیوں، متعصب ہندوؤں میں بڑھتی ہوئی شدت پسندی، انسانوں کے لیے بنیادی سہولتوں کے فقدان کو مغرب کی نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔

پاکستان عسکری اور سیاسی طور پر امریکہ کا اتحادی ہے۔ اس کا اعتراف ہوتا ہے لیکن یہاں مذہبی شدت پسندی، دینی مدارس میں مخصوص نصاب تعلیم، مختلف جہادی تنظیموں کی زیر زمین سرگرمیوں، جمہوریت کے عدم تسلسل کی وجہ سے اسے محبوب کا درجہ نہیں دیا جاتا بلکہ اس

سے ایک خوف کی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ امریکیوں کی بھارت کی طرف یہ مہربان نظریں دیکھتے ہوئے وفد میں شامل ایک بھارتی ایڈیٹر بار بار یہ سوال اٹھاتے تھے کہ امریکہ نے اپنے نائن الیون پر دنیا میں بہت کارروائیاں کی ہیں لیکن بھارت میں اتنے نائن الیون ہو چکے ہیں۔ سری نگر اسمبلی پر حملہ ہوا۔ ہم سب سے بڑی جمہوریت ہیں، جمہوریت کی علامت ہماری پارلیمینٹ ہے، اس پر حملہ کیا گیا اور یہ سب دہشت گرد پاکستان سے آتے ہیں۔ سرحد پار دہشت گردی ختم نہیں ہو رہی ہے، اس سلسلے میں امریکہ کیا کر رہا ہے؟

یہ سوال اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں میٹنگ میں بھی کیا گیا۔ جہاں جنوبی ایشیا کے امور سے متعلقہ تمام اہم حکام موجود تھے جو وقتاً فوقتاً بھارت، پاکستان، نیپال، بنگلہ دیش وغیرہ میں سفارتی ذمہ داریاں انجام دے چکے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف اور امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کے درمیان بڑی گہری مفاہمت ہے اور دہشت گردی کے خاتمے کی مہم میں پاکستان نے امریکہ کا ساتھ دیتے ہوئے بہت اہم اور نتیجہ خیز اقدامات کئے ہیں جن میں سرفہرست شدت پسند تنظیموں پر پابندی شامل ہے، تعلیم کے میدان میں پاکستان میں نمایاں تبدیلیاں لائی گئی ہیں خاص طور پر دینی مدارس میں جدید علوم کو بھی شامل کیا جا رہا ہے، القاعدہ کے اہم ارکان کی گرفتاری بھی پاکستان میں ہوئی ہیں، ہمارے نزدیک یہ اقدامات قابل غور ہیں اور امریکہ مطمئن ہے کہ پاکستان میں صحیح سمت میں قدم اٹھائے جا رہے ہیں۔

پھر جب بھارتی صحافی نے خاص طور پر سرحد پار دہشت گردی کے حوالے سے دوبارہ پوچھا، تو امریکی محکمہ خارجہ کے ایک سینئر افسر نے واضح طور پر کہا کہ حکومت پاکستان نے جو یقین دہانیاں کروائی ہیں ہمیں ان پر مکمل اطمینان ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ایک عرصے سے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے کہ پاکستان کی طرف سے بھارت میں دراندازی ہو رہی ہو۔

واشنگٹن میں سیکورٹی پہلے بھی ہوتی تھی لیکن 11 ستمبر کے واقعات کے بعد تو اس میں غیر معمولی اضافہ ہو چکا ہے۔ وائٹ ہاؤس، کانگریس، سینٹ، محکمہ خارجہ اور دوسرے اہم سرکاری دفاتر قریباً ایک ہی علاقے میں ہیں اور دریائے پوٹومک کے ایک طرف واقع ہیں۔ ان کے عین نیچے زیر زمین بھی ایک متبادل شہر آباد ہو رہا ہے، پہلے تو یہ انتظام کسی ایٹمی حملے کے خوف سے

کئے جا رہے تھے، اب یہ نامعلوم دہشت گردوں کے ڈر سے ہو رہے ہیں۔

اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور اس کے آس پاس حتیٰ کہ وائٹ ہاؤس کے گرد و نواح میں بھی پہلے سیاحوں کی ایک بڑی تعداد آزادانہ آتی جاتی رہتی تھی لیکن اب جگہ جگہ بندشیں ہیں۔ عام کاروں، بسوں کے راستے بدل دیئے گئے ہیں مسافتیں بہت طویل ہو گئی ہیں۔ پیدل پہنچنا زیادہ آسان ہے لیکن کئی مقامات پر فٹ پاتھ بھی سیکورٹی کی زد میں آ گئے ہیں۔

ہر سرکاری عمارت میں داخلے کے لیے سیکورٹی کے طویل مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے۔ کوئی اعتراض کرتا بھی نظر نہیں آتا، کہیں کوٹ اتر رہے ہوتے ہیں کہیں جوتے۔ ہاتھ اوپر کریں، گھوم جائیں، جیبوں سے تمام چیزیں باہر نکال دیں۔ موبائل فون، سکے، قلم، مشین اگر بول پڑے تو پھر دوبارہ گزریں۔ ان تمام مراحل سے گزر کر جب آپ عمارت سے اندر داخل ہو جاتے ہیں تو ایک گارڈ آپ کے ساتھ ہوتا ہے۔ آپ کو اس کی معیت میں رہنا ہے۔ اس کی ذمہ داری ہے کہ جہاں جہاں آپ کی میٹنگ ہے آپ کو لے جائے اور پھر واپس آپ کو دروازے پر لا کر چھوڑ دے۔ یہ پروٹوکول نہیں بلکہ یہ خوف ہے کہ کسی وفد میں سے کوئی اِدھر اُدھر ہو کر عمارت میں روپوش نہ ہو جائے، کوئی واردات نہ کر دے۔

پنٹاگون، جہاں دنیا بھر میں فوجی کارروائیوں کے فیصلے ہوتے ہیں، جنگی چالیں ترتیب دی جاتی ہیں۔ کمپیوٹرز پر وار گیمز ڈیزائن کی جاتی ہیں۔ یہ عمارت دریا کے دوسری طرف واقع ہے اور یہ چونکہ 11 ستمبر کو دہشت گردوں کا نشانہ بھی بنی تھی اس لیے یہاں سیکورٹی اور زیادہ سخت ہے۔ یہاں آپ ہر وقت امریکی فوجیوں کے حصار میں چلتے ہیں اِدھر اُدھر ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

یہاں بھی ہماری ملاقاتیں سینئر حکام سے ہوئیں۔ طے یہی ہوا کہ یہ گفتگو شائع ہو سکتی ہے لیکن حکام کا نام نہ دیا جائے۔ امریکی وزارت دفاع پنٹاگون امریکی سلامتی کے تحفظ اور جنگ روکنے کے لیے فوجی قوت فراہم کرنے کا ذمہ دار ہے۔ بری فوج، بحریہ، میرین کور اور فضائیہ میں قریباً 14 لاکھ مرد اور خواتین شامل ہیں۔ ہنگامی حالات میں 9 لاکھ محفوظ فوجی بھی ان کی مدد کے لیے آ جاتے ہیں۔

محکمہ دفاع میں 8لاکھ سویلین بھی ملازم ہیں۔ امریکی صدر، مسلح افواج کے کمانڈر انچیف بھی ہوتے ہیں۔ ان کی کمان میں سیکرٹری دفاع اس محکمے پر کنٹرول کرتے ہیں۔ یہاں ہماری بات چیت جن حکام سے ہوئی وہ پالیسی سازی سے تعلق رکھتے تھے۔ مستقبل کی پالیسیاں، جنوبی ایشیا میں امریکی سلامتی کے معاملات، امریکہ آئندہ خطرات اور ضروریات کے حوالے سے اپنی مسلح افواج کے نظم وضبط، غیر ممالک میں فوجی اڈوں اور مہلک ہتھیاروں میں کیا تبدیلیاں لارہا ہے۔ یہ تفصیلات آپ کے لیے جاننا بہت ضروری ہے کیونکہ اس سے پہلے آپ کا اور ہماری آئندہ نسلوں کا سابقہ پڑے گا۔ فی الحال تو یہ جان لیں کہ افغانستان پاکستان کی طرف سے پنٹاگون اب بھی تشویش میں مبتلا ہے، ان کا زور اسی بات پر ہے کہ شدت پسندی کے خاتمے کے لیے دونوں ملکوں کو کوششیں جاری رکھنا ہوں گی۔

اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی نسبت پنٹاگون میں پاکستان اور صدر جنرل پرویز مشرف کے لیے زیادہ پرجوش حمایت محسوس ہوئی۔ انہوں نے زیادہ واضح الفاظ میں کہا کہ صدر مشرف پاکستان کے مستقبل کو محفوظ اور مستحکم بنانے کے لیے ٹھوس اقدامات کررہے ہیں۔ پاکستان کو جدید، فلاحی مملکت بنانے کے لیے انہوں نے جو پالیسیاں اختیار کی ہیں وہ قابل قدر ہیں۔

ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ جہادی تنظیموں کے کیمپ ختم کرنے اور سرحد پار دہشت گردی بند کرنے کے لیے صدر پاکستان نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ امریکہ کے نزدیک مثبت ہے اور ہم اس سے مطمئن ہیں۔ انہوں نے بھارت پر زور دیا کہ صدر مشرف پاکستان کو جدید جمہوری مملکت بنانے کے لیے جو کچھ کررہے ہیں وہ بھارت کے لیے بھی اچھی خبر ہے۔ ماڈرن پاکستان علاقے میں کشیدگی کم کرنے کی طرف بھی قدم ہوگا۔

محکمہ خارجہ اور محکمہ دفاع ہی امریکی پالیسیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دونوں اس حد تک تو مطمئن نظر آئے کہ بھارت کا سرحد پار دہشت گردی کا الزام اب درست نہیں ہے اور صدر جنرل پرویز مشرف کے اقدامات مثبت اور نتیجہ خیز ہیں لیکن ہمارے ذہن میں اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ امریکہ کا یہ اطمینان صرف صدر جنرل پرویز مشرف کی ذات پر ہے یا پاکستان کی مملکت پر ہے۔ ماضی میں شخصیتوں پر اعتماد مملکت کو فائدے نہیں پہنچاسکا ہے۔ اس

وقت صدر جنرل پرویز مشرف کو اس سپر طاقت کے صدر سمیت اعلیٰ حلقوں میں جو خیر خواہی حاصل ہے۔ پوری پاکستانی قوم کے لیے خیر خواہی میں کیسے تبدیلی ہوسکتی ہے۔ کیا ہم اس سمت بڑھ رہے ہیں۔ کیا ہمیں اس سمت بڑھنا چاہیئے اور کیا صدر پرویز مشرف کے پاس ایسی ٹیم ہے جو اس اطمینان اور اعتماد کو ملک کے محفوظ اور مستحکم مستقبل کی بنیاد بنا سکے۔

پینٹاگون میں مستقبل کی نقشہ کشی

پینٹاگون کے سینئر افسر جس اعتماد سے عراق کی صورتحال پر گفتگو کررہے تھے اس سے کسی قدر رعونت بھی ٹپک رہی تھی لیکن بات تو ان کی صحیح تھی، ان کا کہنا تھا کہ عراق میں اس وقت رد عمل میں جو کچھ ہورہا ہے وہ خلاف توقع نہیں ہے۔ امریکہ نے جہاں ایسے آپریشن کیے ہیں وہاں اس طرح کے واقعات ہوئے ہیں۔ امریکی فوج گوریلا کارروائیوں سے ہلاک ہوئے ہیں لیکن یہ جو سیاسی مہم چلائی جارہی ہے کہ عرب دنیا بہت برہم ہورہی ہے، عرب نوجوان ناراض ہیں۔ وہ بہت اعتماد سے کہنے لگے، عرب ملکوں کے بازاروں، شاہراہوں پر کوئی ہنگامے، فسادات نہیں ہورہے ہیں۔ تل ابیب پر کسی نے میزائل نہیں پھینکا۔

ہم سب سوچ رہے تھے کہ عراق پر حملے سے پہلے اور اس کے فوراً بعد تو یقیناً جلوس نکلے، بڑے بڑے مظاہرے ہوئے، لیکن جب امریکہ نے عراق پر مکمل قبضہ کرلیا ہے اس کے بعد عرب اور مسلم دنیا میں خاموشی ہے۔ امریکی محکمۂ دفاع کے ان اعلیٰ افسر کا نام ظاہر نہ کرنے کا طے ہوا تھا۔ وہ یقیناً امریکی ملٹری بیوروکریسی ذہنیت کی عکاسی کررہے تھے۔ ان کی گفتگو کا محور تھا۔

مستقبل کی منصوبہ بندی ....تبدیل شدہ امریکی فوج کا کردار

دنیا میں جو نئی علاقائی صورتحال جنم لے رہی ہیں اس کے کیا تقاضے ہیں۔ اب مختلف

ملکوں میں امریکی فوجوں کو کس طرح متعین کیا جائے گا، ان کے پاس کیسے ہتھیار ہوں گے، انہیں کیا کیا اختیارات ہوں گے۔ پہلے تو صنعتی دور ، اطلاعاتی دور میں منتقلی کے حوالے سے امریکی فوج کی تربیت اور تنظیم کی گئی تھی یہ بھی پیش نظر تھا کہ دنیا دو طاقتوں کے زیرنگیں ہے۔ اب دنیا میں ایک ہی طاقت ہے اسے ہی پورے ملکوں کو سنبھالنا ہے۔ اس لیے اب فوجی منصوبہ بندی اسی بناد پر ہوگی۔

ان سے دریافت کیا گیا کہ کیا امریکہ نے افغانستان، عراق میں ہونے والے واقعات سے کچھ سبق سیکھا ہے۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان میں کارروائی بہت تیزی سے کرنا پڑی تھی، ہم اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ عراق پر حملے کے لیے ہمارے پاس بہت وقت تھا، رائے عامہ کو بھی ہموار کیا گیا، منصوبہ بندی بھی جامع انداز میں کی گئی اور تینوں مسلح افواج میں رابطہ افغانستان کی نسبت بہت قریبی رہا۔ ان کے مطابق عراق میں اس وقت جو کچھ ہورہا ہے اس کی امریکہ کو توقع تھی کیونکہ حکمراں بعث پارٹی 21 سال سے برسر اقتدار تھی اس کے اثرات یقیناً گہرے ہیں۔ اس سے وابستہ وفادار افراد بھی بڑی تعداد میں ہیں جو مختلف مقامات پر کارروائیاں کرتے ہیں لیکن امریکہ وہاں گورننگ کونسل بنانے میں کامیاب رہا ہے۔ اب وہاں سیاسی اور اقتصادی پالیسیوں کے ذریعے عراق کے عوام کو حکومت اور فیصلوں میں شرکت کا موقع دیا جائے گا۔ جب یہ کہا گیا کہ عراق میں ہر مہینے چار ارب ڈالر خرچ ہورہے ہیں تو اسے امریکی عوام کب تک برداشت کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ اخراجات میں کمی کی کوشش کررہے ہیں لیکن محکمۂ دفاع سمجھتا ہے کہ اتنے اخراجات درست ہیں۔

امریکی کانگریس کی بین الاقوامی تعلقات کی کمیٹی میں عراق کی صورتحال پر جو سوال جواب ہورہے ہیں، امریکی انتظامیہ کو سخت تنقید کا سامنا ہے۔ اس کو انہوں نے کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی۔ صرف یہ کہا کہ سیاسی مہم کچھ قبل از وقت شروع ہوگئی ہے۔ ان کا اشارہ آئندہ امریکی صدارتی انتخابات کی طرف تھا۔

امریکی محکمۂ دفاع نے اپنی افواج کو مستقبل کے لیے معرکوں کے لیے تیار کردیا ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی زیرغور ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں افواج متعین ہوں گی وہاں آئندہ برسوں

میں کیا کیا سماجی، سیاسی، اقتصادی، تبدیلیاں رونما ہوسکتی ہیں۔ مقامی افواج سے کس طرح رابطہ ہوگا، مقامی افواج کی بھی تربیت ہونی چاہیئے یا نہیں، انہیں کس قسم کے ہتھیار دیئے چاہئیں، ان کی انٹیلی جنس کی صلاحیتوں کو آگے بڑھایا جائے یا نہیں۔

اس سوال کا جواب تو براہ راست ہمیں نہیں ملا کہ امریکی فوج کی اس وسیع تر تنظیم نو میں اتحادی ملکوں کی فوجوں کی تربیت بھی پروگرام میں شامل ہے یا نہیں۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ پہلے فوجی تربیت کے سلسلے میں جو معاہدے ہیں ان پر عمل ہوگا۔ گفتگو سے یہ اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ سرد جنگ کے دور میں امریکہ اپنے دوست ممالک کی فوجوں کو جس طرح طاقتور بناتا تھا، جدید ترین ہتھیار فراہم کرتا تھا، مقامی فوجی افسروں کے ذریعے ان ملکوں کی سیاست میں داخل ہوتا تھا اور یہ پالیسی ہوتی تھی کہ ان افواج کے ذریعے مقامی عوام کو قابو میں رکھا جائے، اب یک طاقتی دنیا میں وہ دوسرے ملکوں کی افواج کو زیادہ طاقتور نہیں، بنانا چاہتا بلکہ اپنی عسکری قوت میں اضافہ کرکے اسے ناقابل تسخیر بناکر اپنی فوجی برتری قائم رکھتے ہوئے دوسرے ملکوں کو اپنی پالیسیوں پر عمل پیرا دیکھنا چاہتا ہے۔

اس نکتے پر تفصیل سے گفتگو اور مزید تحقیق کی ضرورت ہے کیونکہ یہی پہلو زیادہ تشویشناک ہے اور امریکہ میں اب جو ایمپائر، شہنشاہیت بننے کے خواب دیکھے جارہے ہیں۔ اس کے لیے بے پناہ عسکری طاقت کی ضرورت بھی محسوس کی جارہی ہے۔ حب الوطنی کے نعرے اس شدت کے بلند ہورہے ہیں کہ اکثر امریکیوں کی سوچ میں عسکریت داخل ہورہی ہے اور وہ اپنے عدم تحفظ کا علاج طاقتور امریکی فوج میں ہی تلاش کررہے ہیں۔ شہری آزادیوں، اختلاف رائے کسی غیر ملک کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت جیسے اصولوں کو اب اہمیت نہیں دی جارہی ہے بلکہ انہیں غیر متعلق کہا جارہا ہے۔

پینٹا گون کے تمام برآمدے امریکی عسکریت کی نمائش کرتے ہیں۔ مختلف معرکوں کی تصویریں دونوں طرف آویزاں ہیں۔ پرل ہاربر، ویتنام، کوریا، ان جنگوں کے ہیروز جو جنگ میں کام آئے، جو بچ گئے۔ اس میں سے بہت کچھ آپ کو پینٹا گون کی ویب سائٹ پر بھی مل سکتا ہے۔ اس ہال کا دورہ بھی ہوا جہاں امریکی وزیر دفاع اور پینٹا گون کے ترجمان بریفنگ

دیتے ہیں۔ پینٹا گون میں 600 صحافیوں کو ایکریڈیشن ملی ہوئی ہے جن میں اخبارات، ٹی وی، خبررساں ایجنسیوں کے نمائندے شامل ہیں۔ کچھ صحافی دن بھر یہیں کام کرتے رہتے ہیں۔ ان کے باقاعدہ کیبن ہیں۔ پریس سے متعلقہ افسروں نے بتایا کہ ویتنام کے بعد صحافیوں اور امریکی افواج کے درمیان بتدریج فاصلے بڑھ رہے تھے، افغانستان میں اس دوری کو بہت محسوس کیا گیا، امریکی کامیابیوں کی خبریں تفصیل سے نہیں دی جاسکی تھیں کیونکہ امریکی صحافی میدان جنگ میں فوجیوں کے ساتھ موجود نہیں تھے۔ عراق کی جنگ سے قبل اس پر بہت غور کیا گیا اور اہم فیصلے کئے گئے۔ صحافی عام طور پر بریفنگ سے مطمئن نہیں ہوتے بلکہ شکوک وشبہات ظاہر کرتے ہیں۔ اس لیے اخبار نویسوں کو براہ راست مشاہدے کا موقع دیا جاتا ہے۔ عراق کی جنگ میں صحافی فوجوں کے ساتھ چل رہے تھے Imbedded کی اصطلاح خوب استعمال ہوئی۔

امریکی محکمۂ دفاع دنیا بھر میں ہونے والے واقعات سے اپنے آپ کو کس طرح باخبر رکھتا ہے، اس پر بات شروع ہوئی تو یہ معلوم ہوا کہ امریکی اخبارات کا بغور مطالعہ تو ہوتا ہی ہے دوسرے ملکوں کے اخبارات سے بھی متعلقہ خبریں اور تبصرے ان کی ویب سائٹوں سے اخذ کئے جاتے ہیں۔ اس کے لیے باقاعدہ اسٹاف مقرر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی انتظام ہے کہ دنیا بھر میں امریکی سفارت خانوں میں مقامی زبانیں جاننے والا عملہ صبح سویرے دفتر پہنچ کر اخبارات پڑھتا ہے اور پریس اتاشی کو باخبر کرتا ہے جو اہم اور حساس خبروں یا تبصروں کے تراشے فوراً واشنگٹن بھیج دیتا ہے۔ یہاں سے پینٹا گون کو بھی متعلقہ تراشے اسی روز مل جاتے ہیں۔

پینٹا گون اور وائٹ ہاؤس میں روزانہ فعال رابطہ رہتا ہے، امریکی صدر اور امریکی وزیر دفاع روزانہ بالمشافہ ملتے ہیں یا فون پر بات کرتے ہیں۔ اس طرح وائٹ ہاؤس کی ہدایات بھی متعلقہ فوجی افسروں تک پہنچانے کا نظام موجود ہے۔ دوسری طرف محکمۂ دفاع کے کسی درجے سے بھی کوئی اطلاع وائٹ ہاؤس تک جانا ہوتو اس کا بندوبست بھی ہے۔

ویسے تو ہر ملک میں اس طرح رابطوں کے دعوے کئے جاتے ہیں لیکن کیا یہ دعوے واقعی درست ہیں اور کیا ان انتظامات کے ذریعے تمام حساس امور کا حقیقی ادراک ہوپاتا ہے، یہ محل

نظر ہے۔

پینٹا گون میں ہی ایک دوسرے اعلیٰ افسر سے ہماری ملاقات کا موضوع تھا۔

جنوبی ایشیا میں امریکی سیکورٹی کے خدشات اور پالیسی بشمول ایٹمی اسلحے کی عدم توسیع۔

انہوں نے بھارت اور پاکستان کے بارے میں جن امریکی پالیسیوں پر بات کی تو وہ پہلے بیان ہوچکی ہیں۔ امریکہ کی طرف سے صدر جنرل پرویز مشرف کے ان تمام اقدامات پر مکمل اعتماد ظاہر کیا گیا جو القاعدہ کے ارکان کی گرفتاریوں، سرحد پار دہشت گردی کی روک تھام اور پاکستان کو جدید جمہوری مملکت بنا کر مستقبل کے تحفظ کے لیے کئے جارہے ہیں۔ ایک بھارتی صحافی کی طرف سے پاکستان سے سرحد پار دہشت گردی پر بار بار اصرار کے باوجود انہوں نے یہی کہا کہ امریکہ صدر جنرل پرویز مشرف کی یقین دہانیوں کو پوری سنجیدگی سے تسلیم کرتا ہے ہمیں اس سلسلے میں کوئی تشویش نہیں ہے۔

لگتا تھا کہ انہوں نے تیاری بھی کی ہے اور وہ موضوع پر عبور رکھتے ہیں لیکن وہ بار بار اسلامی انتہا پسندی کی اصطلاح استعمال کررہے تھے اور اس سلسلے میں وہ بہت سنجیدہ بھی تھے، لگتا تھا کہ وہ دل سے یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کوئی عنصر موجود ہے۔ ان کی بات کاٹتے ہوئے ان کے یہ گوش گزار کیا گیا کہ یہ اصطلاح غلط ہے۔ مسلمانوں میں انتہا پسند یقیناً موجود ہوں گے، ہر ملک اور ہر مذہب میں ایسا حلقہ موجود ہوتا ہے ان کے لیے کبھی پورے مذہب یا پورے ملک کے حوالے سے اصطلاحات استعمال نہیں ہوتی ہیں نہ کبھی عیسائی انتہا پسندی سنائی دیتی ہے، نہ یہودی انتہا پسندی، نہ ہندو انتہا پسندی، یہ جو آپ اسلامی انتہا پسند Islamic Extremist بار بار کہتے ہیں یہ لغت کے اعتبار سے بھی غلط ہے، یہ تصور بھی غلط فہمی پر مبنی ہے اس سے آپ اسلام کے ماننے والوں میں مزید نفرت پیدا کرتے ہیں۔ ان سے براہ راست سوال کیا گیا کہ کیا آپ واقعی تمام مسلمانوں کو دہشت گرد سمجھتے ہیں، انہوں نے کہا کہ نہیں۔

پھر ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ یہ تصور کرتے ہیں کہ اسلام انتہا پسندی اور دہشت گردی سکھاتا ہے، تو انہوں نے کہا کہ نہیں۔

انہوں نے تسلیم کیا کہ واقعی یہ اصطلاح غلط ہے اور وہ آئندہ یہ نہیں کہیں گے۔

اس ایک افسر تک ممکن ہے کہ اس غلط تصور کی تصحیح ہوگئی ہو لیکن امریکی معاشرے میں ایسے تصورات پائے جاتے ہیں جو حقیقت پر مبنی نہیں ہیں۔

میرے ذہن میں یہ سوالات ابھر رہے تھے کہ پاکستان اور دوسرے مسلم ملکوں کے حکمراں وزارت خارجہ، وزارت دفاع کے افسر، امریکی حکومت سے مختلف سطحوں پر جب تبادلۂ خیال کرتے ہیں تو کیا وہ ان غلط اصطلاحات کی طرف توجہ نہیں دلاتے۔ اگر انہوں نے یہ کوشش کی ہوتی تو بہت سے غلط تصورات ختم ہوسکتے تھے۔

ایک دوسرے پہلو سے یہ سوچ رہا تھا کہ امریکی محکمۂ دفاع یہ دعویٰ کررہا تھا کہ ہم ملکی اخبارات کے مطالعے سے تمام امور اور تازہ ترین معاملات سے باخبر رہتے ہیں، تو اسلامی دنیا کی طرف سے یہ تشویش ان تک کیوں نہیں پہنچتی۔ ان پر بحث مباحثہ تو پاکستان اور دوسرے اسلامی ملکوں میں ہورہا ہے۔

یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کہ یہ جو بڑی جمہوریتیں ہونے کے دعویدار ہیں یہ اپنے شہریوں کو ایسے اصطلاحات کے استعمال سے اسی طرح بےخبر رکھتے ہیں یا بلکہ گمراہ کرتے ہیں۔ جمہوریت ہونے کا اس حوالے سے ان کے عوام کو کیا فائدہ ہوتا ہے۔ بڑی جمہوریت امریکہ کی حکومت 9/11 کے حوالے سے شہریوں کو خوفزدہ رکھے ہوئے ہے، ادھر ایک اور بڑی جمہوریت بھارت کی حکومت اپنے شہریوں کو سرحد پار دہشت گردی کے حوالے سے ڈرائے رکھتی ہے۔

امریکی عوام بے خبر کیوں رہتے ہیں؟

امریکی عوام کو ان کی حکومت بے خبر رکھتی ہے یا ان کا لائف اسٹائل (جینے کا انداز) ہی ایسا ہے کہ انہیں سارے جہاں کا درد اپنے جگر میں رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

عام طور پر ایشیائی بلکہ بعض یورپی بھی یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ امریکی بے خبر لوگ ہیں۔ انہیں بین الاقوامی معاملات کا علم نہیں ہوتا۔

انٹرنیشنل وزیٹرز پروگرام کے تحت اس مسئلے پر گفتگو بھی بہت ہوئی۔ ہم نے اس کے مشاہدے کی بھی کوششیں کیں۔ سب سے پہلے تو اس امر کی تصدیق ہوئی کہ موجودہ امریکی صدر اپنے عہدہ جلیلہ پر آنے سے قبل خارجہ پالیسی سے بالکل نابلد تھے، ان کے باقی ساتھیوں کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے۔ بعض حلقے امریکہ کے خارجہ معاملات میں بعض ناکامیوں کا سبب امریکی صدر کی خارجہ پالیسی میں مہارت نہ ہونے کو قرار دیتے ہیں۔ یہ محل نظر ہے کہ صدر کی ذاتی عدم دلچسپی کتنی رکاوٹ بن سکتی ہے کیونکہ خارجہ پالیسی تشکیل دینے کے لیے تو اپنا ایک نظم ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں امریکی سفارت خانے ہیں اور وہ اپنی معلومات ارسال کرتے ہیں، اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں مختلف ملکوں کے انچارج ہیں جو خود بھی ان علاقوں میں جاتے رہتے ہیں۔ اپنے سفارت خانوں کی فراہم کردہ معلومات سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ ان کی روشنی میں رپورٹیں مرتب کر کے نیچے سے اوپر تک پہنچتی ہیں۔ کتنے اسسٹنٹ، کتنے ڈپٹی، کتنے پرنسپل اسسٹنٹ ہیں

جو یہ کام کرتے ہیں۔ کتنے نائب وزرائے خارجہ ہیں۔

عام امریکی بین الاقوامی معاملات میں کتنی دلچسپی رکھتا ہے اس کے ذرائع معلومات کیا ہیں؟ یہ قصہ زیادہ زور سے اس وقت چھڑا جب اس پروگرام کے مرکزی ادارے میریڈیان سینٹر میں ایک تھنک ٹینک سے وابستہ ایک تجربہ کار خاتون نے بتانا شروع کیا کہ امریکی معاشرے کو درپیش مسائل پر عوام کی رائے لی جاتی ہے، پھر پالیسیاں مرتب کی جاتی ہیں۔ مختلف ادارے، اخبارات، ٹی وی چینل برسوں سے یہ عوامی سروے کرتے آرہے ہیں۔ پہلے اس کے لیے مختلف افراد کو نمونے کے طور پر چن کر ان سے سوالات کے جوابات حاصل کئے جاتے تھے پھر ٹیلی فون کے ذریعے آراء حاصل کی جانے لگیں، اب انٹرنیٹ سب سے موثر ذریعہ ہے۔

''بین الاقوامی معاملات پر امریکی عوام کی رائے''

معلوم ہوا کہ امریکہ میں سب سے پہلا تھنک ٹینک 1907ء میں ایک خاتون نے قائم کیا تھا جو زیادہ تر شہری علاقے کے امور پر سوچ بچار کرتا تھا۔ واشنگٹن میں دس سال بعد یہ سلسلہ شروع ہوا اس وقت امریکہ میں قریباً 1200 تھنک ٹینک ہیں جبکہ باقی دنیا میں کل ملا کر 255 ہیں۔ امریکہ میں تھنک ٹینک کے بارے میں عام طور پر مشہور ہے کہ یہ ایسی یونیورسٹیاں ہیں جہاں طالب علم نہیں ہیں۔ تھنک ٹینک اپنے اپنے مخصوص موضوعات پر کام کرتے ہیں۔ کچھ تھنک ٹینکوں کو حکومت بھی فنڈز فراہم کرتی ہے۔ بعض کے اخراجات کثیر القوی کارپوریشنیں ادا کرتی ہیں۔ کچھ کو افراد چلا رہے ہیں۔ زیادہ تر تھنک ٹینک اپنے سرپرستوں کی طرف سے دیئے گئے موضوعات پر رپورٹیں مرتب کر کے دیتے ہیں۔ اپنے اپنے دائرے میں یہ مسلسل مصروف کار رہتے ہیں۔ کچھ تھنک ٹینکوں کی شاخیں دوسرے ممالک میں بھی ہیں۔

تھنک ٹینک اپنے طور پر مختلف امور پر ریسرچ بھی کرتے ہیں لیکن جب کسی مسئلے پر رائے عامہ کے حصول کا مرحلہ ہو تو وہ گیلپ پول پر انحصار کرتے ہیں۔ اخبارات، ٹی وی چینلوں کو سوالات فرائم کئے جاتے ہیں۔ یہ جاننے کی کوشش کی جاتی ہے کہ کس مسئلے پر کتنے لوگ حق میں ہیں، کتنے مخالف ہیں۔ کتنے ہاں یا نہ کچھ بھی نہیں ہیں۔

اس خاتون کے نزدیک امریکہ میں ان جائزوں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ تھنک

ٹینکوں کی تحقیق پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں اور حکومت کے فیصلوں پر بھی۔ ایسے جائزوں کا سلسلہ 1930ء کی دہائی سے جاری ہے۔ خاتون کا کہنا ہے کہ جس طرح آپ کو ان جائزوں پر اعتبار میں کچھ جھجک ہے اسی طرح ماضی میں امریکی عوام بھی ان کے نتائج قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ امریکی صدر روز ویلٹ نے ایک سروے کے نتائج ماننے میں کچھ تامل کیا لیکن بعد میں انہوں نے خود اپنے ذرائع سے رائے عامہ جاننا چاہی تو وہی نتائج نکلے۔

اس وقت بھی یہ مسئلہ پوری دنیا میں زیر بحث ہے کہ کیا امریکہ کو دنیا بھر میں فعال کردار ادا کرنا چاہئے۔ خاتون نے کہا کہ رائے عامہ کے جائزوں میں دوسری جنگ عظیم کے بعد سے امریکیوں سے یہ پوچھا جا رہا ہے کہ امریکہ کو بین الاقوامی معاملات میں فعال کردار ادا کرنا چاہیے یا نہیں۔ 1947ء سے نہ جانے کتنی بار یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔ نصف صدی سے اس نقطہ نظر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ 60 فیصد سے زیادہ امریکی پبلک اس کے حق میں رائے دیتی آ رہی ہے۔

اس فعال کردار کی حدود اور دائرے کے بارے میں مختلف آراء رہی ہیں۔ اب دہشت گردی کے خاتمے کے سلسلے میں بھی زیادہ تر آراء ہاں میں مل رہی ہیں۔ امریکیوں کی دو تہائی اکثریت امریکہ کے قائدانہ کردار کے حق میں ہے۔

ان خاتون سے پوچھا گیا کہ ان جائزوں کو جب پالیسی سازی اور فیصلوں میں اتنی اہمیت دی جاتی ہے تو کیا یہ بھی جائزہ لیا جاتا ہے کہ اصل مسائل اور امریکی رائے عامہ میں کتنی دوری ہے اور نمونے کے جن امریکیوں سے انتہائی اہم معاملات پر رائے لی جاتی ہے کیا یہ دیکھا جاتا ہے۔

کہ وہ ان کے سلسلے میں معلومات بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ یہ معلومات ان تک کیسے پہنچتی ہے۔

کیا وہ اخبارات باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔

کیا وہ ٹی وی چینل میں متعلقہ خبریں سنتے ہیں۔

اخبارات ان معاملات پر خبریں شائع بھی کرتے ہیں یا نہیں۔ شائع کرتے ہیں تو کیا وہ

خبریں یک طرفہ ہوتی ہیں یا تمام پہلو دیئے جاتے ہیں۔

ٹیلی ویژن چینل ان معاملات پر کتنی تفصیل سے حقائق بیان کرتے اور دکھاتے ہیں۔ یہ مناظر یک طرفہ ہوتے ہیں یا ہر زاویہ فکر ان میں ہوتا ہے۔

اس معاملے میں خاتون نے اعتراف کیا کہ امریکی عوام اخبارات بہت کم پڑھتے ہیں، اسی طرح ٹیلی ویژن بھی کم دیکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں بھی سروے کئے جاتے ہیں کہ اخبارات کتنے لوگ پڑھتے ہیں اور اخبارات میں کون سے حصے زیادہ زیر مطالعہ آتے ہیں۔

امریکی عوام جن معاملات میں امریکہ کا کردار فعال اور غالب چاہتے ہیں ان کے بارے میں امریکی اخبارات کتنی خبریں شائع کرتے ہیں اور کتنے غیر جانبدار ہیں یا ان کے پاس اطلاعات کے ذرائع کتنے ہیں۔ اس سلسلے میں مشہور عالم تعلیمی ادارے ہارورڈ یونیورسٹی میں قائم نیمان فاؤنڈیشن کے عمر رسیدہ کیوریٹر بوب جائیلز کے تاثرات آنکھیں کھول دینے والے تھے۔ نیمان فاؤنڈیشن صحافت میں تربیت کا ایک نامور ادارہ ہے جو دنیا بھر سے صحافیوں کو اعلیٰ تعلیم اور تربیت کے لیے وظائف دیتا ہے۔ امریکی اخبارات کی پالیسیوں پر بات ہوئی تو انہوں نے کھل کر بتایا کہ ہمارے اخبارات اور ٹیلی ویژن میں صرف امریکی مفادات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ ہمارے صحافی صرف امریکی عینک سے دیکھتے ہیں۔ ان کی اطلاعات کا ذریعہ صرف پینٹا گون اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ ہیں۔ امریکی قارئین تک صحیح خبر نہیں پہنچتی ہے۔ انہوں نے ایک دلچسپ حقیقت کا انکشاف کیا کہ پہلے اکثر بڑے امریکی اخبارات اور ٹی وی چینل مختلف اہم ممالک میں باقاعدہ بیورو دفاتر رکھتے تھے جہاں صحافیوں کا باقاعدہ تعین ہوتا تھا۔ وہ ان ملکوں کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی امور پر گہری نظر رکھتے تھے۔ جب وہ اپنے ڈسپیچ بھیجتے تھے تو ان میں ان کا مشاہدہ بھی جھلکتا تھا۔ 1990ء میں سوویت یونین کے خاتمے کے بعد اکثر اخبارات نے اپنے غیر ملکی بیورو بند کر دیئے۔ اس عرصے میں جو شدت پسند گروپ تشکیل پائے اور امریکہ مخالف جذبات نے جڑ پکڑی ان کے بارے میں امریکی عوام صحیح نہیں جان سکے کہ کیا ہو رہا ہے۔ اب باقاعدہ مستقل بیورو نہیں تھے۔ جب کہیں بم دھماکا ہوا اور ہنگامہ بڑھا تو پیراشوٹر صحافی جاتے تھے اور جو کچھ فوری ہنگامی طور پر دیکھتے تھے اس کی خبریں بھیج دیتے تھے۔ یہ ہنگامہ فرد ہوتا تو وہ

واپس آ جاتے تھے۔

اس سینئر امریکی ماہر صحافت کا یہ مخلصانہ مشورہ تھا کہ امریکی ذرائع ابلاغ کو اپنے غیر ملکی بیورو دوبارہ قائم کرنے چاہئیں تاکہ خبریں ہنگامی نوعیت کی نہ ہوں۔ بیرونی دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے پہلے سے ہی آگاہ رہا جائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ حب الوطنی کا اتنا شور مچایا جا رہا ہے کہ حقائق جذبات میں چھپ جاتے ہیں۔ فوکس ٹی وی سب سے آگے ہے اتنا آگے کہ سی این این بھی اس کی نقل کرنے پر مجبور ہو رہا ہے۔ بوب جائیلز کا تجزیہ ماہرانہ اور حقیقت پسندانہ تھا۔ انہوں نے اس سلسلے میں اعداد و شمار بھی بیان کئے۔

ہم نے یہ مشاہدہ بھی کیا کہ امریکی ٹیلی ویژن چینل دوسرے ملکوں میں جو نشریات دیتے ہیں اپنے ملک میں ان کی نشریات ان سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ امریکیوں کو زیادہ معلومات فراہم کرنا نہیں چاہتے۔

ہمارے وفد کے ایشیائی ساتھی اس پر بہت ناز کر رہے تھے کہ ہمارے شہری بین الاقوامی امور پر کتنی معلومات رکھتے ہیں۔ یہ امریکی تو بالکل بے خبر ہیں، جاہل ہیں۔ ہمارے ایک ساتھی نے کہا کہ ایک امریکی صحافی نے پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور کے حوالے سے لکھا تھا جو اسے اسلام آباد ایئر پورٹ چھوڑنے آیا تھا کہ وہ ٹیکسی ڈرائیور سیاست کے بارے میں اس سے زیادہ تفصیلات جانتا تھا۔

ہمارے شہروں، قصبوں، گاؤں میں دفتروں، گھروں میں ملکی اور بین الاقوامی مسائل پر ہر لمحے ہی بحث ہوتی رہتی ہے۔ غریبوں کے ہاں کھانا ہو یا امیروں کے ڈنر لنچ ہوں۔ انگریزی درس گاہیں ہوں یا مذہبی مدرسے، سیاسی معاملات ہر جگہ ہی زیر بحث ہوتے ہیں لیکن کیا ہم نے سوچا کہ یہ بحث مباحثہ بین الاقوامی مسائل حل کرنے میں کبھی مدد دیتا ہے۔ امریکی اگر بین الاقوامی مسائل پر بات نہیں کرتے انہیں یہ علم نہیں ہے کہ پاکستان کہاں ہے مگر ان کے اپنے مسائل تو حل ہو رہے ہیں۔ انہیں گھر سے دفتر تک جانے کے لیے ہر قسم کی ٹرانسپورٹ، کھلی شاہراہیں تو میسر ہیں، روزگار کے مواقع یقینی ہیں، پینے کو اچھا پانی ملتا ہے، ملاوٹ کے بغیر خوراک ملتی ہے، مقامی حکومتوں کا نظام صحیح چل رہا ہے۔ ان کی بے خبری ان کے اپنے مسائل

کے حل میں رکاوٹ نہیں ہے۔ ہماری باخبری ہمارے اپنے بنیادی مسائل کو حل کرنے میں کوئی مدد نہیں کرتی۔ اس لیے کہ ہماری ترجیح اپنی بنیادی ضرورتیں ہونی چاہئیں۔ ایسا تو نہیں ہے کہ اپنے بنیادی مسائل سے توجہ ہٹانے کے لیے ہمیں ان بین الاقوامی مباحث بھی الجھایا جاتا ہو۔

یہ ایک سوچ ہے ضروری نہیں آپ اس سے اتفاق کریں۔ اب ہم جائزہ لیں گے کہ امریکہ میں یہ قدامت پسند نظریات کیا واقعی غالب آ رہے ہیں کہ امریکہ کو ایک ایمپائر کا کردار ادا کرنا چاہئے۔

کیا امریکہ ایک ایمپائر بن رہا ہے؟

"کیا امریکہ وہی، ایمپائر بن گئی ہے۔ جسے اس جمہوریہ کے بانیوں نے دل سے مسترد کیا تھا۔"

"امریکہکو ایمپائر (سامراج) بنانے کا مشورہ دینے والے جمہوری سامراجی "Democratic Imperialist" ہیں۔"

"امریکی پالیسی سازی میں نئی قدامت پسندی Neo-Conservatism دوبارہ داخل ہوگئی ہے۔ جس کا مقصد ملک کوایک ایمپائر کی طرح چلانا ہے، جوحقیقت پسندی نہیں ہے۔"

"نئے قدامت پسندوں نے فی الحال جنگ جیت لی ہے۔"

"ایک جمہوری اچھائی کے مقابلے میں امریکہ نواز اچھائی زیادہ قابل قبول ہے۔"

"امریکہ اپنے بانیوں کی اس روایت سے دور ہوتا جارہا ہے جس میں دنیا کی رہنمائی مثالوں سے کی جاتی تھی طاقت سے نہیں۔"

"جہاں بھی امریکی مفاد کوخطرہ لاحق ہو یا ایسا خدشہ ہو، وہاں امریکہ کو اپنی پوری فوجی طاقت کے ساتھ پہنچ جانا چاہئے۔"

"امریکی وزیر خارجہ کولن ایل پاول کو بش انتظامیہ میں وزیر دفاع ڈونالڈرمسفیلڈ اور نائب صدر ڈک چینی کی قیادت میں جارح قوم پرستوں کا سامنا ہے۔"

"قوم پرستوں کا نصب العین یہ ہے کہ جمہوریت قائم کرنے کے لیے اداروں کی تعمیر نہیں بلکہ "برے لوگوں" کا جسمانی صفایا ضروری ہے۔"

واشنگٹن اور دوسرے شہریوں میں سرکاری افسروں، تھنک ٹینکوں کے ماہرین، امریکی فوجیوں، عام شہریوں سے تبادلۂ خیال کے دوران یہ سوال بار بار موضوع بحث بنتا تھا۔ کیا امریکہ ایک استعماری طاقت بن رہا ہے یا بننا چاہتا ہے۔ ہم ایشیائیوں کی طرف سے تو یہ بار بار پوچھا جاتا تھا کہ امریکہ کو یہ اختیار یا جواز کس بین الاقوامی قانون کے تحت مل سکتا ہے کہ وہ کسی بھی خودمختار ملک میں فوجیں لے کر اتر جائے۔ کیا اب عالمی چارٹر میں تمام ملک یکساں حیثیت نہیں رکھتے۔ بعض امریکیوں کی طرف سے بھی اس سوال کی تائید کی جاتی تھی۔ بعض یہ کہتے تھے کہ ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے دنیا میں امن کا قیام تو امریکہ کی ذمہ داری ہے لیکن یہ بحث ضرور ہونی چاہئے کہ مداخلت کہاں، کب اور کیوں کی جائے۔ بعض پرجوش نوجوان امریکی تو کہتے تھے کہ امریکہ کو ہر ایسے ملک کو سیدھا کردینا چاہئے جو امریکہ کے خلاف ہو۔

بعض حلقوں کے مطابق امریکہ میں میکارتھی ازم کے سیاہ دن واپس آرہے ہیں۔ انسانوں سے امتیازی سلوک کا یہ رجحان دوسری جنگ عظیم میں پرل ہاربر کے واقعے کے بعد ہوا تھا۔ جب امریکہ میں تمام جاپانیوں کو کیمپوں میں محدود کردیا گیا تھا، ہر جاپانی کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ پھر سرد جنگ کے دوران سینیٹر میکارتھی کے شدت پسند نظریات نے امریکہ میں جارحانہ سوچوں کو فروغ دیا۔ کیمونسٹ فکر رکھنے والوں یا کیمونسٹوں سے ہمدردی کا اظہار کرنے والوں پر روزگار کے دروازے بند کردیے جاتے تھے، ان کا سوشل بائیکاٹ کیا جاتا تھا۔ اب یہی کچھ دہشت گردی کے نام پر ہورہا ہے۔

واشنگٹن میں غیرسرکاری اداروں کے ماہرین سے ہماری زیادہ تر میٹنگیں میریڈیان کے دفاتر میں ہوتی تھیں جو پرانی کوٹھیوں جیسی دو بلڈنگوں میں واقع تھے۔ ان کی بیرونی ہیئت اور اندرونی آرائش دیکھ کر فری میسن یاد آجاتے تھے۔ لاہور اور کراچی میں ان کے پراسرار دفاتر بھی ایسی عمارات میں ہی تھے مگر ان بند بند اور مدھم روشنی والے ہالوں میں باتیں کھلی کھلی اور خیالات روشن روشن رہتے تھے۔ میریڈیان انٹرنیشنل سینٹر ایک پرائیوٹ، غیر منافع بخش تنظیم ہے جس کا

مقصد عوام، نظریات اور فنون کے تبادلوں کے ذریعے بین الاقوامی مفاہمت کا فروغ بتایا گیا۔ اس کا پروگرام ڈویژن، امریکی محکمہ خارجہ کی ایک گرانٹ کے تحت کام کرتا ہے اور محکمہ خارجہ کی زیر سرپرستی ہونے والے انٹرنیشنل وزیٹر پروگرام کے شرکاء کے لیے پیشہ ورانہ پروگراموں، ان کے سفر اور قیام کے انتظامات کرتا ہے۔

نئی قدامت پسندی اور استعماری طاقت کا ذکر اسی پراسرار بلڈنگ میں پہلی بار اس وقت چھڑا جب ہیری ٹیج فاؤنڈیشن کے جواں سال، خوبرو ریسرچ فیلو ڈاکٹر جان بلسمین نے کہا جب دنیا ''تاریخ کے خاتمے'' اور ''تہذیبوں کے تصادم'' جیسے مراحل سے گزر رہی تھی اس وقت امریکہ میں نئی قدامت پسندی کا آغاز ہوگیا ہے۔ اب ہم ایک استعماری طاقت کے طور پر کارروائیاں کررہے ہیں۔ نام جمہوریت کا لیا جاتا ہے لیکن یہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ جمہوری اچھائی ہو یا نہ ہو امریکہ نواز اچھائی ہے یا نہیں۔ الجزائر کی مثال سامنے ہے، یہاں انتخابات کے نتائج تسلیم نہیں کیے گئے تو امریکہ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اسی طرح مشرق وسطی میں سعودی عرب اور مصر وغیرہ ہمارے ایسے اتحادی ہیں جن کے ہاں جمہوری نظام یا انسانی حقوق نہ ہونے پر ہمیں کوئی تشویش نہیں ہوتی۔ ان کا انداز خطاب بہت پرجوش تھا اور کم وقت میں بہت کچھ کہنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عراق کی جنگ نے امریکی عوام کو ہی نہیں ری پبلکن پارٹی کو بھی حقیقت پسندوں اور نئے قدامت پسندوں میں تقسیم کردیا ہے۔ فوج کشی کے شوق میں امریکہ اپنے آپ کو مالی طور پر بھی الجھا رہا ہے۔ دفاعی اخراجات کے باعث جو خسارہ ہو رہا ہے ہم اسے کب تک برداشت کرسکیں گے۔ امریکی ٹیکس گزار کو اس کی کیا قیمت چکانا پڑے گی۔ بہرحال ایک معیار ہمیں طے کرنا ہوگا کہ امریکہ کہاں کب مداخلت کرے اور کب نہ کرے، ورنہ ہم الجھتے چلے جائیں گے۔

رینڈ کارپوریشن بھی ایک آزاد، غیر منافع بخش ادارہ ہے جو سائنسی تحقیق اور تجزیوں میں مصروف ہے۔ امریکہ کی وفاقی، مقامی ریاستی حکومتوں اور پرائیوٹ فاؤنڈیشنوں کی مدد سے عوامی دلچسپی کے موضوعات پر تحقیقی مطالعہ کرتا ہے۔ اس کی بعض دفاعی رپورٹوں پر تو کافی ہنگامے بھی رہے ہیں۔ اس کے ایک سینئر فیلو اور معمر سفارت کار ایمبیسڈر رابرٹ ہنٹر بھی اس غیر

رسمی تبادلہ خیال میں شریک تھے جو 1993ء سے 1998ء تک ناٹو میں امریکی سفیر رہے ہیں اور مختلف حکومتوں کے دور میں اہم سفارتی ذمہ داریاں انجام دینے کے ساتھ ساتھ وہ مختلف یونیورسٹیوں اور مراکز میں تدریسی فرائض سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر جان بلسمین کی نئی قدامت پسندی کے خیال سے تو اتفاق نہیں کیا لیکن وہ امریکہ کی غیر ممالک میں جارحانہ پالیسیوں کے بھی حق میں نہیں تھے، ان کا کہنا تھا کہ امریکی عوام سے خفیہ رائے لی جاتی تو جنگ کے خلاف ہی ووٹ پڑتا۔ لوگ تو یہ پوچھتے ہیں کہ جناب صدر، آپ کو افغانستان، عراق پر فوج کشی کے لیے منتخب نہیں کیا گیا آپ معیشت کا کچھ کریں۔ امریکیوں میں ہر سطح پر یہ بحث ہورہی ہے کہ ہر مسئلے کا حل جنگ ہی کیوں تلاش کیا جارہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ اس وقت عراق میں اپنی تاریخ کی سب سے بڑی فوجی کارروائی میں پھنسا ہوا ہے جس سے ملک میں خسارہ بھی بڑھ رہا ہے جبکہ چین ہمارا ایک سیاسی اور اقتصادی مدمقابل بن کر ابھر رہا ہے۔ امریکہ کی آئندہ نسل کو سب سے بڑے علاقائی، سیاسی چیلنج کا سامنا اس علاقے میں کرنا پڑے گا۔ عراق میں کیا ہم کامیاب ہوسکتے ہیں؟ یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ صدام کے زمانے میں وہاں دہشت گرد سرگرم نہیں تھے لیکن اب وہ کارروائیاں کررہے ہیں۔

ان کے نزدیک دنیا میں تین نظام تھے۔ کمیونزم، فاشزم، جمہوریت۔ کمیونزم تو ختم ہوگیا۔ جمہوریت مغربی یورپ میں ٹھیک چل رہی ہے۔ فاشزم کا جائزہ لینا چاہئے کہ یہ اب کیسی کیسی شکلوں میں سامنے آرہا ہے۔

انہوں نے ہماری اس بات سے اتفاق کیا کہ امریکہ کی اکثریت دہشت گردی کے خاتمے کے لیے صرف قوت کے استعمال کی حمایت نہیں کرتی ہے۔ اس کے لیے تعلیم کی اشاعت ضروری ہے۔ یہ امر بھی امریکی اکثریت کے نزدیک تشویشناک ہے کہ دنیا میں دفاع کے نام پر ہونے والے کل اخراجات میں سے 47 فیصد صرف امریکہ کررہا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ امریکہ کو عراق میں صرف اپنی فوج کو نہیں ناٹو اور دوسرے ممالک کی فوجوں سے بھی مدد لینی چاہئے، اسی سے استعماری طاقت ہونے کا الزام دور ہوسکتا ہے۔

9/11 کے حوالے سے جمہوری سامراجیوں نے ایسی جارحانہ سوچ پیدا کردی ہے کہ پرجوش امریکی اپنے نامعلوم دشمن کے خوف سے نجات کا راستہ دنیا پر امریکی فوجی غلبے میں سمجھنے لگے ہیں۔ امریکی ریاست اوہائیو کے ایک شہر سنسناٹی میں ہماری ملاقات کویت اور عراق سے واپس آنے والے بعض فوجیوں سے بھی کروائی گئی۔ جس میں بڑی معنی خیز اور آنکھیں کھول دینے والی باتیں ہوئیں۔ اس کی باضابطہ تفصیل تو بعد میں بیان کروں گا لیکن یہاں ایک سیاہ فام میرین اور ایک دو سفید فاموں کا جذبہ دیدنی تھا۔ وہ خالص فوجی بلکہ فسطائی انداز میں کہہ گئے کہ مرنے کو تو یہاں لاس انجلز کے نسلی فساد میں بہت امریکی مرجاتے ہیں، موت کا کیا ڈر، لیکن امریکہ کے مفاد کو جہاں خطرہ ہوگا ہم وہاں جاکر لڑیں گے اور خون کا آخری قطرہ بھی بہادیں گے۔

ان سے جب کہا گیا کہ امریکہ کو یہ حق کیسے مل جاتا ہے۔ کیا آپ یہ برداشت کریں گے کہ کوئی اور ملک مثال کے طور پر چین دوسرے کمزور ملکوں پر اس طرح فوج کشی کر کے اپنی مرضی کا نظام مسلط کرے۔

اسی ریاست میں تاجروں، مختلف سرکاری غیر سرکاری اداروں کے ملازمین، وکلا سے بھی چائے اور کھانوں کے دوران تبادلۂ خیال ہوا۔ وہاں بھی بعض امریکی بڑے شدومد سے یہ کہہ رہے تھے کہ امریکہ سپر طاقت ہے۔ ہم نے کتنی صدیوں کی محنت سے اپنی اس سوسائٹی کو تشکیل دیا ہے ہم نہیں برداشت کرسکتے کہ اس طرح مسلمان ہمارے ٹریڈ سینٹروں، سفارت خانوں، قونصل خانوں پر حملے کریں۔ ہماری فوجوں کو اس وقت تک واپس نہیں آنا چاہئے جب تک وہ ایک ایک دہشت گرد کو ختم نہ کرلیں۔

ایسی سوچ رکھنے والے ہر میٹنگ میں اگرچہ اکثریت میں نہیں ہوتے تھے لیکن بہرحال یہ ایک انداز فکر ہے جو فروغ پارہا ہے۔ کئی ٹی وی چینل، اخبار، رسالے اس کو مزید ہوا دے رہے ہیں۔ جب کہیں کسی ملک سے کسی امریکی سفارت خانے، بحری جہاز یا کسی اور دفتر پر خودکش حملے یا بم دھماکے کی خبر آتی ہے تو یہ فکر رکھنے والے حلقے اور زیادہ متحرک ہوجاتے ہیں۔

امریکی معاشرہ بھی ان رجحانات میں مضمر خطرات کا احساس کررہا ہے، اس پر مباحثے

ہورہے ہیں، کتابیں بھی تالیف کی جارہی ہیں۔ ایک گروپ تشکیل دیا گیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ امریکیوں کو ایمپائر ہونے کے خطرات سے آگاہ کیا جائے اور اپنے بانی بزرگوں کی روایات اور اقدار کی طرف واپسی کی تربیت دی جائے۔ اس گروپ میں امریکی صدر کے سابق مشیر لی بوائیڈن گرے بھی شامل ہوگئے ہیں۔ سابق صدر نکسن کے 1994ء میں قائم کردہ نکسن سینٹر کے صدر ڈیمٹری کے سائمنز ایک منصوبے ''امریکی استعماری مصائب'' پر تحقیق کررہے ہیں۔ بعض سنجیدہ مفکرین کا کہنا ہے کہ جب سوویت یونین کا خاتمہ ہونے والا تھا تو امریکہ کو ایمپائر ہونے کے خدشات اور خطرات پر اسی وقت غور کرنا چاہئے تھا۔ سوویت یونین تو تاریخ میں حصہ بن گئی لیکن اس کے مقابلے کے لیے تیار کردہ امریکہ کے جاسوس سیاروں کا جال اسی طرح بچھا ہوا ہے، ایٹمی آبدوزیں اسی طرح زیر سمندر رواں ہیں، طیارہ بردار بحری جہاز بھی اسی طرح موجود ہیں۔ دوسرے ممالک میں ہزاروں فوجی بھی اسی طرح متعین ہیں۔

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد بھی امریکہ کئی جگہ فوجی مداخلتیں کرچکا ہے۔ اس طرح استعماری رجحانات فروغ پارہے ہیں۔ نئی قدامت پسندی کا تعلق ڈیموکریٹس کے ایک بائیں بازو کے منحرف گروپ سے جوڑا جارہا ہے۔ ان کا فلسفہ یہ ہے کہ امریکی سیاسی اقتدار کو دنیا بھر میں پھیلانے اور جن ملکوں میں امریکہ کو اپنے وسیع تباہی کے ہتھیاروں سے مقابلے کی اہلیت ہو ان پر حملے سے پہلے ہی کارروائی کرنے کے لیے اور قوموں کی ازسرنو تعمیر کے لیے امریکہ کو اپنی فوجی طاقت استعمال کرنی چاہئے۔

ایک سیاسی ماہر میکس بوٹ نے کہا کہ امریکہ ''ایمپائر آف لبرٹی'' استعمار آزادی ہے اس کا فرض ہے کہ دنیا بھر میں جمہوریت پھیلائے۔ نیشنل پبلک ریڈیو کے ایک ٹاک شو میں میکس بوٹ نے امریکہ کو اپنے دفاعی اخراجات دوگنا کر کے اپنی عالمی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے زور دیا۔

دوسری طرف وہ امریکی حلقے بھی ہیں جو ایسی تحقیق اور تجزیے پیش کررہے ہیں جن سے نئی امریکی نسل کو بتایا جاسکے کہ کس طرح پہلے روم جیسی سلطنتیں اور دوسری جمہوریائیں اپنے استعماری رویوں سے کمزور ہوتی چلی گئیں۔ ایک دو مقامات پر بعض سیمینارز کے اختتام پر

سامعین کی باضابطہ رائے لینے کے لیے جب یہ قرار داد رکھی گئی کہ: امریکہ ایک ایمپائر ہے اور اسے ایک ایمپائر ہونا چاہئے تو سامعین نے اسے مسترد کر دیا۔

یہ مباحثے جاری ہیں۔ کیا یہ بش انتظامیہ کے جارح قوم پرستوں کو اپنا یہ عقیدہ واپس لینے پر مجبور کر سکتے ہیں کہ جمہوریت کے لیے برے لوگوں کو ہلاک کرنا اداروں کی تعمیر سے زیادہ ضروری ہے۔

یہ بحث تو امریکہ میں جاری ہے کہ اسے ایمپائر ہونا چاہئے یا نہیں۔ امریکی معاشرے کے اپنے انداز ہیں۔ وہاں تحقیق بھی ہوتی رہتی ہے، مطالعہ بھی۔ ان کی بنیاد پر ہی پالیسیاں تبدیل اور تشکیل کی جاتی ہیں۔ ہمیں تو اپنے ہاں دیکھنا ہے کہ امریکہ میں یہ جو خطرناک رجحانات فروغ پا رہے ہیں اس سے پاکستان کے لیے کیا کیا خطرات ہو سکتے ہیں۔ کیا ہمارے ہاں کوئی ایسی بحث جاری ہے کہ ادھر امریکہ میں جو کچھ سوچا جا رہا ہے ہم اس کے اثرات اور نتائج کا سامنا کرنے کے لیے کتنے تیار ہیں۔ دوسرے یہ کہ جن مسائل کی وجہ سے امریکہ اور مغرب ہمارے بارے میں خدشات رکھتے ہیں ہم ان مسائل کو کس طرح حل کر رہے ہیں کیا وہ مسائل حقیقی ہیں۔ کیا ہمارا اپنا معاشرہ بھی ان سے کمزور ہو رہا ہے۔ اگر ہمیں ناکام ہوتی ہوئی ریاست کہیں لکھا یا کہا جاتا ہے تو کیا یہ سچ ہے۔ ہمیں ایک فعال اور متحرک ریاست بننے کے لیے جو کرنا چاہئے ہم کر رہے ہیں یا نہیں کر رہے۔ ہم او آئی سی سے تعلق پر فخر کرتے ہیں۔ او آئی سی امریکہ میں فروغ پاتے ان رجحانات کا جائزہ لے رہی ہے کہ اس سے مسلمان ملکوں کو کیا کیا خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔

خبردار! آپ کی نگرانی ہو رہی ہے

آپ امریکہ میں کسی دکان سے کتاب خرید رہے ہیں۔

کسی لائبریری میں کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں یا اپنے نام جاری کروا رہے ہیں۔

کسی گھر میں بیٹھے بڑے انہماک سے کوئی ویب سائٹ دیکھ رہے ہیں۔ اپنے ٹی وی لاؤنج میں کوئی پروگرام یا فلم دیکھنے میں گم ہیں۔ کسی وڈیو سینٹر سے کوئی وڈیو، سی ڈی خرید رہے ہیں۔ آپ پیدائشی امریکی ہیں یا اجنبی امریکی خبردار! فیڈرل بیورو آف انوسٹی گیشن (ایف بی آئی) آپ کی نگرانی کرتی ہے اور آپ کا دہشت گردی سے رابطہ جوڑ سکتی ہے۔ اینیمل فارم اور 1984ء جیسے شہرہ آفاق ناول لکھنے والا جارج آرویل اپنی قبر میں بے چین ہو رہا ہوگا کہ اس نے تو کمیونسٹ معاشروں کے بارے میں لکھا تھا۔

"Big Brother is Watching"

اب تو آزاد ترین دنیا میں شہری اس خوف سے مبتلا کر دیئے گئے ہیں کہ آپ کو کوئی دیکھ رہا ہے۔

امریکہ کے بانی بزرگ، جدوجہد آزادی کے رہنما، سابق صدور اپنی آخری آرام گاہوں میں تڑپ رہے ہوں گے کہ ان کی طویل محنت سے حاصل کردہ شہری آزادیاں کس طرح ایک ایک کر کے سلب کی جا رہی ہیں۔ آزاد فضاؤں میں سانس لینے والے امریکی اپنے آس پاس کتنی

گھٹن محسوس کر رہے ہیں۔

ہٹلر، مسولینی، اسٹالن اور کتنے دوسرے آمر قہقہے بلند کر رہے ہوں گے کہ بالآخر امریکہ کو بھی ہماری پالیسیاں اختیار کرنی پڑ رہی ہیں۔ امریکہ میں تحریر، تقریر اور دوسری شہری آزادیوں کو آج کل ایک قانون حب الوطنی کے نام پر اپنے حصار میں لپیٹ رہا ہے۔ امریکیوں کے ذہنوں پر پیٹریاٹ ایکٹ اپنے تالے لگا رہا ہے۔ کسی بھی نئے، پرانے امریکی کو کسی وارنٹ، پیشگی اطلاع اور بغیر وجہ بتائے گرفتار کیا جا سکتا ہے، نظر بند رکھا جا سکتا ہے۔

اس ایکٹ کے سائے تو پندرہ روزہ پروگرام کے پہلے دن سے ہی ہمارے اردگرد منڈلاتے رہے، کبھی نہ کبھی کسی حوالے سے اس کا ذکر چھڑ جاتا تھا۔ ہم کہتے تھے کہ ہم لوگ تو برسوں سے حبس بے جا کے عادی ہیں۔ ایسے سیاہ قوانین امریکہ کے منشور نظر آمر نافذ کرتے رہے ہیں۔ ان کے خلاف احتجاج اور ہنگاموں کی تاریخ بھی ہمارے ہاں اتنی ہی طویل ہے جتنے یہ قوانین۔ ہمارے طالب علم، سیاسی کارکن اور خاص طور پر وکلا بڑے بڑے ملک گیر مظاہرے کرتے رہے ہیں۔ آپ کے ہاں کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ ہمارے خطوں میں بھی حب الوطنی، ملک وقوم کے وسیع تر مفاد، قومی سلامتی کے نام پر پکڑ دھکڑ، نظر بندیوں کے سلسلے جاری رہے ہیں۔ اب جب عوام کی جدوجہد کے نتیجے میں ہم ایسی اکثر پابندیوں سے بڑی حد تک آزاد ہو رہے ہیں۔ آپ کے ہاں تاریخ کا پہیہ کیوں الٹا گھومنے لگا ہے؟ ہمارے پروگرام کے آخری دن تھے۔ جب دی پیٹریاٹ ایکٹ پر گفتگو کا اہتمام کیا گیا۔

موضوع تھا: ''دی پیٹریاٹ ایکٹ........ملکی اور بین الاقوامی اثرات''

تبادلۂ خیال کے لیے پال روزن برگ آئے تھے۔ جو دی ہیریٹیج فاؤنڈیشن میں قانونی اور عدالتی مطالعات کے مرکز میں سینئر لیگل ریسرچ فیلو ہیں۔ ہیریٹیج فاؤنڈیشن، ایک تھنک ٹینک ہے۔ جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ پال روزن برگ وفاقی اپیلٹ، کرمنل لا اور قانونی اخلاقیات میں مہارت حاصل کر چکے ہیں۔ وہ ایوان نمائندگان کی کمیٹی برائے ٹرانسپورٹ کے لیے تحقیقاتی مشیر بھی رہے ہیں۔ ان کے ساتھ آنے والے اسکاٹ نیلسن تھے۔ جو پبلک سٹیزن لٹی گیشن گروپ (یعنی شہریوں کے مقدمات کے گروپ) کے اٹارنی ہیں۔ پبلک سٹیزن، شہریوں کے مفادات کا تحفظ کرنے والا ایک گروپ ہے جو ان کے قانونی امور سنبھالتا ہے۔ یہاں زیادہ تر حکومتی اختیارات سے تجاوز کے معاملات زیر بحث آتے ہیں۔ پبلک سٹیزن گروپ سے وابستگی سے پہلے وہ ایک طویل عرصے تک مختلف قانونی فرموں کے ساتھ پریکٹس کر چکے ہیں۔

ہم سب کے خیال میں یہ نشست انتہائی اہم تھی کیونکہ امریکی شہری بالعموم اس قانون پر تنقید کرتے نظر آ رہے تھے انہیں صدر روز ویلٹ یاد آ رہے تھے۔ جنہوں نے کہا تھا۔

''ہمیں بہت ذمہ داری سے تمام شہریوں کے حقوق اور آزادیوں کی حفاظت کرنی چاہیے خواہ ان کا کچھ بھی پس منظر ہو۔ ہمیں یاد رہنا چاہیے کہ کسی قسم کا دباؤ........ ناانصافی یا نفرت دراصل ہمارے ہم وطنوں پر ایک قسم کا حملہ ہے۔''

واشنگٹن میں صدر روز ویلٹ کی یادگار ایک وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔ ان کے مختلف صدارتی ادوار کے اعتبار سے مجسمے، تصاویر اور پینٹنگز بنائی گئی ہیں۔ ماحول بڑا خوبصورت اور پرفضا ہے۔ پانی آبشاروں کی صورت میں بہہ رہا ہے، حوض ہیں، تالاب ہیں لیکن سب سے اہم پہلو ان کے مختلف اقوال ہیں۔ جو آج کے امریکی صدر اور ان کے ساتھیوں کے لیے ایک آئینے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم نے قریباً ہر ایئرپورٹ پر، ہر سرکاری دفتر میں امریکیوں کو ہاتھ بلند کر کے تلاشی دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہم تو خیر مسلمان تھے۔ ایشیائی تھے، پاکستانی تھے۔ ہمارے مقدر میں تو تلاشی دینا لکھ دیا گیا ہے، امریکہ ہی کیا اپنے ملک میں، اپنے مسلمان بھائیوں کے ملکوں میں ہمیں تو ان مراحل سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ کراچی میں بعض شاہراہوں پر اپنے نوجوان ہم وطنوں کو رینجرز یا پولیس والوں کے سامنے جب ہاتھ اٹھائے دیکھتا تھا تو میں سخت برہم ہوتا تھا کہ ہم نے یہ ملک اس لیے تو نہیں بنایا تھا۔ ہمارے نوجوان جب اس طرح قانون نافذ کرنے والے اداروں کے سامنے بے بسی کی تصویر بنتے تھے تو سخت دکھ ہوتا تھا۔ طاقتوروں سے اس سلسلے میں جا کر بات بھی کرتا تھا لیکن اب یہاں ایئرپورٹوں اور سرکاری دفتروں میں جب اچھے خاصے معزز امریکیوں کو، سرکاری افسروں کو سیکورٹی اہلکاروں کے آگے اور خاص طور پر گوروں کو کالوں کے سامنے ہاتھ اٹھا کر گھوم کر چیکنگ کرواتے دیکھا تو خوشی ہوئی کہ یہ بے بسی ان کا مقدر بھی بن گئی ہے۔ ایشیائی امریکی اس حد تک تو برابری کی سطح پر آ گئے ہیں۔ جوتے صرف

ہمارے ہی نہیں ان کے بھی اترتے ہیں۔ ایک دو ایئرپورٹوں پر تو یہ بھی ہوا کہ ہمارے وفد کے ساتھ مستقل رہنے والی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کی کنٹریکٹر اور اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے افسر نے اپنے قانونی حق کا استعمال کرتے ہوئے جوتے اتارنے سے انکار کیا۔ گزشتہ دنوں یہ کہا گیا تھا کہ یہ آپ کا حق ہے کہ آپ جوتے رضا کارانہ اتارنا نہ چاہیں تو آفیسر آپ کو مجبور نہیں کرسکتا۔ اس انکار کے حق کے استعمال کے بعد سیکورٹی آفیسرز نے صرف جوتے ہی نہیں ان کے کوٹ بھی اتروائے۔ ان کی ہم ایشیائیوں کے سامنے ایسی تلاشی لی کہ وہ خود بھی شرمسار ہوئے۔ ہمیں بھی شرمسار کیا لیکن دلی طور پر ہم بہت سرشار تھے۔ اسکاٹ نیلسن کا کہنا تھا کہ پیٹریاٹ ایکٹ انتہائی عجلت میں منظور کیا گیا انتہائی پیچیدہ قانونی مسودہ ہے بلکہ یہ سیکڑوں کاغذات کا ایک پلندہ ہے۔ جس میں سیکورٹی کے نام پر بہت کچھ ٹھونس دیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں بھی ایک دور میں آئین میں ترامیم پانچ سے دس منٹ میں کردی گئی تھیں تو اسے بے رحم پارلیمانی اکثریت کا کارنامہ قرار دیا گیا تھا اور ایسی قانون سازی پر سخت تنقید ہوئی تھی۔ اب دنیا کی ایک بڑی جمہوریت اور مجسمہ آزادی والے ملک کی کانگریس نے بھی یہی کارنامہ انجام دیا ہے، یہ بھی ایک بے رحم پارلیمانی کاروائی ہی تو ہے۔ گفتگو بڑی دلچسپ اور سنجیدہ تھی۔ یہ اس دور کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ اس پر بات آئندہ قسط میں بھی جاری رہے گی۔

عدالتیں، قانون سب بے بس ہوگئے

بات ہو رہی تھی حب الوطنی ایکٹ کی، جس نے پورے امریکی معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ماہر قانون سکاٹ نیلسن بتا رہے تھے کہ اس میں دہشت گردی کے مقابلے کے لیے بھی بہت سی شقیں ہیں لیکن کافی حصہ اس سے ماورا بھی ہے۔ شہری آزادیوں سے مختلف حصے بہت تشویشناک ہیں۔ منی لانڈرنگ سے متعلقہ قواعد وضوابط یہ جائزہ لیتے ہیں کہ پیسہ بین الاقوامی سطح پر امریکہ میں یا امریکہ سے منتقل نہ ہو رہا ہو۔ پہلے تبادلہ زر میں آزادی تھی اب بغیر لائسنس کے یہ نہیں ہوسکتا زیادہ تر کام کرنے والے امریکہ سے مشرق وسطیٰ اور ایشیا کے ملکوں میں پیسے بھیجتے تھے۔ وہ سخت متاثر ہوئے ہیں، کرنسی ایکسچینج کے چھوٹے کاروباری اس کی زد میں آگئے ہیں۔ ان کی رقوم اور محنت کشوں کی رقوم ضبط ہوگئی ہیں۔ امیگریشن سیکورٹی سے متعلقہ شقوں کا اطلاق Aliens اجنبیوں پر ہو رہا ہے۔ ان کے لیے پہلے سے بھی ایسی شقیں تھیں جن کے تحت بعض جرائم میں ملوث ہونے پر انہیں اپنے اپنے وطن بھیجا جاسکتا تھا لیکن اب دہشت گردی کی تعریف میں توسیع کردی گئی ہے۔ ایف بی آئی کا کوئی ایجنٹ اگر حلفیہ بیان دے دے تو کسی گواہی یا ثبوت کی ضرورت نہیں ہے، دہشت گردی کی کوئی واردات ضروری نہیں ہے، اسلحے کا استعمال، دھماکہ یا اسلحے کی موجودگی بھی ضروری نہیں ہے۔ کسی کے بارے میں یہ کہہ دیا جائے کہ اس نے دہشت گردوں کو پناہ دی، رہائش فراہم کی، مالی امداد دی، اسے اس ایکٹ کے تحت گرفتار کیا

جاسکتا ہے۔ وکیل صاحب کا کہنا تھا کہ اب ہمارے لیے ایسے غیر ملکیوں کی قانونی نمائندگی بھی مشکل ہوتی جارہی ہے کیونکہ یہ زیادہ تر سیاسی نوعیت کے مقدمات ہیں اور اس گرفتار شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ ثابت کرے کہ وہ دہشت گردی کی حمایت نہیں کررہا تھا۔ انہوں نے کسی قدر تعجب ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ آپ حماس جیسی تنظیموں کو چاہے اسپتال کی تعمیر کے لیے پیسہ دیں یا گولہ بارود کے لیے، یہ ایک جیسا جرم ہے۔

اسکاٹ نیلسن نے خدشہ ظاہر کیا کہ اب سب کچھ انٹیلی جنس ایجنٹوں کی صوابدید پر ہے۔ کسی شہادت، ثبوت یا قانونی جواز کا سوال نہیں رہا ہے۔ اس لیے اب انصاف قریباً ناممکن ہوگیا ہے۔ اب قانونی حلقوں میں ایک عرصے تک بے یقینی رہے گی۔ پیٹریاٹ ایکٹ کے ایک حصے میں تو اب دہشت گردی کے الزام کے لیے ایسی سرگرمی بھی ضروری نہیں جس سے انسانی جان کو خطرہ لاحق ہوتا ہو۔ اب یہ بھی ممکن ہے کہ کسی جلوس پر صرف پتھر پھینکنے والا بھی دہشت گرد قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسکاٹ نے یہ انکشاف بھی کیا کہ پہلے خفیہ نگرانی کو کسی شہری کے نجی معاملات میں مداخلت قرار دیا جاتا تھا۔ اس کی اجازت نہیں تھی، کسی گفتگو کی ٹیپ، نقل و حرکت کی وڈیو خفیہ طور پر تیار ہوں گی اور کسی کے خلاف بھی استعمال ہوسکتی ہیں۔ کوئی عدالت اب یہ نہیں کہہ سکتی کہ خفیہ نگرانی کا حکم کس نے دیا، کیوں دیا، لائبریریوں سے معلومات حاصل کی جارہی ہیں کہ لوگ کیا پڑھ رہے ہیں۔ کسی بھی کتاب کو دہشت گردی کا لٹریچر کہہ کر پڑھنے والوں کو دہشت گرد قرار دے کر نظر بند کیا جاسکتا ہے۔

مجھے احساس ہے کہ میرے جن قارئین کے نوجوان بیٹے یا عزیز و اقارب امریکہ یا کینیڈا میں مقیم ہوں گے وہ ان سطور کو پڑھ کر ہی بے چینی اور خوف محسوس کررہے ہوں لیکن مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی رال ٹپک رہی ہوگی کہ وہ بھی ایسے قوانین بنوائیں، ان کو بھی ایسی طاقت حاصل ہوجائے کہ کتابیں پڑھنے والوں پر ہاتھ ڈال سکیں۔ جس سیاسی مخالف سے حساب چکانا ہو، اس کو بغیر ثبوت کے اسی طرح غیر معینہ عرصے تک نظر بند رکھیں۔ میری یہ سطور کسی بھی جذبے کا محرک بن سکتی ہیں لیکن میرا فرض تو یہ ہے کہ مجھے دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے جن عزائم سے بھی آگاہی حاصل ہوئی ہے وہ آپ

تک پہنچاؤں۔

انہی وکیل صاحب نے کہا کہ اب اس قانون کے تحت کسی وکیل، اکاؤنٹنٹ، تاجر، صنعت کار کی دستاویزات ایف بی آئی حاصل کرسکتی ہے اور اس اقدام کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔

دوسرے ماہر قانون پال روزن برگ کا کہنا تھا کہ اب یہ بھی ہورہا ہے کہ ایف بی آئی اور سی آئی اے کے ایجنٹ کسی بھی پبلک مقام پر جاسکتے ہیں، مسجد میں داخل ہوسکتے ہیں۔ 9/11 کے بعد اگرچہ مسجد جانے کی اتھارٹی صرف ایک بار استعمال ہوئی ہے لیکن آئندہ اس اجازت کے غلط استعمال کے خطرات موجود ہیں۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ امریکیوں کو سبق سیکھنے کی ضرورت ہے۔ ماضی میں سی آئی اے کے ایجنٹ اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے دوسرے ملکوں کے سیاسی لیڈروں کو قتل کروایا کرتے تھے لیکن اب جب انہیں قانونی طور پر ایسے اختیارات مل جائیں گے تو کتنی قیامتیں رونما ہوسکتی ہیں۔ اس ایکٹ کے تحت سب سے تشویشناک پہلو یہی ہے کہ اس میں سب کچھ خفیہ طریقے سے ہوتا ہے۔ گرفتاری، نظر بندی جب تک چاہے خفیہ رکھی جائے۔ جج خفیہ مقام پر بیٹھتا ہے، گرفتار شدگان کے لواحقین داد فریاد کریں تو ان کے پاس کوئی ثبوت، معلومات نہیں ہوتیں۔ ہم یقیناً مختلف حالات سے دوچار ہیں۔ ایف بی آئی، فارن انٹیلی جنس سروس اپنے اختیارات غلط استعمال کررہے ہیں۔ ساٹھ اور ستر کے عشرے میں ایسا ہوتا تھا تو پریس سخت تنقید کرتا تھا، عام لوگ احتجاج کرتے تھے۔ اب کچھ تنظیمیں اس کے خلاف مہم چلارہی ہیں لیکن قومی سلامتی اور حب الوطنی کی گرد اتنی اڑادی گئی ہے کہ سب کچھ اس کی لپیٹ میں آرہا ہے۔ ان سے کہا گیا کہ کیا پہلے بھی ایسا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے تو ایسا تجربہ نہیں ہے لیکن سنا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپان اور جرمنی سے وابستہ لوگوں کو الگ تھلگ کرکے کیمپوں میں رکھا گیا تھا لیکن بعد میں ایسے قوانین واپس لے لیے گئے تھے۔ اس سے پہلے سول وار (خانہ جنگی) میں پولیس اور فوج کو ایسے اختیارات ہوتے تھے لیکن جس بے جا پر بعد میں سخت قوانین آئے تھے۔ ہماری طرف سے یہ پوچھا گیا کہ کیا اس قانون کو کسی عدالت میں چیلنج کیا گیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ لاس انجلز کی وفاقی عدالت میں نیویارک میں قائم ایک

تنظیم مرکز برائے آئینی حقوق نے اس کے آئینی جواز کو چیلنج کیا ہے۔ اس سے پہلے امریکی سول لبرٹیز یونین نے بھی تفتیش کے دوران کاروباری ریکارڈ کو ضبط کرنے کے خلاف مقدمہ دائر کیا تھا۔

پال کا کہنا تھا کہ یہ ایسا قانون ہے۔ جسے ہم وکلاء برداشت نہیں کرسکتے۔ یہ عجلت میں منظور کیا گیا ایکٹ ہے۔ اس لیے اس میں بہت سے قانونی اور آئینی پہلو نظر انداز کردیئے گئے ہیں۔ انہوں نے ہمارے پوچھنے پر بتایا کہ ہم وکلاء اس سے خوفزدہ نہیں ہیں۔ ہم اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کریں گے۔ حکومت اپنے اختیارات یکطرفہ طور پر استعمال کررہی ہے۔ جس سے شہری آزادیاں متاثر ہورہی ہیں اور انصاف کی فراہمی کا عمل بھی یقیناً متاثر ہوگا۔ امریکی حکمرانوں میں یہ جس قسم کے رجحانات پیدا ہورہے ہیں یہ تشویشناک ہیں اس سے قانون کی حکمرانی کمزور ہوگی۔ ہم نے پوچھا کہ ہمارے ہاں تو ایسے سیاہ قوانین کے نفاذ پر وکلاء تنظیمیں جلوس نکالتی ہیں، مظاہرے کرتی ہیں، عدالتوں کا بائیکاٹ کرتی ہیں۔ آپ کے ہاں ایسا نہیں ہورہا ہے۔ انہوں نے تعجب ظاہر کیا کہ اچھا آپ کے ہاں وکلاء اتنے باشعور اور سرگرم ہیں، ہمارے ہاں تو امریکن بار ایسوسی ایشن نے فوجی عدالتوں کے قیام کے خلاف قرارداد منظور کی تھی۔ ہمارے ہاں وکلاء کے جلوس نکالنے کا کوئی امکان نہیں ہے ہم تو اس امر کا انتظار کریں گے کہ عدالت اس قانون کے بارے میں کیا فیصلہ کرتی ہیں۔

دونوں وکلاء اس قانون کے بارے میں پیشہ ورانہ طور پر سخت برہم تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ اس وقت ملک میں جو فضا ہے اس کی موجودگی میں اس قانون میں کسی تبدیلی کا جلد کوئی امکان نہیں ہے۔ 2005ء تک تو اسے برداشت کرنا ہی ہوگا۔ ان سے پوچھا گیا کہ کیا یہ 2004ء کے صدارتی انتخابات پر اثر انداز ہوسکتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اپوزیشن کی آواز اتنی موثر نہیں ہے لیکن جیسا کہ خفیہ ایجنسیاں اپنے اختیارات سے تجاوز کررہی ہیں تو کیا ایسا کوئی واقعہ ہوسکتا ہے جس سے ایک لہر چل پڑے لیکن ابھی ایسا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

انہی دنوں اخبارات میں اس ایکٹ پر تنقید کے جواب میں محکمہ انصاف کی ترجمان باربرا کوم سٹاک نے یہ دلیل اختیار کی کہ یہ تنبیہ ایک طرح سے دہشت گردوں کو تعاون کی فراہمی

ہے۔ ایسی کوئی کوشش بھی امریکی عوام کے لیے مہلک خطرات پیدا کرسکتی ہے۔ کانگریس نے اکثریت سے اور پورے خلوص سے پیٹریاٹ ایکٹ کی منظوری دی ہے اور اس کا عزم ہے کہ دہشت گردوں کی کسی قسم کی مادی امداد اور معاونت کو جرم قرار دیا جائے۔

یہ ہے صورتحال اس سرزمین کی جو خوابوں کی زمین کہلاتی تھی۔ جہاں ہر قسم کے اظہار کی آزادی تھی۔ پابندیوں کا سیلاب انسانی حقوق کو بہا کر لے جارہا ہے۔ اس کی زد میں زیادہ تر مسلمان آرہے ہیں۔ ان میں سعودی عرب سرفہرست ہیں ان کے بعد پاکستان۔

امریکہ کے اٹارنی جنرل اس قانون کے نفاذ کے لیے بہت پرجوش ہیں۔ وہ اس سلسلے میں ملک گیر دورے کررہے ہیں۔ میرا تاثر یہی ہے کہ ان پابندیوں میں ابھی مزید اضافہ ہوگا اور مسلمان تارکین وطن کے لیے یہ مزید مشکل دن آئیں گے۔ دہشت گردی تو اس سے ختم نہیں ہوگی۔ امریکہ کا اپنا ریکارڈ مسخ ہوگا۔ ابراہم لنکن، روز ویلٹ کی ہدایات دم توڑ جائیں گی۔

کیا 9/11 امریکہ کا نفسیاتی مسئلہ بھی بن گئی ہے

کیا 9/11 امریکیوں کے اعصاب پر سوار ہے۔
کیا یہ ان کے لیے نفسیاتی مسئلہ بن گئی ہے۔

کیا 11 ستمبر 2001ء کے بعد امریکیوں کے لیے دنیا واقعی بدل گئی ہے۔ ہمارے تو خیر اس مطالعاتی دورے کا محور بھی یہی تھا۔ اسی لیے اس حوالے سے باتیں ہوتی تھیں۔ ہمیں ظاہر ہے کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ امریکیوں کے لیے اب اس کے علاوہ کوئی موضوع نہیں ہے۔ امریکہ رقبے، آبادی، معیشت اور فوج ہر اعتبار سے ایک بڑا ملک ہے اس میں ہر لمحے بہت کچھ ہوتا رہتا ہے۔ امریکی قوم اس بھیانک خواب کے افسوس سے باہر نکلنا چاہتی ہے۔ خواب سے بیدار ہوتا ہے کوئی محکوم گر، پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری) یہ شعر امریکیوں کے حسب حال ہے، وہاں یہی ہو رہا ہے کہ جب امریکی اپنی زندگی معمول پر لانا چاہتے ہیں، دوسرے مسائل کی طرف متوجہ ہونا چاہتے ہیں، صدر بش یا امریکی ریڈیو، ٹی وی، یا اخبارات کوئی نہ کوئی شوشا چھوڑ دیتے ہیں۔ کبھی اسامہ کی ٹیپ جاری ہو جاتی ہے، کبھی صدام کی کبھی کسی ویب سائٹ سے پیغام پکڑا جاتا ہے۔ لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ 11 ستمبر جیسے واقعات کا خطرہ ہے، ایسی تیاریاں جارہی ہیں۔ پاکستانیوں کے لیے تو امریکہ میں داخلہ 9/11 سے پہلے بھی مشکل ہی ہوتا تھا۔ کبھی کاغذات قانونی نہیں ہوتے تھے، کبھی منشیات کے شک میں کتوں سے سنگھایا جاتا تھا،

پاسپورٹ پر تصویریں بدل کر پہنچ جاتے تھے۔ لیکن اب 9/11 کے بعد تو پاکستانی پاسپورٹ کے حوالے سے کسی امریکی امیگریشن کے افسر کے چہرے پر مسکراہٹ دکھائی نہیں دیتی۔ امریکہ میں قدم رکھنے کے بعد پہلا سامنا جس ٹیکسی ڈرائیور سے ہوا وہ ایرانی امریکی تھا۔ یہ جان لینے کے بعد میں پاکستانی ہوں اس نے کھل کر امریکی حکومت پر تنقید شروع کر دی کہ اس کی پالیسیوں سے کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا ہے۔ اب لوگ پہلے کی طرح امریکہ نہیں آتے اور نہ ہی امریکہ اب آنے والوں کے لیے دیدۂ دل فرش راہ کرتا ہے۔ جب ہوٹل پر پہنچے تو استقبالیہ پر خالص امریکی نوجوان سے مکالمہ ہوا۔ اس نے واشنگٹن میں خیر مقدم کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتانا شروع کر دیا کہ حالات خراب ہیں، سب سے زیادہ ٹریول کاروبار متاثر ہوا ہے۔ وہ پہلے جس بڑے ہوٹل میں کام کرتا تھا وہاں کافی شعبے بند کر دیے گئے ہیں، ملازمین نکال دیے گئے ہیں۔ میں اب یہاں کم تنخواہ پر کام کر رہا ہوں۔ انٹرنیشنل وزیٹرز پروگرام کے منتظمین نے کافی کوشش کی تھی کہ ہمیں زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ افراد سے تبادلۂ خیال کا موقع مل جائے تا کہ ہم 9/11 کے بعد امریکی معاشرے کے بارے میں کوئی رائے قائم کر سکیں اور ادھر امریکی ہم جنوبی ایشیائیوں کا نقطۂ نظر جان سکیں۔ اپنے باہمی اختلافات کے باجود ہم سب ان امور پر ایک نقطۂ نظر رکھتے تھے کہ امریکیوں کو دوسرے ملکوں پر فوج کشی کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ افغانستان، عراق میں فوجی کارروائی سے عالمی امن کو خطرہ لاحق ہوا ہے اور 9/11 کے واقعات پر بعض جنوبی ایشیائی حلقے اس اعتبار سے خوش ہوئے تھے کہ امریکی غرور خاک میں مل گیا ہے۔ میں نے وکلاء، تاجروں، نوجوانوں، بزرگوں، بحریہ اور فضائیہ کے افسروں پر مشتمل شہریوں کی ایک میٹنگ میں اپنی باری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ جب 11 ستمبر 2001ء کو نیویارک، واشنگٹن میں خوفناک دہشت گردی ہوئی تو ہم نے اسے انسانیت پر حملہ سمجھا تھا لیکن امریکی حکومت نے اسے صرف امریکیوں پر حملہ قرار دے کر اور یکطرفہ فوجی طاقت کا استعمال کر کے انسانیت کو تقسیم کر دیا۔ عرفان صدیقی نے کہا کہ یہ تو طے نہیں ہو سکا کہ ٹریڈ ٹاور اور پینٹا گون سے جہاز ٹکرانے والے کون تھے اور دیگر مقامات پر ایسی وارداتیں ہو رہی ہیں وہ کون کروا رہا ہے لیکن افغانستان اور عراق میں جو مسلمان شہری مارے جا رہے ہیں ان کو ہلاک کرنے والوں کو تو

پتہ ہے، ان کو حکم کون دے رہا ہے۔ اس سے آپ خود اندازہ کرلیں کہ امریکہ ایک نامعلوم دشمن کا تعاقب کررہا ہے، مسلم دنیا کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کو کون دشمن ہلاک کررہا ہے سنسناٹی، ریاست اوہائیو کا دریا کے کنارے پر آباد خوبصورت شہر ہے۔ یہاں ایک نشست میں وکلاء، مقامی اخبار نویس اور نوعمر امریکی بھی موجود تھے۔ یہ مغربی ساحل کا دروازہ بھی کہلاتا ہے۔ مگر ایک خصوصیت اس شہر کی بتائی گئی کہ یہاں پر کام آرام سے ہوتا ہے دوسرے شہروں کی نسبت دس سال تاخیر ہوجاتی ہے۔ ممتاز امریکی ادیب مارک ٹوین نے سنسناٹی میں قیام کی خواہش کی، وجہ یہ بتائی تھی کہ اسطرح موت دس سال تاخیر سے آئے گی۔ سنسناٹی میں دوسری قوموں کے لوگ بھی رہتے ہیں۔ پروفیسرز، سینئر وکیل بات کررہے تھے۔ ہم نے کہا یہاں دو نوجوان امریکی ایک خاتون ایک مرد بیٹھے ہیں ہم ان کے جذبات جاننا چاہیں گے۔ دونوں نے بڑے اہم امور پر خاص باتیں کیں۔ جواں سالہ خاتون وکیل کرسٹین نے کہا کہ میں اسلامی تاریخ سے آگاہ نہیں تھی اس واقعے کے بعد میں نے اپنے طور پر تاریخ پڑھنا شروع کی ہے۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ امریکیوں کو اسلام کے بارے میں تعلیم دی جائے۔ امریکی مرد نے کہا کہ میری بہن پاکستان میں رہ رہی ہیں اسلام آباد اور لاہور میں، مجھے بھی جانے کا اتفاق ہوا، یہ بہت شاندار لوگ ہیں۔ 11 ستمبر کے بعد اتنا کچھ کہا اور سنا جارہا ہے کہ مجھے یقین نہیں آتا۔ میں پاکستان جانا چاہتا ہوں تاکہ معلوم کروں کہ کیا ہوا ہے لیکن سفر کا خیال ہی مجھے تذبذب میں ڈال دیتا ہے۔ یہاں میرے دوست پاکستانی بھی ہیں، انڈین بھی، ہم ان سے ملتے رہتے ہیں۔ ایک خاتون جو نسبتاً عمر میں ان سے بڑی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ بہتر طریقہ یہی ہے کہ آپس میں رابطے بڑھائے جائیں ایک دوسرے کے خیالات اور اقدار سے آگاہی حاصل ہو تو مختلف کلچر، مختلف نسلیں، مختلف زبانیں کوئی مسئلہ نہیں بن سکتے۔ اس چھوٹے مگر حسین شہر کی آنکھوں میں ہم ایشیائیوں کے لیے شکوک وشبہات یا خوف نظر نہیں آرہا تھا۔ یہاں عالمی مہمانوں کے لیے ایک کونسل قائم ہے جو ان کو ہر ممکن سہولت بہم پہنچاتی ہے۔ ہماری رہنمائی کے لیے انہوں نے ایک جواں سال پاکستانی امریکی کی خدمات حاصل کی تھیں جس نے کہا کہ وہ اس شہر میں ایک عرصے سے ہے اور اسے گیارہ ستمبر اور اس کے بعد بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

اس کے ساتھ امریکی بھی پڑھتے ہیں انہوں نے تو اسے مکمل تحفظ دیا اور کسی قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ یہاں ایک دو سینئر امریکیوں نے 9/11 کے نتیجے میں بڑھتی ہوئی سیکورٹی پر بہت تشویش ظاہر کی اور کہا ہے کہ وہیل چیئرز پر بیٹھے معذروں کی تلاشی بھی لی جاتی ہے۔ امریکہ کے دوسرے شہروں کی طرح سنسناٹی میں بھی تمام بنیادی شہری سہولتیں مقامی شہری حکومت فراہم کررہی ہے۔ شہر کی آبادی صرف تین لاکھ اکتیس ہزار ہے لیکن اس کی بندرگاہی حیثیت اور تجارتی اہمیت کے باعث یہاں اہم دفاتر، ہوٹل اور بڑی ایئرپورٹس میں گہما گہمی رہتی ہے۔ 1788ء میں بسنے والے اس شہر کا موجودہ نام 1790ء میں ایک رومن شہری فوجی کے نام پر رکھا گیا۔ شہری فوجی کی اصطلاح آپ کو ذرا اوپری (مختلف) سی لگ رہی ہوگی۔ اس کی توضیح بھی ہوجائے گی۔

سنسناٹی میں سب سے خیال انگیز ملاقات یہاں کے جواں سال کونسل ممبر ڈیوڈ پیپر سے رہی جو اپوزیشن پارٹی، ڈیموکریٹک سے تعلق رکھتے ہیں۔ سٹی ہال کی تاریخی عمارت کے عین سامنے یہودیوں کا معبد سنی گاگ ہے جس کا طرز مسجد سے ملتا جلتا ہے۔ دائیں، بائیں کلیساؤں کی عمارتیں ہیں۔ ڈیوڈ پیپر متبادل میئر کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی پرجوش گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ سنسناٹی ان کے سیاسی مزاج اور کام کے لیے بہت محدود ہے وہ جلد ہی اپنی ریاست کی گورنری تک جا پہنچیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ یقیناً ایک روز امریکی صدارت کے امیدوار ہوں گے، ان کا کہنا تھا کہ ہوم لینڈ سیکورٹی کے محکمے نے ریاستوں اور ضلعوں کے کاموں میں مداخلت تو شروع کردی ہے لیکن وفاقی حکومت جتنا پیسہ چاہئے وہ نہیں دے رہی ہے۔ اس طرز عمل سے شہری قائدین (سٹی لیڈرز) مایوس ہیں۔ انہوں نے اس امر کا اظہار بھی کیا کہ جن شہروں میں ری پبلکن مقامی حکومت میں نہیں ہیں ان سے امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ سٹی حکومتوں نے مل کر ایک ادارہ قائم کیا ہے جیسے نیشنل لیگ آف سٹیز، (شہروں کی قومی لیگ) جس کے سال میں دوبار اجلاس ہوتے ہیں جہاں شہر، ریاست اور وفاق کے درمیان تعلقات، تنازعات بھی زیر غور آتے ہیں۔ اسی مقامی قیادت سے ریاستوں اور وفاق کے لیے قیادت جنم لیتی ہے۔ اگر نعمت اللہ صاحب، مخدوم رفیق الزماں، میاں عامر محمود، طارق کیانی،

اعظم آفریدی، سن رہے ہوں تو وہ بھی ایسی کوئی انجمن قائم کرسکتے ہیں اور ہر سال اجلاس منعقد کرسکتے ہیں۔ ڈیوڈ پپر نے کہا کہ 9/11 کے بعد افغانستان میں کارروائی کے لیے تو سب رضامند نظر آتے تھے لیکن عراق میں جو صورتحال پیدا ہورہی ہے وہ خراب سے خراب تر ہورہی ہے اس لیے پہلی بار صدر کی مقبولیت میں بھی کمی آرہی ہے۔ اس امریکی نوجوان کی گفتگو مدلل بھی تھی اور مجموعی صورتحال کا ادراک بھی رکھتی تھی۔ سنسنائی میں ہی ہمیں ایک مضافاتی علاقے میں امریکی خاندان کے فارم ہاؤس میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے خاندانوں سے ملایا گیا۔ جہاں پکنک جیسا سماں پیدا کیا گیا تھا۔ اس گھر سے ملحقہ جھیل بھی تھی، جنگل میں جگنو بھی۔ براعظموں کے درمیان فاصلوں کا کوئی اثر نہیں تھا۔ سب کا موضوع یہ تھا کہ آئندہ انسانیت کس طرح پرامن طریقے سے رہ سکتی ہے، انسان سب ایک جیسے ہیں۔

سنسنائی کی طرح امریکہ کے ہر شہر میں غیر ملکی مہمانوں کی میزبانی کے لیے سٹی کونسلیں بنی ہوئی ہیں ان کے بعض ارکان وفود کی میزبانی کی پیشکش بھی کرتے ہیں جہاں ایسا بے تکلف ماحول میسر آتا ہے لیکن ایک ایسی شام ان تمام خون آشام دنوں، راتوں، شاموں کے زخم کیسے مندمل کرسکتی ہے جو ان دنوں افغانستان اور عراق میں لگائے جارہے ہیں اور اس سے پہلے نہ جانے کہاں کہاں لگ چکے ہیں۔ بوسٹن میں ہمارے پروگرام ورلڈ بوسٹن نامی ایک ادارے نے کئے تھے۔ انہوں نے بھی ہمیں شہر کی اہم شخصیتوں، وکلاء، تاجروں، مقامی حکومتوں کے افسروں، پولیس اور سول ڈیفنس کے حکام سے گفتگو کا موقع دیا۔ ریاست موساچسٹس کا دارالحکومت بوسٹن ہارورڈ یونیورسٹی آف ٹیکنالوجی اور دوسرے تعلیمی اداروں کی وجہ سے بھی مشہور ہے لیکن اس کی اصل تاریخی اہمیت یہ ہے کہ سب سے پہلے غیر ملکی تارکین وطن یہیں پہنچے تھے اور امریکی انقلاب کا آغاز یہیں چائے کی ایک پارٹی سے ہوا جب 1770ء میں برطانوی فوجوں نے شہریوں پر بے دریغ فائرنگ کرکے قتل عام شروع کردیا، پھر 1773ء میں بوسٹن ٹی پارٹی کے نام سے ٹیکس کے خلاف بغاوت شروع ہوئی جس کے نتیجے میں برطانوی پارلیمینٹ نے 1773ء میں اس بندرگاہ کو بند کردیا تھا۔ بوسٹن میں اکثر شہریوں کا ملال یہ تھا کہ یہاں سے دو مسافر جہاز اڑے تھے جو نیویارک میں ٹکرائے اس لیے ہلاک ہونے والوں میں اکثریت یہاں کی ہے اس کے

المناک اثرات یہاں بہت محسوس کئے گئے۔ یہاں لوگ یونیورسٹیوں میں مقیم غیر ملکی طلبہ اور اساتذہ کی بڑی تعداد کی وجہ سے دوسرے ملکوں کے حالات سے اتنے بے خبر نہیں ہیں۔ ویتنام کے زمانے میں یہاں جنگ اور فوج کے خلاف بہت احتجاج ہوتے تھے۔ بوسٹن سے بش کو ووٹ نہیں مل رہے تھے لیکن اب فضا بدل گئی ہے، ان کو حمایت حاصل ہورہی ہے۔ 9/11 نے انہیں بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ قومی پرچم بھی اب عمارتوں پر پہلے سے زیادہ لہراتے نظر آتے ہیں۔ ان سے عراق کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا کہ عراق کے بارے میں کچھ رائے میں اختلاف ہے۔ کسی پرائیوٹ فرم میں اعلیٰ عہدے پر فائز خاتون نے اعتراف کیا کہ ہماری شہری آزادیاں متاثر ہورہی ہیں نجی زندگی میں مداخلت ہورہی ہے۔ کریڈٹ کارڈ اور بینک اکاؤنٹ سب کچھ دیکھا جارہا ہے، اس پہلو سے ہم پریشان ہیں۔ ایک سینئر وکیل جو یہاں اٹارنی کہلانا زیادہ پسند کرتے ہیں انہوں نے بتایا کہ 11 ستمبر کے واقعے کے فوراً بعد مسلم آبادی اور مساجد پر حملے ہوئے لیکن ان پر فوراً قابو پالیا گیا۔ واضح طور پر کہا گیا کہ یہ نفرت کے جرائم برداشت نہیں کریں گے یہاں یہ بھی احساس پایا جاتا ہے کہ خسارہ بڑھ رہا ہے، ترقیاتی پروگراموں میں کٹوتی ہورہی ہے۔ ایک خاتون نے اس امر کو تسلیم کیا کہ اقوام متحدہ کی اجازت نہ لینے سے بڑا اثر پڑا ہے۔ یہاں بائیں بازو اور لبرل سوچ پیدا ہورہی ہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ امریکہ اپنی حکمت عملی میں اقوام متحدہ کی اجازت کو شامل کرے ورنہ امریکہ کے لیے خطرات بڑھ جائیں گے جس کا ثبوت یہ ہے کہ جن ملکوں نے افغانستان کے سلسلے میں امریکہ کی مدد کی اب وہ عراق میں امریکہ کی مدد نہیں کررہے۔ یہاں زیادہ تر رائے اعتدال پسند اور حقیقت پسندانہ تھی۔ صرف ایک سینئر اٹارنی اور بحریہ کے ایک افسر بہت جذباتی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ امریکہ کو یہ حق حاصل ہے کہ جہاں امریکی مفادات کو خطرہ ہو وہاں امریکہ فوج لے کر پہنچ جائے لیکن اکثریت اس فکر کا اظہار کررہی تھی کہ طاقت کے استعمال کے بجائے کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا جائے ورنہ ہمارا اقتصادی خسارہ بڑھے گا، روزگار کم ہوگا، لوگوں میں جنگ عظیم ویتنام کی جنگ جیسی صورت پیدا ہوگی، آگے بڑھنے کی رفتار رک جائے گی۔ خیال رہے کہ بوسٹن ہی وہ بندرگاہ ہے جہاں پر برطانیہ کے غلبے کے خلاف انقلاب کی بنیاد رکھی گئی تھی اور پھر بالآخر امریکہ

نے آزادی حاصل کی۔ اب برطانیہ امریکہ کا سب سے بڑا اتحادی ہے۔ ہم نے بوسٹن کے شہریوں سے جب یہ جاننا چاہا کہ کیا اب بھی نئے دور میں امریکی انقلاب کا آغاز یہیں سے ہونے کا امکان ہے۔ یہ بزرگ اور نوجوان شہری خاموش رہے۔ انہوں نے ہمیں اس عمارت کو دیکھنے کا مشورہ دیا جہاں ٹی پارٹی سے انقلاب شروع ہوا تھا۔ یعنی چائے کی پیالی سے طوفان واقعتاً اٹھ سکتا ہے۔ کچھ نشستوں کی گفتگو ابھی اور قابل ذکر ہے۔ جن سے اندازہ ہوجائے گا کہ 9/11 واقعی امریکی نفسیات پر اثر انداز ہورہا ہے۔

افغانستان کا امریکی تجربہ کیسا رہا؟

افغانستان سے اس پروگرام میں شرکت کے لیے شکریہ بارک زئی آئی ہوئی تھیں جو کابل سے خواتین کے لیے ایک ہفت روزہ ''آئینہ زن'' نکالتی ہیں۔ ایڈیٹر بھی ہیں مالک بھی اور افغانستان کا نیا آئین بنانے والے کمیشن کی رکن بھی ہیں۔ وہ ہر جگہ افغانستان کا مقدمہ بڑے خلوص اور شدت سے پیش کرتی تھیں۔ امریکیوں کو پریشانی بھی ہوتی تھی کیونکہ وہ افغانستان کو عراق کی نسبت ابھی تک ایک کامیاب کہانی کے طور پر پیش کررہے ہیں۔ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ ہو یا پینٹاگون، یا تھنک ٹینکس وغیرہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یہ حکام یہی وعدے کرتے تھے کہ ہم نے اسامہ بن لادن کو پناہ دینے والے طالبان کی حکومت ختم کردی، گیارہ ستمبر کے خوفناک واقعات کی ذمہ دار القاعدہ کی کمر توڑدی۔ اب ہم افغانستان میں ایسی سوسائٹی قائم کرنے والے ہیں جہاں سب کو اپنی مرضی سے حکمراں چننے کا اختیار ہوگا، جہاں خواتین بھی تعلیم حاصل کریں گی، مردوں کے شانہ بشانہ کام کریں گی جہاں امن ہوگا، سکون ہوگا۔

یہ سب باتیں سننے کے بعد جب شکریہ کی باری آتی تو وہ پہلے تو انکسار سے کام لیتے ہوئے یہ کہتیں کہ میری انگریزی کمزور ہے اس لیے ممکن ہے اظہار خیال بھرپور انداز سے نہ کرپاؤں۔

ان کا بنیادی استدلال یہ ہوتا تھا کہ امریکہ افغانستان سے کئے گئے وعدے پورے نہیں

کررہا ہے۔ اپنے تمام عہدو پیمان بھول چکا ہے۔ صرف کابل میں تھوڑی بہت سیکورٹی ہے۔ کابل سے باہر اور دوسرے صوبوں میں اسی طرح خطرات ہیں، لوگ مارے جارہے ہیں اکثریت دوسرے صوبوں میں سفر محفوظ نہیں سمجھتی۔ وہ ہر نشست میں یہ بھی کہتی تھیں کہ امریکہ وار لارڈز (جنگجو قبائل سرداروں) کو فنڈز فراہم کررہا ہے۔ یہی لوگ تو افغانستان میں خرابی حالات کے ذمہ داری ہیں۔ ہر دور میں ہر حکومت کے ساتھ مل کر یہ غریب افغانیوں پر ظلم ڈھاتے رہے ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہوتا تھا کہ اس طرح مرکزی حکومت کا دائرہ اختیار صرف کابل تک محدود ہوکر رہ جاتا ہے۔ امریکیوں کو وار لارڈز کی مدد نہیں کرنی چاہیے۔

امریکی حکام جنگی حوالے سے تو یہ کہتے تھے کہ ہمیں 9/11 کے بعد فوراً افغانستان میں کارروائی کرنا پڑی، ہم اس کے لیے پہلے سے تیار نہیں تھے، 11 ستمبر کو یہ واقعات ہوئے پھر اتنی تیزی سے حالات نے گردش کی سفارتی سرگرمیاں بھی بڑی سرعت سے بڑھیں۔ جنگی بیڑوں کو حرکت میں لاکر افغانستان کے قریب سمندر میں پہنچایا گیا۔ ہمارے اخبار نویس بھی افغانستان کے اندر نہیں جاسکتے تھے لیکن اس کے باوجود ہماری افواج نے کامیابی حاصل کی۔

اس پر ان سے کہا جاتا تھا کہ آپ جن کے تعاقب میں گئے تھے، وہ تو اسی طرح موجود ہیں۔ اسامہ بن لادن بھی اور ملا عمر بھی۔ ہم میں سے اکثر ان سے کہتے تھے کہ ہمارے ہاں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ امریکہ نے خود اسامہ بن لادن اور ملا عمر کو گرفتار نہیں کیا ہے وہ ان سے پھر کسی وقت کوئی کام لینا چاہتا ہے۔ بحث کے دوران 1980ء اور 1990ء کے عشرے بھی سامنے آتے تھے۔ ان سے جب یہ کہا جاتا کہ آپ نے کمیونزم کے مقابلے کے لیے عالم اسلام کے عسکریت پسندوں سے تعاون حاصل کیا۔ انہیں بی بی سی، سی این این، اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ اور پینٹا گون زبان چبا چبا کر مجاہدین کہتے تھے، اسلام سے ان کی گہری اور شدید محبت کو سب سے بڑا ہتھیار قرار دیا جاتا تھا اور یہی ظاہر کیا جاتا تھا کہ اس جذبے سے ہی کیمونزم کی عمارت زمیں بوس ہوجائے گی۔ اب یہی اسلامی جذبہ جب آپ کے خلاف جوش میں آرہا ہے آپ بھی تو غیر مسلم ہیں تو آپ اسے دہشت گردی کہنے لگ جاتے ہیں۔

اس کے جواب میں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی تھی۔ افغانستان میں امریکہ اپنے

وعدے پورے کرنے کے لیے کچھ نہیں کررہا ہے، کے جواب میں عام طور پر امریکی محکمہ خارجہ کی طرف سے یہ جواب دیئے جاتے تھے کہ امریکہ اور اتحادیوں نے افغانستان میں جتنا استحکام پیدا کیا ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ کئی برس سے اپنے گھروں کو چھوڑنے والے مہاجرین اب اپنے گھر واپس پہنچ رہے ہیں۔ یہ کہنا غلط ہے کہ امریکہ اپنا وعدہ پورا نہیں کررہا ہے۔ یہ ایک طویل سفر ہے۔ افغانستان میں مملکت کا پورا ڈھانچہ از سر نو تعمیر ہونا ہے، افغانستان کی اپنی کوئی فوج نہیں ہے، پولیس نہیں ہے، غیر ملکی فوجیں نہ تو ہمیشہ وہاں رہ سکتی ہیں اور نہ ہی یہ وہاں مقامی آبادی کے تعاون کے بغیر امن وامان قائم کرسکتی ہیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ اب تک پانچ ہزار افغانستانیوں کو باقاعدہ فوجی تربیت دے دی گئی ہے۔ افغانستان کی اپنی فوج کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ اسی طرح افغان نوجوانوں پر مشتمل اپنی پولیس فورس بھی تیار کی جارہی ہے۔ لڑکیوں کے لیے تعلیم کا آغاز بھی کیا جارہا ہے یہ بھی بتایا گیا کہ امریکہ پچھلی بار کی طرح افغانستان کو درمیان میں چھوڑ کر نہیں چلا جائے گا۔ اپنی طویل المیعاد حکمت عملی کے تحت اقتصادی سماجی اور سیاسی مسائل کو حل کرکے جائے گا۔

افغانستان کی ایڈیٹر امریکہ کی سست رفتاری پر سخت مایوس تھیں۔ وہ یہ خدشہ ظاہر کرتی تھیں کہ سماجی ترقی اگر درمیان میں رک گئی تو خانہ جنگی پھر شروع ہوسکتی ہے۔

امریکی حکام کہتے تھے کہ ہم پوست کی کاشت ختم کروا کے دوسری اہم زرعی فصلوں کی طرف توجہ مبذول کروانا چاہتے ہیں۔

سینیٹ کی غیر ملکی تعلقات کی کمیٹی کی بریفنگ میں یہ انکشاف ہوا کہ افغانستان کے بگڑتے ہوئے حالات کے پیش نظر سینیٹ کی طرف سے افغانستان کے لیے 3.3 بلین ڈالر کے پیکیج کی سفارش کی گئی لیکن امریکی انتظامیہ نے اتنے فنڈز افغانستان میں خرچ نہیں کئے ہیں۔ اس حوالے سے سینیٹ امریکی حکومت پر سخت تنقید کررہی ہے۔ سینیٹ کے متعلقہ ارکان یہ سمجھتے ہیں کہ افغانستان میں اقتصادی سرگرمیوں کو تیز تر کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

کانگریس کی بین الاقوامی تعلقات کی کمیٹی کی بریفنگ میں بھی یہی تاثر سامنے آیا کہ کانگریس کے متعلقہ نمائندے افغانستان ہوکر بھی آئے ہیں۔ انہوں نے بھی انتظامیہ سے کہا ہے

کہ امریکہ کو افغانستان میں جو کچھ کرنا چاہئے وہ نہیں کیا جارہا ہے اس سے زیادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ اگرچہ اس امر سے پورا اتفاق نہیں کرتے تھے کہ وار لارڈز کو فنڈز فراہم کئے جارہے ہیں لیکن وہ یہ ضرور کہتے تھے کہ امریکہ اور اتحادیوں کو افغانستان میں کسی ایک قبیلے یا ایک زبان بولنے والوں کو اہمیت نہیں دینا چاہئے۔ یہ بات بھی کسی حد تک تسلیم کی گئی کہ قندھار، مزار شریف اور ہرات کے علاقوں میں صورت حال تسلی بخش نہیں ہے۔

دہشت گردی کے خلاف اس عالمی مہم میں افغانستان امریکہ کا پہلا تجربہ ہے اور عام طور پر تاثر یہی ہے کہ امریکہ نے جو اعلیٰ مقاصد بیان کرکے اقوام متحدہ سے اور دوسرے ملکوں سے تعاون حاصل کیا تھا، انہیں اتحادی بنایا تھا ان مقاصد کو پوری طرح بلکہ کسی معقول حد تک حاصل کرنے سے پہلے ہی اس نے عراق پر چڑھائی کردی۔ اس لیے افغانستان کے اندر بھی اور دنیا میں بھی یہ تاثر پیدا ہوا ہے کہ افغانستان کو نظرانداز کردیا گیا ہے۔ گفتگو کے دوران امریکیوں سے بار بار یہ کہا جاتا تھا کہ اب جب آپ عراق میں بھی اپنے مقاصد حاصل نہیں کر پارہے، اپنے وعدے پورے نہیں کر پارہے، آپ کسی اور ملک پر حملہ کردیں گے تاکہ آپ کے شہری بھی افغانستان اور عراق کو بھول جائیں۔ اس نئے نشانے کے حوالے سے حب الوطنی کا اظہار شروع کردیں۔ امریکیوں کو بالعموم یہ احساس ہے کہ وہ افغانستان میں جمہوریت اتنی جلد متعارف نہیں کرواسکیں گے جو ان کا ٹائم فریم ورک تھا۔

پینٹاگون کے لیے افغانستان اور عراق فوجی مشقوں کی حیثیت رکھتے ہیں جہاں انہوں نے اپنی بری، بحری اور فضائی افواج کی اب تک کی تربیت، اپنے جدید ترین ہتھیاروں اور خاص طور پر ہائی ٹیک کے تجربے کئے ہیں وہ ان سے سبق سیکھ کر اپنی افواج کو نئے طریقے بھی بتانا چاہتے ہیں اور ہتھیاروں میں بھی تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں اس کے لیے باقاعدہ نیا شعبہ قائم کردیا گیا ہے، اس کا ذکر پہلے کرچکا ہوں آپ خود اندازہ کرلیں کہ امریکی محکمہ دفاع کے نزدیک افغانستان اور عراق میں بسنے والے جیتے جاگتے انسانوں، بچوں، عورتوں، بزرگوں کی کیا حیثیت ہے۔ امریکی فوجیوں کی ہلاکت کے امریکی شہریوں پر اثرات اور صدمے کا جائزہ تو لیا جاتا ہے لیکن افغانستان اور عراق میں جو بچے یتیم ہوگئے ہیں، جن ماؤں کے نوجوان لخت جگر لقمۂ اجل

بن گئے ہیں، جو بوڑھے باپ اپنے جوان سال بیٹوں کے سہارے سے محروم ہوگئے ہیں ان کے خاندان کیا محسوس کرتے ہیں، ان کے عزیز واقارب کس کرب سے گزرتے ہیں، ان معاشروں میں امریکی قوم کے خلاف کتنی نفرتیں پیدا ہورہی ہیں، اسے دور کرنے کے لیے کسی امریکی محکمے میں کوئی حکمت عملی ترتیب نہیں پا رہی ہے۔ یہ بھی نہیں سوچا جارہا ہے کہ یہاں بہنے والا خون زیادہ تر مسلمانوں کا ہے۔ اس خون کی سرخی دنیا بھر کے مسلمانوں میں کیا ذہنی طوفان برپا کررہی ہے، یہ بھی شاید امریکی سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں زیر غور نہیں ہے۔

افغانستان کے تجربے میں امریکی حکومتی حلقوں کے نزدیک قابل اعتماد امر یہ تھا کہ افغانستان اب دہشت گردوں کے لیے محفوظ جنت نہیں رہا ہے۔ اب ان کی ساری توجہ جدید اور جمہوری افغان مملکت کی تشکیل پر ہے۔ ایسی فوج تیار کی جارہی ہے جو اپنے علاقے کو مکمل طور پر خود کنٹرول کرسکے، ایسی پولیس کو تربیت دے رہے ہیں جو قانون کو یکساں طور پر نافذ کرسکے، ایسے جمہوری معاشرے کے قیام کے لیے کوششیں کی جارہی ہیں جو آس پاس کے ملکوں سے شدت پسندی کے داخلے کو روک سکے۔

افغانستان کی ایڈیٹر پاکستان پر بھی سخت تنقید کرتی تھیں ان کا کہنا تھا کہ پاکستان نے ہمیشہ افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی ہے، خاص طور پر طالبان پاکستان کی سرپرستی میں ہی طاقتور ہوئے انہوں نے افغانستان کی ترقی کو بھی روکا، پھر اسامہ بن لادن جیسی شخصیتوں کو پناہ دے کر افغانستان کے لیے مصائب پیدا کئے، لیکن دوران بحث یہ بات تسلیم کی جاتی تھی کہ اس وقت سیکورٹی کو جو خطرات ہیں طالبان کے دور میں عام شہری اس سے کہیں زیادہ محفوظ تھے۔

عام طور پر امریکی سرکاری حلقے افغانستان کے حوالے سے بون معاہدے کو ہی روڈ میپ سمجھتے تھے کہ اس پر عمل کرتے ہوئے ہی افغانستان استحکام کی طرف جاسکتا ہے، افغانیوں کو صبر کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ نے دہشت گردی کے مقابلے کے لئے ایک الگ خصوصی شعبہ قائم کردیا ہے جس کے سربراہ ایمبسڈر رجے کوفر ہیں انہیں اس وقت امریکہ میں بڑی اہمیت حاصل ہے ان کی اپنی سیکورٹی بھی بہت زیادہ کی جاتی ہے۔ افغانستان کے حوالے سے مختلف

سوالات کے جوابات میں انہوں نے جن امور کو اہمیت دی وہ کچھ اس طرح تھے کہ امریکہ اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر افغانستان سے طالبان کو نکالنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ القاعدہ نے اپنی خوفناک سرگرمیوں کے لیے طالبان حکومت کو استعمال کیا وہ سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ افغانستان میں تعمیر نو کا عمل شروع ہو چکا ہے، عوام کو سیاسی نمائندگی دینا بنیادی مقصد ہے، تعلیم کو فروغ ہو، افغانستان کے لوگ اپنی مرضی سے زندگی گزار سکیں۔ انہوں نے کہا یہ تاثر بالکل غلط ہے کہ ہم افغانستان کو نظر انداز کر رہے ہیں یا عراق میں ہم پھنس گئے ہیں، یہ پروپیگنڈہ ہے، ہم کہیں ناکام ہوئے ہیں اور نہ غافل ہوئے ہیں۔ دہشت گردوں اور بنیاد پرستوں کو جان لینا چاہئے کہ ہم تھکیں گے نہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ خود بھی افغانستان کا دورہ کرتے رہتے ہیں انہیں خوشی ہوتی ہے کہ جب بچوں کو اسکول جاتے دیکھتے ہیں۔ سڑکیں تعمیر ہو رہی ہیں ہم انسان ہیں جو کچھ کر سکتے ہیں کر رہے ہیں۔ یہ کہنا ناانصافی ہے کہ امریکہ سب کچھ نہیں کر رہا۔ انہوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ مرکزی حکومت کا طاقتور ہونا ہی ملک میں استحکام کی چابی ہو سکتی ہے لیکن یہ جو آپس کی خانہ جنگی ہے یہ امریکہ یا دوسرے ممالک کا مسئلہ نہیں ہے افغان عوام کو چاہئے کہ وہ ان مسائل کو خود حل کریں۔ قومی فوج تیار ہو رہی ہے وہ اپنی سرحدوں کی حفاظت کرے۔ پولیس امن وامان قائم کرے اس طرح صحت کے لیے بھی پروگرام اور منصوبے بنانا افغانیوں کا اپنا فرض ہے۔

بات تو یہ جہاندیدہ سفارت کار کی صحیح تھی لیکن اس کا کیا جائے کہ ساری تباہی بربادی امریکہ نے اس کے اتحادیوں نے کی۔ اقوام متحدہ بھی اس میں شامل تھی اب جب اس منتشر اور تاراج معاشرے کو یکجا کرنے کا وقت آ رہا ہے تو انہیں کہا جا رہا ہے کہ یہ ان کا اپنا فرض ہے۔ 17 اکتوبر کو امریکہ نے اسے اپنا فرض کیوں سمجھ لیا تھا۔

امریکہ میں اب یہ بھی محسوس کیا جا رہا ہے کہ افغانستان میں جدید جمہوری معاشرہ قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بون معاہدہ جب طے پا رہا تھا، اس وقت کے مقابلے میں اب حالات زیادہ خراب ہیں، وارلارڈز اپنی طاقتور ملیشیا دوبارہ تشکیل دے چکے ہیں۔ ابھی یقین نہیں ہے کہ لوئی جرگہ آئین وقت پر بنا سکے گا اور الیکشن ہو سکیں گے۔ امریکہ کو اپنی اتھارٹی قائم

رکھنے کے لیے جنگجو قبائلی سرداروں کو مدد دینا پڑ رہی ہے اور اس طرح وہ انہیں اپنے علاقوں میں جائز اور قانونی حاکم سمجھ رہا ہے۔

امریکی اخبار نویسوں کا یہ تجزیہ ہے کہ جس قومی فوج کی تشکیل اور تربیت کی بات کی جا رہی ہے، ضروری نہیں کہ وہ افغانستان کے صدر اور کابل کی مرکزی حکومت کی وفادار ہو۔ اس کے شمالی اتحاد اور وزیر دفاع جنرل فہیم کے حامی ہونے کے زیادہ امکانات ہیں اور اگر الیکشن ہوتے ہیں تو مختلف علاقوں میں اسی سیاسی قوت کی کامیابی کے امکانات ہوں گے جس کا وہاں عسکری غلبہ ہوگا اور جو اپنے مخالفین کو خوفزدہ کر سکے گی۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، کانگریس افغانستان کو زیادہ مالی امداد فراہم کرنے کے حق میں ہے۔ یہ امداد بڑھنی چاہئے اور اگر یہ جلد نہ کیا گیا۔ افغانستان ایک مملکت کی حیثیت حاصل کرنے میں ناکام ہوا تو خطرات بھی بڑھ جائیں گے اور قیمت بھی۔ اس وقت افغانیوں میں پھر یہ تاثر شدت اختیار کر رہا ہے کہ ہمیں اس طرح نظر انداز کیا جا رہا ہے جیسے روس کے خلاف جنگ جیتنے کے بعد کیا گیا تھا اور اب ایسی سوچ خطرناک ہے کیونکہ اس خلا کو پر کرنے کے لیے القاعدہ اور طالبان موجود ہیں۔ لیکن امریکہ میں ایسی سوچ بھی پائی جاتی ہے کہ اب تک ہم افغانیوں پر جو اربوں ڈالر خرچ کئے ہیں وہ بے نتیجہ رہے ہیں اس لیے مزید اربوں ڈالر خرچ کرنے سے کچھ حاصل بھی ہوگا یا نہیں۔

افغانستان کا تجربہ ہمارے ہمسائے میں کیا جا رہا ہے۔ اس تجربے کی آنچ ہم تک بھی پہنچتی ہے۔ پہلے بھی امریکہ کے 80 کے عشرے کے تجربے کے بھیانک نتائج پاکستان بھگت چکا ہے اس لیے پاکستانی حکومت معاشرے کو ان سوچوں، منصوبوں اور محسوسات سے خبردار رہنا چاہئے جو افغانستان کے عوام میں امریکہ کے حوالے سے پیدا ہو رہے ہیں۔

کیا صدر بش 2004ء کا الیکشن جیت جائیں گے؟

شہری آزادیاں جب اس حد تک متاثر ہو رہی ہیں۔
معیشت میں خسارہ بڑھ رہا ہے۔
دنیا میں امریکہ سے نفرت بڑھ رہی ہے۔

تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امریکی معاشرے کی روایات کو مسخ کرنے والے، شہری آزادیاں سلب کرنے والے، خفیہ ایجنسیوں کا عملہ بڑھانے والے امریکی صدر جارج بش کیا دوبارہ الیکشن جیت جائیں گے۔

امریکی دارالحکومت کے مختلف دفاتر، اقتدار کے ایوانوں میں کچھ ایسی بے بسی دکھائی دیتی ہے جیسے صدر جارج بش کو منتخب کرنے کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔ ماہرین، سرکاری افسر، اخبار نویس یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ وہ صدر ہیں جنہیں بین الاقوامی امور کا کوئی تجربہ نہیں تھا، مطالعے کا شوق نہیں تھا، اہم ممالک کے دورے بھی نہیں کئے تھے اور اب انہوں نے نئے نئے قدامت پسندوں میں گھر کر ایسے فیصلے کئے ہیں کہ امریکہ میں شہری آزادیاں سلب کرنے کے لیے ایسے نئے قوانین وضع کئے جارہے ہیں، جس سے انسانی حقوق بھی متاثر ہورہے ہیں لیکن جب ان سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا ان پابندیوں سے 2004ء کے صدارتی انتخاب پر اثر پڑے گا تو وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کا جواب اتنا

آسان نہیں ہے کیونکہ صورتحال بہت پیچیدہ ہے، تجزیہ کرنا اتنا سہل نہیں ہے، اپوزیشن بہت زیادہ مغلوب ہے۔ پھر ان کے پاس کوئی ایسا غیر معمولی لیڈر بھی نہیں ہے جو اپنی قد آور شخصیت یا کرشمہ سازی سے حالات کو پلٹ سکے۔

صدر جارج بش جس راہ پر چل رہے ہیں اسے نئی قدامت پسندی بھی کہا جاسکتا ہے، فسطائیت بھی، شخصی حکومت بھی، آمریت بھی، یہ کسی طرح بھی ایک آزاد جمہوری، انسانی حقوق کے محافظ مملکت کے صدر والا راستہ نہیں ہے۔ چھوٹے ملکوں اور مسلمانوں کے ساتھ تو خیر امریکہ کا رویہ یہی رہا ہے کسی بھی امریکی صدر کو فلسطینیوں سے محبت نہیں رہی ہے، کسی نے اسرائیل کو اپنے مظالم سے نہیں روکا ہے، کسی نے بھارت کو کشمیریوں پر ستم ڈھانے سے منع نہیں کیا لیکن موجودہ امریکی صدر ان معاملات میں شدت اختیار کرگئے ہیں۔ اسرائیل سے عشق مزید تیز ہوگیا ہے، بھارت سے پینگیں بڑھائی جارہی ہیں، لیکن یہ صدر اندرون ملک معاملات میں آگے نکل گئے ہیں۔ دہشت گردی کے خاتمے کی عالمی مہم کے نام پر انہوں نے جو پالیسی اختیار کی ہے اس میں یہ اپنے پیشرو صدور سے بہت مختلف ہوگئے ہیں۔

صدر بش نے بڑے پیمانے پر تباہی کے جس ہتھیار سے اپنی اندرون ملک اور بیرون ملک فتوحات کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ وہ ہے حب الوطنی۔ امریکہ کے اندر اسے ملک سے، امریکی روایات سے، وطن سے محبت اور وابستگی کا نام دیا جارہا ہے۔ دنیا میں اس پر امریکی مفادات کے تحفظ کا لیبل لگایا جارہا ہے اور یہ نسخہ کارگر ہے۔ امریکی جواں سال فوجی اپنی جان نثار کرنے کے لیے بھی تیار ہیں۔ ہم یہاں ہر چند کہیں کہ امریکیوں کی لاشیں جب امریکہ زیادہ پہنچنے لگیں گی تو وہاں رائے عامہ بدل جائے گی اور صدر بش پر تنقید شدت پکڑ لے گی۔ حب الوطنی اور عظیم تر امریکی مفاد کو رائے عامہ کے جسم میں پھیلانے کے لیے امریکی انتظامیہ انتہائی محتاط اور گہری منصوبہ بندی کے ذریعے آگے بڑھ رہی ہے۔ قانون سازی بھی ہورہی ہے پھر ان نئے محکموں اور اداروں کو متحرک رکھنے کے لیے وفاقی شخصیتیں ملک گیر دورے بھی کررہی ہیں۔ پیٹریاٹ ایکٹ پر تو آپ سے تفصیل سے بات ہوچکی ہے۔ اٹارنی جنرل اس کے لیے امریکی عوام کو قائل کرنے پر نکلے ہوئے ہیں۔ اخبارات، ٹی وی چینل ایسے عوامی جائزے پیش کرتے

ہیں جس سے امریکی عوام کے ذہنوں میں یہ بات بار بار ڈالی جاتی ہے کہ اگر یہ پابندیاں نہیں ہوں گی تو کسی وقت بھی کچھ ہوسکتا ہے۔ نائب صدر ڈک چینی، وزیر دفاع رونالڈ رمسفیلڈ اور نیشنل سیکورٹی کونسل کی سربراہ سیاہ فام کونڈالیزا'' امریکی انتظامیہ کو بھی چلا رہے ہیں اور صدر بش کو بھی۔ صدر بش انتہائی خلوص، ذمہ داری سے اور ایک فرمانبردار افسر کی طرح اس مثلث کی ترتیب دی ہوئی حکمت عملی پر عملدرآمد کروانے کے لیے اپنے صدارتی منصب کا استعمال کر رہے ہیں۔ ان کے ریڈیو سے خطاب، مختلف مقامات پر ان کی تقریریں امریکی عوام کو بار بار یہ احساس دلاتی ہیں کہ 11 ستمبر کا خوفناک دن کتنی تباہی لایا تھا اور پھر دوبارہ بھی ایسا ہوسکتا ہے۔ تجزیہ نگاروں کا یہ کہنا ہے اور یہ بات درست بھی لگتی ہے کہ صدر بش ایک بے یقینی کی کیفیت مسلسل پیدا رکھنا چاہتے ہیں تاکہ امریکی ووٹرز ایک خوف میں مبتلا رہیں اور انہیں یہ اندیشہ لاحق رہے کہ ایسے ہنگامی دور میں قیادت کی تبدیلی سے انارکی پیدا ہوجائے گی۔ وہ نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو موجودہ قیادت کے ہاتھوں میں ہی محفوظ سمجھتے ہیں۔ اپنی قیادت کو بہت زیادہ الرٹ اور امریکی عوام کے تحفظ کے لیے بہت زیادہ اقدامات کرنے والی حکومت کا تاثر قائم کرنے میں یقیناً یہ امریکی انتظامیہ کامیاب رہی ہے۔ سیکورٹی کے نام پر جو نئے قوانین بنائے گئے، نئے ادارے تشکیل دیئے گئے جس کا مظاہرہ مختلف مقامات، ایئرپورٹوں، ریلوے اسٹیشنوں، شاپنگ سینٹروں میں ہوتا ہے اس سے گھبراہٹ کے ساتھ ساتھ خوف بھی پیدا ہوتا ہے، لیکن اس سے کہیں زیادہ یہ احساس ابھرتا ہے کہ حکومت کو ممکنہ خطرات کا ادراک ہے اور وہ ایسے اقدامات کررہی ہے جس سے یہ یقین ہو کہ آئندہ ایسے واقعات نہیں ہوسکیں گے۔ ہوم لینڈ سیکورٹی کا محکمہ پہلے سے موجود تھا لیکن اس کا دائرہ کار بڑھادیا گیا ہے۔ اب فائر بریگیڈ، پولیس، ریڈ کراس، اسپتال، فراہمی آب کے محکموں کو اس حوالے سے تربیت دی گئی ہے اور باقاعدہ قانون کے تحت تحفظ ماحولیات کے ادارے کو ہوم لینڈ سیکورٹی کی تحویل میں دیا گیا ہے۔ پانی کی فراہمی اور ایسی عمارتیں جہاں عوام کی بڑی تعداد آتی جاتی ہے، اسی طرح دوسرے اداروں کی مانیٹرنگ اس حوالے سے بھی کی جارہی ہے کہ دہشت گرد اپنی وارداتوں کے لیے انہیں استعمال نہ کریں۔ دریاؤں کے پانی میں کچھ ملاوٹ نہ کردی جائے، ہمیں سنسناٹی میں پینے کے پانی کی مسلسل جانچ

پڑتال کرنے والے ادارے میں بھی لے جایا گیا۔ کسی بھی ہنگامی صورتحال سے نمٹنے کے لیے یونیورسٹیوں کے طلباء و طالبات کو تربیت دی جارہی ہے، خون جمع کیا جارہا ہے، ہوم لینڈ سیکورٹی مختلف اداروں کے درمیان رابطہ بنی ہوئی ہے۔ ریڈکراس کے دفتر میں ہمیں یہ بتایا گیا کہ ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے ایسے رضا کاروں کی فہرستیں تیار کرلی گئی ہیں جو ایک گھنٹے کے نوٹس پر حاضر ہوجائیں گے۔ یہ انتظام بھی ہے کہ 24 گھنٹے میں پانچ ہزار افراد تک کے لیے کھانا فراہم کیا جاسکے۔ عوام کو باخبر رکھنے کے لیے سائرن سسٹم اور دوسرے اہتمام کئے گئے ہیں۔ ایسے اقدامات سے امریکی عوام کے ذہنوں میں یہ خیال واضح ہورہا ہے کہ موجودہ امریکی انتظامیہ ہی ملک کو دہشت گردی کے مقابلے میں محفوظ رکھ سکتی ہے۔ 11 ستمبر کی دہشت گردی میں ایئر پورٹ اور طیارے استعمال ہوئے تھے اس لیے امریکہ کے 429 کمرشل ایئرپورٹوں اور 1100 جدید ترین اسکریننگ مشینیں نصب کردی گئی ہیں پچاس ہزار اسکریزز بھرتی کئے گئے ہیں۔ تجارتی پروازیں میں تقریباً 4 ہزار ایئر مارشل سفر کرتے ہیں۔ امریکی کانگریس کی ایک کمیٹی نے 335 ملین ڈالر کے اخراجات کی سفارش کی ہے۔ اب ان ایئرپورٹوں کی سیکورٹی فیڈرل حکومت نے سنبھال لی ہے۔ اسکرین کرنے والی ایک مشین 'ایگزامیز' کی قیمت 12 لاکھ ڈالر ہے۔ ہمیں بوسٹن ایئرپورٹ پر ان خفیہ زیر زمین کمروں میں بھی لے جایا گیا وہاں خواتین اور مرد اسکریزز کمپیوٹر پر سامان کا ایکسرے دیکھ رہے تھے۔ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ میں Counter terrorism کا باقاعدہ شعبہ قائم ہے جو دہشت گردی کی روک تھام کے لیے دوسرے ملکوں سے تعاون حاصل کرنے پر مامور ہے۔

اقتصادی شعبے میں بھی اسی طرح جائزے لیے جارہے ہیں۔ موجودہ حکومت کے ماہرین نے یہ استدلال اختیار کی ہے کہ 11 ستمبر 2001ء سے پہلے معیشت کی رفتار سست ہورہی تھی لیکن 11 ستمبر کے بعد معیشت متحرک ہوئی ہے، دفاعی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے، عوام میں بھی خریداری کے رجحانات پیدا ہوئے ہیں۔ ان تمام نئے قوانین، نئے اقدامات اور نئے اداروں کے قیام سے صدر جارج بش اور ان کی انتظامیہ عوام کو یہ باور کروانے میں یقیناً اب تک کامیاب رہی ہے کہ امریکی قیادت ہمہ وقت الرٹ ہے اور وہ امریکہ کو دہشت گردی سے محفوظ

رکھنے کے لیے جو کچھ بھی ضروری ہے کر رہی ہے، ان اقدامات کو ذرائع ابلاغ سے اتنا زیادہ پیش کیا جا رہا ہے کہ دوسری آوازیں دب کر رہ جاتی ہیں۔ بعض حلقے جو صدر جارج بش کے انتخابات سے پہلے اور بعد میں ان کے مخالف تھے وہ بھی اب ان کے حامی ہیں۔ بوسٹن میں ایک بھری میٹنگ میں ایک سینئر وکیل نے جو ڈیموکریٹک پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں اس کے باوجود انہوں نے کہا کہ وہ صدر جارج بش کو ہی دوبارہ منتخب دیکھنا چاہیں گے۔ سیاسی ماہرین اور تجزیہ نگار بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ ڈیموکریٹس ابھی تک عوام کو 11 ستمبر کے سحر سے نکالنے کی ہمت نہیں پا رہے ہیں اگرچہ وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ عوام زیادہ دیر تک اصل مسائل سے انحراف برداشت نہیں کریں گے، لیکن وہ اس سلسلے میں پرامید نہیں ہیں کہ وہ صدارتی انتخاب جیت سکیں گے۔

یہ باتیں بھی سننے میں آئیں کہ اگلے سال حکمراں ری پبلکن پارٹی 11 ستمبر کو زیادہ ڈرامائی طور پر استعمال کرے گی، آئندہ سال پارٹی قومی کنونشن کچھ تاخیر سے منعقد کیا جائے گا۔ اس کا اہتمام 11 ستمبر 2001ء کی جائے واردات کے نزدیک مین ہٹن میں کیا جا رہا ہے۔ حکمراں حلقوں میں یہ ذکر ہو رہا تھا کہ کنونشن کو 2004ء میں 30 اگست سے 2 ستمبر کے درمیان کیا جائے تا کہ کنونشن کے بعد کی جو روایتی مقبولیت ہوتی ہے اسی کے شور میں 11 ستمبر کے واقعات کی تیسری برسی آ جائے۔

اس اعتبار سے 2004ء امریکی شہریوں کے لیے ہی نہیں دنیا اور بالخصوص پاکستان کے لیے بھی ایک حساس اور اہم سال ہوگا۔ امریکی پارٹی 11 ستمبر 2001ء کو اپنے دوبارہ انتخاب کے لیے جواز بنانا چاہتی ہے۔ ڈیموکریٹس اس سیاسی مہم کو شرمناک اور سفاک سیاست بھی کہتے ہیں، لیکن دیکھنا یہی ہوگا کہ وہ ان امریکی ووٹرز کو قائل کر سکتے ہیں یا نہیں جنہیں ہر روز ذرائع ابلاغ کسی نئی تصوراتی دہشت گردی سے خوفزدہ کرتے رہتے ہیں۔

9/11........امریکہ، اسلام اور مسلمان

برسوں پہلے بچپن میں اپنے اسکول کی کاپیوں کے پیچھے ایک نظم میں یہ شعر پڑھتے تھے۔

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

اس کا عملی مظاہرہ امریکہ میں دیکھنے میں آ رہا ہے۔ 9/11 کے بعد امریکی انتظامیہ، متعصب عیسائیوں، جنونی امریکیوں کے زبانی اور عملی حملوں کا نشانہ اسلام بن گیا تھا۔ بہت کچھ کہا گیا، بہت کچھ سنا گیا، بہت کچھ لکھا گیا۔ گیارہ ستمبر 2001ء کے فوراً بعد تو مسلمانوں کے لیے امریکہ میں جینا دوبھر کر دیا گیا تھا۔ اس معاشرے میں جہاں شہری آزادیاں مثالی تھیں، جہاں سیاسی، مذہبی ہر قسم کے حقوق حاصل تھے، وہاں ہائی جیکرز اور دہشت گردوں کا تعلق اتنی شدت سے مسلمانوں سے جوڑا گیا کہ دوسرے مذاہب کے ماننے والے امریکیوں کی آنکھوں میں مسلمانوں کے خلاف خون اتر آیا۔ برسوں سے اکٹھے رہنے والے، کام کرنے والے، مذہب کی بنیاد پر ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے۔ ذرائع ابلاغ سے اسلام کے خلاف ایک مہم شروع کر دی گئی، لیکن حقیقت میں کیا ہوا کہ امریکہ کے سنجیدہ اور مدبر حلقوں میں اسلام کو زیادہ جاننے اور پڑھنے کی خواہش زور پکڑتی گئی۔ صرف سینئر شہریوں میں ہی نہیں اسکولوں کے بچوں میں بھی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں تجسس بڑھتا گیا۔ بعض ٹی وی چینلوں، اخباروں اور رسالوں

[illegible] یہ باتیں دیکھی اور پڑھی ہی تھیں لیکن اس سلسلے میں زیادہ ٹھوس بات اوہائیو کے چھوٹے سے پانچ چھ ہزار نفوس پر مشتمل ایک قصبے ہیرسن کی سٹی کونسل میں سننے میں آئی۔ جہاں محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر نے یہ کہا کہ 11 ستمبر 2001ء کے فوراً بعد اسکول کے بچوں نے یہ سوالات کئے کہ یہ مسلمان کون لوگ ہیں، یہ کیوں اس طرح اپنی جانیں دے رہے ہیں، ان کا مذہب کتنا پرانا ہے، ان کی تاریخ کیا ہے، یہ کہاں کہاں رہتے ہیں۔

جب ان ڈائریکٹر سے پوچھا گیا کہ آپ نے ان معصوم امریکی بچوں کے ذہنوں میں ابھرتے سوالات کے جوابات فراہم کرنے کا کیا انتظام کیا ہے، اس کو اب دو سال گزرنے والے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ اسکولوں کا سلیبس ریاستی حکومت بناتی ہے آپ نے بچوں کے یہ سوالات ریاستی حکومت تک پہنچائے، ان کا جواب نفی میں تھا کیونکہ نصاب میں ہر چھ سال بعد تبدیلی کی جاتی ہے۔ اس سے پہلے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ گریڈ 12 تک کے طالب علموں کی بات تھی۔ ہم نے بعد میں جائزہ لیا تو صرف یہ اسی شہر کا مسئلہ نہیں ہے۔ ریاستیں الگ الگ سلیبس تیار کرتی ہیں۔ نصاب میں تبدیلی کے علاوہ بھی امریکی بچوں کے اس تجسس کو دور کرنے کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ البتہ اعلیٰ تعلیمی سطح پر اسلام کے بارے میں تحقیق کی جا رہی ہے۔

ہمیں سب سے زیادہ خوشی اس وقت ہوتی تھی جب بڑی دکانوں میں Best Sellers یعنی سب سے زیادہ بکنے والی کتابوں میں اسلام سے متعلق تصنیفات نمایاں رکھی ہوئی ملتی تھیں۔ ہر بک اسٹور میں اسلام سے متعلق الگ حصہ مخصوص کیا گیا ہے اور وہاں کافی کتابیں دستیاب ہیں، انہی دکانوں سے معلوم ہوا اگر اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی آخری کتاب قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ لاکھوں کی تعداد میں خریدا گیا ہے اس کی مزید مانگ ہے۔ یہ کیفیت ہر شہر میں نظر آئی۔۔ واشنگٹن میں مرکزی ریلوے اسٹیشن، یونین اسٹیشن پر کتابوں کی بہت بڑی دکان ہے، وہاں بھی اسلام پر سیکشن تھا۔ سنسناٹی، بوسٹن، نیویارک میں تمام مشہور بک اسٹورز پر یہی عالم تھا۔ ٹورنٹو کینیڈا میں ورلڈ بکسٹ بک اسٹور (دنیا کی سب بڑی کتابی دکان) میں تو کتابوں کی تعداد اور زیادہ تھی۔ اسلام پر کتابوں کی مانگ چونکہ بڑھ رہی ہے اس لیے مارکیٹنگ کے نقطۂ نظر سے اکثر مصنفین کو

اسلام پر اتھارٹی بھی قرار دیا جا رہا ہے۔ کتابیں فروخت کرنے کے لیے یہ بتایا جاتا ہے کہ اس مصنف کو مسلمانوں نے بھی مستند تسلیم کیا ہے۔ ”جہاد“ کے بارے میں بھی متعدد کتابیں مارکیٹ میں آ گئی ہیں، بعض پرانی کتابوں کے نئے ایڈیشن 9/11 کے بعد لائے گئے لیکن یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ کوششیں یکطرفہ ہیں۔ یہ زیادہ تر غیر مسلموں کی تصنیفات ہیں۔ عالم اسلام کے اسکالرز کی کتابیں بہت کم ملتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی ہو سکتی ہے کہ امریکی قارئین کے نقطۂ نظر سے مسلم اسکالرز کتابیں نہیں لکھتے یا وہ تدریسی نوعیت کی ہوتی ہیں، عام فہم نہیں ہوتیں، اس لیے عام امریکی قارئین کی نظر میں اہمیت نہیں پاتیں۔ ایک پاکستانی نژاد امریکی نوجوان خاتون اسماء گل کی تصنیف 'امریکی مسلمان' 9/11 سے پہلے لکھی گئی تھی جس میں ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی گئی تھی کہ امریکہ میں رہتے ہوئے مسلمان اپنی تعلیمات، اقدار اور شعائر کی کیسے پابندی کر سکتے ہیں۔ دوسرے مذاہب کے ماننے والے امریکی مسلمانوں کی روایات اور عبادات کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ نماز، حج، روزہ، طلاق، چار شادیوں کے بارے میں امریکی بچے، عورتیں جو جاننا چاہتے ہیں ان کے جوابات اس کتاب میں موثر انداز میں دیئے گئے تھے۔ مصنفہ چونکہ امریکہ میں ہی پلی بڑھی ہیں اس لیے یہ بہتر انداز میں امریکیوں کے جوابات دے سکتی ہیں۔ یہ خوشی ہوئی کہ 11 ستمبر کے بعد اس کتاب کا نیا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے۔

بوسٹن میں شہرہ آفاق یونیورسٹی ہارورڈ میں ہمیں ”دی پلورل ازم پروجیکٹ“ میں خصوصی طور پر لے جایا گیا۔ ”پلورل ازم“ کا عربی لغت میں ترجمہ ”تعدد“ مل رہا ہے۔ اردو میں ”کثرتیت“ امریکہ میں جب مختلف مذاہب سے رکھنے والے تارکین وطن کی تعداد بڑھتی گئی تو ان مذاہب کے ایک دوسرے پر اثرات کا جائزہ لینے کے لیے تحقیق اور مطالعہ شروع کیا گیا۔ مرکزی دفتر تک پہنچتے پہنچتے ہم نے کئی کلاس روم دیکھے۔ کہیں کرسچین اسٹڈیز درج تھا، کہیں جیواش، بدھ مت، مسلم، جین، مرکزی دفتر میں جہاں خاتون ڈائریکٹر تشریف رکھتی تھیں وہاں مختلف کتابیں اور رسائل کی جلدیں بھی تھیں جو مختلف مذاہب سے متعلقہ ادارے شائع کر رہے ہیں۔ اس منصوبے کی بنیاد ڈیانا ایل ایک نے رکھی تھی جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ امریکہ میں تمام مذاہب سے متعلقہ معلومات یکجا کی جائیں۔ مشاہدہ یہ تھا کہ امریکہ کا مذہبی منظر نامہ تیزی سے تبدیل

ہو رہا ہے، اب صرف کلیسا ہی نہیں، خوبصورت مساجد کے مینار نظر آ رہے ہیں۔ ہندوؤں کے مندر بھی ہیں، سکھوں کے گردوارے ہیں، بدھ مت، جین مت اور زرتشت سبھی ہیں، اس وقت توجہ اسلام پر ہے۔ ڈائریکٹر صاحب کا کہنا یہ تھا کہ ہم اپنے طالب علموں، محققوں کی رہنمائی اس طرح کرتے ہیں کہ انہیں ویب سائٹ کا پتہ بتاتے ہیں۔ مختلف یونیورسٹیوں میں ہونے والی تحقیق کے موضوعات بتاتے ہیں امریکی اخبارات ورسائل سے متعلقہ تراشے پیش کرتے ہیں۔
9/11 کے بعد بنیادی کوشش یہ کی جارہی ہے کہ ایک دوسرے کے مذہب کے بارے میں تفصیلات بتا کر ان میں رواداری، تحمل اور برداشت پیدا کی جائے۔ ایک مذہب کے ماننے والوں میں دوسرے مذہب کے بارے میں غلط فہمیاں دور کی جائیں۔

آج کل امریکہ میں اسلام، عیسائیت اور صیہونیت کو قریب لانے کے لیے خاص طور پر یہ اصطلاح استعمال کی جارہی ہے۔ ''ابراہیمی مذہب'' یہ کہا جاتا ہے کہ یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ماننے والوں کے مذاہب ہیں، اس لیے یہ غلط فہمیاں دور کرکے ایک دوسرے کے نزدیک آسکتے ہیں۔ پلورل ازم (کثرتیت) کے منصوبے کی بنیاد رکھنے والی خاتون ڈیانا ایل ایک نے اہم کتاب تصنیف کی ہے۔ New Religious America (ایک نیا مذہبی امریکہ) جس میں انہوں نے یہ مطالعہ کیا ہے کہ ایک عیسائی ملک کس طرح دنیا کی سب سے زیادہ متنوع مذہبی ریاست بن گیا۔ مسلمانوں کی اہمیت کو اس وقت پارلیمانی طور پر تسلیم کیا گیا جب 25 جون 1991ء کو امریکی ایوان نمائندگان میں بروکلن کی مسجد تقویٰ کے امام سراج وہاج نے قرآن پاک کی تلاوت کی اور سورہ الحجرات کی یہ آیات پڑھیں۔ اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔ اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو، بلاشبہ اللہ خوب جاننے والا باخبر ہے۔'' مصنفہ نے اسلامی تنظیموں سے براہ راست ملاقاتوں، اسلامی ممالک کے دوروں سے تازہ ترین معلومات حاصل کرکے درج کی ہیں۔ دین مبین اسلام کے علاوہ امریکہ میں ہندوؤں اور دوسرے مذاہب کا بھی تفصیلی جائزہ لیا گیا اور اختتام کثیر المذاہبی امریکہ پر کیا گیا جس میں ان مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان پل تعمیر کرنے کی خواہش ظاہر

کی گئی ہے۔ مختلف شہروں میں ذرائع ابلاغ کے ماہرین کانگریس، سینٹ کے اراکین اور دوسرے حلقوں سے گفتگو سے جو معلومات حاصل ہوئیں، اس سے مجھے تو بہت خوشی اور اعتماد حاصل ہوا کہ امریکہ میں مسلمانوں نے اپنے مذہب کا صحیح تصور بحال کرنے کے لیے بہت ہمت اور جرأت سے کام لیا ہے۔ مختلف امریکی شہروں میں اسلامک سینٹرز کے منتظمین، اماموں اور کمیٹیوں کے ارکان نے اجتماعی کوششوں کے ذریعے اسلام کے خلاف پھیلائی گئی غلط فہمیوں کو دور کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان مراکز میں اوپن ہاؤس منعقد کیے گئے۔ پہلے تو یہ جان لیجئے کہ امریکی شہروں میں قائم مساجد ہمارے ہاں کی مساجد کی نسبت زیادہ مرکزی کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ صرف نماز کی ادائیگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ یہ مسلمانوں کے لیے مرکزی ادارہ ہیں جہاں وہ پانچ وقت اللہ تعالیٰ کے حضور سر بھی جھکاتے ہیں، نماز کا فرض ادا کرتے ہیں، یہاں قرآن پاک کی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور اسلام کے بارے میں مزید تدریس کا اہتمام بھی ہے۔ کئی مراکز میں طالب علموں کے لیے گریڈ 12 تک تعلیم کے انتظامات ہیں۔ اندرون خانہ کھیلوں کے لیے جمنازیم بھی ہیں امریکہ میں رہتے ہوئے اسلامی طرز زندگی سے متصادم امور سے جو سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کا جواب بھی دیا جاتا ہے۔ غیر مسلم اگر اسلام سے دلچسپی ظاہر کرتے ہیں تو ان کے رہن سہن، انداز فکر کے اعتبار سے سوالات کے جوابات بھی پمفلٹوں کی شکل میں موجود ہیں۔، ویب سائٹس ہیں، ای میل کے ذریعے بھی اپنی پیاس بجھائی جاسکتی ہے۔ اسلام کیا ہے، مسلمان کون ہیں، مسلمانوں کے عقائد کیا ہیں، اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کس لیے اتارے، آخرت کا تصور کیا ہے، آج کے مسائل کا حل اسلام میں کس طرح دیا گیا ہے، ایسے سوالات عام طور پر اٹھائے جاتے ہیں اس لیے ان کے جوابات تحقیق کے بعد تیار کیے گئے ہیں۔ واشنگٹن میں سعودی عرب کے سفارت خانے کی طرف سے بھی انگریزی میں ایک خوبصورت کتابچہ تقسیم کیا گیا ہے۔ ''اسلام اور مسلمانوں کی تفہیم'' جس میں بتایا جاتا ہے کہ مسلمان کس طرح بنا جاسکتا ہے۔ اسلام مختلف کیوں لگتا ہے، کیا اسلام اور عیسائیت کے ماخذ مختلف ہیں۔ اشاعت اسلام سے دنیا پر کیا اثرات مرتب ہوئے، اسلام کے ستون۔ کیا اسلام دوسرے عقائد کو برداشت کرتا ہے۔ مسلمان حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں کیا سوچتے ہیں، اسی طرح یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ

اسلام میں خواتین کے حقوق کیا ہیں۔

بوسٹن کے اسلامی مرکز میں ہماری ملاقات امام بسیونی نحیلہ سے ہوئی جو مصری نژاد ہیں۔ الازہر سے فارغ التحصیل ۔ یہ اسلامی مرکز ابھی پرانی عمارت میں ہے لیکن کچھ ہی عرصے بعد یہ نئے کمپلیکس میں منتقل ہوجائے گا جو اس وقت زیر تعمیر ہے۔ بوسٹن میں 70 ہزار مسلمان ہیں۔ ہر نماز میں اس مرکز میں 100 کے قریب نمازی ہوتے ہیں، جمعہ کو تعداد ایک ہزار کے قریب ہوجاتی ہے۔ خواتین کے لیے بھی لیکچر ہوتے ہیں۔ 9/11 کے بعد کچھ واقعات ہوئے ہیں لیکن پولیس بروقت پہنچ گئی تھی اس کے بعد سے پولیس مستقل پہرہ دے رہی ہے، میں سوچ رہا تھا کہ ہم امریکیوں سے کیا گلہ کریں، ہمارے اپنے مسلمانوں کی اکثریت والے ملک میں بھی نمازیں پولیس کے پہرے میں پڑھی جاتی ہیں۔ بوسٹن کے امام نے اپنے اس مرکز کے بارے میں جس طرح مسلمانوں کے اجتماعات کا بتایا امریکہ بھر میں اسلامی مراکز میں اسی طرح اہتمام ہوتے ہیں۔ 11 ستمبر کے بعد اسلام کے تصور کو اجاگر کرنے کے لیے اوپن ہاؤس منعقد کئے گئے جس میں تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے سرکاری حکام، اسکالرز، تاجروں وغیرہ کو مدعو کیا گیا، انہیں مسلمانوں سے طالب علموں سے ملنے، تبادلہ خیال اور سوال جواب کا موقع دیا گیا، امریکہ بھر کے اسلامی مراکز کے علاوہ کینیڈا میں بھی ایسے اجتماعات بہت نتیجہ خیز رہے ہیں۔

مسلم امریکن سوسائٹی ایک ماہنامہ ''امریکی مسلم'' شائع کرتی ہے جس میں ان تمام اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے جو مختلف غیر مسلم مصنف سیاستداں اسلام کے بارے میں اٹھاتے رہتے ہیں۔ جن میں اسلام پر ایک رجعت پسند، بنیاد پرست اور جدید روشن خیالی سے عاری مذہب ہونے کے الزامات عائد کئے جاتے ہیں۔

امریکی مسلمانوں کو یقیناً بہت سنگین چیلنج درپیش ہیں۔ ایک طرف انہیں اس معاشرے میں اپنی حیثیت برقرار رکھنا ہے، اپنے دینی فرائض کو ادا کرنا ہے، حلال حرام میں امتیاز کرنا ہے، دوسری طرف غیر مسلموں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈے کا جواب بھی دینا ہے۔ اس سلسلے میں مسلم ممالک ، اسلامی ملکوں کی تنظیم، مسلم ممالک کے سفارت خانے کیا کررہے ہیں، کچھ نہ کچھ کررہے ہوں گے لیکن امریکی مسلمان مطمئن نہیں ہیں جس طرح

مسلمانوں کے خلاف دباؤ بڑھا ہے، مہمیں چلائی گئی ہیں، مسلمان بھی کسی بھی ملک سے تعلق رکھتے ہیں، کسی رنگ کے ہیں، کوئی زبان بولتے ہیں، انہیں بحیثیت مسلمان ہدف بنایا گیا۔ معاشرے میں ان پر تنقید بحیثیت مسلمان ہوئی تو مسلم امہ کو بھی یہاں اجتماعی حیثیت سے اس کا جواب دینے کے لیے یہاں کے اسلامی مراکز کو مالی، علمی اور فکری طور پر امداد فراہم کرنا چاہئے تھی۔ مسلمانوں کے پاس کوئی موثر میڈیا نہیں ہے جو امریکی ذرائع ابلاغ کے پروپیگنڈے کا جواب دے سکے۔ دنیا میں جب کہیں بھی کوئی دہشت گردی کا ایسا واقعہ رونما ہوتا ہے جس میں امریکی شہریوں، سفارت خانے، طیاروں یا بحری جہازوں کو ہدف بنایا جاتا ہے تو امریکہ میں رہائش پذیر مسلمانوں کے خلاف نفرت کا سیلاب امڈ جاتا ہے۔ یہ امر بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ یہودی امریکہ میں تعداد میں اگرچہ کم ہیں لیکن وہ مالی اعتبار سے بہت طاقتور ہیں اس لیے وہ میڈیا، تھنک ٹینکوں اور دوسرے ذرائع سے اسلام کا تصور مسخ کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ دوسری طرف بعض ایسے مسلمان ادارے، تنظیمیں جو غیر مسلموں کے بارے میں سخت بیانات دیتے ہیں، دھمکیاں دیتے ہیں ان سے بھی اسلام کا صحیح تصور اجاگر نہیں ہوتا ہے۔ اسلامی ملکوں کی تنظیم کو اس سلسلے میں موثر حکمت عملی ترتیب دینی چاہئے اس کے ساتھ ساتھ پاکستان سمیت ہر مسلم ملک کو اپنے اپنے طور پر بھی اپنے شہریوں کی حفاظت کے لیے اپنے سفارت خانوں کو متحرک رکھنا چاہئے اور تمام اسلامی مراکز سے رابطے کرکے امریکہ میں اپنے اپنے شہریوں کو درپیش خطرات سے اجتماعی طور پر باخبر رہنا چاہئے۔

امریکی مسلمان اپنے طور پر بہت پرعزم ہیں امریکی مسلم جریدے کے مطابق انہوں نے اس سال کے آغاز میں یہ عزم کیا تھا کہ 2002ء میں ہمیں بہت زیادہ نفرتوں اور تعصبات کا سامنا کرنا پڑا، صدارتی تقریروں میں بھی مسلمانوں کو دہشت گرد کہا گیا، امریکہ میں بھی مصائب درپیش ہیں، فلسطین میں بھی اور دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی، ہمیں آئندہ اپنے آپ کو زیادہ طاقتور بنانا ہے، ہمیں اپنا سیاسی اثر بھی بڑھانا ہوگا، تعلیم کے میدان میں نمایاں پوزیشنیں لینا ہوں گی۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام امید اور آگے بڑھنے کا درس دیتا ہے، ہمیں انفرادی طور پر نہیں اجتماعی طور پر آگے بڑھنے کی حکمت عملی ترتیب دینی چاہئے۔

امریکہ اور مغرب میں مسلمان جن چیلنجوں سے دوچار ہیں ان کا مشاہدہ کرتے ہوئے یہ بلامبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی حقیقی روح کو وہی پہچان رہے ہیں، وہ اپنے عقائد پر عمل کرتے ہوئے اور دینوی علوم میں نمایاں مقام حاصل کرتے ہوئے یہ ثابت کررہے ہیں کہ اسلام اور روشن خیالی یا جدید علوم میں تصادم نہیں ہے۔ 11 ستمبر کے بعد مسلمانوں کو مالی طور پر نقصانات ہوئے ہیں، کاروبار بند ہوئے ہیں، ملازمتیں بھی چھینی گئی ہیں لیکن ان کے عزائم بلند ہیں اور وہ حوصلہ ہارنے کی بجائے اس معاشرے میں اپنا باوقار مقام حاصل کرنے اور اسلام کا حقیقی تصور پیش کرنے کے لیے جدوجہد میں مصروف ہیں۔ مسلم ممالک کو بھی چاہئے کہ وہ اپنے معاشروں میں بھی یہ صورتحال پیدا کریں اور یہ انداز فکر اختیار کریں۔

پاکستان ناکام مملکت ہونے سے کیسے بچ سکتا ہے؟

بوسٹن ایئرپورٹ پر ہم واشنگٹن جانے کے لیے کچھ جلدی پہنچ گئے تھے۔ وقت تھا تو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی جولیانہ۔ افغانستان کی شکریہ کو لے کر ان کی واپسی کے معاملات طے کرنے چلی گئیں کیونکہ انہیں کابل سے جلد واپس پہنچنے کے فون آرہے تھے۔ باقی لوگ پہلے سے لاؤنج میں جا بیٹھے تھے۔ میں اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ڈیوڈ پاکستان اور امریکہ کے بارے میں گفتگو میں مصروف ہوگئے۔ ڈیوڈ نے بین الاقوامی امور پر ڈاکٹریٹ بھی کر رکھا ہے اور ادھر جنوبی ایشیا پر ان کا خصوصی مطالعہ ہے۔ وہ دریافت کررہے تھے کہ ہمارے ہاں مقامی حکومتوں کا نظام کتنا مضبوط اور کتنے تسلسل سے چل رہا ہے۔ عام شہریوں کو کتنی بنیادی سہولتیں دستیاب ہیں۔ بڑے شہروں میں سڑکیں کتنی وسیع ہیں۔ چھوٹے شہروں، قصبوں اور دیہات میں پینے کا پانی، کھیت سے منڈی تک سڑکیں اور ٹرانسپورٹ کتنی میسر ہے، کتنے لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔

اس کے بعد یہ بات چل نکلی کہ قانون کا نفاذ ہر شہری کے لیے یکساں ہے یا نہیں۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ کئی علاقے ایسے ہیں جہاں وفاق کا قانون چلتا ہے نہ صوبے کا۔ قبائلی سردار اپنا سسٹم چلاتے ہیں۔ اسی طرح جاگیرداروں کے علاقے میں بھی پولیس کچھ نہیں کرپاتی، ان کا اپنا نظام ہے۔ عدالتیں بھی یہاں کچھ نہیں کرپاتیں۔ ان تک معاملات پہنچتے ہی نہیں ہیں، جرگے فیصلے کرتے ہیں، ان میں ابھی کیا کوئی اصلاح ہوئی ہے، یا فرق پڑا ہے۔

پھر تذکرہ چل نکلا جہادی تنظیموں، دینی مدارس اور فرقہ پرستی کا۔ ان صاحب کا پاکستان کے محل وقوع، قدرتی وسائل اور بھرپور امکانات کے حوالے سے یہ تاثر تھا کہ یہ ایک انتہائی کامیاب ملک بن سکتا ہے لیکن آپ کی ترجیحات صحیح نہیں ہیں۔ غیر ضروری ملکی اور بین الاقوامی امور میں الجھ کر بہت وقت ضائع کیا جا رہا ہے، توجہ ہونی چاہیے، اپنے شہریوں کی جان اور مال کو تحفظ دینے پر۔ ان کو احساس ہو کہ وہ اس مملکت میں محفوظ ہیں اور اسٹیٹ ان کی بنیادی ضروریات کو فوقیت دیتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ادھر سے جس قسم کی خبریں آتی ہیں وہ بار بار یہ اشارے دیتی ہیں کہ پاکستان ایک قائم رہنے والی اور کام کرنے والی ریاست نہیں بن رہی ہے۔

یہ تاثر یقیناً صرف ان کی ذات تک محدود نہیں ہوگا۔ امریکی محکمۂ خارجہ کے افسروں میں یہ سوچ ہوگی جن کی ذمہ داری جنوبی ایشیا کے امور پر نظر رکھنا ہے۔ پاکستان اور بھارت میں مسلسل تصادم اور کشیدگی کے پیش منظر میں امریکی ان خطوط سے معاملات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ بھارت میں عوام کو مسلسل اپنی رائے کے ذریعے حکمران منتخب کرنے اور مسترد کرنے کا موقع ملتا رہا ہے۔ بھارت نے گزشتہ دس بارہ برس سے اپنی معیشت کو آزاد کیا ہے۔ اس اعتبار سے ترقی کر رہا ہے۔ پاکستان کی طرف سے کشمیر میں مسلح مداخلت کار گھستے رہے ہیں جو نہ صرف کشمیر کے اندر بلکہ بھارت کے دوسرے علاقوں میں بھی دہشت گردی کرتے ہیں۔ پاکستان میں عوام کو اپنی مرضی سے حکومتیں تبدیل کرنے کا حق مسلسل نہیں ملا ہے۔ پاکستان کی معیشت ابھی تک مکمل طور پر آزاد نہیں ہے۔ پاکستان میں مذہبی انتہا پسندوں نے سیاست، معیشت اور سول سوسائٹی کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ فوج میں بھی انتہا پسند اور بنیاد پرست موجود ہیں۔ سرکاری افسروں میں بھی مذہب، فرقوں، زبانوں اور صوبوں کے حوالے سے تقسیم پائی جاتی ہے۔ یہ خطرہ بھی پایا جاتا ہے کہ دونوں ملک ایٹمی طاقت بن چکے ہیں۔ ان کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی کسی وقت بھی ایٹمی جنگ میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ ایک شدید تاثر یہ ہے جو کئی بار سرکاری طور پر تردید کے باوجود اپنی جگہ قائم ہے کہ پاکستان کے ایٹمی اثاثوں پر کسی وقت بھی مذہبی انتہا پسند کنٹرول حاصل کر سکتے ہیں اور وہ انہیں کسی طرح بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ جنوبی ایشیا کے امور کے ذمہ دار بھی

افسر امریکی وزیر خارجہ، امریکی صدر کو اس خطے کے بارے میں باخبر کرتے ہیں، انہی رپورٹوں کی بنیادوں پر ہمارے بارے میں پالیسیاں مرتب کی جاتی ہیں۔ یہ بھی کہیں کہیں سننے میں آتا ہے کہ پاکستان اور امریکہ کے روایتی تعلقات ہیں۔ یہ دوسری جنگ کے فوراً بعد سے سرد جنگ کے آغاز سے ہمارا اتحادی رہا ہے۔ اس کا محل وقوع بہت اہم ہے۔ افغانستان پر روسی حملے کے بعد بھی پاکستان نے امریکہ کا ساتھ دیا لیکن اس نصف صدی کے اتحادی ہونے کو آج کی تعلق داری میں کتنے فی صد اہمیت حاصل ہے اور پاکستان کو اس 50 سالہ رفاقت یا خدمات کے حوالے سے خطے میں کوئی ترجیحی اہمیت نصیب ہو سکتی ہے یا ہو رہی ہے۔ ہم نے اس حوالے سے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ پینٹاگون اور تھنک ٹینکوں سے میٹنگوں میں سوالات بھی کئے۔ ان کی آف دی ریکارڈ۔ آن دی ریکارڈ باتوں اور ان کے پس منظر میں جھانکنے کی کوشش کی۔ پینٹاگون میں تو ہمارے محل وقوع کے حوالے سے کچھ اہمیت محسوس ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہاں دہشت گردی کے خلاف عالمی مہم میں ہماری عسکری کوششوں کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ بھارت کے کشمیر میں سرحد پار مسلح مداخلت یا دہشت گردی کے الزامات کو مسترد کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہمیں صدر پاکستان کی یقین دہانیوں پر اعتماد ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد حقیقتیں بدل رہی ہیں۔ تعلقات کے لیے نئے جواز تلاش کئے جا رہے ہیں۔ 11 ستمبر 2001ء کے خوفناک واقعات کے بعد مسلمانوں کے خلاف جن تعصبات کا طوفان برپا ہوا پھر افغانستان میں اسامہ بن لادن کی موجودگی اور پاکستان کے مختلف علاقوں میں ان سے ہمدردی اور جہادی تنظیموں کی سرگرمیوں کے باعث پاکستان بھی تنقید کا ہدف بن گیا ہے۔ اب جب سے پاکستان امریکہ کا دوبارہ اتحادی بنا ہے۔ بھارت نے اپنا دباؤ بڑھا رکھا ہے۔ دہلی بھی اپنے آپ کو جنوبی ایشیا کا واشنگٹن سمجھنے لگا ہے اور وہاں شہریوں کو یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ انڈین پارلیمنٹ پر دہشت گردوں کا حملہ ان کی 11 ستمبر ہے۔ اس لیے وہ بھی پاکستان پر اسی طرح الزامات عائد کریں جیسے امریکہ نے اسامہ بن لادن پر سارا ملبہ ڈال دیا ہے اور پھر اس نے افغانستان پر فوج کشی کر دی۔

یہ سارے الزامات، بیانات، واقعات، امریکہ کی انتظامیہ کے ساتھ ساتھ امریکہ کی

رائے عامہ پر اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ ایک تھنک ٹینک کے معمر فیلو کے پاکستان کے بارے میں تاثرات ایسے ہی تھے وہ کئی ملکوں میں سفیر رہ چکے ہیں، جہاندیدہ ہیں لیکن ان کا انداز گفتگو جارحانہ تھا۔ پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے وہ اسی طرح کا تاثر دینے لگے کہ ایک چھوٹے، غریب ملک کے ہاتھوں میں ایٹمی طاقت آ گئی ہے جس کا استعمال غیر ذمہ داری سے ہوسکتا ہے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ تمام ملکوں کو برابری کی سطح پر سوچنا چاہیے، امریکی اپنے بارے میں ذمہ داری کا تاثر کچھ زیادہ ہی رکھتے ہیں۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر جب ایٹم بم گرائے گئے تو کیا یہ ذمہ دارانہ فیصلہ تھا یا غیر ذمہ دارانہ۔ پاکستان ایک ذمہ دار ملک ہے، ہماری سوسائٹی بھی باشعور ہے، اس طرح کا تاثر انتہائی غیر ذمہ دارانہ ہے۔ یہ تو خیر ہم نے انہیں بروقت جواب دے دیا لیکن سوال یہ ہے کہ تھنک ٹینکوں، ذرائع ابلاغ اور سرکاری حلقوں میں پاکستان کے بارے میں ایسے تاثرات کیوں پائے جاتے ہیں، یہی عام شہریوں کے ذہنوں میں بھی جگہ حاصل کر لیتے ہیں۔ پاکستان کی سول سوسائٹی، دینی رجحانات، مذہبی تنظیموں کے بارے میں بھی غلط فہمیاں زیادہ ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے میڈیا، امریکی میڈیا اور بین الاقوامی میڈیا کے ذریعے امریکی رائے عامہ تک ہمارے بارے میں جو اطلاعات پہنچتی ہیں اس کی بنیاد پر پاکستان کے لیے اپنا موقف ترتیب دیتے ہیں۔ یہ موقف ہمارے بارے میں سیاسی، اقتصادی اور دفاعی پالیسیوں کی بنیاد بنتا ہے۔ ہماری ایک حیثیت تو یہ ہے کہ ہم اپنی جگہ ایک مملکت ہیں، دوسرے ہم مسلم امہ کے ایک اہم رکن ہیں۔ ان دونوں حوالوں سے ہمیں اپنے بارے میں پائے جانے والے تاثرات کا جائزہ لینا چاہیے جو محض غلط فہمیوں کی بنیاد پر قائم ہو رہے ہیں۔ ان کے بارے میں حقائق فراہم کرنا، ان کی اشاعت ہماری حکومت کا فرض ہے۔ وہ پاکستان میں موجود سفارت خانوں کے ذریعے ان غلط فہمیوں کو دور کرے پھر دوسرے ممالک بالخصوص امریکہ میں موجود پاکستانی سفارت خانے کو ان غلط تاثرات کے خاتمے کے لیے دن رات کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے معاشرے میں جو واقعتاً غلط رجحانات ہیں یا قانون کے یکساں نفاذ نہ ہونے کے مظاہر ہیں، عوام کو بنیادی سہولتیں نہیں ہیں، مقامی حکومتیں کمزور ہیں

اور ان میں تسلسل نہیں ہے۔ ہمارا سماجی شعبہ کمزور ہے۔ تعلیم عام نہیں ہے۔ علاج معالجہ کی سہولتیں نہیں ہیں۔ پینے کا پانی نہیں ملتا۔ شاہراہیں، پل اگر کم ہیں تو یہ ہماری اپنی ترجیحات ہیں، ان پر عملدرآمد ہونا چاہیے۔ ملک کے تمام علاقوں میں ہر شہری کو ایک جیسے حقوق، وسائل اور آزادیاں ملنی چاہئیں۔

امریکہ میں پاکستان پر یہ دباؤ بہت ڈالا جاتا ہے کہ وہ بھارت سے مذاکرت کے ذریعے مسائل حل کرے۔ کشمیر کا تنازع دونوں کو گفتگو کے ذریعے طے کرنا چاہیے لیکن امریکہ اس میں کسی ثالثی کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ وہ فلسطین کی طرح اس کے لیے کوئی روڈ میپ نہیں دینا چاہتا۔ کیونکہ بھارت اس سلسلے میں صاف انکار کر دیتا ہے۔ امریکہ افغانستان میں جیسے وارلارڈز کے ذریعے بعض علاقوں پر کنٹرول رکھ رہا ہے اسی طرح ایک تصور یہ ہے کہ جنوبی ایشیا میں بھارت کو یہ حیثیت دی جائے۔ اس کے پس منظر میں بھارت کو آئندہ دس سے پندرہ برس میں سیاسی، اقتصادی اور دفاعی طور پر اتنا طاقت ور بنانا ہے کہ وہ اس عرصے میں ایک سیاسی، اقتصادی اور دفاعی قوت بن کر ابھر کے چین کے مقابلے میں کھڑا ہو سکے۔

رابرٹ اوکلے پاکستان میں انتہائی حساس دور میں سفیر رہ چکے ہیں۔ عمر رسیدہ ہیں، جہاندیدہ ہیں، جنوبی ایشیا پر ان کی بہت گہری نظر ہے۔ انہوں نے کافی تفصیلی گفتگو کی۔ پاکستان میں بنیاد پرستی اور دہشت گردی کے حوالے سے وہ ماضی سے رشتہ جوڑ رہے تھے، انہیں جنرل ضیاء الحق کے دور میں امریکی سفارت خانے کی آتشزدگی بھی یاد تھی جس کے حوالے سے ان کا کہنا یہ تھا کہ امریکہ کے خلاف نفرت 11 ستمبر کے بعد نہیں پہلے سے پائی جاتی ہے اور یہ انتہا پسند سوچ کی غمازی کرتی ہے۔ انہوں نے ایک دلچسپ بات جملہ معترضہ کے طور پر یہ کی کہ جنرل ضیاء امریکہ کے کے زیادہ قریبی دوست کہلاتے تھے اور افغانستان میں روسی حملے کے خلاف انہوں نے بہت شدت سے امریکہ کا ساتھ دیا جبکہ بے نظیر بھٹو اور ان کی پارٹی کو امریکہ کے اعلیٰ حلقوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ بے نظیر بھٹو نے اپنے دور میں امریکن سینٹر کو پتھراؤ سے بھی بچالیا تھا جبکہ جنرل ضیاء نے پورا امریکی سفارت خانے جلنے دیا تھا۔ رابرٹ اوکلے نے بڑی حقیقت پسندی سے جائزہ لیا کہ پاکستان کشمیر میں جدوجہد آزادی کے حوالے سے بعض اوقات

شدت پسندی اختیار کرلیتا ہے لیکن القاعدہ جنوبی ایشیا کی تنظیم نہیں ہے اس کے فنڈز، جہادی سب دوسرے علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ بھارت کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ اگر پاکستان میں طالبان جیسی حکومت قائم ہوتی ہے تو وہ اس کے لیے بھی خطرناک ہوگی۔ افغانستان جنوبی ایشیا کا ہی حصہ ہے۔ یہاں بھی بنیاد پرستی پورے جنوبی ایشیا کے لیے خطرناک ہوسکتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ امریکہ کے لیے خطرناک امور یہ ہیں کہ پاکستان سے کشمیر میں مسلح مداخلت ہوتی رہتی ہے۔ پاکستان اور بھارت میں عدم اعتماد بہت زیادہ ہے۔ پاکستان میں فوج مذہبی عناصر سے اقتدار میں شراکت کررہی ہے۔ کلنٹن انتظامیہ کے دور سے ہی امریکہ، بھارت سے قریبی تعلقات قائم کررہا تھا کیونکہ ایٹمی دھماکوں کے بعد امریکہ نے یہ طے کیا کہ اس علاقے میں اب سنجیدگی سے کام کیا جائے، ان کا تجزیہ یہ تھا کہ بھارت میں اندرونی معاملات پہلے سے بہتر ہورہے ہیں۔ وہ اپنے اقتصادی اور سیاسی مسائل کو بتدریج حل کررہا ہے اور گزشتہ دس بارہ برس سے معیشت میں خاص طور پر بہتری آئی ہے۔ پاکستان میں اندرونی تنازعات طے کرنے کے لیے ٹھوس کام نہیں کیا جارہا ہے، اس لیے حالات خراب ہیں، مزید خراب ہوسکتے ہیں۔ ایک طرف یہ مسائل حل نہیں ہورہے ہیں۔ جمہوریت مکمل طور پر بحال نہیں ہورہی، اس لیے مستقبل میں خطرات بڑھ سکتے ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ پاکستان کو ناکام ہوتی ہوئی ریاست سمجھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہرگز نہیں۔ پاکستان قطعی طور پر ناکام ریاست نہیں ہے لیکن اگر اپنے داخلی تضادات اور تنازعات کو خصوصی توجہ سے جلد طے نہ کیا گیا تو مستقبل میں مسائل زیادہ شدید ہوجائیں گے۔ ان سے جب ان کے نزدیک اہم اور سنگین مسائل کی نشاندہی کے لیے کہا گیا تو انہوں نے بتایا کہ (1) معیشت میں بہتری نہیں ہورہی ہے۔ (2) نئی سرمایہ کاری نہیں ہورہی ہے۔ روزگار کے لیے مواقع نہیں مل رہے ہیں، جس سے پاکستانی نوجوانوں میں مایوسی پھیلی ہے۔ (3) سماجی شعبے میں مسائل بڑھ رہے ہیں۔ تعلیم کا دائرہ وسیع نہیں ہورہا ہے۔ (4) مذہبی جماعتیں غلبہ پارہی ہیں۔ (5) لبرل اور سیکولر پارٹیاں کمزور ہورہی ہیں۔

انہوں نے کہا کہ پاکستان کی سول سوسائٹی کو ان بنیادی مسائل کی طرف توجہ دینا چاہیے۔ ان پر بھرپور کام بھی ہونا چاہیے اور رفتار بھی تیز ہونا چاہیے۔ وہ امریکہ میں شہری

آزادیاں بتدریج کم ہونے پر بہت فکرمند تھے اور اس کو بہتر راستہ نہیں کہہ رہے تھے۔ ان کے خیال میں دہشت گردی کے خاتمے کے لیے صرف طاقت کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ دوسرے راستے بھی اختیار کئے جائیں جن سے دہشت گردی کو جڑ سے ختم کیا جاسکے۔ سینئر امریکی سفارت کار، ماہرین، طالبان سے ہمدردی اور جہادی تنظیموں کی سرگرمیوں کے حوالے سے پاکستان کے بارے میں فکرمند ہیں کہ اس سے دلائل، مباحثوں اور جدید علوم کا راستہ مسدود ہورہا ہے۔ نوجوانوں میں شدت پسندانہ سوچ پیدا ہورہی ہے۔ امریکہ میں زیرتعلیم بعض نوجوان بھی جہاد میں شرکت کے لیے پاکستان چلے جاتے ہیں۔ دینی مدارس میں کیا پڑھایا جاتا ہے۔ وہاں سے کس قسم کے طلبہ فارغ التحصیل ہوکر نکلتے ہیں۔ ان کا پاکستان کی سول سوسائٹی میں کیا مقام ہے اور وہ کیسے خیالات کو فروغ دیتے ہیں۔

یہ تو امریکیوں کے خیالات، خدشات اور تجاویز ہیں۔ امریکہ میں مقیم پاکستانی برادری کے بھی اپنے خدشات ہیں۔ 11 ستمبر کے بعد امریکیوں کی سوچ میں جو تبدیلیاں آئی ہیں اس کا براہ راست مقابلہ تو ان کو ہی کرنا پڑا ہے۔ یہ پاکستانی امریکیوں کے لیے پاکستان سول سوسائٹی کا نمونہ بھی بن سکتے ہیں کہ ان کے رہن سہن اور اقدامات سے وہ پاکستان کے بارے میں اندازے قائم کرسکتے ہیں۔ سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ان کے درمیان موجود اختلافات بھی دور ہوں۔ پاکستانی وہاں اپنے آپ کو مختلف سیاسی، مذہبی اور لسانی تنظیموں کے حوالے سے نہیں بلکہ صرف پاکستانی کی حیثیت سے پیش کریں۔ ان کے ان اختلافات کو پاکستان کے معاشرے کے داخلی تضادات کا اشارہ قرار دیا جاتا ہے۔ ان پاکستانیوں کو امریکی سیاسی قائدین، دانشوروں اور اسکالرز سے رابطہ بڑھانا چاہیے، مکالمے کرنا چاہئیں۔ پاکستانی سفارت خانہ اس میں ایک کلیدی کردار ادا کرسکتا ہے۔ پاکستان اور اسلام کے بارے میں جو غلط تاثرات ایک باقاعدہ مہم کے ذریعے پیش کئے جارہے ہیں انہیں دور کیا جانا چاہیے۔

پاکستان میں ہم اگر اپنے اقتصادی شعبے کو بہتر بنانے کے اقدامات کریں گے، اس سے ہم اپنے نوجوانوں کے لیے روزگار بھی پیدا کریں گے، امریکہ اور دوسرے ملکوں کے آگے بھیک مانگنے بھی نہیں جانا پڑے گا۔ یہ تو ہماری ذمہ داری ہے۔ کمزور معیشت، مضبوط دفاع کو بھی بے اثر

بنا دیتی ہے۔ معیشت کی بہتری کے لیے تمام سیاسی جماعتیں اور معاشرے کے تمام طبقوں کو اپنا اپنا حصہ لینا چاہیے۔ امریکہ میں یہ تاثر غلط نہیں ہے کہ پاکستان میں معیشت کی ترقی میں حصہ لینے والوں کی شرح بہت کم ہے، اس طرح تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد بھی کم ہے۔ جب ہماری سوسائٹی کا یہ تاثر زیادہ پھیلے گا کہ ہم اقتصادی طور پر زیادہ منصوبے بنا رہے ہیں، زیادہ آگے بڑھ رہے ہیں اور دوسری طرف یہ کہ مقامی حکومتوں کو زیادہ اختیارات اور فنڈز مل رہے ہوں تو شہریوں کو زندگی کی بنیادی سہولتیں ملیں گی، وہ ذہنی طور پر مطمئن ہوں گے، ان کی سیاسی شدت پسندی بھی ختم ہوسکتی ہے اور قومی تعمیر کے عمل میں ان کا حصہ بڑھ سکتا ہے۔

میں نے ایک پاکستانی کی حیثیت سے جو دیکھا، سنا، محسوس کیا، وہ آپ تک پہنچا دیا ہے، معلومات، اطلاعات اور خیالات ومحسوسات تو اتنے وسیع اور موثر ہیں کہ ایک کتاب ترتیب پاسکتی ہے جو یقیناً ہم پاکستانیوں کے لیے آگے بڑھنے اور شہری سہولتیں پیش کرنے کے عملی راستے دکھاسکتی ہے اگر موقع ملا اور آپ کا مشورہ ہوا تو یقیناً اس کے لیے بھی وقت نکالنا ہوگا۔

(ب)

صدر پاکستان کا دورہ امریکہ

جون 2003ء میں صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف نے امریکی صدر جارج بش کی دعوت پر امریکہ کا دورہ کیا۔ اور کیمپ ڈیوڈ میں مذاکرات کیے۔

اس دورے سے واپسی پر لکھی گئی اقساط بھی پاک امریکہ تعلقات پر نظر رکھنے والوں کے لیے خصوصی دلچسپی اور اہمیت کا باعث ہوں گی۔

صدر پاکستان کا دورۂ امریکہ

صدر صاحب کا دورہ کیسا رہا.........؟

''پاکستان اور امریکہ دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے''

''پاکستان نے امریکہ کے لیے جتنا کچھ کیا، تین ارب ڈالر تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں'' ''اصل بات تو یہ ہے کہ دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کے موقف اور ضروریات کو سمجھ لیا ہے'' ''شکریئے کے ساتھ اتنی معمولی رقم لینے سے انکار کردینا چاہئے تھا'' ''دہشت گردی کے خاتمے کے لیے پاکستان نے جو کچھ کیا۔ وہ اس کے اپنے مفاد میں بھی تھا صرف امریکہ کے لیے نہیں کیا'' ''ترکی نے 15 ارب لیے تھے۔ مصر نے اپنے سارے قرضے معاف کروالئے تھے۔'' ''ایک وسیع البنیاد طویل المیعاد دوستی کی بنیاد رکھی گئی ہے۔'' ''وزیر خارجہ، وزیر اطلاعات اور وزیر تجارت کو صدر صاحب ساتھ کیوں نہیں لائے۔''

''صدر صاحب نے پی آئی اے کی عام کمرشل پرواز سے سفر کر کے مملکت کا لاکھوں روپیہ بچایا ہے۔''

کیمپ ڈیوڈ کے پرفضا مقام سے صدر امریکہ کی طرف سے 3 ارب ڈالر کی امداد کے اعلان کے ساتھ ہی مختلف چہ میگوئیاں شروع ہوگئی تھیں۔ جنوبی ایشیا کے ایک چھوٹے، غریب اور پسماندہ ملک کے صدر مملکت کی دنیا کی واحد سپر طاقت کے صدر سے بے تکلفانہ ملاقات یقیناً

اس ملک کے عوام اور سنجیدہ حلقوں کے لیے انتہائی اہمیت کی حامل ہونی چاہئے تھی۔ سب کی آنکھیں اگر کیمپ ڈیوڈ پر لگی ہوئی تھیں تو اس کے کئی اسباب تھے۔ پاکستان کے ہر سربراہ مملکت یا سربراہ حکومت کے لیے امریکہ کا دورہ اور صدر امریکہ سے ملاقات ایک اہم ترین ایجنڈا سمجھا جاتا رہا ہے، ایسی سربراہی مذاکرات کی تاریخوں کے تعین کے لیے بڑی سفارتی کوششیں کی جاتی رہی ہیں لیکن صدر جنرل پرویز مشرف اس اعتبار سے خوش قسمت ہیں کہ انہیں چار مرتبہ امریکہ آنے کا موقع ملا ہے اور ہر بار ان کی اہم ترین امریکی شخصیتوں سے نتیجہ خیز گفتگو رہی ہے۔ وقت وقت کی بات ہے۔ جب صدر کلنٹن بھارت کے دورے پر آرہے تھے تو پاکستان کو کس قدر سفارتی کوششیں کرنا پڑی تھیں۔ ان کے نتیجے میں بھی صرف چند گھنٹے پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں گزارے گئے۔ اس وقت کے صدر مملکت جناب رفیق تارڑ سے ملاقات کوتو امریکہ نے دورے کا باقاعدہ حصہ بنایا جبکہ اس وقت کے چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف سے ملاقات کو منظر عام پر لانے سے بھی گریز کیا گیا لیکن تاریخ کا جبر ملاحظہ ہو کہ امریکہ میں جب گیارہ ستمبر 2001ء کے المناک واقعات رونما ہوئے تو صدر جنرل پرویز مشرف کو صدر امریکہ نے خصوصی دعوت پر واشنگٹن بلایا انہیں Man of the Hour (مردِ لمحۂ موجود) قرار دیا گیا۔ اخبار نویسوں، ٹی وی چینلوں، تھنک ٹینکوں کی آنکھیں ان پر مرکوز تھیں ایک سے ایک اہم شخصیت ان سے ملنے کی خواہش مند تھی۔ وہ تو خیر 11 ستمبر کے حادثے کے عالمی اثرات اور افغانستان میں امریکی اور اتحادیوں کی فوجی کارروائیوں میں پاکستان کے تعاون کے فوراً بعد کا دورہ تھا جس میں پاکستان کو ایک مرکزی اور کلیدی حیثیت حاصل تھی لیکن آج کل تو توجہ مشرق وسطیٰ منتقل ہوچکی ہے جہاں عراق میں فوجی کارروائیاں جاری ہیں۔ فلسطین کا روڈ میپ دیا جاچکا ہے۔ اس وقت پاکستان کے صدر کو امریکی صدر کا اپنے تفریحی مقام کیمپ ڈیوڈ پر کام کے دن منگل کو ملاقات کے لیے بلانا اور اس میٹنگ میں امریکی نائب صدر، وزیر خارجہ، سلامتی کی مشیر اور دیگر اعلیٰ شخصیتوں کی موجودگی انتہائی معنی خیز ہے اس سے اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ امریکہ کو اب بھی پاکستان کی ضرورت ہے۔ کسی بھی سربراہ مملکت یا سربراہ حکومت کا کسی دوسرے ملک کا [illegible]رہ کسی ذاتی حیثیت یا تعلق کے حوالے سے نہیں ہوتا۔ یہ ان ملکوں کی اپنے

اپنے مفادات کے حصول کے سلسلے میں ایک دوسرے کی اہمیت کا اعتراف ہوتا ہے۔

کسی ایک ملک کو دوسرے ملک سے تعاون کی جتنی شدید ضرورت ہوتی ہے اسی کی روشنی میں اس کے لیے مہمان نوازی کی سطح بھی طے کی جاتی ہے۔ دنیا کی واحد سپر طاقت اور اس وقت امریکہ کے مضبوط ترین صدر جارج ڈبلیو بش کی طرف سے صدر جنرل پرویز مشرف کو ایک کام کے دن منگل کو جس طرح کیمپ ڈیوڈ میں مدعو کیا گیا پھر جس گرمجوشی سے مذاکرات ہوئے، اعلیٰ ترین شخصیتیں شریک ہوئیں، صدر بش سے تنہائی میں ملاقات کے بعد واشنگٹن میں نائب صدر ڈک چینی سے خصوصی میٹنگ کا موقع ملا اور فور سیزنز ہوٹل میں صدر پاکستان کے کمرے میں خود ملنے کے لیے آنے والوں میں وزیر دفاع، وزیر خارجہ، وزیر خزانہ، عالمی بینک کے صدر شامل تھے۔ کانگریس اور سینیٹ کی بین الاقوامی تعلقات کی کمیٹیوں کے چیئرمینوں اور ارکان سے ان کمیٹیوں کے دفاتر میں مذاکرات ہوئے۔ پاکستانی سفارت خانے کی نئی عمارت کے افتتاح کی تقریب میں بھی وزیر دفاع اور اٹارنی جنرل شریک ہوئے۔ امریکہ میں مقیم پاکستانی برادری کی ممتاز شخصیتوں کے خیال میں یہ بھی ایک غیر معمولی بات تھی۔ عام طور پر سفارت خانوں میں ایسے سرکردہ امریکی افراد نہیں آتے ہیں۔ واشنگٹن میں جہاں امریکی ایوان تجارت کے عشائیے میں ممتاز امریکی سرمایہ کار اور بزنس مین موجود تھے۔ امریکی انسٹیٹیوٹ برائے امن میں تھنک ٹینکس سے وابستہ افراد شریک تھے۔ وہاں لاس اینجلس میں ورلڈ کونسل کی تقریب میں ایک ہزار کے قریب امریکی شخصیتیں موجود تھیں اکثر ان سے مصافحہ کرنے اور تصویر کھنچوانے کے خواہاں نظر آئے۔

ایک ملک کے سربراہ کو دنیا کے سب سے طاقتور ملک میں یہ اعزاز دیئے جارہے ہوں تو مجھ سمیت وہاں موجود پاکستانیوں کے لیے یقیناً ایک افتخار کا مقام بھی تھا اور اللہ تعالیٰ کے حضور اظہار تشکر کا لمحہ بھی کہ جب مسلم امہ ایک سنگین بحران سے گزر رہی ہے اس وقت ایک مسلم ملک کے صدر کو یہ خصوصی اہمیت دی جارہی ہے۔ دنیا کا سب سے طاقتور سربراہ ہمارے سربراہ کو جراتمندی، روشن خیالی کا پیکر اور صاحب بصیرت قرار دے رہا ہے۔ ایک پاکستانی کی حیثیت سے میرے لیے یہ فخر کا لمحہ بھی تھا لیکن ساتھ ساتھ یہ تشویش اور فکر بھی تھی کہ موجودہ عالمی بحرانوں میں امریکہ پاکستان کو اگر یہ اہمیت دے رہا ہے تو یقیناً ہم بہت سے چیلنجوں اور

آزمائشوں سے دوچار ہوگئے ہیں۔ تاریخ کی طرف سے پاکستان کو مغرب اور اسلامی دنیا کے درمیان بڑھتی ہوئی کشمکش میں اگر ایک فیصلہ کن کردار ادا کرنے کا موقع ملنے والا ہے تو کیا ہم یہ اہلیت رکھتے ہیں۔ ہمارے اردگرد اگر بہت سی تبدیلیاں ہونے کو تڑپ رہی ہیں تو رونما ہونے والے واقعات کے تناظر میں دہشت گردی کے بڑھتے ہوئے رجحانات میں، تجارت اور سرمایہ کاری کو زیادہ آزادیاں دینے کے حوالے سے کیا ہماری قیادت اوعوام میں یہ صلاحیتیں ہیں کہ وقت جن اہم اور نازک فیصلوں کا تقاضا کررہا ہے وہ ہم پورے اعتماد کے ساتھ کرسکیں۔ حالات نے انتہائی حساس امور پر مشتمل ایک مشکل ایجنڈا ہمارے سامنے رکھ دیا ہے جو اگرچہ اس دورے سے پہلے سے ہی ہماری بصیرت، معاملہ فہمی اور سفارتکارانہ مہارت کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا اب امریکی صدر اور دوسری شخصیتوں سے تبادلہ خیال کے بعد اس ایجنڈے پر مسلسل عملدرآمد اور قطعی طور پر ضروری ہوگیا ہے۔

امریکہ اور پاکستان کے درمیان کچھ سلگتے اور بھڑکتے ہوئے جو موضوعات زیر بحث رہے ہر پاکستانی کو ان کا علم ہونا چاہئے موضوعات پر صرف صدر پاکستان، صدر امریکہ۔ پاکستان اور امریکہ کی حکومتوں یا سیاستدانوں کے لیے ہی قابل توجہ نہیں ہیں کیونکہ ان کے منفی یا مثبت اثرات ہر پاکستانی اور آنے والی پاکستانی نسلوں تک بھی پہنچیں گے اس لیے ہم سب کو ان کا جائزہ لینا چاہئے۔ ہر ایک موضوع دوسرے سے زیادہ اہم اور کہیں حساس ہے ان میں کچھ یہ ہیں۔

(1) دہشت گردی کے خاتمے کے لیے پاکستان اور امریکہ کی مشترکہ کارروائیاں۔ (2) پاک بھارت تعلقات میں بہتری اور کشیدگی کے خاتمے کے لیے اقدامات۔ (3) افغانستان میں حالات معمول پر لانے، سول سوسائٹی کی تعمیر اور جمہوریت کے قیام میں امریکہ سے مسلسل تعاون۔ (4) عراق میں پاکستانی فوجی دستوں کا تعین۔ (5) مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے باضابطہ پاک بھارت مذاکرات کا آغاز۔

(6) شمالی کوریا سے ایٹمی پروگرام میں تعاون کے شکوک وشبہات۔

(7) سرحد پار دہشت گردی کا خاتمہ۔

(8) مذہبی انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے اقدامات، خواتین کی تعلیم۔

(9) پاکستانی معیشت کا استحکام، آزاد تجارت، سرمایہ کاری۔

(10) امریکہ اور پاکستان میں فوجی تعاون، پاکستانی فوجی افسروں کی تربیت، ایف۔16 طیاروں کی خریداری، پہلے سے موجود ایف۔16 طیاروں کے لیے فالتو پرزوں کی درآمد ان کی دیکھ بھال اور انہیں جدید ترین ٹیکنالوجی سے لیس کرنا۔

(11) اسرائیل کو تسلیم کرنا۔

(12) 3ارب ڈالر کی امدادی رقم سے ملحقہ شرائط۔

(13) مسلم دنیا اور مغرب کے درمیان غلط فہمیاں دور کرکے فاصلے کم کرنا۔

(14) پاکستان کے قبائلی علاقوں میں سڑکوں اور اسکولوں کی تعمیر۔

(15) پاکستان کو ایک روشن خیال، روادار، اسلامی فلاحی مملکت بنانا۔

(16) امریکہ میں مقیم پاکستانی برادری کا، امریکہ اور پاکستان کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کرنا۔

(17) ایران میں امریکی فوجی کارروائی کی صورت میں پاکستان کے کردار کا تعین۔

یہ موضوعات کسی ترتیب سے نہیں لکھے گئے ہیں، ان میں کونسا سرفہرست ہونا چاہئے کونسا زیادہ اہم ہے، یہ آپ کو سوچنا ہے۔ ہر پاکستانی کی الگ الگ ترجیح ہوسکتی ہے۔ اسی طرح امریکہ کی اپنی ترجیحات ہیں.......... پاکستان کی اپنی۔

واشنگٹن اور لاس اینجلس میں گزرنے والے پاکستانی صدر کے یہ چھ روز جہاں پاکستان اور امریکہ کے درمیان تعلقات کا ایک نیا ورق الٹ رہے ہیں وہاں ان کے نتیجے میں پاکستان میں کئی تبدیلیاں آنے والی ہیں۔

کیا مذہبی تنظیموں پر گرفت زیادہ سخت ہوگی، کیا پاکستان 3ارب ڈالر کی امداد میں اضافے کی بات کرے گا۔ کیا اس سے ملحقہ شرائط پوری کی جاسکتی ہیں۔ کیا پاکستانی قبائلی علاقوں میں القاعدہ کا تعاقب تیز ہوجائے گا۔ اس میں امریکی فوجی بھی شامل ہوں گے۔ کیا عراق میں پاکستانی فوج بھیجی جائے گی، کیا اسرائیل کو تسلیم کرلیا جائے گا، ایسے حساس اور نازک امور آئندہ تحریروں کا موضوع ہوں گے۔

آئندہ آٹھ دس سال کا روڈ میپ

آپ نے دیکھا کہ پاکستان اور امریکہ کے درمیان زیر بحث آنے والے 17 نکات کتنے شعبوں کا احاطہ کرتے ہیں ان سے وابستہ حساسیت اور نزاکتوں پر بہت سے ہم وطن چونک اٹھے ہیں انہوں نے ٹیلی فون پر تشویش کا اظہار بھی کیا ہے یہ فکر لاحق ہوگئی ہے کہ کیا پاکستانی قوم اس ایجنڈے پر عملدرآمد بھی کرسکے گی کیونکہ یہ ترجیحات کا معاملہ ہے ہماری ترجیحات کچھ اور رہتی ہیں جبکہ وقت کچھ اور تقاضے کررہا ہے۔

کسی بھی مملکت سے مذاکرات اور معاہدوں کے بعد اصل مسئلہ فالو اپ ہوتا ہے کہ اس ملک میں موجودہ ہمارا سفارت خانہ طے شدہ امور کے مطابق متعلقہ حلقوں سے رابطہ کیسے برقرار رکھتا ہے۔ ان شعبوں اور شخصیتوں سے ملاقاتوں کا تواتر جاری رہتا ہے یا نہیں ادھر وطن میں متعلقہ وزارتیں اور محکمے ان رابطوں کے نتائج کو حقیقت میں کیسے تبدیل کرتے ہیں۔

ایک دلچسپ امر یہ دیکھئے کہ امریکہ سے جو بھی اس دورے میں طے ہوا ہے وہ ہر صورت میں ہمارے حالات پر اب اور مستقبل میں اثر انداز ہوگا لیکن ہمارے اپوزیشن اکابرین یہ کہہ کر بری الذمہ ہوجاتے ہیں کہ ہم جنرل پرویز مشرف کے امریکہ سے مذاکرات اور معاہدوں کو تسلیم نہیں کریں گے۔ وہ مذاکرات اور معاہدوں کی تفصیلات جاننے کی زحمت بھی نہیں کرتے اسی طرح اپوزیشن رہنماؤں کے معتقدین بھی ان حقائق سے آگاہی کو ضروری نہیں سمجھتے جو آج کی

زندگیوں اور کل ان کے بیٹوں بیٹیوں، پوتوں پوتیوں، نواسوں، نواسیوں کے معمولات کو متاثر کرنے والے ہیں۔

برسوں کی ناکامیوں اور غلط فہمیوں نے قوم کو مایوس بھی کردیا ہے اور شکی بھی بنادیا ہے۔ کوئی مورخ یا محقق اب تک تاشقند یا شملہ کے معاہدوں پر خفیہ ڈیل کے مندرجات تلاش نہیں کرسکا ہے لیکن وہ الزامات اب تک چلے آتے ہیں اب ان میں کیمپ ڈیوڈ کی خفیہ ڈیل کا اضافہ بھی ہوگیا ہے ہر نسل کا کوئی نہ کوئی تاشقند، شملہ یا کیمپ ڈیوڈ ضرور ہوتا ہے اس حوالے سے وہ نسل ہاں یا نہیں میں بٹی رہتی ہے اور سیاسی محاذ آرائی میں اپنی اپنی قیادتوں کے اقوال کو حرف آخر سمجھا جاتا ہے وہی بات جو اپنے لیڈر کے حوالے سے قابل تحسین اور لائق تقلید ہو اگر کسی دوسرے لیڈر یا حکمراں کی طرف سے سامنے آجائے تو اس کی تعریف نہیں کی جاتی۔ فیصلوں اور پالیسیوں کا جائزہ، ملک کے مفاد، مسائل اور موضوعات کی اہمیت و نزاکت کی روشنی میں نہیں بلکہ اپنی سیاسی وابستگی کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔

وہ پاکستانی جو کئی عشروں سے مختلف حکمرانوں اور سیاسی قائدین کے ساتھ مختلف معاہدے اور مذاکرات دیکھ چکے ہیں وہ ان تضادات میں تسلسل کو واضح طور پر محسوس کرسکتے ہیں ملک کے مفاد کی بجائے سیاسی وابستگی کو ترجیح دینے کے نتیجے میں ملک کو بہت نقصان پہنچ چکا ہے مشکل یہ ہے کہ سیاسی ہوں یا فوجی حکمراں فانی ہیں، ملک باقی رہنے والا ہے، مسائل موجود رہتے ہیں۔

11 ستمبر کے بعد پاکستان کی طرف سے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے ساتھ دہشت گردی کے خاتمے میں اشتراک کا فیصلہ ملک کے مفاد میں تھا یا نہیں ملک کی اکثریت اب اس تنازع میں جانا ضروری نہیں سمجھتی کیونکہ دلوں میں سب محسوس کرتے ہیں کہ پاکستان امریکہ اور اتحادیوں کی یورشوں سے محفوظ رہ گیا۔ اسی طرح عراق پر فوج کشی کے وقت جو پالیسی اختیار کی گئی اسے بھی اکثر حلقے پاکستان کے مفاد میں جانتے ہیں طالبان اور صدام حسین دونوں نے مزاحمت اور مقابلے کا راستہ اختیار نہ کرکے ان پالیسیوں کو برمحل ثابت کردیا ہے۔

اکثر پاکستانیوں کے ذہن میں دو سوالات ہیں۔

1۔ صدر جنرل پرویز مشرف کو صدر جارج بش نے اتنی غیر معمولی اہمیت کیوں دی؟

2۔ 3 بلین ڈالر امداد کے ساتھ کیا خفیہ شرائط منسلک کی گئی ہیں۔

عالمی نقشے پر پاکستان ایک چھوٹے سے نقطے جتنا وجود رکھتا ہے واحد سپر طاقت اس کے صدر کو کیوں اتنا اہم قرار دے رہی ہے۔ واقعی یہ سوچنے کی بات ہے لیکن اگر ہماری حالات حاضرہ پر نظر ہو اور ہم بلاوجہ احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں تو ایک آنکھ رکھنے والا یہ دیکھ سکتا ہے کہ 11 ستمبر کے واقعات کے بعد امریکہ اور عالمی برادری کے لیے افغانستان ایک ہدف تھا جہاں سے انہیں دہشت گردی کے سرچشموں کو ختم کرنا تھا پاکستان قریب ترین تھا پہلے کیمونزم کی یلغار روکنے کے لیے بھی پاکستان نے یہ کردارادا کیا تھا افغانستان میں امریکی فوجی آپریشن کے وقت پاکستان کی محل وقوع کے اعتبار سے جو اہمیت تھی اب افغانستان میں سول سوسائٹی کی تعمیر اور جمہوریت کی منزل تک پہنچنے کے مراحل میں بھی امریکہ.اور اتحادیوں کو پاکستان کی اتنی ہی ضرورت ہے۔ پہلے ہنگامی حالات تھے تو امریکہ، برطانیہ، جرمنی ،فرانس کی اہم سرکاری شخصیتیں خود پاکستان آرہی تھیں اب صورتحال مستحکم ہورہی ہے تو ان ہنگامی بنیادوں پر قائم ہونے والے دوطرفہ تعلقات کو مستحکم کرنے کے لیے پاکستان کے حکمراں وہاں جارہے ہیں القاعدہ کے سرکردہ کارگزار اور اس کے قائد اسامہ بن لادن کی افغانستان یا پاکستان کے قبائلی علاقوں میں موجودگی بھی پاکستان کو اہم بنارہی ہے۔ مسلم دنیا اور مغرب کے درمیان رابطے کے لیے پاکستان ایک موثر کردار ادا کررہا ہے۔ اسلام کی تعلیمات اور انداز فکر سے مغرب کی آگاہی میں بھی اس چھوٹے سے ملک کا بڑا حصہ ہے وسطی ایشیائی ریاستوں، خلیج اور جنوبی ایشیا کے سنگم پر واقع بڑی بندرگاہیں رکھنے والا یہ ملک دنیا کے باقی حصوں کے لیے اس لیے بھی خصوصی حیثیت رکھتا ہے کہ اس کے پاس ایٹمی طاقت ہے اس وقت یہ ملک سلامتی کونسل کا رکن بھی ہے۔

موسم اچھا، پانی وافر۔ مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان

قائداعظم محمد علی جناح کی دلیرانہ ، روشن خیال ، حقیقت پسند اور غیر جذباتی قیادت میں برصغیر کے مسلمانوں کی جدوجہد اور قربانیوں سے حاصل ہونے والی مملکت خداداد پاکستان اور وقت مغرب کے نزدیک ایک حساس مرکزیت رکھتی ہے اتفاق سے اس کے سربراہ اس وقت

صدر جنرل پرویز مشرف ہیں اس لیے امریکہ اور مغرب کے دوسرے سربراہان مملکت پاکستان کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ان کو اہمیت دے رہے ہیں ان کی اہمیت دوچند اس لیے ہوگئی ہے کہ امریکہ اور مغرب سے تعاون کرنے میں انہوں نے پہلے حکمرانوں کی طرح تامل اور جھجک سے کام نہیں لیا۔

پہلے بھی سب حکمرانوں نے امریکہ سے تعاون کیا لیکن فیصلوں میں دیر کی، اس کا نقصان ان سربراہوں کو نہیں ملک کو ہوا۔ پاکستان کا محل وقوع اہم تھا، اہم ہے، اہم رہے گا۔ صدر جنرل پرویز مشرف نے تیزی سے جراتمندانہ فیصلے کئے۔ تو ان کی شخصیت بھی اہمیت اختیار کرگئی ان کی اپنی کوئی سیاسی پارٹی نہیں ہے اس لیے ملک میں ان کو کوئی جذباتی حمایت حاصل نہیں ہے ورنہ کامیاب دوروں پر جلسے جلوس بھی ہوتے لیکن ان کو اپنے آپ پر اعتماد ہے وہ پاکستان کا مقدمہ بڑے شدومد سے لڑتے ہیں وقت بڑا استاد ہے وہ بہت کچھ سکھا دیتا ہے صدر پرویز نے کولمبو سے ایئر بس کی پرواز کے فضا میں معلق ہونے سے لے کر کیمپ ڈیوڈ تک بہت کچھ سیکھا ہے۔ 11 ستمبر کے بعد جس طرح دنیا کی بڑی بڑی تجربہ کار سیاسی فوجی شخصیتیں پاکستان آئیں جنرل پرویز کا ان سے تبادلہ خیال ہوا یقیناً انہوں نے سیاست ، سفارت، قیادت ، سیادت کے بہت سے رموز سیکھے ہونگے فوج میں ان کی اندرونی، بیرونی کم از کم تین عشروں کی تربیت اپنی جگہ، وہ دہشت گردی، مسلم دنیا میں امریکہ سے نفرت، جنوبی ایشیا کے مرکزی مسئلے کشمیر، بھارت کی ہٹ دھرمی، کشمیر میں سات لاکھ بھارتی غاصب فوجیوں کے مظالم، نام نہاد سرحد پار دہشت گردی، طالبانائزڈ سوسائٹی، رواداراسلامی معاشرے کے سلسلے میں اپنا موقف تنہا ملاقاتوں باضابطہ مذاکرات اور بڑے اجتماعات سے خطاب میں پوری اعتماد اور زور سے پیش کرتے ہیں۔ آئین میں ترامیم اور نئے سیاسی نظام کے حق میں بھی وہ سربراہان مملکت سے مذاکرات میں اور بڑی تقریبات میں اپنا موقف بھرپور انداز میں بیان کرتے ہیں کہیں ان کا رویہ معذرت خواہانہ نہیں ہوتا۔ مختلف میٹنگوں، اجتماعات اور اخبار نویسوں سے خطاب کے دوران صدر مملکت نے کیا دلائل دیئے انہیں غور سے سننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے کیونکہ ملکی امور آئندہ ان کے حوالے سے ہی چلائے جائیں گے ان دلائل میں یہ جواب بھی آپ کو مل جائے گا کہ امداد سے منسلک شرائط

کیا پاکستان کے لیے خطرناک ہیں اور کیا کوئی خفیہ ڈیل ہوئی ہے یہ بھی خیال رہے کہ بھارت سے ان دلائل کی روشنی ہی میں بات چیت ہوگی ایران پر اگر امریکہ نے کوئی کارروائی کی تو پاکستان اپنی حکمت عملی ان نکات کی روشنی میں ہی مرتب کرے گا۔

یوں سمجھ لیجئے کہ یہ آئندہ آٹھ دس سال کا روڈ میپ ہے اور یہ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ یعنی فوج، محکمہ خارجہ اور دوسرے مستقل اداروں کی محنت اور عرق ریزی سے تیار کیا گیا ہے۔ جس میں خاموش اکثریت کی آراء کو سامنے رکھا گیا ہے۔ پارلیمنٹ میں ان اہم نکات پر کسی طرف سے بھی بات نہیں کی جاتی ہے اس لیے پارلیمنٹ کی آراء نہ ظاہر کی گئی ہیں نہ ظاہر ہے شامل کی گئی ہونگی۔

صدر پرویز مشرف کے دلائل

پاکستان اور امریکہ کے درمیان موجودہ تعلقات کار میں سب سے اہم نکتہ بلکہ نئی دوستی کا محور دہشت گردی کے مقابلے میں اشتراک ہے جو صدر مشرف کے دور سے پہلے سے جاری تھا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں محمد نواز شریف دونوں کے ادوار میں امریکہ کو مطلوب کچھ افراد اس کے حوالے کئے گئے لیکن 11 ستمبر 2001ء کی دہشت گردی تاریخ انسانی کی چند بڑی غیر معمولی تباہ کاریوں میں سے تھی۔ اس لیے اس کے بعد کا تعاون بھی تاریخی قرار پایا۔ اس سلسلے میں جب بھی کہیں سوال کیا گیا یا از خود انہوں نے بات کی تو ان کا استدلال یہ تھا کہ دہشت گردی کے خاتمے کے لیے اقدامات خود ہمارے لیے ضروری تھے۔ جو کچھ ہو رہا تھا یہ اسلام کی خدمت تھی نہ ملک کی۔ بے گناہ انسانوں کو خودکش حملوں کے ذریعے ہلاک کرنا یا کسی اور طریقے سے، یہ کسی طور پر قابل برداشت نہیں ہے ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اب تک بیرون ملک جتنے خوفناک واقعات ہوئے ہیں ان میں کوئی بھی پاکستانی ملوث نہیں پایا گیا۔ ایسی وارداتوں میں جو خطرناک لوگ ماخوذ رہے وہ غیر ملکی تھے پھر پاکستان میں وہ کسی بھی قانونی یا جائز دستاویزات کے بغیر مقیم تھے۔ انہیں تلاش کر کے ہم نے پہلے ان کے ملکوں کے حوالے کرنا چاہا لیکن کسی نے قبول نہ کیا جب ان کے اپنے ملک انہیں قبول نہ کریں تو ہم انہیں کیسے اپنے ہاں رکھ سکتے ہیں، اس لیے انہیں امریکہ کے حوالے کیا گیا۔ انہوں نے یہ باتیں اخبار نویسوں سے بھی کیں، صدر بش سے بھی اور

دوسرے اجتماعات میں بھی۔ جب ایک مملکت کے قوانین کی حرمت کا سوال ہوتو ایسا ہی کیا جاتا ہے۔

صدر پرویز مشرف نے امریکہ، مغرب اور مسلم دنیا کے درمیان اعتماد کے فقدان کا ذمہ دار دونوں طرف کوٹھہرایا۔ صدر جارج بش سے اپنی ملاقات میں بھی ان کے دلائل یہی تھے۔ ایوان تجارت واشنگٹن ، عالمی کونسل لاس اینجلس اور امریکی انسٹی ٹیوٹ برائے امن بھی انہوں نے پورے اعتماد سے یہ کہا کہ دنیا اگر انسانیت کے لیے خطرناک ہورہی ہے اور دہشت گردی بڑھ رہی ہے تو اس کی وجہ بعض حساس علاقوں میں موجود دیرینہ سیاسی تنازعات ہیں۔ اتفاق یہ ہے کہ ان میں سب سے زیادہ خطرناک قضیوں کا تعلق مسلم ممالک سے ہے۔ کوسو، بوسنیا، فلسطین، افغانستان، کشمیر، عراق سب جگہ انسانوں کا خون بہہ رہا ہے، زندگی اجیرن ہورہی ہے۔ مغرب کی طرف سے ان کو حل کرنے کے لیے سنجیدہ کوششیں نہیں کی گئیں۔ اس لیے یہ سب شعلہ فشاں بن گئے۔ دوسری طرف مسلم دنیا نے یہ سوچنا شروع کردیا کہ ان کا مذہب اسلام اور ان کی اقدار نشانہ بن رہی ہیں۔ غیر مسلم اسلام کو ختم کرنا چاہتے ہیں اس لیے نوجوانوں میں شدت پسندی کا غلبہ شروع ہوا۔ ادھر امریکہ اور مغرب میں یہ تاثر پیدا ہوا اور یہ پروپیگنڈہ بھی کیا جارہا ہے کہ اسلام دہشت گردی ، انتہا پسندی اور بنیاد پرستی کا مذہب ہے۔ صدر پرویز مشرف نے کہا کہ دوسرے، مسائل تو اسی مسئلے کی وجہ سے پیدا ہورہے ہیں ان پر کیسے بات ہوسکتی ہے۔ انہوں نے کئی تقریبات میں سامعین سے پوچھا کہ آپ بتائیں کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان کشمیر کے علاوہ اور کوئی تنازع ہے؟ سب نے صدر کی تائید کی۔ صدر پاکستان نے کہا پاکستان بھارت سے Soverign equality ۔خودمختاری برابری کی بنیاد پر بات کرے گا۔ تقریب میں موجود ایک بھارتی نژاد امریکی نے کہا کہ کنٹرول لائن کو مستقل سرحد تسلیم کرنے سے تنازع طے ہوسکتا ہے۔ صدر کا برجستہ جواب یہ تھا کہ تین جنگیں اسی کنٹرول لائن پر تو لڑی گئی ہیں۔ جو چیز تنازع کی وجہ ہو وہ تنازع کیسے طے کرواسکتی ہے۔ مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے انہوں نے مزید دلائل دیے اور کہا اس مسئلے کے دس بارہ حل بتائے جارہے ہیں میں کہتا ہوں کہ ایسے حل جو پاکستان، بھارت اور کشمیریوں کے لیے قابل قبول نہیں ہیں انہیں پہلے ہی ایک طرف کریں۔ جو حل قابل

قبول ہوسکتے ہیں ان پر بات شروع کی جائے۔ کچھ دو اور کچھ لو کا فارمولا بھی مذاکرات میں زیر غور ہوتا ہے لیکن یہ دونوں طرف پر لاگو ہوتا ہے کسی ایک پر دباؤ نہیں ڈالا جاسکتا۔ انہوں نے یہ بھی واضح کردیا کہ مملکتوں کے درمیان سمجھوتے ہوتے ہیں، مفاہمت ہوتی ہے لیکن ہر ملک کے کچھ بنیادی مفادات ہوتے ہیں جن پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکتا۔ اگر ایسا ہوتو اسے حب الوطنی کے خلاف قرار دیا جاتا ہے بلکہ اسے غداری سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے مثلاً پاکستان کے لیے مسئلہ کشمیر کی مرکزیت اور ہمارے حساس اثاثے۔ بنیادی مفادات ہیں ان پر ہم کوئی سمجھوتہ نہیں کرسکتے۔ ان کے سلسلے میں ہمیں کوئی ڈکٹیٹ نہیں کرسکتا۔

بھارت کی طرف سے سرحد پار دہشت گردی یا کشمیر میں دراندازی کا معاملہ اٹھا کر مذاکرات کے آغاز کو ناممکن کہا جاتا ہے۔ امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک کو بھی بھارت نے کسی حد تک یہ قائل کر رکھا ہے کہ پاکستان سے دراندازی کے سبب کشمیر میں دہشت گردی ہورہی ہے۔ اس لیے امن خطرے میں رہتا ہے۔ اس پر صدر پاکستان نے صدر بش سے کیمپ ڈیوڈ میں اور دوسرے اجتماعات میں اخبار نویسوں کے سامنے یہ دلیل اختیار کی کہ یہ سرحدیں بہت طویل ہیں۔ میرے پاس کوئی سیٹی نہیں ہے جسے بجا کر جانے والوں کو روک دوں۔ نہ جانے والے حکومت پاکستان سے پوچھ کر جاتے ہیں۔ ہم نے ہر ممکن کوشش کی ہے لیکن کشمیر کے اندر کے جو حالات ہیں۔ کشمیری اپنے حقوق سے محروم ہیں۔ بھارت کے 7 لاکھ غاصب فوجی وہاں ظلم وستم کا بازار گرم کیے ہوئے ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہاں لوگ مقامی طور پر ایکشن کرتے ہیں۔ اس کا الزام پاکستان پر عائد کردیا جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ 7 لاکھ فوجی دراندازی کیوں نہیں روک پا رہے ہیں۔ صدر نے کہا یہ بھارت کا کھسیانہ پن ہے۔ اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ بھارت یہ رویہ نہیں چھوڑے گا تو علاقے میں امن قائم نہیں ہوگا۔

صدر پرویز مشرف نے جن دیگر امور پر کھل کر اظہار خیال کیا ان میں پاکستان میں ایک روشن خیال، رواداری، اعتدال پسند معاشرے کا قیام سرفہرست تھا۔ ان کا طرز استدلال یہ تھا کہ قائد اعظم محمد علی جناح نے پاکستان کے لیے جن خطوط کو بنیادی قرار دیا تھا ان میں روشن خیالی، روا داری اور انسانی فلاح نمایاں تھے۔ یہی علامہ اقبال کا بھی خواب تھا۔ پاکستانیوں کی اکثریت

طالبان والا معاشرہ نہیں چاہتی۔ وہ خالص اسلامی معاشرہ بھی نہیں ہے۔ اسلام لڑکیوں کو تعلیم سے نہیں روکتا۔ ہم تعلیم کو عام کریں گے۔ خاص طور پر خواتین کو معاشرے میں ایک فعال کردار دیں گے۔ اس وقت قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں 200 خواتین ممبر ہیں اور مقامی حکومتوں میں ہزاروں کی تعداد میں خواتین شامل ہیں۔ حکومت کی مختلف سطحوں پر 41 ہزار خواتین سیاسی اختیارات کے ساتھ متمکن ہیں۔ معاشرے کو اعتدال پسند بنانے کے ضمن میں انہوں نے صدر بش سمیت تمام امریکیوں کو بتایا کہ کئی صدیوں بعد پہلی بار وفاقی حکومت کے زیر اہتمام قبائلی علاقوں میں پاکستانی فوج اور پولیس نے کارروائی کی ہے۔ پہلے یہ علاقہ غیر کہلاتا تھا القاعدہ کے تعاقب میں ہم وہاں گئے ہیں۔ ہم نے القاعدہ کی کمر توڑ دی ہے لیکن یہ مشکل کام ہے۔ خطرناک دشوار گزار علاقے ہیں۔ یہاں سڑکیں تعمیر کرنی ہوں گی، اسکول بنانے ہوں گے۔ انہوں نے صوبہ سرحد میں خواتین ماڈل والے اشتہارات توڑنے اور سیاہی پھیرنے کے واقعات کے حوالے سے کہا کہ ہم نے سرحد کے وزیر اعلیٰ سے کہا ہے کہ وہ ان اشتہارات کو دوبارہ لگوائیں۔ امریکہ اور مغربی ممالک میں ان حرکتوں سے غلط پیغام پہنچتا ہے۔ سرمایہ کار پاکستان آنا ملتوی کر دیتے ہیں۔ پاکستان کو اگر مضبوط بنانا ہے تو اس کے لیے معیشت کو مستحکم کرنا ضروری ہے۔

صدر پرویز مشرف نے غیر ملکی امداد کے موضوع پر یہ دلیل اختیار کی کہ ہمیں ایڈ (امداد) کی بجائے ٹریڈ (کاروبار) پر زور دینا چاہئے۔ جب بھی تین ارب ڈالر کی بات کی گئی اور کہا گیا کہ پاکستان نے امریکہ کے کہنے پر اتنا کچھ کیا تو زیادہ مانگنا چاہئے تھا۔ یہ کم رقم لینے سے انکار کر دینا چاہئے تھا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ ہمارے بعض حلقے اکثر مایوسی میں گرفتار رہتے ہیں۔ ہمیں اس سے نکلنا چاہئے۔ کہا جا رہا ہے کہ ہمیں امریکہ سے تین ارب ڈالر سے زیادہ مانگنا چاہئے تھا۔ میں نے تو یہ بھی نہیں مانگے تھے، مجھے تو شرم آتی ہے کہ ہم دوسرے ملکوں سے بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ ہم ہر سال بھیک مانگنے مشرق وسطیٰ جاتے ہیں۔ مجھے تو وہاں بھی شرمندگی ہوئی کہ ہم کس طرح مانگیں۔ یہ کہا جا رہا ہے کہ ہم 5 ارب ڈالر مانگتے یہ تو بچوں والی بات ہوئی۔ ہم تو اب اللہ کے فضل سے ایسی اسٹیج پر ہیں کہ ہم دوسروں کو دے سکتے ہیں تو ہم بھیک کیوں مانگتے پھریں۔ ہم تجارت پر توجہ دیں۔ اس لیے ہم نے آزاد تجارت کا معاہدہ کیا ہے۔

جمہوریت کام کر رہی ہے

امریکہ اور پاکستان کے درمیان کھلی تجارت کے امکانات کافی قوی ہیں۔ ٹریڈ اینڈ انوسٹمنٹ فریم ورک ایگریمنٹ (ٹیفا) دونوں ملکوں کے درمیان بتدریج مختلف شعبوں میں تجارت کے پھیلاؤ کی بنیاد رکھ رہا ہے۔ صدر پاکستان کے انتہائی معتمد ساتھی وزیر خزانہ شوکت عزیز کے مطابق مختلف مراحل طے کرتے ہوئے پاکستان آزاد تجارت کی منزل مقصود تک پہنچے گا اور یہ پاکستان کے تاجروں اور صنعت کاروں کی معاملہ فہمی، دیانتداری اور بصیرت پر منحصر ہوگا کہ وہ تجارت کی آزادیوں میں کتنی ذمہ داری کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ اس میں کسی حکومتی سرپرستی یا کوٹے کی پابندی کا مسئلہ نہیں ہوگا۔ تجارت اور معیشت کے تعلقات کے ضمن میں صدر پاکستان نے امریکہ کی طرف سے وقتاً فوقتاً جاری ہونے والی ٹریول ایڈوائزریوں (امریکی تاجروں اور شہریوں کو پاکستان میں آمدورفت کے حوالے سے حکومت امریکہ کی ہدایتیں) کو معیشت کے فروغ میں ایک بڑی رکاوٹ قرار دیا۔ انہوں نے صدر جارج بش سے باضابطہ احتجاج کیا کہ پاکستان کے سفر کے سلسلے میں امریکہ کی طرف سے اعلان کردہ ٹریول ایڈوائزریاں بہت نقصان پہنچا رہی ہیں اب پاکستان میں امن وامان کی صورتحال قابو میں ہے۔

سرمایہ کاری کی گفتگو چل رہی ہوتی ہے کہ امریکی حکومت اعلان کر دیتی ہے کہ پاکستان کی طرف سفر نہ کریں وہاں خطرات ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ دوستی کی علامت نہیں ہے۔ اکا دکا

واقعہ تو کہیں نہ کہیں دنیا میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ انہوں نے لاس اینجلس میں امریکی تاجروں کی ایک بڑی تعداد سے کہا کہ وہ بلاخوف وخطر پاکستان آئیں۔ ٹریول ایڈوائزری ہم جاری کریں گے۔ ہم ذمہ داری لیں گے کہ ماحول سازگار رہے۔ اس گفتگو کے دوران ایک امریکی تاجر نے خود مائیک سنبھال لیا اور کہا کہ وہ ابھی پاکستان ہوکر آیا ہے۔ اسلام آباد میں بھی رہا جہاں شام کو سیر بھی کرتا رہا، لوگ ملتے تھے، مسکراہٹوں کے تبادلے کرتے تھے۔ کراچی میں بھی رہا، جس کے بارے میں بار بار بڑے خوفناک تذکرے کیے جاتے ہیں وہاں بھی میں سڑکوں گلیوں میں گھومتا رہا، تاجروں سے تبادلہ خیال کرتا رہا۔ کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ صدر مملکت نے اس امریکی تاجر کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ ہے ہمارے پاکستان کی سچی تصویر۔

ایل ایف او۔ وردی اگرچہ ایک فوجی حکومت کی کمزوریاں تصور کی جاتی ہیں لیکن صدر پرویز مشرف نے کیمپ ڈیوڈ میں صدر بش کے سامنے بھی اور بعد میں مختلف تقریبات، کے دوران اپنا موقف شدومد سے بیان کیا اور کہا میں تو فوجی آدمی ہوں سیاست سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن ایک محبِ وطن پاکستانی ہونے کی حیثیت ست وطن کے حالات پر میرا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ جب مجھے حکومت سنبھالنی پڑگئی تو میں نے یہ عزم کیا تھا کہ ملک کو لوٹ مار کرنے والوں سے نجات دلاؤں گا، کرپشن کلچر ختم کروں گا۔ 1999ء سے پہلے جمہوریت غیر فعال تھی، اس کی بنیاد کمزور ستونوں پر رکھی گئی تھی۔ ہم نے اختیارات کی تقسیم کا نیا نظام قائم کیا ہے۔ ضلعی حکومتوں کے ذریعے مسائل کا حل عوام کی اپنی دہلیز پر لے گئے ہیں۔ اس وقت یہ مقامی سطح کا نظام اپنے مالی اور انتظامی اختیارات کے ساتھ ٹیک آف کرچکا ہے۔ مرکز یا صوبے میں کوئی ہلچل ہو، تبدیلی ہو، ضلعی حکومتیں متاثر نہیں ہوں گی۔ ان کے اختیارات بھی قائم رہے ہیں۔

ان کے پاس مالی وسیلے بھی ہوں گے۔ ضلعی، صوبائی اور وفاقی سطح پر نیا جمہوری نظام اب کام کررہا ہے۔ تعلیم کے ذریعے کوشش کی جارہی ہے کہ لوگ اپنے حقوق سے آشنا ہوں۔ دینی مدارس میں جدید قومی نصاب بھی شامل کیا جارہا ہے۔ جس سے پاکستان کو آزاد جمہوری ملک بنانے میں مدد ملے گی۔ صدر پاکستان نے کہا ہم ماضی کی غیر فعال جمہوریت کی جگہ پائیدار جمہوریت کو لے کر آرہے ہیں۔ خواتین کو سیاسی طاقت دی گئی ہے، غریب لوگوں کو اختیارات

دیئے گئے ہیں۔ سپریم کورٹ نے مجھے آئین میں ترمیم کا اختیار دیا تھا۔ ہم نے جمہوریت کو زیادہ فعال اور مستحکم بنانے کے لیے ترامیم کی ہیں۔ سیاسی ڈھانچے کو ازسرنو ترتیب دیا ہے۔ یہ نظام جاری رہے گا تاکہ جمہوریت کی ریل دوبارہ پٹڑی سے نیچے نہ اترے۔ انہوں نے امریکی انتظامیہ اور شہریوں کو بتایا کہ اگر جمہوریت اکثریت کی رائے کا نام ہے تو ملک میں جمہوریت کام کررہی ہے۔ قومی اسمبلی میں اکثریت نے بجٹ منظور کردیا ہے۔ صوبائی اسمبلیوں میں بھی بجٹ منظور ہوگیا ہے۔ یہ اکثریت کے کام تو ہورہے ہیں۔ قومی اسمبلی کے اسپیکر نے ایل ایف او کو آئین کا حصہ قرار دے دیا ہے۔ پنجاب پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے، وہاں کی دوتہائی اکثریت نے یہ قرار داد منظور کی ہے کہ میرا وردی میں رہنا ملک کے مفاد میں ہے۔

انہوں نے کہا اسمبلیوں میں اکثریت اپنا کام کررہی ہے۔ اپوزیشن اقلیت میں ہے۔ جمہوریت کی دعویدار ہے لیکن وہ بنیادی طور پر جمہوریت کی جڑیں کاٹ رہی ہے۔ وہ اقلیت کی رائے اکثریت پر مسلط کرنا چاہتی ہے۔ یہ تو کسی جمہوری ملک میں نہیں ہوتا کہ اکثریت پر اقلیت اپنی مرضی منوائے اور کہے کہ اصل جمہوریت یہی ہے۔ صدر نے امریکیوں کو بتایا کہ خاموش اکثریت میرے ساتھ ہے، حالات کی نبض پر میری انگلیاں ہیں اس لیے میں 20 دن کے غیر ملکی دورے پر نکل آیا ہوں، 20 دن ملک سے باہر رہوں گا۔ مجھے یہ اعتماد نہیں ہوتا تو میں ملک سے باہر نہیں نکلتا۔

امریکی پریس شمالی کوریا سے ایٹمی اسلحہ سازی میں پاکستان کے تعاون کو بہت اچھال رہا تھا۔ کالم بھی لکھے جارہے تھے۔ بیانات میں بھی اس کا حوالہ تھا۔ اکثر اخبار نویس اس سے متعلق سوال بھی کرتے تھے۔ اس کا جواب صدر پرویز یہی کہ دے رہے تھے کہ یہ ماضی کا ایک قصہ ہے۔ ہم نے اس باب کو ہمیشہ کے لیے بند کردیا ہے۔ اب کسی قسم کا کوئی تعاون نہیں ہورہا ہے۔ اس جواب پر بڑے بڑے امریکی اخبار بڑے جز بز ہوئے لیکن امریکی حکومت کی طرف سے بھی اس پر زیادہ اصرار نہیں کیا گیا۔

صدر مشرف نے پہلی دو تین ملاقاتوں کے بعد ایک نئی دلیل یہ اختیار کی کہ اگرچہ دو ممالک۔ اپنے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے مذاکرات کرتے ہیں اور ان کے پیش نظر اپنے

مفادات کو ترجیح ہوتی تھی لیکن امریکہ اور پاکستان کے درمیان بار بار کے رابطوں اور قریبی اشتراک کے بعد یہ بھی محسوس ہو رہا ہے کہ دونوں کے مفادات کئی شعبوں میں ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔ دہشت گردی کا خاتمہ دونوں چاہتے ہیں، پاک بھارت تنازعات کو جلد طے کروانا دونوں کی خواہش ہے، مشرق وسطیٰ میں امن کا قیام دونوں کے نزدیک ضروری ہے، افغانستان میں سول سوسائٹی کی تعمیر۔ جمہوریت کا قیام بھی دونوں کا مقصد ہے۔ صدر پرویز نے بتایا کہ انہوں نے امریکی حکام پر ڈیڑھ گھنٹے کے لیکچر میں واضح کیا کہ افغانستان میں امریکہ کی حکمت عملی درست نہیں ہے۔ صدر نے کہا کہ طالبان کے بارے میں بھی ہم یہی کہتے ہیں کہ انہوں نے اسلام کو نقصان پہنچایا۔ القاعدہ کے لیے بھی ہم کہتے رہتے ہیں کہ اس کی کارروائیوں سے مسلمانوں پر مصیبتیں آئی ہیں۔ اس پر بھی ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ صدر نے کہا کہ ایک ملک کے مفادات دوسرے ملک کے مفادات سے مل جائیں تو تعلقات طویل المیعاد ہو جاتے ہیں۔

عراق میں فوجی دستے بھیجنے کے بارے میں ان کا استدلال تھا کہ امریکہ برطانیہ نے ہم سے دو بریگیڈ مانگے ہیں۔ اس سے پہلے ہمارے فوجی صومالیہ، سیرالیون اور دوسرے مقامات پر اقوام متحدہ کے بینر تلے اچھے کام کر چکے ہیں۔ غیر ملکی سربراہوں۔ فوجی افسروں اور اقوام متحدہ کے حکام نے ان کی کارکردگی کی تعریف کی ہے۔ ہم امن کے قیام کے لیے عراق میں اپنے فوجی بھیجنے کے مخالف نہیں ہیں کیونکہ اس طرح وہاں غیر مسلم فوجیں کم کرنے کا موقع ملے گا۔ مسلمان ایک دوسرے کی اقدار کا خیال رکھیں گے۔ ان کی روایات، تہذیب، تمدن ایک جیسا ہے۔ اس لیے وہ اجنبیت نہیں ہوگی جو اس وقت امریکی فوجیوں اور عراقی شہریوں کے درمیان ہے۔ ایسے تباہ وتاراج ملکوں میں غیر ملکی افواج حالات معمول پر لانے کے لیے جاتی ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ ان افواج کی کمان اقوام متحدہ کے ہاتھوں میں ہو۔ اس سلسلے میں مسلم ملکوں کی تنظیم (OIC) اور خلیج کے ملکوں کی تنظیم (GCC) سے مشورہ بھی ضروری ہے۔

اسرائیل کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کی بحث موجودہ حکومت کی طرف سے اچانک شروع کرادی گئی ہے۔ ماضی میں بھی یہ مسئلہ کبھی کبھار سر اٹھاتا رہا ہے۔ جب فلسطین اتھارٹی قائم کی گئی۔ اس کے بعد سے یہ قیاس آرائیاں زیادہ زور وشور سے شروع ہوئیں کہ جب براہ راست

حریفوں نے آپس میں تعلقات کار قائم کر لیے ہیں، ملاقاتیں ہو رہی ہیں۔ پھر مصر اور اردن نے اسرائیل کو مان لیا ہے تو پاکستان کے اسرائیل پالیسی پر نظر ثانی کرنے میں کیا ہرج ہے۔ صدر پاکستان نے کہا کہ عجیب بات ہے کہ 3 جنگیں تو بھارت سے لڑی گئیں۔ ہمیشہ کشیدگی بھارت سے رہی لیکن ہمارے پاسپورٹوں پر لکھا ہوتا ہے کہ ''اسرائیل نہیں'' اور اسرائیل کے دشمن عربوں نے ہمیشہ ہمارے دشمن بھارت سے اچھے تعلقات رکھے۔ اس طرح اسرائیل اور عرب دونوں بھارت کی طرف جھکے رہے۔ صدر پرویز مشرف کا خیال ہے کہ پاکستانی قوم اس سلسلے میں جلد اتفاق رائے حاصل کر لے گی۔

اسرائیل کو تسلیم کرنے کا وقت کب آتا ہے یہ تو پتہ نہیں لیکن امریکہ کے یہودی حلقوں میں پاکستان کی یہ بحث زیر غور آ رہی ہے۔ سفارتی حلقوں کا کہنا ہے کہ پاکستان کی اسرائیل سے لاتعلقی سے بھارت نے فائدہ اٹھایا۔ اب ہم نظر ثانی کر کے اسرائیل کو بھارت سے دور کر سکتے ہیں۔ فلسطین میں امن کے روڈ میپ کی منزل جوں جوں نزدیک آتی جائے گی پاکستان بھی اسرائیل کو تسلیم کرنے کے نزدیک ہوتا جائے گا۔

3 ارب ڈالر۔ 5 سال۔ 3 شرائط

باتیں بہت سی ہیں۔ جو مجھے کرنی چاہئیں۔ آپ کو سنی چاہئیں۔ پانچ سال تک کے لیے 3 ارب ڈالر کی امداد۔ اس کے اجراء کا طریق کار۔ اس سے منسلک شرائط اور پابندیاں۔

مجھے آپ کو کیمپ ڈیوڈ بھی لے کر چلنا ہے۔ وائٹ ہاؤس تو اب کے جانے سے محروم رہے۔ اقتدار کے برآمدوں میں گھومنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کیمپ ڈیوڈ کی سانپ کی طرح بل کھاتی سڑکیں، دونوں طرف چوبداروں کی طرح کھڑے چھتنار پیڑ۔ میپل لیف، شاہ بلوط، دیودار، عالمی تنازعات سے بے نیاز اڑتے پرندے۔ یہ سب کچھ آپ کو دکھانا ہے۔ لیکن اس بار گفتگو ہو جائے۔ 3 ارب ڈالر کی امداد پر۔

یہ ترقی یافتہ ممالک کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ پسماندہ اور ترقی پذیر ملکوں کو امداد فراہم کریں تاکہ وہاں غربت دور کی جاسکے۔ تعلیم عام کی جاسکے۔ وہاں انسانوں کو زندگی کی آسانیاں میسر آسکیں۔ ان امیر ملکوں کے عوام اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے ان امدادی رقوم کی منظوری دیتے ہیں۔ یہ ان کے گاڑھے پسینے کی کمائی ہوتی ہے۔ یہ پیسے ان کے ادا شدہ ٹیکسوں میں سے دیئے جاتے ہیں، اس لیے یہ ان کا حق بھی بنتا ہے کہ وہ اپنی حکومت سے پوچھیں کہ انہیں اس رقم کے بدلے کیا ملے گا۔ وہاں کے عوام کے اس ضمن میں جو سوالات ہوتے ہیں۔ وہی عرف عام میں شرائط کہلاتی ہیں دوسرے معنوں میں انہیں پابندیاں بھی کہا جاسکتا

ہے۔

یہ پابندیاں اب صرف امداد پر ہی نہیں قرضوں سے بھی منسلک ہونے لگی ہیں۔ بعض ادارے ان کے استعمال کی نگرانی بھی کرتے ہیں۔ سفارتی زبان میں پہلے ایسی پابندیاں ملکوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کہلاتی تھیں۔ پہلے ایسے معمولات نہیں ہوتے تھے لیکن پاکستان سمیت اکثر غریب ملکوں میں وہاں کے عوام نے، دانشوروں نے، سیاسی رہنماؤں نے یہ سوالات اٹھائے کہ امدادی رقوم اور قرضے جن منصوبوں کے لیے لئے گئے وہاں خرچ نہیں ہوئے۔ اس لیے پسماندگی اسی طرح باقی رہی۔ جہالت کا غلبہ رہا، سڑکیں نہیں بنیں، انہی ملکوں سے یہ زور دیا گیا کہ عطیات اور قرضے دینے والے ملکوں کو دیکھنا چاہئے کہ یہ رقوم انہی منصوبوں اور شعبوں پر خرچ ہوں۔ جن کے لیے یہ جاری کی گئی ہیں۔ پسماندہ اور غریب ملکوں کو جب تک یہ آزادی ملی کہ وہ اپنی مرضی سے ان رقوم کو خرچ کریں۔ تو ان کا استعمال صحیح نہیں ہوا۔ قرضے چڑھتے چلے گئے لیکن مسائل حل نہیں ہوئے۔ اس لیے اب امریکہ مدد کرے یا کوئی اور مخیر ملک، وہ اس کے ساتھ پابندیاں عائد کرتا ہے اور نگرانی کے لیے بندے بھی مامور کرتا ہے۔

یہ کہنا بھی کسی طرح منطقی نہیں ہے کہ 3 ارب ڈالر کی امداد کسی پابندی یا شرط کے بغیر ملی ہے اور یہ کہنا بھی کوئی وزن نہیں رکھتا کہ ہم نے اس امداد کے حصول کے لیے اپنے بنیادی مفادات پر سودا کرلیا ہے۔ پہلے تو یہ دیکھتے ہیں کہ 3 ارب ڈالر کی امداد سے پہلے ہمیں امریکہ کہاں کہاں مدد کررہا ہے۔ 100 ملین ڈالر پاکستان کو تعلیمی اصلاحات کے لیے پہلے سے ملے ہوئے ہیں جو آئندہ 5 سال کے دوران خرچ ہوں گے۔ ان میں سرفہرست دینی مدارس میں جدید نصاب کو متعارف کروانا ہے۔ 1200 دینی مدارس حکومت کے پاس اس سلسلے میں رجسٹریشن کرواچکے ہیں۔ اب وہاں اسلامی تعلیمات، قرآنی تدریس کے ساتھ ساتھ۔ ریاضی، سائنس، انگریزی بھی پڑھائی جائے گی۔ امریکی اسے صدارتی تعلیمی پروگرام کہتے ہیں۔ دینی مدارس میں اصلاحات کے علاوہ خواندگی کی شرح میں بالعموم بہتری، اساتذہ اور منتظمین کی تربیت، لڑکیوں کے لیے تعلیمی مواقع میں وسعت اور عام مقامی پاکستانیوں کی پرائمری تعلیم میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی بھی اس کی شرائط ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان کی طرف سے 2004ء کے

مالی سال کے لیے 120 ملین ڈالر کی درخواست بھی منظور ہونے والی ہے۔ جس میں صحت، قانون کے نفاذ اور دوسرے پروگرام شامل ہیں۔ 100 ملین ڈالر کا پروگرام 2002ء میں شروع ہوا تھا۔ پرائیوٹ سیکٹر کے لیے 75 ملین ڈالر کے اجراء کی اوپی آئی سی نے گارنٹی دی ہے۔ 2002ء میں امریکی محکمۂ محنت نے پنجاب کے نوجوانوں کی پیشہ ورانہ تربیت کے لیے 5 ملین ڈالر کا پروگرام شروع کیا تھا۔

ممتاز امریکی محقق اور پاکستان پر تنقید کرنے والے سیلگ ہیریسن نے اپنے ایک حالیہ مقالے میں بتایا کہ گیارہ ستمبر 2001ء کے بعد سے اب تک کے مختصر سے عرصے میں امریکہ پاکستان کو 600 ملین ڈالر نقد فراہم کر چکا ہے۔ جبکہ 350 ملین ڈالر فوجی امداد کے طور پر 3.6 ارب ڈالر امریکہ اور آئی ایم ایف کے قرضوں کی صورت میں مہیا کر چکا ہے۔ ہیریسن کے مطابق اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ امریکہ کی زیر قیادت کنسورشیم پاکستان پر واجب الادا ساڑھے 12 ارب ڈالر کے قرضوں کی ادائیگی موخر کر چکی ہے۔ ہیریسن نے افسوس ظاہر کیا ہے کہ ان مراعات کے بدلے امریکہ نے پاکستان سے ایٹمی تنصیبات کے معائنے کی شرائط عائد نہیں کیں اور نہ ہی بش انتظامیہ کی طرف سے مشرف پر زور دیا جا رہا ہے کہ وہ کشمیر میں اسلامی انتہا پسندوں کو تقویت پہنچانا بند کرے۔ اس سے پہلے امریکہ ایک ارب ڈالر کا قرضہ معاف کر چکا ہے۔ جس کا ذکر صدر بش نے کیمپ ڈیوڈ میں 3 بلین ڈالر کی امداد کا اعلان کرتے وقت بھی کیا۔ صدر بش نے 3 بلین ڈالر امداد کے لیے یہ الفاظ استعمال کئے کہ وہ امریکی کانگریس کے ساتھ مل کر تین بلین ڈالر کے امدادی پیکیج کے لیے کام کریں گے۔ جو پاکستان کے عوام کی سلامتی کے تحفظ اور اقتصادی مواقع بڑھانے میں معاون ہو۔ اس میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ 50 فی صد رقم فوجی امداد کے لیے اور 50 فی صد معیشت، تعلیم وصحت اور سوشل سیکٹر کے لیے ہوگی۔ غیر فوجی 50 فی صد میں سے دو تہائی قرضوں کی ادائیگی کے لیے بھی استعمال ہوسکتی ہے۔ اب یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ یہ 3 ارب ڈالر کیمپ ڈیوڈ میں ہی صدر بش کی جیب سے صدر مشرف کی جیب میں منتقل نہیں ہوگئے۔ اور نہ ہی کیمپ ڈیوڈ سے ان کی ٹی ٹی اسلام آباد بھیج دی گئی ہے۔ ہم تو عادی ہو چکے ہیں کہ قرضوں کی یا تنخواہ میں ترقی کی خبر ملتے ہی اخراجات بڑھا دیتے ہیں یا ہمیشہ

اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلاتے ہیں۔ اضافی اخراجات کے لیے یا تو قرضوں کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہیں یا رشوتیں وصول کرتے ہیں۔ یہ 3 ارب ڈالر 5 سال کے دوران 600 ملین ڈالر سالانہ کے حساب سے جاری کئے جائیں گے۔ وائٹ ہاؤس میں امریکی انتظامیہ کے ایک سینئر آفیسر نے اسی دن یعنی 24 جون کو باضابطہ سرکاری بریفنگ میں واضح طور پر کہا کہ 3 ارب ڈالر کے 5 سال 2005ء سے شروع ہوں گے کیونکہ 2003ء کے لیے 100 ملین ڈالر دیئے جا چکے ہیں۔ 2004ء کے لیے 120 ملین ڈالر کی امریکی انتظامیہ کانگریس سے درخواست کر چکی ہے۔ 3 بلین ڈالر۔ ای ایس ایف (اکنامک سپورٹ فنڈز۔ اقتصادی امداد۔ امدادی رقوم) اور ایف ایم ایف۔ (فارن ملٹری فنانسنگ ۔غیر ملکی فوج کو مالی فراہمی) کے لیے ہیں اور یہ 2005ء سے شروع ہوسکتے ہیں۔

اسی آفیسر نے یہ بھی کھل کر کہا کہ یہ کئی سالہ پروگرام ہے۔ کانگریس نے اس کی منظوری دینی ہے۔ انہوں نے کہا میں شرائط یا پابندیوں کی اصطلاح استعمال نہیں کر رہا لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ امریکی حکومت نے فنڈز مانگنے ہیں۔ کانگریس نے ان کا جواز فراہم کرنا ہے۔ ہمیں یہ اطمینان حاصل کرنا ہوگا کہ 1۔ پاکستان دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پرجوش حصہ لے رہا ہے۔ 2۔ ایٹمی اسلحے میں مزید پھیلاؤ نہیں ہو رہا ہے۔ 3۔ جمہوریت کی طرف تیزی سے قدم بڑھا رہا ہے۔ اس آفیسر کے یہ الفاظ ہر پاکستانی کو غور سے پڑھنے چاہئیں۔" میں انہیں شرائط نہیں کہہ رہا۔ لیکن آیئے ہم حقیقت پسندی سے کام لیں۔ ابھی تین سال کا وقت ہے۔ اگر ان شعبوں میں معاملات خراب چلیں گے۔ تو یہ نہیں ہوگا۔ ہم اس کی درخواست نہیں کریں گے۔ کانگریس اس کو منظور نہیں کرے گی۔ یہ سودا کھلا ہے۔

پاکستانی یقیناً آنکھیں کھلی رکھ کر اس میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس آفیسر نے یہ واضح کر دیا کہ ان تین شعبوں میں اگر کہیں معاملہ زیادہ بگڑ گیا تو امداد کی فراہمی میں رکاوٹ آسکتی ہے۔ یہ ایک ہی بار منظور نہیں ہو جائے گی۔ ہر سال 600 بلین ڈالر کے لیے منظوری دی جائے گی۔ پاکستان کے لیے ایک اور سوال بھی یقیناً دلچسپی کا مرکز ہوگا۔ اس آفیسر سے پوچھا گیا تھا کہ یہ 3 بلین ڈالر کی رقم پاکستانی صدر کی طرف سے مانگی گئی تھی۔ یا یہ امریکہ کا اپنا پیکیج تھا۔

آفیسر کا جواب تھا کہ یہ پیکیج زیادہ تر امریکہ کا اپنا ڈیزائن ہے۔ ہم اب پاکستانیوں سے بات کریں گے انہیں بتائیں گے کہ اس کے کیا مندرجات ہیں۔

دفاعی ضروریات کے سلسلے میں نئے ایف 16 طیاروں کی خریداری سے تو صدر بش نے ہی نفی میں جواب دے دیا تھا۔ اس آفیسر نے اپنی بریفنگ میں کہا کہ دفاع اور معیشت دونوں شعبوں میں پاکستان اور امریکہ اب مذاکرات کریں گے۔ پاکستان کی دفاعی ضروریات بہت ہیں امریکہ اس پر تفصیلی بات چیت کرے گا پہلی ضرورت تو یہ ہوگی کہ اس کے پاس ایف 16 کے جو موجودہ فلیٹ ہیں۔ ان کی دیکھ بھال، مرمت اور ان کی صلاحیتوں میں اضافہ۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے دفاعی شعبے ہیں۔ جن میں امریکہ تعاون کرسکتا ہے اور نئے ایف 16 کا معاملہ اتنا ترجیحی بھی نہیں رہتا۔

اسی آفیسر نے سوال جواب میں کہا کہ کشمیر کا مسئلہ زیر بحث آیا اور بلکہ کافی دیر تک رہا۔ صدر مشرف نے زور دے کر بتایا کہ سرحد پار مداخلت کے خلاف انہوں نے بہت موثر اقدامات کئے ہیں اور انہیں یقین ہے کہ اب پاکستانی کشمیر کے اندر دہشت گردی کے کوئی کیمپ نہیں ہیں اور اب پاکستان، بھارت سے مذاکرات چاہتا ہے۔ اس آفیسر کے مطابق امریکہ کا موقف یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ پاکستان اور بھارت مل کر اپنے مسائل حل کریں اور اگر اس دوران کوئی کردار امریکہ ادا کرسکتا ہے تو ہم وہ کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن یہ بنیادی ذمہ داری پاکستان اور بھارت ہی کی ہے کہ وہ امن کی طرف باہمی طور پر قدم بڑھائیں۔ سینئر امریکی افسر نے خالصتاً امریکی نقطہ نظر سے معاملات کی وضاحت کی ہے۔ پاکستان کی طرف سے اتنی کھل کر وضاحت نہیں کی گئی۔ پاکستان کے حکام کی طرف سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ اس امدادی پیکیج سے شرائط منسلک نہیں ہیں۔ حالانکہ اس وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ سیکرٹری خارجہ نے کہا کہ کسی دباؤ کا تاثر غلط ہے۔ کوئی پابندیاں عائد نہیں کی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ دہشت گردی کے خاتمے میں پاکستان کا کردار بہت بھرپور رہا ہے۔ ہم نے القاعدہ کے 500 سے زیادہ اہم ارکان گرفتار کر کے امریکہ کے حوالے کیے ہیں۔ پاک، بھارت تعلقات کے ضمن میں ان کا کہنا تھا اس سلسلے میں پاکستان نے زیادہ سے زیادہ اقدامات

کئے ہیں۔ سرحد پار دہشت گردی کے خاتمے کے لیے ہماری کوششیں دنیا کے سامنے ہیں لیکن ہم اس کی بندش کی 100 فی صد گارنٹی نہیں دے سکتے۔ اب بھارت کا فرض ہے کہ وہ یقین دلائے کہ کشمیر میں انسانی حقوق کی پامالی نہیں ہوگی۔ کشمیری رہنماؤں کو آپس میں بات چیت کی آزادی دی جائے گی۔ سوالات کے جوابات میں بھی سیکرٹری خارجہ نے زیادہ تفصیلات میں جانے کی زحمت نہیں کی۔ افغانستان، عراق، مشرق وسطیٰ کے امور کا سرسری ذکر کیا۔ اس بات پر زور زیادہ تھا کہ کیمپ ڈیوڈ میں بڑے پر جوش ماحول میں بات چیت ہوئی۔ دونوں وفود دوستانہ اور بے تکلفانہ انداز میں مصروف گفتگو رہے۔ کوئی باقاعدہ طے شدہ ایجنڈا نہیں تھا۔ دونوں لیڈروں کی تنہائی میں 22 منٹ تک بات چیت ہوئی۔

وزیر خارجہ شوکت عزیز نے اپنے حصے یعنی اقتصادی شعبے پر کھل کر بتایا کہ اس امداد میں 50 فیصد اقتصادی امداد ہے۔ جو سماجی شعبے کے لیے وقف ہوگی۔ اس کا 2/3 پاکستان قرضوں کی ادائیگی کے لیے بھی استعمال کرسکتا ہے۔ ہمارے بہتر اقتصادی حالات کے باعث چونکہ ہماری ریٹنگ بہتر ہوگئی ہے اس لیے قرضے اتارنے میں ہمیں اور آسانی ہوگی۔ ہماری کوشش ہوگی کہ ہم امریکہ کے سارے قرضے اتار دیں اور تجارت کی آزادی سے فائدہ اٹھائیں۔ سماجی شعبے میں رقوم زیادہ تر تعلیم وصحت اور خوراک پر خرچ ہوں گی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ سرمایہ کاری کے لیے ہونے والے معاہدے سے پاکستانی تاجروں کو امریکہ کی مضبوط اور بڑی معیشت میں داخلے کا موقع مل سکے گا۔

انہوں نے بریفنگ میں سوالات کے جوابات دیتے ہوئے ان رقوم کی تفصیلات بھی بتائیں جو ان 3 ارب ڈالر میں شامل نہیں ہیں۔ جن میں 100 ملین ڈالر تعلیم کے لیے جاری ہوچکے ہیں۔ 120 ملین ڈالر کے لیے درخواست زیر غور ہے۔ اس کے علاوہ 389 ملین ڈالر دوسرے شعبوں کے لیے زیر غور ہیں۔ وہ بھی اس پیکیج سے الگ ہیں۔ شوکت عزیز صاحب کا استدلال یہ تھا کہ رقم اتنی اہم نہیں ہے، جتنی سودمند بات یہ ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان اقتصادی شعبے میں تعلقات گہرے اور وسیع ہو رہے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اس رقم کے حصول اور خرچ کے طریق کار پر امریکی حکام سے مذاکرات ہوتے رہیں گے اور تفصیلات ان

میں طے ہوں گی۔ انہوں نے کہا ہم باہمی تعاون کو زیادہ اہمیت دیں گے۔

3ارب ڈالر کی کیا تقسیم ہوگی۔ کس طرح ملیں گے۔ ملنے میں کیا کیا رکاوٹیں پڑ سکتی ہیں۔ یہ تمام امور یقیناً آپ کے سامنے آ گئے ہوں گے۔ تین بڑے شعبے بتائے گئے ہیں۔ 1۔ دہشت گردی کا خاتمہ۔ 2۔ ایٹمی ہتھیاروں کا عدم پھیلاؤ۔ 3۔ جمہوریت کی طرف تیز پیش قدمی۔ ان تینوں سے کسی پاکستانی کو اختلاف نہیں ہو سکتا ہے۔ دہشت گردی کا خاتمہ ہم سب چاہتے ہیں۔ صدر پاکستان اور حکومت پاکستان اس کے لیے ضروری اقدامات کر رہے ہیں۔ ایٹمی ہتھیاروں کا پھیلاؤ روکنے کے لیے پاکستان اپنی سی کوششیں کر رہا ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ عہد بھی ہے کہ بھارت جیسے بڑے ملک کی طرف سے سلامتی کو لاحق خطرات کے لیے کم از کم ایٹمی ڈیٹرنٹ ضرور رکھیں گے۔ جمہوریت کی طرف پیش قدمی یقیناً جاری ہے۔

انہیں شرائط نہیں کہا گیا لیکن یہ تو کہا گیا کہ ان شعبوں میں معالات خراب ہونے پر امداد رُک سکتی ہے۔ امداد ہو یا نہ ہو۔ ان شعبوں میں پیش رفت تو پاکستان کے عوام ہر صورت میں چاہتے ہیں۔ کیونکہ یہ بالآخر ان کے مفاد میں ہی ہیں۔

آیئے۔ کیمپ ڈیوڈ چلتے ہیں

یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ امریکی صدر نے صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف کو کیمپ ڈیوڈ میں مدعو کیا ہے۔

لیکن کیمپ ڈیوڈ جانے والوں کا کیا انجام ہوا ہے۔

زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

پاکستانی سفارت خانے نے یہ کہا تھا کہ صبح ساڑھے پانچ بجے روانگی ہوگی۔ صدر پاکستان اور ان کے وفد کے ارکان ہیلی کاپٹرز سے کیمپ ڈیوڈ پہنچیں گے۔ اخبار نویسوں، ٹیلی ویژن والوں کو گاڑیوں سے لے جایا جائے گا۔ دو ڈھائی گھنٹے کا سفر ہے۔ مجھے شملہ یاد آ رہا ہے وہاں بھی چنڈی گڑھ سے صدر ذوالفقار علی بھٹو ہیلی کاپٹر سے شملہ چلے گئے تھے۔ اخبار نویسوں کو گاڑیوں میں لے جایا گیا تھا اور بھی نہ جانے کتنے ایسے اسائنمنٹ یاد آ رہے تھے۔ جب صحافیوں کو سڑک سے لے جایا جاتا ہے۔ سربراہان مملکت طیاروں یا ہیلی کاپٹروں سے پہنچ جاتے ہیں۔ ایک وزیر اعظم کے دور میں منظور نظر صحافیوں کو ہیلی کاپٹر سے لے جایا جانے لگا تھا، تو وہ یار لوگوں نے ان صحافیوں کو ہیلی کاپٹر گروپ کا نام دے دیا تھا۔

واشنگٹن سے مضافات کو آنے والی شاہراہ گاڑیوں سے بھری ہوئی ہے۔ لگ رہا ہے کہ ساری دنیا واشنگٹن آ رہی ہے۔ مقامی صحافیوں نے بتایا کہ واشنگٹن میں رہائش مہنگی بھی ہے اور

کمیاب بھی۔ اس لیے کافی لوگ مضافاتی علاقوں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ اچھے گھر کم قیمت یا کم کرائے پر مل جاتے ہیں۔ یہ سب لوگ صبح صبح واشنگٹن کا رخ کرتے ہیں۔ دونوں طرف ہریالی ہے، سرسبز پہاڑ، سربلند پیڑ اوراب شاہراہ سے مڑکر ہم درختوں میں گھری تنگ سڑک پر آ گئے ہیں۔ میری لینڈ کے علاقے میں واقع کیمپ ڈیوڈ تک بل کھاتی سڑک پر رواں گاڑیاں چند ایک ہی ہیں۔ کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی ندیاں بھی گنگناتی نظر آتی ہیں۔ آنکھوں میں طراوت آ رہی ہے کچھ چڑھائی کے بعد درختوں کے ایک جھنڈ کے درمیان وہ جگہ آ گئی ہے جہاں سب مہمان اکٹھے ہوگئے ہیں۔ امریکی بھی، امریکہ میں مقیم پاکستانی نمائندے بھی اور پاکستان سے آئے ہوئے اخبار نویس بھی۔ سی این این والے پورے لاؤلشکر، وین، ڈشوں سمیت موجود ہیں۔ انہیں خصوصی طور پر براہ راست نشریات کی اجازت دی گئی ہے۔ عارضی طور پر پریس سینٹر یہیں قائم کیا گیا ہے۔ کمپیوٹر، انٹرنیٹ، فون، فیکس فراہم کیے گئے ہیں۔ یہاں سے سیکورٹی چیکنگ کے بعد امریکی اور پاکستانی صحافیوں کو بسوں کے ذریعے کیمپ ڈیوڈ لے جایا جائے گا۔

واشنگٹن سے قریباً 70 میل کے فاصلے پر سطح سمندر سے 1800 فٹ بلند اس علاقے کو ایک امریکی صدر فرینکلن روز ویلٹ نے تفریحی صدر مقام کے طور پر پسند کیا تھا۔ یہ 1942ء کی بات ہے۔ دوسری جنگ عظیم جاری تھی۔ عسکری مصروفیات کے دباؤ سے کچھ آرام پانے کے لیے یہ طے ہوا تھا کہ ایک پرفضا ماحول ہو، جو واشنگٹن سے زیادہ دور بھی نہ ہو اور عام لوگوں کی رسائی میں بھی نہ ہو۔ تین چار مقامات دکھائے گئے۔ میری لینڈ میں تھرماؤنٹ کے نزدیک کیٹوسن ری کریشنل ڈیمانسٹریشن ایریا میں پہلے سے کیبن بنے ہوئے تھے۔ امریکی محکمہ قومی باغات کے زیر انتظام یہ علاقے عوامی تفریح گاہ کے طور پر استعمال ہوتے تھے روز ویلٹ نے اس کا نام شنگریلا رکھا تھا دوسری جنگ عظیم کے سلسلے میں کئی تاریخی فیصلے یہاں کئے گئے اس اہمیت کے پیش نظر اس مقام کو مستقل تفریحی صدر مقام کی حیثیت دیدی گئی۔ بعد میں آنے والے امریکی صدرور نے بھی واشنگٹن کی گرمی، وائٹ ہاؤس کی گرما گرمی، سرکاری دفاتر کی گہما گہمی سے دور قدرے پرسکون، پرفضا ماحول میں سوچ بچار اور باہمی مشاورت کے لیے یہیں وقت گزارنا مناسب سمجھا۔ صدر آئزن ہاور نے اس کا نام شنگریلا کی بجائے اپنے پوتے جان

ڈیوڈ کے نام پر کیمپ ڈیوڈ رکھ دیا۔ امریکی صدور نے اہم فیصلہ کن مواقع پر بعض غیرملکی مہمانوں سے مذاکرات کے لیے بھی اس مقام کا انتخاب کیا۔ سب سے پہلے آنے والے غیرملکی سربراہ حکومت برطانیہ کے وزیراعظم سرونسٹن چرچل تھے۔ روسی وزرائے اعظم خردشچیف، برزنیف بھی یہاں آنے والوں میں شامل ہیں۔

مسلم سربراہوں میں یہاں سب سے پہلے مصر کے صدر سادات ستمبر 1978ء میں آئے اورمشہور زمانہ کیمپ ڈیوڈ سہ فریقی سربراہی مذاکرات۔ امریکی صدر کارٹر، مصری صدر سادات، اسرائیلی وزیراعظم بیگن کے درمیان ہوئے جس سے مشرق وسطیٰ کی تاریخ ہی بدل گئی۔ عالم اسلام کے لیے کیمپ ڈیوڈ پھر ایک بار 23 جولائی 2000ء کو مرکز توجہ بنا جب صدر کلنٹن نے فلسطین کے چیئرمین یاسرعرفات اور اسرائیلی وزیراعظم بارک کو یہاں مدعو کیا اور اب جون 2003ء میں صدر پرویزمشرف جنوبی ایشیا کے پہلے سربراہ ہیں جنہیں کیمپ ڈیوڈ میں مدعو کیا گیا ہے۔ تاریخ کے طالب علم تو یہ توقع کررہے تھے کہ امریکی صدر، پاکستانی صدر یا وزیراعظم کے ہمراہ۔ بھارت کے وزیراعظم کو بھی مدعو کریں گے اور کشمیر کے دیرینہ مسئلے کو حل کرنے کا اعلان کیا جائے گا۔

کیمپ ڈیوڈ کی سیکورٹی امریکی بحریہ کے ذمہ ہے۔ دنیا میں جیسے جیسے دہشت گردی کی وارداتیں بڑھ رہی ہیں سیکورٹی انتظامات بھی سخت ہوتے جارہے ہیں۔ اہم شخصیتوں کی ہلاکتوں میں اخبار نویسوں، فوٹوگرافروں کو بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے اخبار نویسوں اور فوٹوگرافروں کو بھی چیکنگ کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ عام سرکاری دفاتر میں بھی شناخت کے لیے دستاویزات دکھانی پڑتی ہیں۔ جہاں سربراہان مملکت ہوں وہاں تو کئی کئی میل کا علاقہ چیکنگ کے حصار میں آ جاتا ہے۔ اس قسم کی چیکنگ اب امریکہ کیا ہر ملک میں کی جارہی ہے۔ پاکستان میں بھی ایوان صدر، ایوان وزیراعظم اور غیرملکی سفارت خانوں میں یہی ہورہا ہے۔

کیمپ ڈیوڈ میں سیکورٹی پر مامور کرنل ہنگلے نے پہلے تمام امریکی اور پاکستانی صحافیوں سے خطاب کیا جوتحریری طور پر بھی تقسیم کیا گیا تھا۔ جس میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ کیمرے، ٹیپ ریکارڈ، اسی وقت ہی استعمال ہوسکتے ہیں جب اس کی اجازت دی جائے۔ صرف لازمی

سامان ساتھ لے جاسکتے ہیں۔ جو بھی کیمپ میں جائے گا اس کی تلاشی لی جائے گی۔ راستے میں متعین میرین سپاہیوں کی تصویریں نہیں لی جاسکتیں۔ کیمپ ڈیوڈ میں کوئی اسلحہ، بندوق، چاقو، کیمیکل اسپرے، الکحل یا دھماکہ خیز اشیاء نہیں لے جائی جاسکتیں۔ کیمپ ڈیوڈ میں تمبا کونوشی منع ہے، کیمپ کے نزدیک کیمپ کے اندر موبائل فون بھی استعمال نہیں ہوسکتا۔

یہاں کچھ سوال جواب بھی ہوئے۔ جن کا ماحصل یہی تھا کہ کیمپ ڈیوڈ کی حدود میں نہ تو کمپیوٹر استعمال ہوسکے گا۔ نہ موبائل فون۔

ایک ایک امریکی اور پاکستانی صحافی کا اس کے نام اور کسی شناختی ثبوت سے موازنہ کرکے ایک ہال میں داخل ہونے دیا جارہا تھا۔ جہاں کیمرے، بیگ، دوسرا سامان ایک طرف ترتیب سے رکھا جارہا تھا۔ دوسری طرف ذاتی تلاشی کے عمل سے گزارا جارہا تھا۔ دونوں بازو بلند کرکے پہلے سیدھے، پھر الٹے، مشین سے اسکیننگ کی جارہی تھی اپنا سامان چھوڑ کر سب دوسرے ہال میں جمع ہوگئے۔ اتنی دیر میں ٹیلی ویژن کیمرے، اسٹینڈ، بیگ، کیمرے چیک کیے۔ اس چیکنگ میں کتے مرکزی کردار ادا کررہے تھے۔ پھر یہ نوید سنائی گئی کہ اپنا اپنا سامان اٹھا کر بحریہ کی بسوں میں بیٹھا جائے۔ ایک بس امریکی صحافیوں کے لیے تھی۔ دوسری بس پاکستانی صحافیوں کے لیے۔ گھنے سایہ دار پیڑوں میں سے آہستہ آہستہ بسیں کیمپ ڈیوڈ تک جا پہنچیں۔ یہاں سے پھر سیکورٹی شروع ہوئی رکاوٹ آتی تھی۔ امریکی فوجی بس میں بیٹھے فوجی سے کوڈ میں گفتگو کرتے تھے اور اجازت دیتے تھے۔ چار رکاوٹیں عبور کرنے کے بعد امریکی صدر کے ہیلی کاپٹر دکھائی دیئے۔ وہاں بسیں روک دی گئیں۔ امریکی میرینز کی قیادت میں صحافیوں کے لیے مخصوص احاطے میں امریکی پاکستانی کھڑے ہوگئے۔ پہلے سے بتایا گیا تھا کہ جب دونوں صدور آجائیں۔ تب کیمرے چل سکتے ہیں اور صرف دو دو سوال ہوں گے۔ دو امریکی صحافیوں اور دو پاکستانیوں کی طرف سے۔ اس کے بعد کا حال تو آپ نے یقیناً ٹی وی پر دیکھا ہوگا۔ دونوں صدور نے کیا کہا۔ کتنے اہم اعلان ہوئے۔ دونوں ہشاش بشاش اور بے تکلفانہ انداز میں۔ ٹائی کسی نے بھی نہیں لگائی تھی۔

میں دیکھ رہا تھا۔ کیمپ ڈیوڈ جہاں کروڑوں افراد کی تقدیر کے فیصلے کئے جاتے ہیں۔

فلسطینیوں، مصریوں، اسرائیلیوں کا مستقبل یہاں لکھا گیا۔ اب ایک طرف دنیا کا طاقتور ترین شخص۔ سب سے بڑی بلکہ واحد طاقت امریکہ کا صدر ہے اور دوسری طرف پاکستان کا طاقتور ترین شخص۔ معلوم نہیں ان کو احساس بھی ہے کہ نہیں کہ دنیا کی نگاہیں ان پر لگی ہیں۔ ان کی سوچیں۔ ان کے الفاظ تباہی بھی لاسکتے ہیں، تہذیبوں کو بچا بھی سکتے ہیں۔

دونوں صدور کی گفتگو اور سوال جواب 22 منٹ میں تمام ہوگئے۔ ہمارا کیمپ ڈیوڈ تو صرف 22 منٹ کا تھا 22 منٹ کے لیے ہم نے کتنا طویل سفر کیا۔ صبح سویرے جاگے، اور پھر اب گاڑیوں سے واپسی ہوگی لیکن صحافت تو یہی ہے۔ بعض اوقات صرف 2 منٹ کی خبر کے لیے کئی کئی گھنٹے کھڑے رہنا پڑتا ہے۔

واپس آکر سب فون پر فیکس انٹرنیٹ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جس نے پہل کی۔ اس کی خبر پہلے پہنچ گئی۔

3 ارب ڈالر کیسے ملیں گے۔ کتنی قسطیں ہوں گی۔ کیا یہ اونٹ کے منہ میں زیرہ ہے۔ کیا اس کے ساتھ شرائط ہیں۔ اور ایسی ہی چہ میگوئیاں۔ میں ان پیڑوں پر رشک کررہا تھا۔ جو اپنے سامنے تاریخ کو بنتے بگڑتے دیکھتے رہے ہیں۔ کتنی کہانیاں ان کے سینے میں چھپی ہوں گی۔ کتنے راز ابھی تک افشا نہیں ہوئے ہوں گے اور نہ جانے آئندہ کتنی نسلوں کی تقدیر کے فیصلے کیمپ ڈیوڈ میں ہوں گے۔

امریکہ میں مقیم عظیم پاکستانی برادری

11 ستمبر کے بعد امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کو انتہائی خوفناک حالات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ پاکستان نے دہشت گردی کے خاتمے کے لیے امریکہ کے سب سے بڑے اتحادی کی حیثیت سے ساتھ دیا ہے۔ امریکہ میں دہشت گردی کے واقعات میں کوئی پاکستانی ملوث نہیں پایا گیا۔ پاکستانی برادری بالعموم بڑی محنتی، قانون کی پابند اور اپنی صلاحیتوں کو بہترین انداز میں بروئے کار لاتی ہے۔ پاکستانی طلبہ اپنی توجہ پڑھائی پر مرکوز رکھتے ہیں۔ ان کے نتائج ہمیشہ اچھے رہے ہیں۔ صدر پاکستان ریاستہائے متحدہ امریکہ انسٹی ٹیوٹ برائے امن میں اپنی تقریر میں امریکہ میں مقیم عظیم پاکستانی برادری کو درپیش خطرات پر اظہار خیال کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے صدر جارج بش سے بھی پاکستانی برادری سے امتیازی سلوک پر بھرپور انداز میں شکایت کی ہے اور ان سے خاص طور پر کہا ہے کہ جب پاکستانی کسی واقعے میں ملوث نہیں پائے گئے تو ان کے ساتھ ایسا سلوک کیوں جا رہا ہے۔ نئے طلبہ کو ویزے نہیں دیئے جا رہے ہیں، طلبہ اور ان کے والدین بے عزتی اور ہراساں کئے جانے کے خوف کی وجہ سے امریکہ آنے میں ہچکچاتے ہیں۔ امیگریشن کا عملہ بھی انہیں یہ محسوس نہیں ہونے دیتا کہ انہیں وہاں خوش آمدید کہا جا رہا ہے جن لوگوں کو سیمینار ٹیں دعوت دی جاتی ہے یا جو تجارتی وفود امریکہ آنا چاہتے ہیں انہیں یا تو ویزا نہیں دیا جاتا یا غیر معمولی طور پر انتظار کرایا جاتا ہے۔ اس طرح پاکستان کے لیے جاری

کردہ سفری ہدایات (travel advisary) بڑھتی ہوئی تجارت میں رکاوٹ ڈال دیتی ہیں۔ صورتحال بہتر ہونی چاہئے، کیونکہ اس سے پاکستان میں منفی اثرات ہو رہے ہیں۔

صدر پاکستان نے اہم امریکی شخصیتوں کی ایک بڑی تعداد کے سامنے واضح الفاظ میں کہا کہ میں یہ بات امریکہ کے ایک مخلص دوست کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں۔ مجھے جھجکنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ صدر بش جو اسی طرح دردمند انسان ہیں اور اسی طرح پاکستان کے مخلص دوست ہیں ان کی گفتگو سے ظاہر ہوا کہ وہ بھی اس مسئلے کو اسی تناظر میں دیکھتے ہیں۔

صدر پاکستان نے ایک دو اور مواقع پر بھی پاکستانیوں کو درپیش صورتحال پر تشویش کا اظہار کیا۔ پاکستانی اخبار نویسوں سے گفتگو کے دوران ایک صحافی کی طرف سے اس مسئلے پر توجہ دلانے پر انہوں نے کہا کہ ہم اس معاملے کا جائزہ لے رہے ہیں۔ انہوں نے وہیں موجود پاکستانی سفیر اشرف جہانگیر قاضی کو بھی ہدایت کی کہ وہ پاکستانیوں سے ملیں، ان کے مسائل جانیں، پھر امریکی حکومت سے بات کریں۔

واشنگٹن اور نیویارک میں پانچ چھ دن کے مختصر سے قیام کے دوران ہمیں زیادہ پاکستانیوں سے ملنے کا موقع نہیں مل سکا لیکن جتنے بھی ہم وطن ملے ان سے تبادلہ خیال سے یہ علم ہوا کہ اب حالات نسبتاً بہتر ہیں۔ 9/11 کے فوراً بعد تو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا ایک بڑی تعداد کے کاروبار بھی تباہ ہوگئے۔ مجموعی طور پر تو مسلمانوں کے خلاف ایک لہر اٹھی تھی، پاکستانی بھی اس کی زد میں آئے۔ امریکہ میں امیگریشن کے قوانین میں بہت سی تبدیلیاں لائی گئیں۔ پہلے جس طرح پاکستانی یا دوسرے ملکوں کے مسلمان آ کر یہاں بس جاتے تھے۔ چند ایک غیر قانونی طور پر بھی کام کرتے رہتے تھے۔ گرین کارڈ کے لیے درخواست دے کر فیصلے کے منتظر رہتے تھے، سیاسی پناہ مانگ کر بیٹھے رہتے تھے۔ اب وہ حالات نہیں رہے ہیں۔ نئے تارکین وطن کی آمد تو فی الحال ناممکن ہی ہوگئی ہے۔ رجسٹریشن کے قانون نے بہت دشواریاں پیدا کی ہیں۔ بعض پاکستانی انجمنیں، ہمدرد پاکستانی شخصیتیں، پاکستانی وکلاء اپنے ہم وطنوں کی مدد کر رہے ہیں۔ قانونی طور پر ان کے لیے تعاون فراہم کر رہے ہیں لیکن پاکستانی سفارت

خانے کے لیے کسی پاکستانی سے اچھے کلمات سننے کو نہیں ملے۔

پاکستانی سفارت خانہ......... نئے سفارتی علاقے میں نئی بلڈنگ میں منتقل ہو چکا ہے۔ کافی حد تک اسے اسلامی طرز تعمیر کا نمونہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ پاکستان کا اپنا طرز تعمیر تو ابھی تک طے ہی نہیں ہے۔ کوشش کے باوجود ہمیں تفصیلات نہیں مل سکی تھیں کہ آرکیٹیکٹ کون تھے۔ اس کی تعمیر کتنے عرصے میں مکمل ہوئی، کتنا پیسہ خرچ ہوا، صدر پاکستان نے ایک انتہائی گرم سہ پہر کو اس کا باقاعدہ افتتاح کیا جس میں امریکہ کے وزیر دفاع اور اٹارنی جنرل جیسی اہم شخصیتیں بھی شریک ہوئیں۔ واشنگٹن میں مقیم کچھ پاکستانی بھی موجود تھے۔ خانم گوہر اعجاز، اعجاز اے خان دکھائی دیے۔ واشنگٹن میں مسلم لیگ قائد اعظم کے مرکزی رہنما چوہدری شمشاد احمد، چوہدری ظفر اقبال اور حافظ ضیا بھی تھے، ممتاز اقتصادی ماہر شاہد جاوید برکی سے بھی سلام دعا ہوئی۔ پاکستان میں امریکہ کے سابق سفیر مائیلم بھی پاکستان کو یاد کر رہے تھے۔ سفارت خانے کے مرکزی ہال میں ابوالحسن اصفہانی سے لے کر ملیحہ لودھی تک مختلف ادوار میں متعین امریکہ میں پاکستانی سفیروں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ جن میں محمد علی بوگرہ بھی تھے جو واشنگٹن سے پاکستان میں آکر سیدھے وزیر اعظم بن گئے تھے۔ پاکستان کے سفار خانے کے بالکل سامنے سڑک پار اسرائیل کا سفارت خانہ ہے۔ ایک طرف ملائیشیا والے ہیں۔ سیکورٹی بہت سخت تھی۔ سفارت خانے سے کافی فاصلے پر سڑک سے بہت پیچھے ہٹ کر مسلم لیگ (ن) کی طرف سے چھ سات افراد پلے کارڈ لیے کھڑے تھے، مکمل جمہوریت کی بحالی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ یہاں کسی مظاہرے کے لیے کئی روز پہلے باقاعدہ پرمٹ لینا پڑتا ہے اور مظاہرہ اس ڈسپلن کے ساتھ ہوتا ہے کہ ٹریفک کی روانی میں خلل نہ پڑے۔ امریکہ میں مقیم پاکستانی صحافی بھی عام پاکستانی شہریوں کی طرح سفارتی عملے کے سلوک سے نالاں تھے۔ ملاقات تو کجا ان سے فون پر رابطہ بھی مشکل ہوتا ہے۔ سیکرٹری خارجہ سے بھی باضابطہ شکایات کی گئیں کہ وہ پاکستان کی نمائندگی کرنے والے پاکستان کے شہریوں کے ٹیکسوں سے تنخواہ پانے والے سول سرونٹس (شہری خادمین) کو اپنے فرائض صحیح طریقے سے انجام دینے کے پابند کریں۔

صدر پاکستان تو چاہتے ہیں کہ یہاں مقیم پاکستانی برادری امریکہ اور پاکستان کے

درمیان پل کا کردار ادا کرے۔ یقیناً ایسا ہو بھی سکتا ہے لیکن پاکستانی سفارتی اہلکاروں کو حقیقی معنوں میں پاکستان کا خادم بننا پڑے گا اور پاکستانی برادری سے فعال رابطہ رکھنا ہوگا۔ صدر پاکستان کے ساتھ دورے پر گئے ہوئے صحافیوں نے خود بھی محسوس کیا کہ سفیر سمیت سفارتی عملے کا رویہ دوستانہ نہیں تھا۔ ویسے تو دوسرے ممالک میں بھی پاکستانی سفارت خانوں کے بارے میں یہی گلے شکوے رہتے ہیں۔ اب پاکستان کو عالمی برادری میں جو وقار اور اہم مقام مل رہا ہے اسے برقرار رکھنے کے لیے اور ان ملکوں میں مقیم پاکستانیوں کو بھی اسی وقار کی علامت بنانے کے لیے سفارت کاروں کو اپنے رویے میں تبدیلی لانا ہوگی۔ انہیں بھی "سب سے پہلے پاکستان" کی ترجیح کو اختیار کرنا ہوگا۔ امریکہ میں مقیم پاکستانیوں میں کھرب پتی بھی ہیں، ٹیکنوکریٹ بھی، ڈاکٹرز بھی، وکلاء بھی، پروفیسرز بھی، آئی ٹی اور اپنے اپنے شعبوں کے ماہرین بھی، جو امریکی سوسائٹی میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ رشید چوہدری جیسے بڑے صنعت کار بھی ہیں جنہوں نے اپنے گھروں میں پاکستان بسا رکھا ہے۔ پاکستان کا تمدن، تہذیب، رکھ رکھاؤ یہاں بھی موجود ہے اور ایسی اہم امریکی شخصیتوں سے ذاتی تعلقات استوار کیے ہیں جو صدارت کے عہدے تک جا پہنچتی ہیں۔ آئی ٹی میں صفی قریشی، ضیا چشتی جیسی شخصیتیں ہیں۔ ڈاکٹرز میں قابل احترام نام ہیں۔ عام محنت کش، ٹیکسی ڈرائیور، ریستورانوں میں ملازم پاکستانی بھی اپنی ایمانداری اور تگ ودو سے پاکستان کا نام بلند رکھتے ہیں۔ سفارت خانے اور قونصل خانوں میں اگر پاکستان سے حقیقی محبت کا جذبہ رکھنے والے سفیر، قونصل جنرل، پریس اتاشی، ویلفیئر اتاشی موجود ہوں جو ایک طرف پاکستانی برادری کو بھی مکمل احترام دیں ان کو فعال رکھیں، ان کے مسائل کو حل کروائیں، دوسری طرف امریکی صحافیوں، تاجروں، صنعتکاروں سے بھی ملیں جلیں۔ امریکہ کی اقدار اور تہذیبی معیار کے اعتبار سے اس معاشرے میں اپنے راستے بنائیں تو پاکستان اور امریکہ کے تعلقات اور زیادہ معروضی ہو سکتے ہیں۔ پاکستان سفارت خانے کو یہ فریضہ بھی انجام دینا ہوگا کہ امریکہ میں اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں ان کو دور کرنے کے لیے اسلام کی تعلیمات کو مثبت انداز میں پیش کرنے کے لیے موثر کوششیں کی جائیں۔ اسکالرز کے وفود کے تبادلے ہونے چاہئیں۔ امریکی اخبارات و رسائل میں ایسی تحریریں شائع

کروائی جائیں۔ امریکی سفارت خانے میں تقرری، سفارشوں اور بڑی شخصیتوں سے رشتوں کے حوالے سے نہ ہوں بلکہ خالصتاً میرٹ پر ہوں۔ اس وقت پاکستان کے سامنے انتہائی مشکل ایجنڈا ہے۔ امریکہ اور مغرب میں پاکستان کا وقار بلند رکھنے کے لیے قابل، ذہین اور جارحانہ حد تک پاکستانیت کے جذبے سے سرشار سفارت کاروں کو امریکہ اور دوسرے بڑے ملکوں میں متعین کیا جائے۔ ایک یہ اچھا فیصلہ ہوا کہ واشنگٹن میں پرانے سفارت خانے کی عمارت میں ''جناح سینٹر'' قائم کیا جائے گا۔ اس بلڈنگ کو فروخت نہیں کیا جائے گا۔ یہاں پاکستانی برادری اپنے اجتماعات منعقد کر سکے گی۔ یہاں ایک دارالمطالعے کے قیام کی تجویز بھی ہے۔ یہ بھی مشورہ دیا گیا ہے کہ پاکستان کے حوالے سے تحقیقی مطالعے کی سہولتیں بھی یہاں فراہم کی جائیں۔ پاکستانی کہیں بھی ہوں۔ اپنی محنت اور تخلیقی صلاحیتوں کے حوالے سے ممتاز ہوتے ہیں۔ اپنے طور پر یہ لوگ پاکستانیوں اور امریکیوں کے درمیان مفاہمت کی تعمیر کے لیے کوششیں بھی کرتے رہتے ہیں۔ پاکستانی برادری کے اپنے مسائل کو بھی حل کرواتے ہیں۔ پاکستانیوں کو امریکی قوانین سے بھی متعارف کرواتے ہیں۔ ادھر مقامی حکومتوں کے امریکی اہلکاروں سے بھی رابطہ رکھتے ہیں۔ 11 ستمبر کے بعد جب پاکستانیوں اور امریکیوں میں تلخیاں پیدا ہوئیں۔ امریکہ میں پاکستانیوں کے حالات پر پاکستان میں تشویش ہوئی تو پاکستانی امریکی برادری کا ایک وفد پاکستان آیا تھا اور یہاں اہم سیاسی حلقوں کے سامنے صحیح حالات رکھے تھے۔ ان میں آغا افضل خان، وکیل انصاری اور دوسری نمایاں شخصیتیں شامل تھیں۔ اب ان حلقوں کی کوشش ہے کہ پاکستان سے صحافیوں اور دانشوروں کے وفود امریکہ آئیں اور امریکی معاشرے میں اپنا جائز مقام حاصل کرنے کے لیے طریق کار وضع کرے۔ پاکستانی سفارت خانہ اس میں تعاون کرے۔ ایک نوجوان صحافی سمیع اللہ بالٹی مور میں ملے۔ فی الحال تو وہ بزنس مین بنے ہوئے ہیں۔ ان کے خیالات بڑے معروضی اور حقیقت پسندانہ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ امریکیوں کو قائل کرنے کے لیے ان کی اقدار کو سمجھنا ضروری ہے، ہم اپنے کلچر کے مطابق کام کر کے ان کو اپنا موقف نہیں سمجھا سکتے۔ نیویارک میں کراچی کے پرانے سیاسی کارکن رمضان رانا، اے آر رانا۔ مجاہد رانا سے ملاقاتیں رہیں۔ وکیل انصاری اور دوسرے احباب نے عجلت میں ممتاز پاکستانی

تاجروں، شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کی ایک تقریب منعقد کی۔ جس میں صدر پاکستان کا دورہ امریکہ زیر بحث رہا۔ پاکستان میں جمہوری حکومت کی کارکردگی کا ذکر بھی ہوا۔ سب کی دعا تھی کہ جمہوری تجربہ کامیاب ہو۔ پاکستان اقتصادی طور پر ترقی کرے، سیاسی جماعتیں ٹھوس سیاسی اور معاشی پروگرام بنائیں اپنے کارکنوں کو جائز مقام دیں۔ امریکہ میں مقیم پاکستانی نئی نسل سے تعلق رکھتے ہوں یا پرانی نسل سے، پاکستان میں امن وامان کے قیام۔ فرقہ پرستی سے نجات، دہشت گردی کے خاتمے اور جمہوری اداروں کے استحکام کے لیے ایک جیسا درد اور فکر مندی رکھتے ہیں۔ حکومت پاکستان اگر ملک کے اندر سرمایہ کاری کے لیے آسان اور محفوظ مواقع فراہم کرے تو یہ پاکستانی اربوں ڈالر لے کر وطن آنا چاہتے ہیں۔ پہلے جیسے پاکستان سے امریکہ آ کر کاروبار شروع کرنے کی خواہش ہوتی تھی۔ اس طرح اب وہ لوگ جن کے بزنس امریکہ میں کامیاب چل رہے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ وطن میں بھی کچھ کاروبار شروع کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ سرکاری اہلکاروں سے ڈرتے ہیں۔ اگر انہیں یہ اعتماد ہو کہ انہیں مختلف دفتروں کے چکر نہیں لگانا پڑیں گے، مختلف سرکاری افسروں اور ملازمین کو رشوت نہیں دینا ہوگی تو وہ معقول سرمایہ یہاں لگا سکتے ہیں۔ اس طرح اگر پاکستان کا سفارت خانہ اپنے فرائض معروضی طور پر انجام دے تو امریکہ میں مقیم پاکستانی برادری واقعی پاکستان اور امریکہ کے درمیان ایسے پل کا کردار ادا کر سکتی ہے جس سے دین اسلام کے بارے میں بھی غلط تاثرات دور کیے جا سکیں۔ پاکستانیوں کو ہراساں کرنے کا سلسلہ بھی ختم ہو۔ جدید علوم میں تحقیق آگے بڑھے۔ پاکستان میں تعلیم عام ہو اور جمہوری اقدار مستحکم ہو سکیں۔

امریکہ سے واپسی اتفاق سے پی آئی اے کی اسی کمرشل پرواز سے ہوئی جس سے صدر پاکستان اور ان کا وفد جرمنی جا رہا تھا۔ پی آئی اے کی پروازیں نیویارک، مانچسٹر، اسلام آباد کے راستے اختیار کرتی ہیں۔ صدر پاکستان کی سہولت کے لیے مانچسٹر کی بجائے برلن ٹھہرا گیا اور مسافر براہ راست پاکستان کے لیے گئے۔ جو تقریباً 312 تھے صدر نے یہ اچھی روایت شروع کی ہے کہ جہاں پی آئی اے کے طیارے جاتے ہیں وہاں عام پروازوں سے غیر ملکی دورے پر جاتے ہیں۔ ان پروازوں کے مسافروں کو کچھ زیادہ پہلے ائرپورٹوں پر پہنچنا پڑتا ہے۔ سیکورٹی

بھی معمول سے زیادہ ہوجاتی ہے لیکن اس روایت سے وی آئی پی کلچر ختم ہوا ہے۔ حکومت پاکستان پورا جہاز چارٹر کرتی تھی۔ یہ جہاز اتنے دن تجارتی مقاصد کے لیے استعمال نہیں ہوسکتا تھا۔ حکومت کو بھی نقصان ہوتا تھا، پی آئی اے کو بھی۔ اس پرواز میں ہمیں صدر پاکستان سے انٹرویو کا اتفاق بھی ہوا تو قریب سے دیکھا کہ بزنس کلاس میں ان کی اور وفد کی نشستیں ہیں۔ اس حصے میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تھی ورنہ پہلے وزرائے اعظم کے لیے الگ کیبن بنائے جاتے تھے۔ جن میں بیڈروم بھی ہوتا تھا۔ صدر اپنی نشست سے اٹھ کر جہاز کے دروازے کے قریب آ کر ہم سے بات کرتے رہے کیونکہ لوگ سو رہے تھے۔

صدر کے ساتھ خاتون اول بیگم صہبا مشرف، سید شریف الدین پیرزادہ مشیر برائے امور خارجہ۔ وزیر خزانہ شوکت عزیز، سیکرٹری خارجہ ریاض ایچ کھوکھر، سیکرٹری اطلاعات سید انور محمود، ملٹری سیکرٹری میجر جنرل ندیم تاج ان کی بیگم، ذاتی معالج میجر جنرل تصور حسین۔ ایڈیشنل سیکرٹری وزارت خارجہ (امریکہ و یورپ) انیس الدین احمد، ایڈیشنل سیکرٹری صدارتی سیکرٹریٹ محسن حفیظ، چیف آف پروٹوکول، بریگیڈیئر میر میاں خالد حنیف، معین جان نعیم، ڈی جی یورپ، ڈپٹی چیف پروٹوکول مسعود اختر نمایاں تھے۔ دیگر پروٹوکول آفیسر اور سیکورٹی کے عملے اور ایک ویلٹ کو ملا کر کل 26 افراد تھے، پہلے یہ وفود بہت زیادہ افراد پر مشتمل ہوتے تھے۔ ارکان سینیٹ اور اسمبلی کی کافی تعداد بھی ہوتی تھی۔ اخبار نویس بھی بہت ہوتے تھے۔ اب کے اخبار نویسوں کے لیے یہ طے کیا گیا کہ برطانیہ، امریکہ اور فرانس، جرمنی کے لیے الگ الگ ٹیمیں تشکیل دی گئیں جس سے پہلے کی طرح یہ اب صدر کے طیارے میں ساتھ ساتھ نہیں رہتے ہیں۔ یہ الگ کمرشل پروازوں سے جاتے ہیں، ٹھہرنے کا الگ انتظام کرتے ہیں۔ اس طرح سیکورٹی وغیرہ کے کچھ مسائل ہوتے ہیں لیکن حکومت کے اخراجات میں کافی کمی ہوجاتی ہے۔

برلن میں جہاز ایک فوجی ہوائی اڈے پر اترا۔ کھڑکیوں سے ہم صدر کے پرجوش استقبال کا منظر دیکھتے رہے پھر وطن کی طرف واپسی کا سفر شروع ہوگیا۔

کتابیات

1- 9/11- What difference a day makes - by James W. Moorl published by Diverrions for living. Nashville.

(قریباً 95 صفحات پر مشتمل۔ مختصر۔ مگر گہرا تاثر چھوڑنے والی کتاب۔ مسیحیت کی روشنی میں جائزہ لینے کی کوشش۔)

2- Power and Terror. by Noam Chomsky- published by seven storien press, New York.

امریکی دانشور نوم چومسکی نے اپنی آزاد خیالی اور بے باکی کے باعث تیسری دنیا اور عالم اسلام میں بہت شہرت پائی۔ یہ کتاب 11 ستمبر کے بعد ان کے کچھ انٹرویوز اور ریڈیو، ٹی وی گفتگو پر تالیف کی گئی ہے۔

3- Jihad vs Mcworld by Bellman R. Barber published by Ballantine Books. New York.

یہ کتاب آج کے ایک اہم موضوع عالمگیریت... صارفین سرمایہ داری نظام اور دوسری طرف مذہبی شدت پسندی اور قبائلی بنیاد پرستی کے درمیان بڑھتے ہوئے تنازع اور تصادم کا عالمی جائزہ لے رہی ہے.... موجودہ دنیا میں کشیدگی اور انتشار کا اصل سبب یہ ہے۔

4- It's still the economy stupid by Paul Begala, published by Simon & Schuster New York.

ایک دلچسپ.....آنکھیں کھول دینے والی کتاب.....صدر کلنٹن کے غیر سرکاری مشیر نے تجزیہ کیا ہے کہ امریکہ کے چیف ایگزیکٹو جارج بش نے امریکی معیشت کو کس طرح تباہ کر دیا ہے۔

5- Inside Alqaeda- by Rohan Gunartna - published by Berkeley books, New York.

گنارتنا نے القاعدہ پر کافی تحقیق کی ہے اور یہ ان کی جامع تصنیف ہے۔ جس میں دنیا بھر سے اس تنظیم کے بارے میں معلومات یکجا کی گئی ہے۔ ایشیا بالخصوص، فلپائن، انڈونیشیا، ملائشیا اور پاکستان میں القاعدہ کی سرگرمیوں کی تفصیلات چونکا دینے والی ہیں۔

6- In the After Math edited: James Taylor. publisher- North stone - British Columbia Canada.

11 ستمبر کے واقعات کا مسیحی نقطۂ نظر سے جائزہ بھی یقیناً اہم ہے۔ حکومت کینیڈا کی مدد سے شائع کیے گئے مختلف مسیحی اسکالرز کے یہ مضامین اس موضوع پر تحقیقی مطالعے میں معاونت کر سکتے ہیں۔

7- Understanding 11 September, editors, Craig Colhoun, Paul Price and Ashily Timber, published by The News Press 450 west 41st street 6th floor, New York , NY 10036.

دہشت گردی کے مختلف پہلوؤں، طریقوں، وارداتوں، اسلامی انتہا پسندی، عالمگیریت، نئے عالمی نظام سائبر دہشت گردی، عصر حاضر کے تضادات پر امریکی کینیڈا کے اسکالرز کے تحقیقی مقالات کا مجموعہ

8- Unholy War, by John L-Esposito published by Oxford University Press 198 Madison Avenue. Newyork 10016.

اسلام اور مسلمانوں پر امریکہ کے مشہور اور ممتاز محقق ایس پوزیٹو نے جدید دہشت گردی، جہاد اور اسلام کے لیے جدوجہد خدائی لشکروں کا جائزہ لیتے ہوئے بتانے کی کوشش کی ہے کہ اب یہاں سے ہم کہاں جائیں گے۔

9- En Route to GLOBEL occupation by Gary H.Kah, published by Huntington House publishers P.O.B. 53788 defecate domisina 70505.

گیری کاہ۔ امریکی حکومت سے رابطے میں رہے ہیں۔ اس کتاب میں وہ خبردار کر رہے ہیں کہ عالمی دستور اور عالمی پارلیمنٹ بنانے کی کوششیں جڑ پکڑ رہی ہیں۔ ایک نیا مذہب بھی فروغ پا رہا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر امریکیوں نے اس تحریک کی مزاحمت نہیں کی۔ تو قوموں کی خودمختاری ختم ہو جائے گی۔

10- Presidential (Mis) Speak, edited by Robert S-Brown published by outland bohsm outland communications, LLC P.O.B. 534 25 Hannum street Skaneathes, New York 13152.

موجودہ امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کی عجیب و غریب زبان کے حوالے سے ان کے اقتباسات اور اقوال یکجا کیے گئے ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد اور متصادم ہیں۔

11- Breakdown- by Bill Gertz published by Penguin group (USA) inc. 375 Hudson street New York, New York 10014.

بل گرٹز..... دفاع اور نیشنل سیکورٹی کے حوالے سے اہم رپورٹر ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ فرسودہ بیوروکریسی..... اور بزدل سیاستدان قومی سلامتی پر سمجھوتے کرتے رہے ہیں۔ اسامہ کی دہشت گرد تنظیم نے دنیا کے سب سے زبردست اعلیٰ جنس سسٹم کو ناکام کر کے رکھ دیا۔

12- The Politics of post modernism by Linda Hatcheon published by Routledg - 29 west 35th street New York NY

10001.

مابعد جدیدیت کی سیاسیات.....امریکی اور مغربی تجزیہ نگاروں کا اس وقت ایک گرما گرم موضوع ہے۔ جس میں یہ جائزہ لیا جاتا ہے جمہوریت کہ اور عوامی نمائندگی کے بعد اب کونسے سیاسی نظریات غلبہ پا رہے ہیں۔

13- The Assassins - by Bernard Lewis published by Phoenix- an imprint of Orion book ltd. Orion house 5 upper St.. martin lane, London WC 2H 9EA.

پروفیسر برنارڈ لیوئیس۔ اب مسلم تاریخ پر مغرب میں سند مانے جاتے ہیں۔ انہوں نے چودہویں صدی کے ایک خطرناک فرقے کو دریافت کیا ہے۔ جس کا رشتہ اسماعیلیوں سے استدار کیا ہے۔

14- Frontier Justice by Scot Ritter published by context books 368 Broad way suite 314 New York NY 10013.

عراق میں بڑے پیمانے پر تباہی کے ہتھیاروں کے بارے میں امریکی حکومت کے اعتراضات کو بے نقاب کرتے ہوئے اقوام متحدہ کے سابق اسلحہ انسپکٹر نے بہت سے حقائق بیان کیے ہیں۔

15- Media Control, by Noam Chommsky published by seven stories press- 140 watts street New York NY 10013.

نوم چومسکی سوالات کررہے ہیں۔ امریکی کیسے معاشرے میں رہتے ہیں۔ کتنی آزادی تحریر ہے۔ کتنی جمہوریت ہے۔ ذرائع ابلاغ سے کتنا پراپیگنڈہ ہوتا ہے۔

16- Rogue Nation- by Peter Scowen- published by Mcclelland and Stewart ltd. the Canadian publishers 481- university avenue Toronto, Ontario M56 2E9.

حکومت کینیڈا کی اعانت سے شائع ہونے والی اس تصنیف میں تحقیق سے یہ تجزیہ کیا گیا

ہے کہ ایٹمی اسلحے کو سیاسی ہتھیاروں کے طور پر استعمال کرنے والی۔ آمرانہ حکومتوں کو فوجی اور مالی مدد فراہم کرنے والی۔ دہشت گردی کی سرپرستی کرنے والی۔ غیر ملکوں میں تشدد اور دہشت گردی کو استعمال کو فروغ دینے والی۔ اپنے ملک میں انسانی حقوق کو پامال کرنے والی دائیں بازو کی مذہبی اقلیت سے متاثر ہوکر سیاہ قوانین نافذ کرنے والی قوم ایران، عراق یا شمالی امریکہ نہیں ہے۔ بلکہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہے۔

17- Poetry After 9/11 - edited by Dennis loy Johnson and Valcric Merians- published by Melville house publishing P.O.B 3278 Hobohen NJ 07030.

11 ستمبر کے خونیں واقعات پر نیویارک کے شاعروں نے کس طرح اپنے خیالات۔ مشاہدات اور تجربات کو نظموں میں منتقل کیا۔

18- Coloring the News. by William Mcgowen. published by Encounter books. 665 third street suite 330 San Francisco, California 94107-1951.

ایک تجربہ کار امریکی صحافی حقائق کی مدد سے یہ اجاگر کررہا ہے کہ امریکہ کے بڑے اخبارات اور نامور صحافی گزشتہ ایک دہائی میں انتہائی اہم واقعات کو کس طرح مسخ کرکے عوام تک پہنچاتے رہے ہیں۔

19- Against Liberalism by John Kekes. published by Cornell university press- sage house 512 east state street Ithaca, New York- 14850.

لبرل ازم میں کیا کیا خطرات پوشیدہ ہیں۔ ایک فرد کو دی گئی خودمختاری۔ معاشرے کے لیے ضرر رساں ہوسکتی ہے اس کے ساتھ ساتھ امن۔ سماجی ہم آہنگی اور صحت مندانہ ماحول بھی فرد کی آزادی کے لیے ناگزیر ہیں۔

20- Jihad- by Ahmed Rashid published by Vanguard books

(pvt) ltd. 45 the mall Lahore. Pakistan.

وسطی ایشیا میں رونما ہوتی تبدیلیوں میں مسلمانوں کی سوچ کس سمت میں بڑھ رہی ہے۔ سوویت یونین سے آزاد ہونے والی ریاستوں میں اسلام کیا شکل اختیار کر رہا ہے۔ افغانستان، پاکستان کی شدت پسند تنظیموں سے ازبکستان، تاجکستان، کرغیزستان وغیرہ کے تحت گیر مسلمانوں سے رابطے کس عسکریت کو جنم دے رہے ہیں۔

21- The main Enemy - by Milt Bearden and James Risen published by Radom house- New York - website. www.atrandom.com

دنیا کی دو مشہور اور عظیم خفیہ تنظیموں سی آئی اے اور کے جی بی کی اندرونی کہانیاں۔ ان کے اپنے عہدیداروں کی زبانی۔ جو افغانستان، چلی، مصر اور دوسرے ملکوں میں خود ان خوفناک آپریشنز کے مرکزی کردار تھے۔

22- Saddam King of Terror. by Con Conghline. published by Harper Collins publishers inc. east 53rd Street New York NY 10022.

عراق کے معزول رہنما صدام حسین کی زندگی اور سیاسی فکر کی داستان جو اس برطانوی صحافی نے سابق صدر کے قریبی رشتے داروں۔ عراق کی خفیہ ایجنسیوں کے اعلیٰ حکام۔ اور منحرفین سے طویل گفتگوؤں کے بعد مرتب کی۔

23- Unfinished Business- by Harlan Ullman published by Citadel press Kensington publishing corp. 850 Third Avenue - New York 10022.

فوجی امور کے ماہر اسکالر نے اسامہ بن لادن کے خلاف مہم۔ عرب اسرائیل تنازعات۔ مسئلہ فلسطین سوویت یونین کے انہدام سے پیدا ہونے والے خلاء۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان ایٹمی رقابت اسلامی دنیا میں عدم استحکام کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ ان سے امریکی

سلامتی کو مستقبل میں کیا کیا خطرات متوقع ہیں۔

24- Against All Enemies- by Richard a Clarke- published by Free press- Simon & Schussed inc. 1230 Avenue of the American New York. NY 10020.

صدر کلنٹن کے دور میں سلامتی۔ انفراسٹرکچر کے تحفظ۔ انسداد دہشت گردی کے نیشنل کوارڈینیٹر۔ رچرڈ کلارک جارج بش کے دور میں بھی اس عہدے پر فائز رہے۔ وائٹ ہاؤس نے القاعدہ اور دوسری عالمی دہشت گرد تنظیموں کے خاتمے کے لیے کیا کیا خوفناک غلطیاں کیں۔ اندر کے ایک اہم عہدیدار کی زبانی۔

25- The Price of Loyalty- by Ron Suskind - published by Simon & Schuster New York.

جارج ڈبلیو بش کی انتظامیہ کی اندرونی کہانیاں۔ جدید دور کے وائٹ ہاؤس کی خفیہ داستانیں۔

26- Philosophy of Mind - by John Heil - published by Routledge 29 West 35th Street, New York NY 10001.

دماغ کیا ہے۔ دماغ کی نوعیت کیا ہے۔ نظریات کیسے بنتے ہیں۔ نئی نئی تحریکیں کیسے ابھرتی ہیں۔

27- Troubled Waters- by R. Hrair Dechmejian and Horanss H.Suisonian- published by L.B. Taurus & Co ltd. 6 Salem Road London W.2 4BU.

کیسپین کے علاقے کے حوالے سے وسطی ایشیا کی سیاسی اہمیت۔ 11 ستمبر کے بعد امریکہ کی افغانستان، کیسپین اور وسطی ایشیا میں دلچسپی خوفناک حد تک کیوں بڑھ رہی ہے۔

28- The Division of India- by Sheikh Mohammed Naeem published by Commerce Horizons inc. 5694-4 High way East,

suit#172 Markham Ontario Canada L3P1B4.

ہندوستان کیسے تقسیم ہوا۔ تقسیم کے دوران پاکستان کے ساتھ کیا ناانصافی ہوئی۔ کشمیر کس طرح ہمیشہ کے لیے سلگتا ہوا مسئلہ بن گیا۔

29- Do Think Tanks Matter- by Donald E. Abelson- published by Mcgill- Queen's university press- Montreal.

پہلا تھنک ٹینک کب وجود میں آیا۔ امریکہ اور کینیڈا میں کتنے تھنک ٹینک ہیں۔ یہ کیا کرتے ہیں۔ ان کی سفارشات پر عملدرآمد کیسے ہوتا ہے۔

30- The CIA and American Democracy by Rhodri Jeffrey- Jones-published by Yale university press- New Haven and London.

دنیا کے سب سے خفیہ نیٹ ورک۔ سی آئی اے کی تاریخ۔ خاص طور پر نائن الیون کے حوالے سے خفیہ کارگزاریوں کی دل ہلا دینے والی کہانیاں۔

31- What's Right with Islam- by Imam Feisal Abdul Rauf. published by Harper San Francisco- 10 east 53rd street New york. NY 10022.

مسلمانوں اور مغرب کے درمیان کیا مشترک ہے کیا نہیں۔ نظریات کا نظریات سے موازنہ ہونا چاہیئے۔ عمل کا عمل سے۔ مغرب کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ اسلام کے ساتھ کیا درست ہے۔ اس تنازع میں نہیں الجھنا چاہیئے کہ اسلام کے ساتھ کیا غلط ہوا؟ مغرب اور مغرب میں مقیم مسلمانوں کے لیے ایک نیا مگر حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر۔

32- The Two Faces of Islam - by Stephen Schwartz- published by Doubleday- Random house inc. 1540 Broadway New York, New York - 10036.

اسامہ بن لادن کا رشتہ عرب مملکتوں کے جبر اور غیر نمائندہ حیثیت میں نہیں۔ بلکہ اسلام کے ایک فرقے وہابی ازم سے ہے۔ وہابیوں کا عروج سعودی خاندان سے وابستہ ہے۔ سعودیوں اور امریکیوں کے درمیان قریبی تعلقات اور موجودہ کشیدگی کا پس منظر۔

33- Holy War Inc.- by Peter L. Bergen - published by Weidenfelld and Nicholson- The Orion publishing group ltd. Orion house 5 upper st. Martin's Lane London, WC 2H 9EA.

اسامہ بن لادن کی بھرپور زندگی کی دلچسپی روداد۔ اسامہ کے قریبی دوستوں کے انٹرویوز اور تحقیقی رپورٹوں سے مزین یہ تصنیف اہل مغرب کو القاعدہ سے تفصیلی طور پر متعارف کرواتی ہے۔

34- Islam Without Fear- by Raymond William Baker- published by Royal book company BG-5 Rex care Fatima Jinnah Road G.P.O Box 7737 Karachi-75530 Pakistan.

مصر میں نئے اسلامی مفکرین کی کیا سوچ ہے۔ اعتدال پسند اسلامی سیاسی فکر کیا ہے۔ انتہائی چشم کشا تفصیلات۔

35- Terrorism - informing the public- edited by Nancy Ethel published by Mccormick Tribune foundation 435 north Michigon avenue. suite 770 Chicago, illinois 60611.

11 ستمبر کے خوفناک واقعات کے بعد دہشت گردی کے مقابلے اور اپنی حفاظت کے لیے تدابیر ہر معاشرے کی ضرورت ہیں۔ ایک دلچسپ اور دل نشیں پیرا یے میں احتیاطی اقدامات ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

36- A New Religious America-by Diana L. Eck published by Harper San Francisco-

امریکہ میں تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے مذہبی منظرنامے کی آنکھیں کھول دینے والی تفصیلات۔ امریکہ میں عیسائیوں، مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں، بہائیوں، یہودیوں اور دیگر

مذاہب کے ماننے والوں کے اعداد وشمار ان کے مراکز اور عبادت گاہوں کی رپورٹ۔

37- An outline of American History- by United States Information Agency.

سرکاری طور پر مرتب کردہ امریکی تاریخ۔ جو امریکہ میں جمہوریت اور سول سوسائٹی کے قیام کے مختلف مراحل اور مدارج سے گزرتے ہوئے دور حاضر تک پہنچاتی ہے۔

38- Pakistan- in the Shadow of Jihad and Afghanistan- by Mary Anne Weaver- published by Fairer, Strauss and Giraux 19 union square west, New York 10003.

امریکہ کی خارجہ پالیسی کے لیے پاکستان سے زیادہ مشکل اور متنازع کوئی قوم نہیں ہے۔ ایک درجن یا اس سے زیادہ پرائیوٹ اسلامی فوجیں۔ تیس سے پچاس ایٹم بم۔ روئے زمین پر سب سے خوفناک مقامات میں سے ایک۔

39- Closing of the American Mind- by Allen Bloom- published by - Simon & Schuster- New York.

بیسویں صدی میں امریکہ سماجی، سیاسی اور خاص طور پر عقلی بحران سے گزر رہا ہے۔ اعلیٰ تعلیم نے جمہوریت کو ناکام اور آج کے طلبہ کی روحوں کو قلاش کردیا ہے۔ امریکی ذہن کا ایک طویل سفر۔

40- The Paradox of American Power- by Joseph S. Nyejv published by Oxford university press New York.

اگر امریکہ کو عالمی قیادت کرنی ہے تو اسے تعاون بھی کرنا ہوگا۔ اکیسویں صدی میں اور خاص طور پر گیارہ ستمبر کے بعد خاص طور پر امریکہ کیا زیادہ عرصے تک واحد سپر پاور کی حیثیت برقرار رکھ سکے گا۔

41- The Sewing Cirles of Herat- by Christina Lasnh- published by Harper collins publishers. 77-85- Fulham Palace

road Hammersmith London W68JB.

ممتاز برطانوی صحافی کرسٹینا لیمب افغانستان کے امور کی ماہر خیال کی جاتی ہیں۔ اپنے صحافیانہ فرائض کے سلسلے میں انہوں نے کئی برس افغانستان اور پاکستان میں گزارے ہیں۔ مذہبی گروپوں، خواتین اور جنگجو سرداروں کے بارے میں متعدد تفصیلات انتہائی دلچسپ پیرائے میں۔

42- Pakistan and the Afghan Conflict 1979-1985, by Fradric Grare published by Oxford.

کیا پاکستان اپنے طور پر روس سے 1983ء سے 1985ء کے درمیان کسی معاہدے پر دستخط کرسکتا تھا۔ کیا پاکستان آسانی سے ''فرنٹ لائن اسٹیٹ'' کا درجہ ترک کرنے پر رضا مند تھا۔

43- Does America Need a Foreign Policy- by Hentry Kisinger- published by Simon & Schuster-

عالمی شہرت یافتہ ماہر امور خارجہ ہنری کسنجر امریکہ کے لیے اکیسویں صدی کے سفارتی تدبّر کے خدوخال بیان کرتے ہیں۔ ایک نئی جامع خارجہ پالیسی ناگزیر ہے۔

44- Islam, Islmaists and The electoral principle in the middle east- by James Piscatori- published by International Institue for the study of Islam in the modern world (ISIM) P.O.B. 11089- 2301 EB Leiden, the Netherlands.

مشرق وسطیٰ میں جمہوریت سے کیا انتہا پسندی، شدت گیری کی سوچ ختم ہوسکتی ہے۔ ایک معروضی مطالعہ۔

45- Thinking About Secularism and Law in Egypt- by Talal Asad- published ISIM.

مصر میں انتہا پسندی۔ شدت گیری۔ عام زندگی اور سیاست میں دخیل رہی ہے۔ اس کا مستقبل کیا ہے۔

46- Baghdad Diaries- by Nuha Al-Radi- published by

Vintage books- a a division Random house inc- New York.

بغداد کی ایک صاحب ذوق۔فنون لطیفہ کی ماہر خاتون کے شب و روز کی کہانی ان کی اپنی زبانی۔

47- Jinnah, Pakistan and Islamic Identity - by Akber S.Ahmed - published by Routledge New York.

کیا مسلمان کسی صلاح الدین ایوبی کی تلاش میں ہیں۔ قائد محمد علی جناح کی سیاسی جدوجہد۔اور سوچ آج کے اسلامی مباحثوں سے بھی براہ راست تعلق رکھتی ہے۔ پاکستان کے مستقبل کی سمتیں اس سے متعین ہوسکتی ہیں۔

48- The American Papers- compiled and selected by Roedad Khan- published by Oxford.

امریکہ اور پاکستان کے درمیان خفیہ خط وکتابت اور دیگر دستاویزات۔ جن کا تبادلہ 1965ء اور 1973ء کے دوران ہوا۔

49- A new Deal for Asia- by Mahathir Mohammad- published by Pelanduk publications P.O.B. 8265-46785 Kelyana Jaya S clangor Darul Ehsan Malaysia.

نئے ہزاریے میں ایشیا کا مستقبل۔ کیا ۲۱ ویں صدی ایشیا کی صدی بن سکتی ہے۔مشرق صرف مشرق کی طرف دیکھے یا مغرب کی طرف دیکھتا رہے۔

50- Paradoxes of Mahathirism -by Khoo Boo Teik- published by Oxford Malaysia.

مہاتیر کے سیاسی افکار اور ملائشیا میں جمہوریت کا ارتقا۔مغرب سے نفرت یا گریز۔

51- Diplomacy and Diplomatic practice in the early Islamic Era- by Yesin Istanbali- published by Oxford -Karachi.

ابتدائی اسلامی دور میں سفارت کاری۔حضور اکرمؐ کے دور میں۔ پھر خلفائے راشدین، بنوامیہ، عباسی۔ادوار میں سفیر کیسے مقرر کیے جاتے تھے۔اسلامی سفارت کاری کے خدوخال۔

52-Preventing Violent Conflicts - by Michael S. Land - published by United State Institute of peace press - 1550 M Street N.W. Washington D.C. 20005.

تنازعات کو پرتشدد تصادم بننے سے کیسے روکا جائے۔ ایک منظم عالمی ادارہ کن خطوط پر قائم ہونا چاہیے جو تنازعات کے تصفیے میں واقعی موثر ثابت ہوسکے۔

53- The 500 Years Curse(1492-1992) by Tanjutek- published by P.T. Pasadena Indoexim Abadi P.O.B 1034 Singapore 902034.

عالمی تنازعات پر امریکہ کے حوالے سے ایک منفرد نقطۂ نظر۔

54- Kashmir in Conflict- by Victoria Schoffield- published by I.B. Taurus publishers- victoria house bloomsbury square London WCIB 4D2.

کشمیر جنت نظیر۔ کس طرح متنازع بنی۔ اقوام متحدہ، بھارت اور پاکستان کے درمیان اب تک تصفیہ کیوں نہیں کروا سکی۔

55- Muslims on the Americanization Path- edited by Y Vonne Yazbeck Hadad, John L Esposito- published by Oxford- New York.

امریکہ میں مسلمانوں کی شناخت۔ ایک اجنبی معاشرے میں توازن کی تلاش۔ فقہ اور شریعت کے مطابق زندگی کیسے۔

56- The Taliban Ascent to Power- by M.J.Gohari published by Oxford Karachi.

طالبان کا دور حکومت، سیاسی ڈھانچہ، معیشت، سماجی نظام، حقوق انسانی، ہمسائیوں سے تعلقات۔

57- Taliban- by Ahmed Rashid - published by I.B. Taris.

طالبان نئے عالمی کھیل میں مرکزی کردار کیسے بن گئے۔ پاکستان، سعودی عرب اور سی آئی اے نے کیا خفیہ اقدامات کیے۔

58- The World After September 11- edited by Moonis Ahmar published by department of international relations university of Karachi.

11 ستمبر اور اس کے بعد۔ پاکستانی ماہرین کے خیالات کا انتخاب۔ دہشت گردی پر پاکستانی نقطۂ نظر۔

59- Afgan Communism and Soviet intervention- by Henry S. Bradsher- published by Oxford , Karachi.

افغانستان کی صورت حال کا ایک مختلف انداز سے مطالعہ۔ مجاہدین اور روسی غلبے کا مکمل پس منظر۔

60- Danger in Kashmir- by Josef Karlel - published by Oxford -Karachi.

کشمیر پاکستان ور بھارت کے درمیان دیرینہ تنازع۔ لیکن اسے یک عالمی طاقت۔ بین الاقوامی دہشت گردی اور ایٹمی ہتھیاروں نے مزید خطرناک بنادیا ہے۔

61- Living History - by Hillary Rodham Clinton- published by Simon & Schuster- New York.

تنازعات سے معمور اس عہد کے مطالعے کے لیے وائٹ ہاؤس میں مقیم خاتون اول کی روداد بھی بہت سے حوالے اور اشارے دیتی ہے۔

62- The Case of Israel - by R. Garaudy - published by Shoronk International . 316/318 regent street dondon WIR 5AB.

دنیا میں کشیدگی کا مستقل اور مسلسل سبب۔ اسرائیل کا قیام اور فلسطینیوں پر مظالم ہیں۔ ہر معاملے میں یہودیوں پر الزام تراشی۔ دوسری طرف یہودیوں کی سیاسی شدت پسندی۔ ایک گہرا مطالعہ۔

مصنف کی دیگر کتب

☆ روبرو

1967-1977 کے ہنگامہ خیز عرصے میں لیے گئے انٹرویوز

☆ ون ٹو ون

(1978-2002) کے دوران لیے گئے انٹرویوز

☆ تقدیر بدلتی تقریریں

پاکستان کے سربراہوں کی تاریخی تقریریں

☆ لاڑکانہ سے پیکنگ

اردو-انگریزی

☆ چہرہ چہرہ میری کہانی (1974)

پہلا شعری مجموعہ

☆ محلوں میں سرحدیں (1992)

غزلیں، نظمیں

☆ شہر سے جنگ (2002)

شاعری کا انتخاب

☆ ایاں ایاں یویو

بچوں کے لیے لکھی گئی نظمیں

☆ برطانیہ میں خزاں

ایک سفرنامہ

☆ بھارت میں بلیک لسٹ

شملہ مذاکرات سے آگرہ مذاکرات تک

☆ شب بخیر (ناول)

جنرلوں اور سیاست دانوں کی راتیں کیسے گزرتی ہیں

☆ خواتین و حضرات

کتابوں کی افتتاحی تقریبات میں پڑھے گئے مضامین

☆ ایک تہائی اقتدار

1988 سے 1991 کے سیاسی کالم

☆ مملکت اے مملکت

مملکت کے درد میں ڈوبی تحریریں

کچھ مصنف کے بارے میں

محمود شام جنوبی ایشیاء کے سینئر ترین صحافیوں میں سے ہیں اس وقت اردو کے سب سے بڑے اخباری گروپ جنگ گروپ آف نیوز پیپر ز میں گروپ ایڈیٹر ہیں۔وہ ہفت روزہ اخبار معیار بھی نکالتے رہے ہیں جس کی اشاعت 1978 میں مارشل لاء کے دوران منسوخ کر دی گئی، آزادی اظہار کے سلسلے میں کراچی اور حیدر آباد جیل میں نظر بند بھی رہے۔اردو شعراء میں بھی انہیں ایک منفرد حیثیت حاصل ہے،غزل اور نظم دونوں لکھتے ہیں۔گورنمنٹ کالج جھنگ سے بی۔اے اور گورنمٹ کالج لاہور سے فلسفے میں ایم اے کیا۔زمانہء طالب علمی میں جھنگ کالج کے میگزین (کارواں) اور لاہور کالج کے میگزین (راوی) کے مدیر بھی رہے۔پاکستان کے تمام اہم سیاسی قائدین سے انٹرویوز کر چکے ہیں جن میں سابق مشرقی پاکستان کے رہنما بھی شامل ہیں پیشہ ورانہ فرائض کے سلسلے میں دنیا کے تمام اہم ملکوں کے دورے کر چکے ہیں۔ ان میں امریکہ، روس، چین، برطانیہ، فرانس، کینیڈا، ملائیشیا، سنگاپور، تھائی لینڈ، جنوبی کوریا، کمبوڈیا، لاؤس، ہانگ کانگ، برما، ترکی، عراق، بنگلہ دیش، سری لنکا، نیپال، رومانیہ، متحدہ عرب امارات، مسقط، قطر، بھارت، مصر، شام، مراکش، سعودی عرب، کویت، لیبیا، سویڈن، ڈنمارک، سوئٹزر لینڈ، اٹلی، اور بلجیئم نمایا ہیں، انہوں نے 1972 میں جنگ کے لیے شملہ مذاکرات کی رپورٹنگ بھی کی، پھر 2001 آگرہ مذاکرات کی روداد ارسال کرتے رہے کیمپ ڈیوڈ میں بش، مشرف تاریخی سربراہی ملاقات کی رپورٹنگ بھی کی۔مزید معلومات کے لیے www.mehmoodsham.com پر نظر ڈالیں.